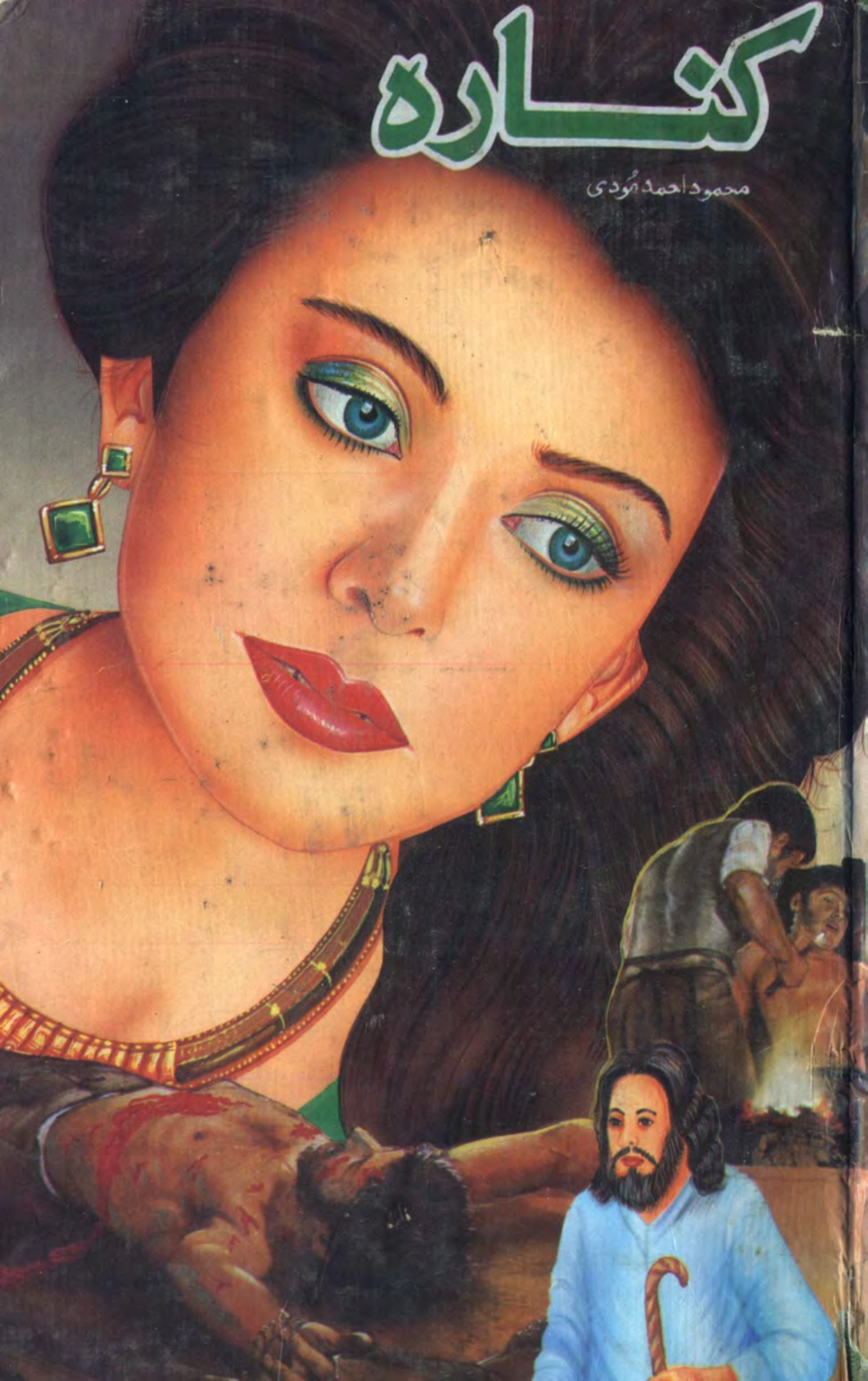

کنارہ
محمود احمد مودی

دیباچہ

میری یہ کہانی انسان کی اس اندر کی تنہائی کی کہانی ہے جو شاید ازل سے اس کا مقدر ہے۔ ہم انسانوں کے ہجوم میں رہتے ہیں لیکن درحقیقت کتنے تنہا ہوتے ہیں، یہ ہمارا دل ہی جانتا ہے۔ یہ ایک ایسے انسان کی کہانی ہے جو نوجوانی میں بے کاری، بے روزگاری کا شکار تھا جو آج کے نہ جانے کتنے نوجوانوں کا مسئلہ ہے۔ جب اس نے کچھ کر گزرنے پر کمر باندھی تو زندگی اسے عجیب راستوں پر لے گئی۔

اس کہانی میں آپ کو ہر قدم پر ایک نیا موڑ ملے گا اور ہر موڑ پر ایک نئے تجربے کا عکس........ محبت کی مٹھاس، نفرتوں کا زہر، سازشوں کے جال، لالچ اور ایثار کی کشمکش........ غرضیکہ حیات انسانی کا ہر رنگ اس کہانی میں جھلکتا ہے۔ اگر آپ ذرا توجہ سے دیکھیں گے تو آپ کو اس کہانی کے کردار بھی اپنے اردگرد ہی کہیں نہ کہیں چلتے پھرتے دکھائی دے جائیں گے۔ اس کہانی کا انجام یقیناً آپ کو کچھ دیر کے لئے اداس بھی کردے گا اور بہت کچھ سوچنے پر بھی مجبور کرے گا۔

بارش اچانک ہی شروع ہو گئی تھی۔

ہم سمجھتے تھے کراچی کے موسم کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ ابھی تیز دھوپ نکلی ہوئی ہے اور ابھی بادل امنڈ آئے، چھما چھم بارش شروع ہوگئی.......... یا پھر ہفتہ ہفتہ بھر آسمان پر سیاہ بادلوں کے پرے کے پرے منڈلاتے رہے۔ آپ دفتر جاتے ہوئے بھی ڈر کے مارے چھتری لے کر نکلتے رہے یا بارش کے ڈر سے اپنے بہت سے کام ملتوی کرتے رہے مگر اتنے دنوں میں ایک چھینٹا پڑ کے نہ دیا۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ دھوپ بھی نکلی ہوئی ہے اور ساتھ موٹی موٹی بوندیں بھی پڑ رہی ہیں۔ یوں ہم تینوں دوست کراچی کو بے اعتبار موسموں کا شہر سمجھتے ہیں۔

لیکن اس روز ہمیں پتا چلا کہ جنگل کے موسم کا بھی کوئی بھروسہ نہیں ہوتا!

ہم جب شکار کے ارادے سے اس جنگل میں پہنچے تو مطلع بالکل صاف تھا۔ آسمان پر سورج چمک رہا تھا اور اس کے باوجود ہلکی سی خنکی تھی۔ ہم موسم کی اس نوازش پر خوش تھے کہ گرمی میں خون پسینہ ایک نہیں کرنا پڑے گا۔ ہم وہ شکاری تھے جو شکار میں بھی آرام تلاش کر رہے تھے۔

بہتر ہو گا کہ پہلے میں اپنا تعارف کرا دوں.......... "ہم" سے مراد ہم تین دوست سندھ کے ایک چھوٹے سے شہر میں رہتے ہیں۔ احمد اور جمال، دونوں کے والد چھوٹے چھوٹے زمیندار ہیں۔ اس قسم کے زمیندار نہیں جیسے عموماً" آپ فلموں میں دیکھتے ہیں۔ جن کے گرد ہر وقت دس بیس کلاشنکوف برداروں کا گھیرا رہتا ہے۔ جو ہر وقت مخمور نظر آتے ہیں اور موٹی موٹی مونچھوں پر تاؤ دے کر اپنے غنڈوں کو کسی غریب مزارع کی لڑکی اٹھا کر لانے اور کبھی کسی غریب مسکین کی ہڈی پسلی ایک کرنے کے احکامات دیتے رہتے ہیں۔

احمد اور جمال، دونوں کے والد اس کے بالکل برعکس تھے۔ احمد اور جمال میں بہت سی

باتیں مشترک تھیں۔ حتیٰ کہ دونوں کی شکلوں میں بھی ہلکی سی مشابہت پائی جاتی تھی۔ لوگوں کو جب معلوم ہوتا تھا کہ ان میں تو دور کی رشتے داری بھی نہیں تھی، تو وہ بہت حیران ہوتے تھے۔

اسی طرح دونوں کے والد ایک دوسرے کے بھائی معلوم ہوتے تھے۔ دونوں کی شخصیتیں ملتی جلتی سی تھیں۔ دونوں ٹوپی پہنتے تھے۔ دونوں ایک ہی مسجد میں نماز پڑھتے تھے۔ دونوں نیک اور پرہیز گار تھے۔ کسی پر ظلم کرنا تو درکنار انہوں نے کبھی کسی کو اونچی آواز میں ڈانٹا تک نہیں تھا۔

دونوں چھوٹے زمیندار تھے لیکن وہ اس وجہ سے شریف نہیں تھے کہ ان کی زمینیں کم تھیں۔ میں نے ان جتنی زمینیں رکھنے والوں کو بھی بڑی بڑی بدمعاشیاں کرتے دیکھا تھا۔ یہ بس کچھ اوپر والے کا کرم ہوتا ہے اور کچھ اپنی نیت کی بات ہوتی ہے کہ آپ ہر برائی کی طاقت رکھنے کے باوجود اچھے بن جائیں۔

دونوں کی زمینیں پاس پاس تھیں مگر کبھی جھگڑا یا اختلاف ہونا تو دور کی بات، ان سے ہر ایک اپنے حصے کا پانی، اپنے حصے کا بیج اور کھاد دوسرے کو دینے کو تیار رہتا تھا۔ آدھی رات کو بھی ایک کو دوسرے کی مدد کی ضرورت ہوتی تھی تو دروازہ کھٹکھٹا لیتے تھے۔ یہی نہیں، ان کے دروازے اپنے مزارعوں کے لئے بھی ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ بارش، برسات اور وبائی بیماریوں کے دنوں میں میں نے ان دونوں کو دوائیں، لے لے کر اپنے مزارعوں کے گھر جاتے دیکھا تھا۔

۔ کبھی کبھی میں آنکھیں بند کر کے بڑی حسرت کے عالم میں سوچتا تھا کہ اگر ہمارے معاشرے میں زیادہ تر لوگ اپنی اپنی حیثیت میں، اپنے اپنے مقام پر ایسے ہی ہوتے یا کم از کم ایسا بننے کی کوشش ہی کیا کرتے تو یہ دنیا کتنی بھلی لگتی، زندگی گزارنا کتنا پرلطف محسوس ہوتا۔

میں.......... یعنی مراد بھی اپنے والد کے بارے میں بتاتا چلوں۔ میرے والد ایک سرکاری افسر ہیں۔ بہت بڑے افسر تو نہیں ہیں لیکن کچھ ایسے چھوٹے بھی نہیں ہیں۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ وہ بہت نیک، متقی اور پرہیز گار آدمی ہیں تو یہ کچھ اچھا بھی معلوم نہیں ہو گا اور کچھ زیادہ صحیح بھی نہیں ہو گا۔

لیکن ان میں ایک بڑی خوبی ہے کہ وہ رشوت نہیں لیتے اور فی زمانہ یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔ ان سے جونیئر افسروں کے بعض بڑے شہروں میں مکانات، بنگلے یا پلاٹ ہیں، کسی کی بسیں چل رہی ہیں، کسی نے کسی رشتے دار کی آڑ میں کوئی چھوٹی موٹی فیکٹری لگا لی ہے مگر والد صاحب اپنے چھوٹے سے شہر میں بھی ذاتی مکان نہیں بنوا سکے۔ ہم اپنے آبائی مکان میں رہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے والد صاحب ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ایسا مکان نہیں بنوا سکیں گے۔

لیکن ہم تینوں دوستوں کے گھرانے نہایت مطمئن و آسودہ زندگی گزار رہے تھے۔ ہمارے پورے پورے گھرانوں کے ایک دوسرے سے گہرے تعلقات تھے اور زیادہ تر لوگ ہمیں آپس میں رشتے دار سمجھتے تھے۔

ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم تینوں دوستوں کو کراچی یونیورسٹی میں داخلہ بھی مل گیا۔ ہمارے شعبے الگ الگ تھے لیکن ہم تقریباً" دن رات ہی ساتھ رہتے تھے کیونکہ ہمیں ہاسٹل میں جگہ نہیں مل سکی تھی اس لئے ہم تینوں یونیورسٹی روڈ پر ہی ایک اپارٹمنٹ کرائے پر لے کر رہ رہے تھے۔

لیکن پھر ہوا یہ کہ بار بار دبتے اور بار بار ابھرتے ہوئے ہنگامے ایک بار پھر ابھرے اور کچھ زیادہ ہی پھیلتے چلے گئے۔ یونیورسٹی سال میں چوتھی مرتبہ بند ہوئی اور اس بار غیر معینہ مدت کے لئے بند ہوئی۔ ہماری گناہگار آنکھوں نے یونیورسٹی اور شہر میں وہ مناظر دیکھے کہ روح پر گھاؤ سے پڑ گئے۔

ہم نے اپارٹمنٹ کو تالا لگایا اور اپنا اپنا بیگ اٹھا کر اپنے چھوٹے سے شہر میں لوٹ آئے۔ کشیدگی اور تناؤ یہاں بھی تھا۔ بڑے شہر کی خونریز سیاست کے اثرات یہاں بھی پہنچے ہوئے تھے لیکن کراچی کے مقابلے میں فضا پھر بھی غنیمت تھی۔ ہماری معاشرتی اقدار یوں تو ہر جگہ ہی ملیامیٹ ہو چکی ہیں لیکن چھوٹے شہروں میں پھر بھی لوگوں میں ایک دوسرے کے لئے کچھ شرم لحاظ ہوتا ہے۔ مزاجوں میں کچھ تحمل ہوتا ہے۔ ہم یہاں کے پرانے رہنے والے تھے اور کچھ ہمارے والدین کی شہرت ایسی تھی کہ ان کا نام آتا تھا تو سرکش سے سرکش آنکھ بھی ایک لمحے کے لئے ضرور جھک جاتی تھی۔ یہاں گلی کوچوں میں پھرتے ہوئے ہمیں اب بھی کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔

کافی دنوں تک ہماری روح پر برف سی جمی رہی اور ہم اپنے گھروں میں مقید سے پڑے رہے۔ طبیعت میں ایک عجیب سی اداسی تھی۔ ایک عجیب اتفاق تھا کہ ہم تینوں دوستوں کی طبیعت میں وہ بے حسی، وہ ہنگامہ پسندی اور وہ حد سے زیادہ چلبلا پن نہیں تھا جو آج کل کے طلباء کی پہچان بنتا جا رہا ہے۔ ہم لاشوں پر بھنگڑے ڈالنے والے اور استادوں کی پسلیوں میں کلاشن کو فیں چھونے والے طالب علم نہیں تھے۔

بالآخر ماحول سے وحشت کے بادل چھٹنے لگے۔ گلی کوچوں میں رونق اور لوگوں کے چہروں پر بشاشت واپس آنے لگی۔ ہماری روح پر سے بھی اداسی کی برف پگھلنے لگی۔ اچھے مستقبل کی امید کا ستارہ بادلوں کی اوٹ سے نکل کر ایک بار پھر جھلملانے لگا.......... لیکن یونیورسٹی کھلنے کی کوئی اطلاع نہ آئی۔

ہمیں بوریت ستانے لگی۔ چھوٹے شہروں میں یوں بھی تفریح کے ذرائع بہت کم ہوتے ہیں۔ وہ تو غنیمت تھا کہ مجھے تھوڑا بہت لکھنے لکھانے کی عادت تھی۔ میرے چھوٹے

موٹے مضامین چھوٹے موٹے ہی اخبارات اور رسائل میں کبھی کبھار شائع ہوتے رہتے ت اور میں بڑی محبت اور محنت سے ان کے تراشے فائلوں میں لگا کر رکھتا تھا۔ گھر پر بھی اگ بوریت حد سے بڑھتی تھی تو میں کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتا تھا۔ میرے چند افسانے بھی شائع ہ چکے تھے۔

لیکن سچی بات یہ تھی کہ ان دنوں لکھنے پڑھنے میں بھی کچھ زیادہ دل نہیں لگ رہا تھا میں کوئی ہلکا پھلکا مضمون لکھنے بیٹھتا اور ختم کرنے کے بعد اسے پڑھتا وہ اسکول کی کسی طا کا لکھا ہوا غم ناک افسانہ معلوم ہوتا۔ جب میں حقیقتاً" کوئی افسانہ لکھنے کی کوشش کرتا تو معاشیات کا مضمون معلوم ہوتا۔ شاید یہ زمانے اور حالات کا اثر تھا کہ محسوسات می معاشیات گھس آئی تھی اور غالب آ گئی تھی۔

انہی حالات میں ایک روز احمد اور جمال میرے گھر آئے۔ چائے اور لوازمات پر ہا صاف کرنے کے بعد جمال نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے نہای سنجیدگی سے بات شروع کی......... "ڈیئر مراد حمیدی! میں نے اور احمد نے شکار کا پروگر بنایا ہے۔ اس میں تمہاری شرکت بھی اشد ضروری ہے"۔

"شکار کا پروگرام؟" میں نے بری طرح چونکتے ہوئے کہا "آج کے دور میں یہ انسان' انسان کا شکار کھیل رہا ہے کیا تمہارے لئے یہ کافی نہیں ہے جو تم بے چارے ۔ زبان جانوروں کی زندگی میں بھی زہر گھولنے کے ارادے باندھنے لگے ہو؟"

احمد اور جمال نے بیک وقت مجھے خونخوار نظروں سے گھورا۔ ہم تینوں میں جمال ذ بارعب شخصیت کا مالک تھا اور جب کوئی بات منوانے یا کوئی مسئلہ طے کرنے کی ضرور پیش آتی تھی تو زیادہ تر بات چیت وہی کرتا تھا۔

اس کے مونچھیں نہیں تھیں مگر اس وقت وہ اپنی خیالی اور غیر معمولی مونچھ کو ؛ دیتے ہوئے بارعب لہجے میں بولا "مانا کہ تم ایک گھٹیا درجے کے' تقریباً" ناکام مضمون نگار ا افسانہ نویس وغیرہ ہو لیکن ہمارے ساتھ گفتگو میں افسانوی اور فلسفیانہ قسم کا انداز اختی کرنے کی کوشش مت کیا کرو۔ اس سے تمہیں بدہضمی بھی ہو سکتی ہے اور پسلیوں میں د بھی ہو سکتا ہے......... بدہضمی کے بارے میں تو میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ پسلی میں درد اس لئے ہو گا کہ میں اور احمد مل کر تمہاری پسلیوں پر آٹھ دس گھونسے رسید کر گے........."

"حد ادب گستاخ نوجوانو!" میں نے حتی الامکان بارعب لہجے میں کہا۔ "اگر تم ا وقت ہمارے مہمان نہ ہوتے تو ہم تمہاری گردنیں قلم کرا دیتے........."

"اور اس قلم سے کوئی نیا افسانہ لکھتے جو کسی رسالے سے ناقابل اشاعت قرار پا واپس آ جاتا........" احمد نے لقمہ دیا پھر وہ تیزی سے بولا "مذاق چھوڑو یار! ہم ۔

سنجیدگی سے بات کرنے آئے ہیں"۔

"سنجیدگی سے ہی بات کرنی ہے تو کسی اور موضوع پر کرو۔ شکار بھلا کوئی سنجیدہ موضوع ہے؟ میرے خیال میں تو شکار ایکبہت ہی بے ہودہ اور بے رحمانہ مشغلہ ہے۔ اس پر سخت پابندی ہونی چاہئے۔ میں اگلا مضمون اسی موضوع پر لکھوں گا"۔

"ضرور لکھنا اور اس کے بعد ہمیشہ کی طرح آنکھیں بند کر کے یہ امید لے کر بیٹھ جانا کہ تمہارے لکھے ہوئے مضمون سے بڑے بڑے اونچے ایوانوں میں زلزلہ برپا ہو گیا ہو گا۔ ارباب اختیار بوکھلائے ہوئے ادھر سے ادھر دوڑے پھر رہے ہوں گے۔ فائلیں ان کے ہاتھ سے گر رہی ہوں گی اور معاشرے میں انقلاب برپا ہو چکا ہو گا........" احمد بولا۔

"حالانکہ معاشرے کے کان پر جوں تک نہیں رینگی ہو گی"۔ جمال منہ بنا کر بولا۔

احمد مجھے سمجھانے کے سے انداز میں بولا........ "ارے بھائی! شکار کا تو وہ معاملہ ہے کہ......... لہو گرم رکھنے کا ہے ایک بہانہ......... شکار وغیرہ ہم لوگوں سے بھلا کیا ہونا ہے۔ یہ تو جمال نے بوریت سے بچنے کا ایک طریقہ سوچا ہے۔ گھر میں لیٹے لیٹے ہاتھ پیروں کو زنگ لگ رہا ہے۔ چل کر ذرا جنگل کے جانوروں سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں۔ اگر واقعی کوئی جانور خود ہی ہماری بندوق کے سامنے آ گیا اور مارا گیا تو یہ اس کی بدقسمتی اور نالائقی ہو گی ورنہ اپنے اور ہمارے نشانے کا حال تو تمہیں معلوم ہی ہے........."

"ہاں......... مجھے معلوم ہے........." میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا......... "ہائی اسکول کے زمانے میں ہم نے رائفل شوٹنگ کورس میں داخلہ لیا تھا......... ہمیں جس پتھر پر نشانہ لگانے کے لئے کہا جاتا تھا' ہماری رائفلوں کی گولیوں سے وہی پتھر سب سے زیادہ محفوظ رہتا تھا........."

"اب بھی ایسا ہی ہو گا........." احمد نے سینے پر ہاتھ رکھ کر ہاں میں ہاں ملائی۔

"انشاء اللہ........." جمال نے بڑے خلوص سے اسکی ہاں میں ہاں ملائی۔

"اور اگر غلطی سے ہم لوگوں سے ایک آدھ نشانہ صحیح لگ گیا تو تم اپنے آپکو جم کاربٹ اور کینتھ اینڈرسن سمجھنے لگو گے........." میں نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں......... ہم اس قسم کے خیالات دل میں لا کر جم کاربٹ اور کینتھ اینڈرسن کی روحوں کو تکلیف نہیں پہنچائیں گے........." جمال نے وعدہ کیا۔

"تمہارا کس مقام کو شوق شکار بخشنے کا ارادہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"رانی پور کے قریب بہت طویل رقبے میں پھیلا ہوا ایک جنگل ہے۔ سنا ہے اس میں خرگوش پائے جاتے ہیں........." جمال نے بتایا۔

"خرگوش کا شکار کرو گے؟" میں تقریباً" اچھل پڑا......... "بے چارا اتنا معصوم سا

جانور ہوتا ہے"۔

"تو پھر کسی بدمعاش سے جانور کا نام بتا دو جو ہمارے آس پاس کے جنگلات میں پایا جاتا ہو۔ اس کا شکار کرلیں گے"۔ جمال نے مجھے گھورا۔

"لگڑ بگھے کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"اس کا مجھے نام ہی پسند نہیں.......... عجیب غیر ادبی اور غیر رومانی سا نام ہے"۔ جمال نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر بھیڑیئے کے شکار پر چلتے ہیں"۔ میں نے تجویز پیش کی۔

"وہ اب دو ٹانگوں پر چلنے لگے ہیں اور شہروں میں.......... دیہات میں آ کر رہنے لگے ہیں۔ انسانوں میں گھل مل گئے ہیں۔ انہیں تلاش کرنا بہت مشکل ہے"۔ جمال بولا۔

"جب شکار ہی کرنا ٹھہرا تو پھر کیوں نہ شیر کے شکار پر نکلا جائے؟" میں نے کہا۔

"شیر ہمارے ہاں چڑیا گھر کے علاوہ کہیں نہیں پایا جاتا.......... اور تمہیں یاد نہیں کراچی میں ایک بار چڑیا گھر کے مرل سے شیر نے ہی احمد کو ذرا گھور کر دیکھ لیا تھا تو کئی راتوں تک اسے ڈراؤنے خواب آتے رہے تھے"۔ جمال نے یاد دلایا۔

"لہٰذا مجبوری ہے.........." احمد ٹھنڈی سانس لے کر بولا.......... "ہمیں خرگوش کے شکار پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا۔ اگر ایک آدھ خرگوش مارا گیا تو ہم اسی کی لاش پر پاؤں رکھ کر تصویر کھنچوا لیں گے اور اسے فریم کرا کے اپنے اپنے ڈرائنگ روم میں لگا لیں گے.........."

"کسے فریم کرا کے لگا لیں گے؟ تصویر کو.......... خرگوش کو.......... یا شکاری کو؟" جمال نے وضاحت چاہی۔

"میرے خیال میں تو تصویر کو ہی فریم کرانا مناسب رہے گا.......... کیوں مراد.......... تمہاری کیا رائے ہے؟" احمد نے نہایت سنجیدگی سے مشورہ طلب انداز میں میری طرف دیکھا۔

"بکواس مت کرو.........." میں نے احمد کو ڈانٹا.......... "اور مجھے سنجیدگی سے جمال سے کچھ معلومات حاصل کرنے دو.........." پھر میں نے جمال کو مخاطب کیا..........

"ہم کس چیز میں شکار پر جائیں گے؟ میرا مطلب ہے کوئی سواری وغیرہ..........؟"

"میرے پاس جیپ جو موجود ہے"۔ جمال نے شاہانہ انداز میں کہا۔

"جیپ؟" میں نے آنکھیں پھیلا کر حیرت کی اداکاری کی.......... "وہی جیپ جو تمہیں تمہارے والد نے تحفے میں دی تھی؟"

"ہاں.......... وہی.........." جمال نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور جو تمہارے والد کو تمہارے دادا نے تحفے میں دی تھی اور تمہارے دادا کو

تمہارے پردادا نے دی تھی اور تمہارے پرداد.........."

"بس..........بس"۔ احمد نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے میری بات کاٹ کر کہا "اس سے آگے نہ جانا ورنہ جیپ کی ملکیت کا سرا نہ جانے کہاں سے کہاں جا پہنچے.......... بہرحال جیپ کے پرانے ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جیپ اگر پرانی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم شکار پر نہیں جا سکتے.......... تم نے وہ محاورے نہیں سنے.......... نیا نو دن' پرانا سو دن.......... اور اولڈ از گولڈ.......... وغیرہ وغیرہ.......... پرانی جیپ میں بیٹھ کر انسان زیادہ پرانا شکاری نظر آتا ہے۔ جنگل کے جانوروں پر ذرا اچھا امپریشن پڑے گا"۔

"اور شاید وہ خود سامنے آ آ کر دست بستہ گزارش کرنے لگیں گے کہ ہمیں شکار کیجئے.......... ہمیں شکار کیجئے حضور والا!" میں نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

"یار! افسانہ نگار اور مضمون نگار وغیرہ تم ہو لیکن تمہاری زبان و بیان کی تصحیح اکثر مجھے کرنا پڑتی ہے"۔ جمال ترحم بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا.......... "جانوروں کے ساتھ تم نے لفظ "دست بستہ" استعمال کیا ہے.......... حالانکہ یہاں پنجہ بستہ یا کھر بستہ ہونا چاہئے تھا.......... میں نے تمہارے ایک افسانے میں بھی پڑھا تھا۔ تم نے جنگل کی ایک تاریک رات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا.......... ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا.......... حالانکہ جنگل کی تاریک رات کا ذکر کرتے وقت تمہیں لکھنا چاہئے تھا کہ پنجے کو پنجہ سجھائی نہیں دے رہا تھا.........."

"تصحیح کا شکریہ"۔ میں نے جمال کو گھورتے ہوئے کہا "آئندہ کسی رسالے میں ایڈیٹر کی جگہ خالی ہوئی تو میں تمہارا نام ضرور پیش کروں گا.......... بات تمہاری اس جیپ کی ہو رہی تھی جس میں بیٹھ کر ابن بطوطہ دنیا کی سیاحت پر نکلا تھا.........."

"ابن بطوطہ کے زمانے میں جیپ نہیں ہوتی تھی.........." جمال نے گویا میری غلط فہمی دور کی۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ تمہاری جیپ دراصل جیپ نہیں ہے۔ ابن بطوطہ کے زمانے میں وہ گدھا گاڑی ہوگی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں دوسری چیزوں کی طرح بہت سی تبدیلیاں آتی گئیں اور اب ہمیں اس پر جیپ کا گماں گزرنے لگا.........." میں نے کہا۔

احمد بولا.......... "اور اب گدھا اس میں آگے نہیں جوتا جاتا بلکہ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ جاتا ہے.........." اس نے جمال کی طرف خفیف سا اشارہ کیا۔

جمال چڑ کر بولا.......... "یار! تم لوگوں کی گفتگو تو طویل دورانئے کا ڈرامہ ہوتی جا رہی ہے۔ سیدھی طرح بتاؤ تم لوگوں کو شکار پر چلنا ہے یا نہیں؟"

میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا.......... "معاف کرنا یار!.......... بس یونہی

بات سے بات نکلتی جاتی ہے۔ میں تو صرف یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ کیا تمہاری جیپ خرگوشوں کے پیچھے کچھوے کی رفتار سے دوڑے گی؟"

جواب جمال کی بجائے احمد نے دیا.......... "ہاں.......... کم از کم ایسے کچھوے کی رفتار سے ضرور دوڑے گی جسے بچپن سے جوڑوں کے درد کی شکایت ہو.........."

جمال نے گھور کر احمد کو دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے بولا.......... "ایسے ہی موقعوں پر کہا جاتا ہے.......... جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے.......... اور وہ کیا شعر ہے..........

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

وغیرہ وغیرہ"

"بھئی واہ!" احمد نے ہاتھ اونچا کر کے داد دی.......... "کمیں گاہ کے ذکر سے بھی اس شعر میں کمینہ پن پیدا نہیں ہوا"۔

"اور جمال نے جس طرح اس مصرعے اور شعر کو نثر کے انداز میں پڑھا ہے اس بد سلیقگی سے تو گھسیارے گھاس بھی نہیں کاٹتے"۔ میں نے کہا۔

"گویا یہ طے پا گیا کہ ہم لوگ شکار پر جا رہے ہیں"۔ جمال نے اچانک ہی گھٹنے پر ہاتھ مار کر اعلان کیا۔

"تم نے یہ نتیجہ کیسے اخذ کر لیا"۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جب گفتگو کا کوئی نتیجہ نہ نکل رہا ہو تو پھر اپنی پسند کا نتیجہ نکال لینا چاہئے.........." جمال نے اطمینان سے جواب دیا.......... "ویسے بھی تم دونوں میری رعایا ہو۔ ہمیشہ سے میرا حکم مانتے آ رہے ہو۔ اب ماننے میں بھی تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے"۔

میں اور احمد خاموش رہے تو جمال گویا اس فیصلے کو حتمی شکل دیتے ہوئے بولا.......... "کل صبح منہ اندھیرے میں جیپ میں تمہارے ہاں پہنچ جاؤں گا۔ تم تیار رہنا ایسا نہ ہو کہ مجھے آ کر پانی کی ایک بالٹی تم پر انڈیلنی پڑے۔ میں احمد کو ساتھ لیتا آؤں گا میں سب تیاریاں کر کے آؤں گا۔ بس تم صرف اپنی بندوق ساتھ لے لینا"۔

"وہی بندوق جس سے تمہارے دادا جان نے دوسری جنگ عظیم میں آخری گولی چلائی تھی.........." احمد لقمہ دیئے بغیر نہ رہ سکا.......... "اس کی صفائی وغیرہ ضرور کر لینا اور تیل بھی دے لینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس سے گولی کی بجائے صرف زنگ باہر آئے.........."

جمال یہ فیصلہ سنا کر چلا گیا تھا اور اسی کے نتیجے میں ہم اس وقت جنگل میں موجود تھے۔

ہم دن چڑھے جنگل میں پہنچ گئے تھے لیکن اس کے بعد بھٹکتے بھٹکتے شام سر پر آ گئی تھی اور ہم کوئی خرگوش تو کیا' کچھوا بھی نہیں مار سکے تھے۔ مذاق اپنی جگہ تھا لیکن اس میں شک نہیں تھا کہ احمد اور جمال کو تو شکار کا تھوڑا بہت تجربہ بھی تھا.......... اس کے باوجود بھی کوئی خرگوش نہیں مار سکے تھے۔

بات یہ نہیں تھی کہ جنگل میں خرگوش نہیں تھے۔ بیسیوں پلے پلائے اور موٹے موٹے خرگوش ہمیں پھدک پھدک کر ایک جھاڑی سے دوسری جھاڑی اور ایک جھنڈ سے دوسرے جھنڈ میں جاتے نظر آئے لیکن سب کے سب بہت ہی خوش قسمت واقع ہوئے تھے۔ کوئی بھی ہماری بندوق کی زد میں نہیں آیا کمبخت بہت ہی پھرتیلے تھے۔

ہم نے کبھی جیپ میں بیٹھے ہی بیٹھے انہیں نشانہ بنانے کی کوشش کی اور کبھی جیپ سے اتر کر جھاڑیوں جھنڈوں میں بہت دور دور تک ان کا تعاقب کیا لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ بلاوجہ ہی تھکن سے ہماری بری حالت ہو گئی لیکن ہم نے ہمت نہیں ہاری اور کوششیں جاری رکھیں۔

شام تک ہم اپنے بیشتر کارتوس ضائع کر چکے تھے اور ایک دوسرے کو اپنی ناکامیوں کا ذمے دار ٹھہرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جمال کے دل سے بھی خود کو دور جدید کا جم کاربٹ یا کینتھ اینڈرسن ثابت کرنے کا شوق نکل چکا تھا۔

پھر شاید خرگوشوں کو ہماری حالت دیکھ کر شرم آ گئی اور ایک خرگوش خود ہی میری بندوق کے سامنے آ گیا۔ شاید یہ وہی خرگوش تھا جو کچھوے سے شرط لگا کر دوڑا تھا اور راستے میں خواب خرگوش سے جاگا تھا اور گھبراہٹ میں میری بندوق کی زد میں آ گیا تھا ورنہ مجھے تو خود سے ایسی کوئی امید نہیں تھی۔ میں قلم چلانے والا آدمی تھا۔ بندوق چلانے میں اپنے دونوں دوستوں سے زیادہ اناڑی تھا لیکن ان کا خیال تھا کہ میں قلم چلانے میں بھی اتنا ہی اناڑی تھا جتنا بندوق چلانے میں۔

قدرت کو شاید ہماری یہ "خون ریزی" پسند نہیں آئی۔ ابھی ہم نے اپنے اکلوتے شکار کو ذبح کر کے باسکٹ میں ڈالا ہی تھا کہ بادل امنڈ کر آنے لگے لیکن اس وقت ہم اتنے خوش تھے کہ ہم نے بادلوں کی طرف کچھ زیادہ توجہ نہیں دی۔ ہمیں خوشی تھی کہ ہمارے پاس کم از کم یہ ثبوت تو آ گیا تھا کہ ہم جنگل میں شکار کھیلنے آئے تھے ورنہ مجھے تو اندیشہ محسوس ہونے لگا تھا کہ ہمیں خالی ہاتھ ہی واپس جانا پڑے گا۔ احمد اور جمال تو دو ایک ایسی جگہوں کے بارے میں بھی باتیں کرنے لگے تھے جہاں خرگوش بکتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ واپسی پر وہاں سے دو چار خرگوش خرید کر ذبح کروا کر ساتھ لے لئے جائیں۔

میں ہی اس شکاریانہ بددیانتی کے لئے تیار نہیں تھا اور شاید قدرت نے میری ہی سن

لی تھی کہ ہمیں اکلوتا شکار عطا کر دیا تھا۔ ہم اس کی خوشی میں مگن' جیپ کو تیز رفتاری سے دوڑاتے ہوئے جنگل میں کچھ اور آگے لے گئے.......... پھر اچانک ہی موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں اور جلد ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

شام پہلے ہی اپنا سرمئی آنچل پھیلانے لگی تھی۔ بادل چھائے تو اچھا خاصا اندھیرا چھا گیا۔ جیپ بھی کھلی تھی۔ اس پر کینوس کی چھت نہیں تھی۔ جلد ہی ہم سب بارش میں بھیگ گئے۔ جنگل کی ناہموار زمین کیچڑ میں تبدیل ہونے لگی۔

جمال نے اپنی دانست میں واپس روانہ ہونے کی کوشش کی۔ کافی دیر تک جیپ ادھر ادھر اونچے نیچے راستوں پر اچھلتی کودتی کبھی تیز کبھی آہستہ چلتی رہی لیکن پھر ہمیں احساس ہوا کہ ہم کسی بھی جانے پہچانے سے مقام تک نہیں پہنچ رہے تھے۔ ہم راستہ بھول چکے تھے۔ جنگل میں راستہ یاد رکھنا بھی ایک آرٹ ہوتا ہے۔

ابھی ہم خود کو یہی طفل تسلیاں دینے میں مصروف تھے کہ ہم راستہ نہیں بھولے تھے اور اگر بھول بھی گئے تھے تو یہ کوئی خاص پریشانی کی بات نہیں تھی' کہ اچانک جیپ کا انجن بھی گھرگھرا کر خاموش ہو گیا۔ جمال نے کئی بار اسے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر ہلکی سی گھرگھراہٹ کے سوا انجن سے کوئی آواز برآمد نہ ہوئی۔

اب ہمیں واقعی پریشانی لاحق ہونے لگی۔ فضا میں خنکی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ پانی میں شرابور ہو جانے کی وجہ سے ہمیں ٹھنڈ لگنے لگی تھی۔ ویسے بھی جنگل بیابان میں جب رات سر پر ہو' موسلا دھار بارش ہو رہی ہو' گاڑی خراب ہو گئی ہو اور انسان کو احساس ہو کہ وہ راستہ بھول چکا ہے تو ساری شوخی اور دلیری ہوا ہو جاتی ہے لیکن ہم اب بھی اپنی زندہ دلی کو برقرار رکھ کر ایک دوسرے کو یا پھر شاید خود کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہے تھے کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں تھی۔

"لو بھئی.......... یہ کسر رہ گئی تھی.......... جیپ بھی خراب ہو گئی.........." جمال اپنا گیلا سر کھجاتے ہوئے بولا۔

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟" میں نے جل کر کہا۔ "مجھے تو اس پر حیرت ہے کہ یہ اب تک چل رہی تھی.........."

"مذاق چھوڑو یار!.......... یہ بتاؤ تمہیں جیپ کے انجن کے بارے میں کچھ معلومات ہیں؟" جمال نے اچھی خاصی سنجیدگی سے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں.......... مجھے انجن کے بارے میں ایک بہت اہم بات معلوم ہے"۔ میں نے جواب دیا۔

"وہ کیا؟" جمال نے اشتیاق سے پوچھا۔

"یہی کہ جیپ کا انجن ہمیشہ بونٹ کے نیچے ہوتا ہے.........." میں نے سنجیدگی سے

کہا۔

جمال نے گھونسہ بلند کیا لیکن بروقت اس کا رخ تبدیل کر لیا اور مجھے رسید کرنے کی بجائے اسٹیئرنگ وہیل پر مار دیا پھر وہ اپنے چہرے سے پانی پونچھ کر چھینکتے ہوئے بولا۔ "کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ لکھنے لکھانے والے لوگ تم جیسے غیر سنجیدہ بلکہ مسخرے ہوتے ہیں"۔

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا.......... "میرے جگر کے چوتھے ٹکڑے! تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اندر سے میں کتنا سنجیدہ انسان ہوں۔ حیرت تو مجھے تم پر ہونی چاہئے۔ ایک زمیندار کے بیٹے ہو کر تم اتنے نالائق ہو۔ جیپ تمہاری ہے اور تم جیپ کے انجن کے بارے میں معلومات مجھ سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہو"۔

"بھائی! میں زمیندار کا بیٹا ہوں' موٹر میکینک کا نہیں۔ میں اس جیپ کو کبھی کبھار صرف استعمال کرتا ہوں۔ اس کے انجن سے الجھنے کی کوشش نہیں کرتا.......... ویسے بھی اسے میری ملکیت میں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ابھی میں اس کے اسرار و رموز سے زیادہ واقف نہیں ہوں"۔

"یار! تم لوگ ٹر ٹر ہی کرتے رہو گے یا کوئی اتر کر انجن کا بھی جائزہ لے گا؟" احمد نے گفتگو میں مداخلت کی۔

ہم دونوں نے بیک وقت اسے گھورا اور اس نے دونوں ہاتھ بغلوں میں دبا لئے۔ وہ سردی سے ہولے ہولے کانپنے لگا تھا۔ میرے جسم میں بھی ٹھنڈی ٹھنڈی لہریں دوڑ رہی تھیں اور میرے خیال میں جمال کا بھی یہی حال تھا۔ بالآخر جمال جیپ سے اترا اور بونٹ اٹھا کر انجن پر جھک گیا۔ کچھ دیر تک اس نے انجن سے چھیڑ چھاڑ کی اور میں نے اس کی ہدایت کے مطابق اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے ایکسیلیٹر دیا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

بالآخر جمال نے سیدھا ہو کر جھنجلا کر بونٹ پٹخا اور جیپ کو لات رسید کی لیکن دوسرے ہی لمحے پاؤں پکڑ کر ناچنے لگا۔

"بند کرو یہ بریک ڈانس.........." میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے اسے ڈانٹا.......... "دولتی یا ایک لتی' ہمیشہ موقع محل دیکھ کر رسید کرنی چاہئے"۔

اس نے ناچنا بند کر دیا۔ احمد بھی نیچے اتر آیا۔ میں نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا.......... "آؤ درختوں کے اس جھنڈ کے نیچے کھڑے ہو کر ملک و ملت کے دانشوروں کی طرح صورت حال پر غور کرتے ہیں"۔

ہم ان درختوں کے نیچے جا کھڑے ہوئے لیکن ملک و ملت کے عظیم دانشوروں ہی کی طرح ہم بھی اپنی پریشانی کا کوئی حل تلاش نہ کر سکے۔ اس دوران کئی بار بجلی اس طرح کڑکی اور بادل اس طرح گرجے کہ دل دہل اٹھا۔ بالآخر ہم نے جیپ کو وہیں چھوڑ کر درختوں کے نیچے نیچے پیدل چلنے کا فیصلہ کیا۔

کافی دیر تک ہم یونہی چلتے رہے لیکن منظر گویا وہی کا وہی رہا۔ کہیں چھدرے کہیں گنجان درخت.......... کہیں جھاڑیاں' کہیں صاف رَستہ'.......... ادل بدل کر یہی چیزیں سامنے آتی رہیں لیکن ہم کوئی واضح شناخت متعین نہ کر سکے کہ کن راستوں سے ہم وہاں تک پہنچے تھے۔ اس روز مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ جنگل میں تمام راستے ایک جیسے لگتے ہیں.......... یا کم از کم اناڑیوں کو ضرور ایسا محسوس ہوتا ہے۔

ہم میں جمال ہی تمام معاملات میں نسبتاً" ذرا ہوشیار تھا اور شکار کی تجویز بھی اس کی تھی۔ اس لئے میں اور احمد باری باری اس پر آنکھیں نکال رہے تھے۔ میں نے اپنے بالوں سے پانی نچوڑ کر اس پر چھڑکتے ہوئے کہا.......... "تم تو کچھ اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے تم اس جنگل کے پتے پتے بوٹے بوٹے سے واقف ہو۔ کونا کونا تمہارا دیکھا بھالا ہے اور کیڑے مکوڑوں تک سے تمہاری پرانی شناسائی ہے۔ اب کیوں منہ اتنا لٹکا ہوا ہے اور کیوں کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آ رہا؟"

"اب مجھے کیا معلوم تھا کہ ہم بے خیالی میں اتنی دور نکل آئیں گے اور اوپر سے جیپ بھی خراب ہو جائے گی.........." وہ جھنجلا کر بولا.......... "اگر بارش نہ ہوتی اور جیپ خراب نہ ہوتی تو ہم کسی نہ کسی طرف سے جنگل سے نکل ہی جاتے"۔

پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا.......... "تمہارا تو وہی معاملہ ہے کہ..........

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے"

"برخوردار! اس وقت تو پتے ہوا نہیں' پانی دے رہے ہیں"۔ احمد اوپر درختوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا جن کے پتوں سے پانی گر رہا تھا۔ بارش کبھی کم کبھی زیادہ ہو رہی تھی۔

مزید چند لمحے خاموشی سے چلنے کے بعد احمد بولا.......... "آخر ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"کاش ہمیں معلوم ہوتا.........." میں نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔ "میرا خیال ہے ہم کہیں بھی نہیں جا رہے.......... ہم صرف ذلیل و خوار ہو رہے ہیں"۔

فضا میں ایک عجیب سرمئی سی دھندلاہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اس دھندلاہٹ میں ہم درختوں کے ایک جھنڈ سے نکل کر ذرا کھلی جگہ پہنچے تو اچانک ہی سامنے کچھ سائے سے متحرک نظر آئے۔ پہلے تو ہم ڈر گئے اور دوبارہ درختوں کی پناہ تلاش کرنے لگے۔ اسی دوران سائے ذرا قریب آ گئے تو ہم نے دیکھا کہ وہ جھاڑ جھنکاڑ داڑھی والا ایک دراز قد شخص ہے۔

اس کے لمبے لمبے' میلے اور الجھے الجھے سے بالوں کی لٹیں پانی میں بھیگ کر اس کے کندھوں پر جھک آئی تھیں اور ان سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ کچھ لٹیں اس کی

جھاڑ جھنکاڑ سی داڑھی مونچھوں میں گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ اس کے جسم پر سیاہ رنگ کا کسی موٹے سے کپڑے کا ایک ڈھیلا ڈھالا لبادہ تھا جس میں کئی بدرنگ سے پیوند لگے دور سے ہی نظر آ رہے تھے۔

اس کے گلے میں موٹی موٹی مالائیں اور ہاتھ میں ٹیڑھا میڑھا سا ایک عصا تھا۔ اس نے شاید پیروں میں گھنگھرو بھی پہنے ہوئے تھے۔ وہ جب قدم اٹھاتا تو چھن چھن کی دھیمی مگر مترنم سی آواز ایک خاص ردھم کے ساتھ سنائی دیتی تھی۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس کے ساتھ تین کتے' ایک بکرا' حتی کہ دو خرگوش بھی تھے۔ وہ سب اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے حالانکہ خرگوش عموماً" کسی کے ساتھ نہیں چلتے۔ سر پہ بھی ایک رنگ برنگی سی چڑیا بیٹھی تھی۔ ایک بلی بھی پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

عام طور پر چرند پرند اور دیگر جانور بارش میں باہر نہیں نکلتے۔ کہیں نہ کہیں دبک کر بیٹھ جاتے ہیں لیکن میرے لئے یہ عجیب نظارہ تھا کہ مختلف جانور بارش میں بھیگتے اس شخص کے ساتھ چلے آ رہے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ کتوں کے پیچھے پیچھے بلی بھی بھیگتی چلی آ رہی تھی اور کوئی کتا اس پر جھپٹنا تو درکنار اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔

احمد میرا ہاتھ دباتے ہوئے نیچی آواز میں بولا.......... "یار! یہ کوئی ڈاکو تو نہیں؟"

"ایسے ہوتے ہیں ڈاکو؟" میں نے اسے گھورا.......... "ٹی وی سے.......... وی سی آر سے.......... اور سینما گھروں میں فلمیں دیکھ دیکھ کر تم نے اپنی نظر کمزور کر لی ہے لیکن تمہیں آج تک یہ پتہ نہیں چلا کہ ڈاکو کیسے ہوتے ہیں؟"

"کیا احمقانہ بات کر رہے ہو یار!" احمد بگڑ کر بولا.......... "ڈاکوؤں کا کوئی بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ حلیہ اور مقررہ یونیفارم تو نہیں ہوتی۔ ڈاکو کسی بھی حلیے میں ہو سکتا ہے"۔

اس دوران وہ شخص کچھ اور قریب آ چکا تھا۔ چہرے سے بھیگے بالوں کی لٹیں ہٹا کر وہ آنکھیں سکیڑے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے جانور بھی ہماری طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ خصوصاً" کتے خاصے متجسس انداز میں تھوتھنیاں اٹھائے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

اچانک مجھے کچھ یاد آیا اور میں نے بے اختیار احمد اور جمال دونوں کے بازو تھامتے ہوئے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا.......... "یہ یقیناً جانوروں والا بابا ہے.........."

جانوروں والا بابا.........' یہ نام ان دونوں کے لئے نیا نہیں تھا۔ ہم تینوں نے بارہا اس کا تذکرہ سنا تھا لیکن کم از کم میرے ذہن میں اس کی شخصیت کا خاکہ ذرا مختلف تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کے بال برف کی طرح سفید ہوں گے لیکن اس کے بالوں کی تو تمام لٹیں بالکل سیاہ تھیں۔ سیاہ بالوں کے ساتھ کسی کا بابا کہلانا کچھ سمجھ میں نہیں آتا

احمد اور جمال بھی اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے اثبات میں سر ہلا رہے تھے۔ انہیں بھی یقیناً یاد آ گیا تھا کہ جانوروں والے بابا کا انہوں نے کئی بار تذکرہ سنا تھا۔ وہ خاصا ”مشہور“ بابا تھا......... حالانکہ آبادیوں سے میلوں دور جنگل میں رہتا تھا۔

یہاں سے قریب ترین آبادی رانی پور تھی۔ وہ بھی کم از کم تین میل کے فاصلے پر تھی۔ ہم نے بارہا اس کا ذکر سنا تھا اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور تھیں۔ نہ جانے ان میں سے کتنی سچ تھیں اور کتنی جھوٹ......... بہرحال اس میں شک نہیں تھا کہ وہ ایک افسانوی سی شخصیت تھا۔

لوگ کہتے تھے وہ بہت پہنچا ہوا بزرگ تھا مگر کسی کو منہ نہیں لگاتا تھا۔ ہمارے معاشرے کا چلن یہ ہے کہ کسی کے بارے میں ذرا سا شبہ ہو جائے کہ وہ پہنچا ہوا بزرگ ہے تو فوراً“ اپنے تمام مسائل حل کرانے کے لئے لوگ جوق در جوق اس کے پاس پہنچنے لگتے ہیں۔

سب کچھ حاصل کر لینے کا یہی ایک آسان سا شارٹ کٹ سب کو نظر آتا ہے۔ بے اولاد لوگ اولاد حاصل کرنے کے لئے چلے آتے ہیں۔ فلمساز کی کوشش ہوتی ہے کہ بزرگ صاحب اس کی فلم کے ڈبے پر پھونک مار دیں تو فلم ہٹ ہو جائے۔ بہو کی کوشش ہوتی ہے کہ بزرگ ایسا تعویز دے دیں کہ ساس کا قصہ پاک ہو جائے جب کہ ساس کو کوئی ایسا تعویز حاصل کرنے کی فکر میں ہوتی ہے جس سے بہو ہوا میں تحلیل ہو جائے۔

طالب علم سارا سال عیش کرنے اور قتل و غارت کی سیاست کرنے کے بعد ایک تو اس اطمینان میں ہوتا ہے کہ ڈیسک پر پستول رکھ کر اور کتاب کھول کر پورا پرچہ حل کر آئے گا لیکن ساتھ ساتھ' اطمینان قلب کے لئے ایسے ہی کسی بزرگ سے مکمل اور یقینی کامیابی کا تعویز حاصل کرنے کی فکر میں بھی ہوتا ہے۔

کوئی اپنے دشمن کو کسی طلسمی نقش سے فنا کر دینے کی فکر میں ہوتا ہے کیونکہ کلاشنکوف چلانا اس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ کوئی کنگال عاشق اپنے محبوب کو رام کرنے کے لئے کوٹھی کار کے بجائے تعویز سے کام چلانا چاہتا ہے۔ وہ بھی اسی طرح کے کسی بزرگ کی تلاش میں ہوتا ہے۔

کوئی محبت کے بجائے تعویز کے ذریعے کسی کے دل میں گھر کرنا چاہتا ہے۔ کوئی سنگدل آفیسر کو موم کرنا چاہتا ہے اور کوئی تعویز کی مدد سے آؤٹ آف ٹرن ترقی پانا چاہتا ہے۔ ان سب کو ایسے ہی کسی نہ کسی بابا کی صورت میں اپنی منزل و مراد کا عکس نظر آتا ہے۔ وہ کسی کی کرامات کی افواہیں بھی سن لیں تو اس پر گروہ در گروہ چڑھائی کئے رکھتے ہیں لوگوں کی اسی خوش اعتقادی کی بدولت نہ جانے' کتنے جعلی پیروں فقیروں اور نہ جانے کتنے فریب کاروں کے وارے نیارے ہیں۔

لیکن جانوروں والے بابا کے نام سے مشہور اس شخصیت کا معاملہ بہت مختلف تھا۔ وہ کسی کو اپنے قریب پھٹکنے ہی نہیں دیتا تھا۔ کچھ لوگ اگر کوئی آس امید لے کر مصیبتیں اٹھاتے' دھکے کھاتے' بڑی مشکلوں سے اسے ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس کے پاس پہنچتے تھے تو وہ آگ بگولہ ہو جاتا تھا۔ جھونپڑی کا دروازہ بند کر لیتا تھا اور جب لوگوں کو اس کے ایک ٹھکانے کا پتہ چل جاتا تھا تو وہ اسے چھوڑ کر کہیں اور چلا جاتا تھا۔ کسی دوسری جگہ جھونپڑی بنا لیتا تھا۔

کبھی کبھار وہ کچھ سودا سلف لینے......... یا یوں کہیئے کہ سودا سلف مانگنے رانی پور آ جاتا تھا۔ اس کے پاس تھوڑے بہت پیسے بھی ہوتے تھے جو نہ جانے کہاں سے آتے تھے حالانکہ وہ کبھی کسی سے پیسے مانگتا نہیں تھا۔ وہ سودے سلف کے بدلے کچھ پیسے کسی دکاندار کو دینے کی کوشش کرتا تو وہ لیتا ہی نہیں تھا۔

وہ رانی پور تک بھی معلوم نہیں کیسے پہنچتا تھا۔ اگر بس والے اسے بٹھا لیتے تھے تو یہ ان کے حوصلے کی دلیل تھی کیونکہ اس کے جلو میں ہمیشہ چار پانچ کتے' دو تین بلیاں' کندھوں پر دو چار کوے' کبوتر' چڑیاں اور طوطے ہوتے تھے۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ جب وہ گلی کوچوں سے گزرتا تھا تو مزید دو چار پرندے اس کے سر پر سے چند فٹ اوپر رہتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ پرواز کرنے لگتے تھے۔

گویا وہ کسی بھی جگہ کے جانوروں کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ جہاں بھی جاتا تھا وہاں کے چرند پرند اس کا ساتھ دینے کی کوشش کرتے تھے۔ یوں وہ جانوروں والا بابا کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔

احمد اور جمال بیک وقت سرگوشی میں بولے ”ہاں......... یہ یقیناً جانوروں والا بابا ہی ہے“۔

جانوروں والا بابا چھن چھن کرتا ہماری طرف ہی آ رہا تھا۔

ہم تینوں دم بخود کھڑے تھے!

جھاڑ جھنکاڑ سے بالوں کی وجہ سے جانوروں والے بابا کے چہرے کا بہت کم حصہ دکھائی دے رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں ہم صاف دیکھ سکتے تھے۔ بارش کے پانی کی دھندلاہٹ کے باوجود آنکھیں نمایاں نظر آ رہی تھیں اور ان آنکھوں میں اداسی کا ایک عجیب بیکراں سمندر پھیلا ہوا تھا۔

میں نے اس قبیل کے جتنے بھی لوگ دیکھے تھے ان میں سے کسی کی آنکھوں میں محض سرخی دیکھی تھی اور کسی کی آنکھوں میں جاہ و جلال......... اگر وہ کوئی جعلی قسم کی شخصیت ہوتا تو اس کی آنکھوں میں محض شیطانی سی چمک دکھائی دیتی لیکن یہ پہلا درویش قسم کا بابا تھا جس کی آنکھوں میں مجھے اداسی کا بیکراں سمندر پھیلا ہوا دکھائی دیا تھا۔

بالآخر وہ ہمارے سامنے آ رکا اور اس کے ساتھ ہی اس کے جانور بھی ساکت ہو گئے۔

معلوم نہیں فضا میں ہی خنکی بڑھ گئی تھی یا کوئی اور بات تھی کہ میں نے اپنے جسم میں خفیف سی کپکپی محسوس کی اور میرا خیال تھا کہ میرے دونوں ساتھیوں کا بھی یہی حال تھا۔ وسط میں کھڑا تھا اور جانوروں والے بابا کی نظر مجھ پر ہی جمی ہوئی تھی۔

وہ بالکل خاموش تھا۔ ہم سے کچھ بھی نہیں پوچھ رہا تھا۔ اس کی خاموشی' اس سکوت ہمیں زیادہ مضطرب کر رہا تھا لیکن شاید ہم میں سے بھی کسی کی ہمت نہیں پڑ رہی کہ اس سکوت کو توڑتا۔ مجھ سمیت شاید کسی کو بھی کوئی لفظ ہی نہیں سوجھ رہا تھا۔

اچانک زور سے بجلی کڑکی اور ہم تینوں بیک وقت بری طرح اچھل پڑے۔ جانوروں والے بابا کی مونچھوں میں خفیف سی حرکت پیدا ہوئی۔ وہ غالباً" مسکرا رہا تھا۔ بالوں کی اوٹ سے اس کے ہونٹ بھی جھانکنے لگے۔ وہ واقعی مسکرا رہا تھا۔ شاید ہما شکلوں پر اس وقت کچھ زیادہ ہی حماقت برس رہی تھی۔

اس کی مسکراہٹ گویا بادلوں کی اوٹ سے سورج کی طرح طلوع ہوئی تھی۔ اس ساتھ ہی ماحول پر جمی ہوئی خوف اور سکوت کی برف پگھلنے لگی۔ کم از کم میری نظر میں ب پراسراریت' اس کی شخصیت کا ایک بے عنوان سا خوف یکدم ہی معدوم ہو گیا۔ میں محسوس کیا کہ جانوروں والا بابا ہمارا دوست تھا' دشمن نہیں۔ وہ ہم پر مہربان تھا' برہم نہیں

"راستہ بھول گئے ہو؟" اس نے بھاری اور گونجدار آواز میں پوچھا۔ اچھی خ ٹھنڈ کے باوجود اس کے لہجے میں ذرا بھی ارتعاش نہیں تھا۔

"جی ہاں.......... بابا جی"! میں نے بھی اس کے بالوں کی سیاہی کے باوجود م لہجے میں اسے "بابا جی" کے لقب سے ہی مخاطب کیا۔

اس سے پہلے کہ میں اسے کچھ اور بتاتا' وہ خود ہی بولا.......... "شکار کھیلنے تھے؟"

مجھے حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا۔ میں نے سوچا شاید وہ اپنی غیب دانی کی قوتوں ہمیں حیران کرنے والا ہے لیکن جب وہ مزید کچھ نہ بولا تو میں نے خود کو سمجھایا کہ اس غیب دانی والی کوئی بات نہیں تھی۔ ہمارے حلئے اور ہمارے کندھوں پر بندوقیں بتا رہی کہ ہم شکار کھیلنے نکلے ہوئے تھے۔ درحقیقت ہم تو بھول ہی گئے تھے کہ ہمارے کندھو بندوقیں لٹکی ہوئی تھیں۔

"جی ہاں.......... جی ہاں.........." میں نے سنبھل کر جلدی سے کہا۔ " جیپ خراب ہو گئی ہے اور ہمیں بالکل اندازہ نہیں ہو رہا کہ ہم جنگل میں ہائی وے سے دور آ گئے ہیں۔ کیا آپ ہماری کچھ رہنمائی کر سکتے ہیں؟"

وہ اسی بھاری اور گونجیلی سی آواز میں بولا۔ "رات سر پر آ گئی ہے اب تم رہنمائی سے بھی ہائی وے تک نہیں پہنچ سکتے۔ آج کی رات کسی طرح میری جھونپڑ

گزار لو۔ صبح میں خود تمہیں ہائی وے تک چھوڑ آؤں گا"۔

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ گھر کی طرف سے تو فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ ہم اپنے اپنے گھر میں کہہ آئے تھے کہ شاید ایک رات کے لئے ہم جنگل ہی میں کیمپ لگائیں لیکن بس یونہی ایک بے عنوان سا تذبذب اور حیرت تھی۔ وہ آدم بیزار بابا جو کسی کو اپنی جھونپڑی کے قریب پھٹکنے نہیں دیتا تھا' ہمیں وہاں قیام کی دعوت دے رہا تھا۔

میرے خیال میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں تھی۔ ہم بہرحال تین تھے.......... نوجوان تھے.......... اور پھر ہمارے پاس بندوقیں بھی تھیں۔ خواہ بارش کی وجہ سے جام ہو چکی ہوں لیکن بندوق کا بہرحال اپنا ایک رعب ہوتا ہے اور کوئی بعید نہیں تھا کہ بوقت ضرورت ان میں سے کوئی بندوق چل ہی جاتی۔

ہمیں خاموش اور متذبذب دیکھ کر گویا بابا کی چڑچڑاہٹ اور آدم بیزاری عود کر آئی۔ وہ قدرے ناگواری سے بولا۔ "آنا ہے یا میں جاؤں؟"

ہم آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو یہ پیش کش قبول کرنے کی رضامندی دے چکے تھے۔ اس جنگل میں' اس برسات میں ہمیں یہ امید نہیں رکھنی چاہئے تھی کہ نہایت معقول قسم کے لوگ قطار در قطار ہماری مدد کے لئے چلے آ رہے ہوں گے۔

"چلئے بابا.......... آپ کی ہمدردی کا بہت شکریہ.........." میں نے جلدی سے کہا اور ہم تینوں اس کے پیچھے چل دیئے۔

جنگل کی بھول بھلیوں میں ہمیں زیادہ دور نہیں چلنا پڑا۔ جلد ہی ہم مختصر سے ایک میدان میں پہنچے جس کے وسط میں ایک خاصی معقول سی جھونپڑی سر اٹھائے کھڑی تھی۔ جھونپڑی کے سامنے برآمدے کے طور پر الگ سے چھوٹا سا ایک چھپر بھی بنا ہوا تھا۔ اس چھپر کے نیچے مزید چند کتے بلیاں اور دیگر جانور نہایت اطمینان سے شیر و شکر ہوئے بیٹھے تھے۔ چھپر کی چھت سے پانی ان پر ٹپک رہا تھا مگر وہ ذرا بھی بے چین نہیں تھے۔

جانوروں والے بابا کو دیکھتے ہی وہ سب گویا اس کے استقبال کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور دوڑ کر قریب آ گئے۔ کوئی اس کے پاؤں چاٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ کوئی قدموں میں لوٹنے لگا اور کوئی اس کی ٹانگوں سے جسم رگڑنے لگا۔

میں دل ہی دل میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ آج کل کھانے کمانے والے اور معقول ذریعہ روزگار رکھنے والوں کو اپنے ہی پیٹ پالنے مشکل ہو رہے تھے جب کہ جانوروں والے بابا کا ظاہر ہے اس جنگل بیابان میں کوئی ذریعہ معاش تو نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس نے اتنے بہت سے جانور پال رکھے تھے۔ ضبط کی کوششوں کے باوجود میری حیرانی ایک سوال کی صورت میں میرے ہونٹوں پر آ ہی گئی۔

"بابا جی! آپ نے اتنے جانور کیسے پال رکھے ہیں؟ میرا مطلب ہے اتنے جانوروں کی

خوراک وغیرہ........" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

بابا آسمان کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے خالص صوفیانہ لہجے میں بولا۔ "پالنے والی صرف خدا کی ذات ہے۔ ہماری تمہاری کہاں جرات کہ کسی کو پال سکیں۔ یہ جانور اس جنگل میں اپنی خوراک خود تلاش کر لیتے ہیں۔ میں نے تو انہیں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں دیا۔ میرے ساتھ اس لئے نہیں رہتے کہ میں انہیں کھانے پینے کو کچھ دیتا ہوں"۔

پھر اس نے ایک طویل سانس لی اور میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرا کر بولا "یہ بے زبان جانور ہیں نا......... صرف محبت کے رشتے میں بندھ کر ہم زندگی بھر کے لئے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ انسان کو تم محل نما گھر بنوا دو۔ اس میں قالین ڈلوا دو ائیرکنڈیشنر لگوا دو' دنیا کا بہترین فرنیچر ڈلوا دو۔ اس کے لئے ریشم و کمخواب کے انبار لگا دو کھانے پینے کے لئے دنیا کی بہترین نعمتیں اس کے سامنے ڈھیر کر دو۔ وہ پھر بھی تمہیں دم دے جائے گا۔ جب بھی اسے موقع ملے گا جب بھی اس کے دماغ میں کوئی سنک سما گی......... جب بھی اسے کے ذہن کی کجی اسے تنگ کرے گی وہ رسی تڑا کر بھاگ جا گا۔ تمہیں چھوڑ کر چلا جائے گا۔ وفا سانپ میں ہو سکتی ہے' انسان میں نہیں.........."

ہم چھپر کے نیچے ایک لمحے خاموش کھڑے رہے۔ پھر میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا......... "باباجی! آپ انسانوں کے ڈسے ہوئے لگتے ہیں"۔

وہ عجیب سے انداز میں ہنسا اور منہ پھیرتے ہوئے جلدی سے بولا "نہیں........ نہیں......... میرا انسانوں سے کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا۔ میں انسانوں سے ہمیشہ دور ہوں......... اور اللہ مجھے دور ہی رکھے۔ آؤ اندر آ جاؤ"۔ اس نے جھونپڑی کی طر اشارہ کیا۔

تمام جانور شک زدہ سی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ سب کے سب جھونپڑی سے باہر برآمدے میں ہی رک گئے گویا وہ خوب تربیت یافتہ تھے۔ انہیں اچھی ط معلوم تھا کہ کس وقت کہاں رہنا ہے۔ ہم بابا کے پیچھے پیچھے جھونپڑی میں جا پہنچے۔

وہ ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ چھت دونوں طرف سے ڈھلوان تھی اور اس پر کا لیپ خاصی محنت سے کیا گیا تھا۔ پانی اندر نہیں ٹپک رہا تھا کم از کم فی الحال تو نہیں رہا تھا ایک کونے میں خشک گھاس پھونس سے بنا ہوا اور خاصی میلی کچیلی سی ایک دری ڈھکا ہوا بستر موجود تھا۔

بستر کے پاس ہی لوہے کا ایک پرانا سا ٹرنک' ٹوٹی ہوئی چپلیں' پھٹے پرانے دو چار کپ اور ضرورت کی چند دوسری معمولی سی چیزیں پڑی تھیں۔ ایک کونے میں مٹی کا چولہا م تھا جس کے آس پاس المونیم کے چند پرانے اور سیاہی زدہ برتن بکھرے ہوئے تھے۔

ہم تینوں دوست چند لمحے کے لئے دم بخود سے کھڑے رہ گئے۔ میری طرح

یرے دونوں ساتھی بھی غربت' معیار زندگی اور انسانی رہن سہن کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ غربت تو ہمارے ہاں چاروں طرف ہی بکھری ہوئی ہے۔ ہم قدم قدم پر اس کا نظارہ کر سکتے ہیں' اس کی ستم گری کے نمونے دیکھ سکتے ہیں لیکن سچی بات تھی کہ اتنے زیادہ غریبانہ رہن سہن کا نظارہ اپنی حقیقی زندگی میں اتنے قریب سے ہم نے آج پہلی بار دیکھا تھا۔

جانوروں والے بابا نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا تو ہمیں ساکت کھڑے پایا۔ اس کی بھیگی ہوئی مونچھوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ یقیناً مسکرا رہا تھا۔ اپنے کندھے پر لٹکا ہوا ایک بڑا سا پیوند زدہ تھیلا اتار کر وہ چولہے کے قریب رکھتے ہوئے گویا ہماری حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ "شاید تم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کہاں بیٹھا جائے۔ معافی چاہتا ہوں کہ تمہارے بیٹھنے کے لئے صوفہ' کرسیاں یا تمہارے شایان شان کوئی اور چیز پیش نہیں کر سکتا۔ جوتے اتار کر' دل پر جبر کر کے اس بستر پر بیٹھ جاؤ"۔ اس نے گھاس پھونس اور میلی دری کے بستر کی طرف اشارہ کیا۔

ہم نے ذرا کھسیانے سے انداز میں اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ بندوقیں دیوار کے ساتھ کھڑی کیں اور جوتے اتار کر بستر پر بیٹھ گئے۔ وہ خود چولہے کے قریب جا بیٹھا اور آگ جلانے کی تیاری کرنے لگا۔ جھونپڑی میں آ کر ہم سرد ہوا اور بارش سے بچ گئے تھے لیکن شاید بھیگے ہوئے کپڑوں کی وجہ سے ہم پر ابھی تک خفیف سی کپکپی طاری تھی۔ ایک کونے میں پانی کا بڑا سا گھڑا رکھا تھا۔ معلوم نہیں بابا پانی کہاں سے بھر کر لاتا تھا اور وہ کیسا ہوتا تھا؟

بابا کی حرکات و سکنات میں پھرتی اور مشاقی تھی۔ میں نے دیکھا' آگ جلانے کے بعد وہ تیزی سے آلوؤں والے چاول پکانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کے تھیلے میں اور کچھ ڈبوں وغیرہ میں کھانے پکانے کی اچھی خاصی چیزیں موجود تھیں۔

وہ آلو کاٹ کر ایک گندے سے برتن میں ڈالتے ہوئے بولا۔ "تم لوگوں کو بھوک لگی ہو گی۔ میں جیسا تیسا کھانے کا کچھ بندوبست کرتا ہوں"۔

اس کے خلوص اور جذبہ میزبانی کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا تھا لیکن ان گندے برتنوں میں پکا ہوا کھانا' گندے ہی برتنوں میں کھانے کا تصور بھی ہمارے لئے خاصا صبر آزما تھا۔ ابھی ہم بھوک اور فاقہ کشی کی اس منزل کو نہیں پہنچے تھے جہاں میلی کچیلی اور گندگی ہمارے لئے بے معنی ہو جاتی۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس کھانے پینے کا سامان بھی موجود تھا۔

جمال جلدی سے اپنے بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "ہمارے پاس کھانے پینے کے لئے خاصی چیزیں موجود ہیں......... بلکہ اگر آپ چاہیں تو پکانے کی زحمت نہ کریں آپ بھی ہمارے ساتھ کھا لیں"۔

وہ یہ پیش کش قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا اور ہمیں بھی اپنے آلوؤں والے چاول ہی کھلانے پر تلا ہوا تھا لیکن جمال نے نہایت ملائمت سے اصرار کرتے ہوئے اسے

آمادہ کر ہی لیا۔ وہ ہمارے ساتھ بستر پر آ بیٹھا۔ جمال نے اپنے مختصر سے سفری بیگ سے ہلکا پھلکا ٹفن کیریئر اور تھرموس نکالا۔

سینڈوچ' بھنا ہوا گوشت اور کافی وغیرہ ٹھنڈی ہو چکی تھی لیکن جمال نے انہیں چولہے پر بابا کے برتنوں میں گرم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جو کچھ جس حالت میں تھا' ہم نے اسی طرح اسے کھا لیا اور صبر شکر سے بیٹھ گئے۔

بارش بدستور جاری تھی لیکن آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ پہلے سے بہت ہلکی ہو گئی تھی۔ چولہے میں اب آگ روشن ہو چکی تھی اور ہمارے پیٹ کے دوزخ کو بھی ایندھن مل چکا تھا اس لئے رگوں میں زندگی کی حرارت دوڑنے لگی۔

بابا نے ہمارے بارے میں مزید کچھ نہیں پوچھا تھا' کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی' لگتا تھا کہ اسے کچھ جاننے کا تجسس بھی نہیں تھا۔ وہ دنیا اور دنیا والوں کے بارے میں بہت بے نیاز معلوم ہوتا تھا۔ جب کہ میرے ذہن میں اس کے بارے میں بہت سے سوالات مچل رہے تھے لیکن میری اس سے کچھ بھی پوچھنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اس سے اس کے بارے میں کچھ بھی پوچھا تو وہ برا مان جائے گا' خفا ہو جائے گا۔

وہ بہت ہی کم گو بابا معلوم ہوتا تھا۔ قطعاً" ہمارے کان نہیں کھا رہا تھا۔ ابھی تک اس نے ہمیں کوئی نصیحت نہیں کی تھی' ہمارے فیشن ایبل کپڑوں' حتیٰ کہ احمد اور جمال کے لمبے بالوں تک پر تنقید نہیں کی تھی۔ وہ جیسے اپنی ہی کسی دنیا میں مگن تھا۔ بڑا ہی بے نیاز قسم کا بابا تھا۔

کافی دیر کے سکوت کے بعد وہ بولا "ہو سکے تو تم تینوں اسی بستر پر سکڑ سمٹ کر سونے کی کوشش کرو........ میرے پاس ایک گدڑی اور ہے۔ میں وہ ادھر بچھا لوں گا........" اس نے کچے فرش پر خالی بچی ہوئی جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے از سر نو بستر کا جائزہ لیا۔ ہم اس پر مجبوراً" بیٹھے ضرور تھے لیکن اس پر سونا........ اور وہ بھی تینوں کا اکٹھے سونا خاصا صبر آزما کام تھا۔ اس سے تو نہ سونا ہی بہتر تھا۔ بیٹھ کر یا نیم دراز ہو کر جاگتے جاگتے رات بہتر انداز میں گزاری جا سکتی تھی۔ ویسے بھی ان حالات میں' جنگل میں' اس اجنبی اور غیر آرام دہ ماحول میں نیند کسی کمبخت کو آنی تھی۔ کم از کم آثار تو یہی بتا رہے تھے۔

ہم تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں خیالات کا تبادلہ کیا۔ بابا نے اس دوران چولہے سے ذرا ہٹ کر گدڑی بچھائی تھی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کی بڑی ڈپلومیٹک قسم کی ترجمانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے کہا "بابا! نیند کہاں آئے گی........ جاگ کر ہی رات گزارتے ہیں۔ زیادہ لطف رہے گا۔ اس قسم کے رت جگے

زندگی میں روز روز کہاں آتے ہیں"۔

میں نے اس سے یہ نہیں پوچھا آپ اس بستر پر کس طرح سوتے ہیں؟ اس پر تو شاید آپ کے کتے بلیاں بھی سونا پسند نہیں کرتے ہوں۔

اب ہم اتنے بھی کم ظرف نہیں تھے کہ اپنے میزبان اور محسن کی دل شکنی کرتے۔ ویسے بھی وہ جس حال میں رہتا تھا' ہمیں اس پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے تھا۔ قدرت نے انسان کی فطرت میں بڑی ہی لچک رکھی ہے۔ وہ جیسی بھی زندگی گزارنے کا عادی ہو جائے' اس کا جسم' اس کے حواس اور اس کی طبیعت اسی کے مطابق ڈھل جاتی ہے۔ انسان میں بڑی ہی متضاد خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اس جیسا نازک مزاج بھی کوئی نہیں اور اس جیسی سخت جان مخلوق بھی کوئی نہیں۔

بابا لیٹتے لیٹتے رک گیا اور بغور ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولا........ "ہاں........ تم لوگوں کو نیند یہاں ذرا مشکل سے ہی آئے گی........ لیکن کیا تم لوگوں کے ساتھ مجھے بھی جاگنا پڑے گا؟"

"ضروری تو نہیں ہے"۔ میں نے جلدی سے کہا........ "آپ کو نیند آئے تو آپ سو جائیں۔"

وہ زیر مونچھ ایک بار پھر ذرا سا مسکرایا اور آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے بولا........ "نہیں........ اچھا نہیں معلوم ہوتا........ چلو میں تمہارا ساتھ دیتا ہوں۔ میں بھی جاگنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم نے ٹھیک کہا ہے۔ اس قسم کے رت جگے زندگی میں روز روز نہیں آتے........"

خاصی دیر کے سکوت کے بعد میں نے مسکراتے ہوئے کہا........ "کوئی بات کیجئے بابا جی! رات بہت لمبی ہے۔ یوں خاموش بیٹھ کر ٹکر ٹکر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے تو نہیں کٹے گی........"

"ہاں........" بابا گہری سانس لے کر بولا........ "ایک تو مجھے بہت ہی ضروری بات کرنا تھی تم لوگوں سے........ بشرطیکہ تم برا نہ مانو"۔

"ہم ہرگز برا نہیں مانیں گے........" ہم تینوں نے تقریباً" ہم آواز ہو کر نہایت خلوص سے وعدہ کیا۔

بابا اپنی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔ "شکار مت کھیلا کرو........ شکار کھیلنا کوئی اچھا مشغلہ نہیں ہے۔ کیوں ان بے چارے بے زبان جانوروں کی جان لیتے ہو۔ یہ تو کسی کو کچھ بھی نہیں کہتے........ حتیٰ کہ یہ تو تمہاری بستیوں کا رخ بھی نہیں کرتے۔ تمہاری بستیوں سے دور' الگ تھلگ یہاں جنگل میں رہتے ہیں۔ تم یہاں بھی بندوقیں اٹھا کر انہیں مارنے آ جاتے ہو........"

ہم شرمندہ ہو گئے۔ بابا ہمیں نہ جانے کتنا پرانا اور عادی شکاری سمجھ رہا تھا۔ میں نے اپنی اور اپنے دوستوں کی طرف سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ بابا کو بتایا کہ یہ ہمارا مستقل مشغلہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی ہم صرف ایک آدھ بار ہی شکار پر نکلے تھے اور آج ہماری جو درگت بنی تھی اس کے بعد آئندہ ہمارا شکار پر نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

بابا کچھ مطمئن ہو گیا لیکن اس کے بعد پھر گہرا سکوت چھا گیا۔ میں اب بابا سے بات کرنے کی فرمائش کرتے ہوئے بھی ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ پھر کوئی نصیحت نہ کرنے لگے لیکن آخر کار خاموش بیٹھ کر رات بتانا میرے بس سے باہر ہو گیا۔ بابا کو تو جیسے بات کرنے کی عادت ہی نہیں تھی۔ اس لئے وہ اپنی گدڑی پر میلے کچیلے کمبل اور تکئے کے سہارے نہایت اطمینان سے نیم دراز تھا اور پرسکون نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

بالآخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے ایک بار پھر کہا.......... "بابا جی! کوئی بات کیجئے.......... کوئی قصہ سنایئے.......... کچھ بھی بولئے مگر خدا کے لئے چپ بیٹھ کر ٹکر ٹکر ہماری طرف مت دیکھئے۔ ہمارے اعصاب کمزور ہیں۔ ہمیں اضطراب محسوس ہونے لگتا ہے.........."

بابا عجیب سے انداز میں مسکرایا اور سر ہلاتے ہوئے بولا.......... "ہاں تم شہری لوگوں کے اعصاب شور کا زہر پینے کے عادی ہو گئے ہیں۔ تم وہ لوگ ہو جو شور شرابے کے زہر سے دھیرے دھیرے مر رہے ہو لیکن خاموشی تم لوگوں سے برداشت نہیں ہوتی"۔

پھر وہ گہری سانس لے کر ملائمت سے بولا.......... "تم چاہتے ہو میں تمہیں کوئی کہانی سناؤں؟"

"ہاں بابا جی! کوئی لمبی سی کہانی.......... جسے سنتے سنتے رات کٹ جائے"۔ میں نے فرمائش کی۔

بابا چند لمحے چولہے میں دہکتی آگ کو تکتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آ گئی یا پھر شاید وہ دہکتی آگ کا عکس تھا۔ ایک بار پھر اس نے عجیب سی نظروں سے باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھا اور اس کی مونچھوں کی حرکت سے ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ مسکرایا تھا.......... نہ جانے کیوں!

"تم مجھ سے کس قسم کی کہانی کی توقع رکھتے ہو؟" بابا نے ملائمت سے پوچھا۔

کہانی کی توقع تو بعد کی بات تھی' مجھے اس سے اس سوال کی ہی توقع نہیں تھی۔ میرا خیال تھا جنگل میں رہنے والا وہ آدم بیزار قسم کا بابا میری فرمائش پر کچھ اسی قسم کی کہانی شروع کرے گا.......... "ہمارا تمہارا خدا بادشاہ.......... کسی زمانے میں کسی ملک پر ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا.........."

یہ بھی ممکن تھا کہ جانوروں والے بابا کو بادشاہت' صدارت' جمہوریت کچھ بھی پسند نہ

ہو۔ اس صورت میں وہ کوئی آسیبی قسم کی کہانی بھی شروع کر سکتا تھا.......... "ایک زمانے کا ذکر ہے کسی ملک کو ایک آسیب چمٹ گیا.........."

لیکن بابا نے اس قسم کی کوئی بھی کہانی شروع نہیں کی تھی۔ اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا تھا اور مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ میں نے اٹک اٹک کر کہا۔ "بابا جی..........! آپ جس طرح کی کہانی بھی چاہیں سنا سکتے ہیں۔ بلکہ کہانی بھی کوئی ضروری نہیں.......... کچھ بھی سنا دیجئے.......... کوئی قصہ.......... کوئی واقعہ.......... کوئی گانا.......... کوئی ماہیا.......... ہیر.......... کچھ بھی سنا دیجئے.......... کوئی بات کیجئے.......... مقصد تو وقت گزاری ہے۔ یوں چپ بیٹھ کر ٹکر ٹکر ہماری طرف مت دیکھئے۔ ہمیں گھبراہٹ ہوتی ہے"۔

بابا ایک لمحے کے لئے کھو سا گیا۔ وہ جیسے ہماری طرف دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا اور سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولا.......... "تم نے فرمائش تو کر دی ہے لیکن معلوم نہیں ہیر تمہاری سمجھ میں آئے گی یا نہیں.......... بہرحال اب تم نے بات مجھ پر چھوڑ دی ہے تو میں تمہیں ہیر ہی سناتا ہوں.........."

بابا نے ہمیں ہیر سنانا شروع کی اور جنگل پر گویا گہرا سکوت چھا گیا۔ شاید بارش بھی تھم گئی تھی اور شاید چرند پرند بھی ہمہ تن گوش ہو گئے تھے۔ ہم بھی دم بخود تھے۔ ہمیں قطعاً توقع نہیں تھی کہ بابا ہیر اتنی عمدگی سے گا سکتا ہو گا۔

لیکن ہیر بھی بھلا کب تک ساتھ دیتی؟ جلد ہی کھیڑے اسے ڈولی میں ڈال کر لے گئے۔ ایک بار پھر سکوت چھا گیا تو میں نے گہری سی جھرجھری لے کر کہا.......... "بابا! رات ابھی آدھی سے زیادہ باقی ہے اور نیند آنکھوں سے کوسوں دور ہے.......... آپ ہمیں کوئی کہانی ہی سنایئے.......... کوئی لمبی سی کہانی.......... اگر آپ کو کہانی گھڑنے کا فن آتا ہے تو گھڑ کر ہی کوئی کہانی سنا دیجئے.........."

تب بابا جی نے باری باری ہم تینوں کی طرف غور سے دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے خاموش رہا پھر گہری سانس لے کر بولا.......... "تم آج کے دور کے لوگوں کو پرانے زمانے کے قصے کہانیاں پسند نہیں آئیں گی۔ میں تمہیں نئے زمانے کے قصے کہانیاں سناتا ہوں۔ ایک بدنصیب اور محروم تمنا انسان کی کہانی.......... مجھے نہیں معلوم یہ کہانی تمہیں اچھی بھی لگے گی یا نہیں.......... یہ ایک عجیب کہانی ہے.......... ایک خزاں رسیدہ پتے.......... ایک برگ آوارہ کی کہانی.......... اگر تمہیں اچھی نہ لگے' تم بور ہونے لگو تو مجھے بتا دینا۔ میں اسے ادھوری چھوڑ دوں گا۔ ویسے بھی دنیا میں بہت سی کہانیاں ادھوری ہی رہتی ہیں۔ اپنے انجام کی تلاش میں بھٹکتی رہتی ہیں.......... لیکن دنیا والے سمجھتے ہیں کہ کہانی ختم ہو گئی..........

فائیو اسٹار ہوٹل یا پنج ستار ہوٹل کی اپنی ہی ایک شان ہوتی ہے.......... ستارہ تو ایک بھی بڑا اہم ہوتا ہے۔ وہ آسمان پر جھلملانے والا ستارہ ہو تو زمین پر رہنے والوں کی زندگی میں خوبصورتی بکھیر دیتا ہے۔ ستارۂ امید ہو تو ڈوبتے ہوئے انسانوں کو تیرنا سکھا دیتا ہے۔ فلمی ستارہ ہو تو اپنے دامن میں ان گنت داستانیں لئے ہوتا ہے۔

فائیو اسٹار ہوٹل کے ساتھ تو پانچ ستارے وابستہ ہوتے ہیں۔ وہ ستارے خواہ کسی کو نظر نہ آئیں مگر ہوٹل کی چمک دمک اور اس کا معیار تو نظر آتا ہے۔ ہوٹل ابھی بنتا ہی شروع ہوتا ہے کہ اس کی ماؤتھ پبلسٹی شروع ہو جاتی ہے۔ اخباروں میں یا ٹی وی پر اس کی باقاعدہ تشہیری مہم شروع ہونے سے پہلے ہی محفلوں میں اس کے تذکرے شروع ہو جاتے ہیں۔ پورے شہر میں اس کی شہرت کی خوشبو پھیل جاتی ہے۔

دولت مند ہی نہیں، شہر کے بیشتر کنگلے بھی اتنی توجہ اور انہماک سے اس کا تذکرہ سنتے ہیں گویا اس کی تعمیر مکمل ہوتے ہی بلاناغہ وہاں جانا شروع کر دیں گے بلکہ شاید مستقل طور پر ایک آدھ کمرہ یا کوئی سوئٹ وغیرہ ہی وہاں بک کرا لیں گے، جب بھی گھر سے دل اکتایا کرے گا، وہاں جا کر لیٹ جایا کریں گے۔

حالانکہ ہوتا صرف یہ ہے کہ ہوٹل کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد اس قسم کے کنگال نچلے متوسط یا سفید پوش لوگ بس میں لٹک کر یا کسی اچھلتے کودتے رکشے میں بیٹھ کر ہوٹل کے سامنے سے گزرتے وقت صرف ایک حسرت بھری نظر اس کی بلند و بالا عمارت پر نظر ڈالتے ہیں اور کبھی نہ کبھی وہاں آنے کا عہد کر کے منہ پھیر لیتے ہیں۔ البتہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے بعض دولت مند رشتے دار اگر اپنے کسی بیٹے یا بیٹی کی شادی ایسے کسی ہوٹل میں کرتے ہیں تو مہمانوں کی فہرست میں سے اپنے غریب رشتے داروں کا نام فوراً کاٹ دیتے ہیں۔

گرین لینڈ بھی ایک نو تعمیر شدہ فائیو اسٹار ہوٹل تھا۔ اس نام سے دنیا بھر میں ہوٹلوں کی ایک چین موجود تھی۔ وہ بھی اس مشہور عالم "زنجیر" کی ایک کڑی تھا۔ تعمیر مکمل ہونے سے پہلے ہی شہر میں اس کی شہرت پھیلنے لگی تھی۔ عالم یہ تھا اس کی صرف تین منزلوں تزئین و آرائش مکمل ہوئی تھی۔ باقی سات منزلوں میں کام جاری تھا مگر ہوٹل کو جزوی طور پر کاروبار کے لئے کھول دیا گیا تھا۔

ہوٹل کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کو اندیشہ تھا کہ ہوٹلنگ کا بزنس چونکہ کچھ مندا جا رہا تھا اس لئے ان کا کروڑوں روپیہ بھی کہیں خطرے میں نہ پھنسا رہے لیکن جب کمرے بھرے رہنے لگے، آڈیٹوریم اور مختلف ہال بھی تقریبات منعقد کرنے والوں کے دم قدم سے آباد رہنے لگے تو مالکان نے سکھ کی سانس لی۔ انہیں اطمینان ہو گیا کہ انہیں بینکوں سے ہوئے قرضے ہڑپ کرنے کے لئے خود کو دیوالیہ قرار نہیں دلوانا پڑے گا۔

ایک عام تاثر یہ تھا کہ گرین لینڈ ہوٹل کی کامیابی میں اس کے آرکسٹرا کا بھی بڑا دخل تھا۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں کسی زمانے میں نائٹ کلب والا جو ہلکا سا رنگ جھلکتا تھا وہ عرصہ ہوا ختم ہو چکا تھا۔ ملک میں اس کے لئے حالات سازگار نہیں رہے تھے۔

ایک طویل عرصے تک عالم یہی رہا کہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل کا اپنا آرکسٹرا نہیں رہا تھا۔ ہوٹل میں بار صرف غیر ملکی مہمانوں کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔ وہ بھی کچھ عجیب ڈھکے چھپے سے انداز میں.......... بال روم نہیں رہے تھے جہاں رقص کے خواہش مند جوڑے اپنا رقص کا شوق پورا کیا کرتے۔

حالات ذرا سازگار ہوئے تھے تو گرین لینڈ ہوٹل نے گویا پرانی روایتوں کو زندہ کرنے کا آغاز کیا تھا۔ ڈرتے ڈرتے اس نے ایک پرانا رنگ تو اپنانے کی کوشش کی تھی یعنی ہوٹل کا اپنا آرکسٹرا ترتیب دیا تھا۔ انہوں نے پرانی روایات سے کچھ ہٹ کر آرکسٹرا کا انتخاب کیا تھا۔

انہوں نے آرکسٹرا میں نہ صرف ان اچھے سازندوں کو جمع کیا تھا جو انگریزی دھنیں بجانے میں ماہر تھے بلکہ ان کے ساتھ چند ایسے سازندوں کو بھی شامل کیا تھا جو ملکی ساز استعمال کرنے اور مشرقی یا لوک دھنیں بجانے میں ماہر تھے۔

دراصل مالکان نے محسوس کر لیا تھا کہ ٹی وی کی بدولت یا کچھ اور وجوہات کی بنا پر ولایت پلٹ سرمایہ داروں یا یورپ میں پرورش پانے والے امیر زادوں میں بھی کبھی کبھی قومی ورثے سے لگاؤ کی لہر جاگ اٹھتی ہے۔ مشرقی اور مغربی روایتوں کو گڈمڈ کرنا، مغرب میں مشرق کا تڑکا لگانا، موسیقی کی ولایتی ہنڈیا کو دیسی دھنوں کا بگھار لگانا فیشن بنتا جا رہا تھا۔

اس پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے ہوٹل کی گیسٹ ریلیشنز منیجر.......... یعنی افسر مہمانداری مس نگہت افروز نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اس نے جنرل منیجر کے سامنے تجویز پیش کی کہ آرکسٹرا میں ایک ایسے شخص کو بھی شامل کیا جائے جو نہ صرف چند مشرقی ساز بجانے کا ماہر ہو بلکہ حاضرین کی فرمائش پر لوک نغمے یا کوئی اور گانا وغیرہ بھی سنا سکے۔

جنرل منیجر کے خیال میں یہ چیز فائیو اسٹار ہوٹل کی روایات سے کچھ زیادہ ہی ہٹ کر تھی لیکن نگہت افروز نے یہ تجویز بورڈ آف ڈائریکٹرز کے اجلاس میں پیش کر دی۔ نگہت افروز کے دلائل کی وجہ سے یا کسی اور بناء پر تجویز بہرحال ڈائریکٹرز کو بھا گئی اور انہوں نے اس کی منظوری دے دی۔ وہ چاہتے تھے کہ جب باقی سات منزلیں مکمل ہو جائیں تب بھی ہوٹل اسی طرح بھرا رہے۔ اس کے لئے ہوٹل میں، حالات کے مطابق جو اٹریکشن پیدا کرنا بھی ممکن تھا، وہ اس کے لئے تیار تھے۔

یوں گرین لینڈ ہوٹل کے آرکسٹرا میں باقاعدہ تقرر نامے کے ذریعے اختر حسین کو شامل کیا گیا اور اسے "ہاؤس سنگر" کا نام دیا گیا۔

ہوٹل اس تفریحی اور پارٹ ٹائم کام کے لئے کسی معروف یا جانے پہچانے سنگر کو ملازم نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ اس مقصد کے لئے زیادہ لمبی چوڑی تنخواہ نہیں دی جا سکتی تھی۔ جو سنگر عوام میں ذرا بھی جانے پہچانے تھے' دو چار مرتبہ بھی ٹی وی پر گا چکے تھے وہ نجی محفلوں اور اسٹیج وغیرہ سے اتنا کما رہے تھے کہ وہ محدود سی تنخواہ پر ہوٹل کے ملازم ہو کر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔

اختر حسین تقریباً" ستائیس سال کا' چھریرے بدن کا' گورا چٹا خوش شکل نوجوان تھا۔ چہرے مہرے سے اور بھی کم عمر لگتا تھا۔ اس کا بچپن گاؤں میں لیکن لڑکپن اور جوانی شہر میں گزری تھی.......... بلکہ جوانی ابھی گزر رہی تھی۔ اس کا باپ ایک چھوٹا موٹا زمیندار تھا جس نے بڑی امنگوں اور ارمانوں سے اپنے اکلوتے بیٹے کو کم عمری میں ہی پڑھنے کی غرض سے شہر بھیج دیا تھا۔

باپ کا خواب تھا کہ بیٹا مقابلے کے امتحان میں بیٹھے اور کمشنر یا ڈپٹی کمشنر بن جائے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو سکے تو کم از کم کہیں مختیار کار تو لگ ہی جائے۔ باپ خود کم پڑھا لکھا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ فی زمانہ کمشنر' ڈپٹی کمشنر' مختیار کار' مجسٹریٹ یا تھانیدار وغیرہ ہی' بادشاہ لوگ' ہوتے ہیں.......... اختر حسین کا باپ بھی اپنے بیٹے کو "بادشاہ لوگ" دیکھنا چاہتا تھا۔

پڑھنے لکھنے سے اختر حسین نے کبھی جی نہیں چرایا۔ وہ بہت زیادہ پڑھاکو' یا رٹو طوطا قسم کا طالب علم تو کبھی نہیں رہا تھا تاہم اسے غبی یا بالکل ہی عام سا طالب علم بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ٹیچرز کو اس سے کبھی کوئی شکایت نہیں رہی تھی.......... لیکن جس طرح بدقسمتی سے بعض نوجوانوں کو سگریٹ پان کی' کسی کو چرس کی اور کسی کسی کو تو شراب یا کسی اور مہلک نشے کی لت لگ جاتی ہے' اسی طرح اختر حسین کو لڑکپن سے موسیقی کی لت لگی گئی اور گلوکاری کا شوق پیدا ہو گیا۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی..........

باپ اکثر گاؤں سے اختر حسین کے ہوٹل آتا رہتا تھا۔ اس نے پہلی بار کمرے میں کتابوں کے ساتھ طبلہ' سارنگی' ہارمونیم اور گٹار سجے دیکھے تو اسے بڑا شدید جھٹکا لگا۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنا غصہ ضبط کیا۔ شاید وہ سمجھتا کہ موسیقی کے وہ آلات اختر حسین کے روم میٹ کے تھے لیکن ستم یہ تھا کہ اس وقت اختر حسین بڑے انہماک اور اشتیاق سے خود ہارمونیم سنبھالے بیٹھا ریاض کر رہا تھا۔

باپ کو دیکھ کر اس نے ہارمونیم چھوڑ دیا اور اٹھ کر اس کے سینے سے لگ گیا مگر آج باپ کے سینے میں کچھ زیادہ محبت کی حرارت محسوس نہیں ہوئی۔ باپ نے خلاف معمول ایک سیکنڈ بعد ہی اسے سینے سے الگ کر دیا۔ وہ جب بولا تو اس کے لہجے میں اس کے سینے سے

بھی زیادہ سرد مہری تھی۔

"یہ کیا ہو رہا تھا؟" اس نے پہلے سازوں کو' پھر اختر حسین کو گھورا۔

"کچھ نہیں ابا جی! وہ.......... بس.......... ذرا ریاض کر رہا تھا"۔ اختر حسین نے بالوں کو انگلیاں پھیرتے ہوئے' نظر چراتے ہوئے بتایا۔

"اسی لئے تم پچھلے دو تین مہینے سے پیسے زیادہ منگوا رہے تھے؟ یہ چیزیں خریدنے کے لئے؟" باپ نے سازوں کی طرف اشارہ کیا۔

"جی.......... ابا جی!" اختر حسین نے جھوٹ بولنے کی کوشش نہیں کی۔

"میں سمجھا تھا کتابوں کا.......... یونیورسٹی کا خرچ بڑھ گیا ہے"۔ اختر حسین کے باپ اکبر حسین نے متاسفانہ سے انداز میں سر ہلایا۔

"ابا جی.......... آپ کو تو پتہ ہی ہے مجھے ذرا موسیقی کا گلوکاری کا شوق ہے"۔ اختر حسین باپ کے لئے کرسی کھینچتے ہوئے بولا۔

"نہیں بیٹا! مجھے نہیں پتہ تھا.........." اکبر حسین کرسی پر بیٹھے بغیر بولا..........

"مجھے پتہ ہوتا تو میں شروع میں ہی کچھ کرتا.......... بات یہاں تک بڑھنے نہ دیتا کہ تم یہ چیزیں بھی خرید لاتے.........."

اکبر حسین غصہ ور آدمی تھا لیکن اختر حسین اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی تمام امنگوں اور آرزوؤں کا مرکز.......... وہ اپنے تمام ادھورے خوابوں' اپنی تمام ناآسودہ خواہشوں کی تکمیل اس کے دم سے ہوتے دیکھنا چاہتا تھا۔

وہ ملائمت سے بولا.......... "بیٹا! میں نے تمہیں شہر پڑھنے کے لئے بھیجا تھا۔ میراثی بننے کے لئے نہیں.........."

"میں پڑھ رہا ہوں ابا جی! میری پڑھائی میں کوئی فرق نہیں آیا".......... پھر وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا.......... "میراثی ہونا کوئی عیب نہیں ابا جی! میراثی بھی ہماری طرح انسان ہوتے ہیں.......... میں بھی کسی میراثی گھرانے میں پیدا ہو سکتا تھا"۔

باپ نے ایک طویل' سرد اور بوجھل سانس لی۔ تنگ سے کمرے میں مضطربانہ انداز میں چاروں طرف دیکھا اور تھکے تھکے انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا مگر صاف ظاہر تھا کہ کرسی پر بیٹھ کر بھی اسے آرام نہیں ملا تھا۔

کئی لمحے کے سکوت کے بعد وہ ایک ٹک اختر حسین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا.......... "تو یہ ترقی کی ہے تم نے!.........."

اختر حسین چھوٹے سے قالین پر' سر جھکا کر دو زانو بیٹھ گیا۔ اکبر حسین بات جاری رکھتے ہوئے بولا.......... "تمہیں شاید یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ہم سید ہیں۔ گاؤں میں چوہدریوں سے زیادہ ہماری عزت ہے۔ کوئی میراثی ہماری برابری کرنے کی کوشش کرتا تھا تو

ہم اسے سزا دیا کرتے تھے............ آج تم خود اپنے آپ کو اور ہمیں میراثیوں کے برابر قرار دینے کی کوشش کر رہے ہو"۔

"ایک سید زادہ ہونے کی وجہ سے مجھے اس بات کا زیادہ خیال آتا ہے کہ خدا کی نظر میں سب انسان برابر ہیں..........." اختر حسین دھیمے لہجے میں بولا۔ "اگر کسی کو کسی پر برتری حاصل ہے تو صرف اعمال کی وجہ سے"۔

"یہ تم اپنے اعمال اچھے کر رہے ہو؟" اکبر حسین نے طبلے سارنگی وغیرہ کی طرف اشارہ کیا۔

"مجھے معلوم ہے یہ کوئی اچھا شوق نہیں ہے ابا جی.........!" اختر حسین دھیمے لہجے میں بولا......... "لیکن بس......... لگ گیا ہے......... پھر بھی......... میرا خیال ہے ان لوگوں سے تو بہتر ہوں جو کوئی اچھا کام کئے بغیر ہی خود کو بہت اچھا' بہت برتر انسان سمجھتے رہتے ہیں۔ میں ان لڑکوں سے بھی بہتر ہوں جو گٹار کی بجائے کلاشن کوف ہاتھ میں لئے دوسروں کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں........."

"مجھے ان دلیلوں سے بہلانے کی کوشش نہ کرو' بیٹے! میں تو تمہیں کمشنر' ڈپٹی کمشنر بنتے دیکھنا چاہتا تھا........." اکبر حسین ابھی تک اپنے غصے پر قابو رکھے ہوئے تھا۔

"قسمت میں ہوا تو ضرور کمشنر یا ڈپٹی کمشنر بن جاؤں گا ابا جی! موسیقی تو صرف میرا شوق ہے۔ یہ مجھے کچھ بھی بننے سے نہیں روکے گی......... بلکہ شاید کچھ مدد کرے۔ موسیقی کا شوق رکھنا اب کوئی معیوب بات نہیں رہی ابا جی......... بڑے بڑے لوگ شوقیہ طور پر گاتے بجاتے ہیں۔ جن کے بچے اس میدان میں نام پیدا کر رہے ہیں وہ والدین ان پر فخر کرتے ہیں"۔ اختر حسین نے نہایت رسان سے باپ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں ان والدین میں سے نہیں ہوں بیٹا!" اکبر حسین نے دھیمے لیکن نہایت غیر متزلزل لہجے میں جواب دیا......... "میں شاید تمہیں گاتے بجاتے دیکھنے سے پہلے مر جانا زیادہ پسند کروں........."

اکبر حسین اس قسم کے آدمیوں میں سے تھا جو نماز روزے کے تو پابند نہیں ہوتے لیکن زندگی کے بیشتر معاملات میں انکا رویہ ناقابل ترمیم اور بے لچک ہوتا ہے۔

موسیقی کے معاملے میں تو سوال مذہب ہی کا نہیں' خاندانی عزت کا بھی تھا۔ کوئی تین چار پشتیں پہلے ان کے خاندان میں کسی مزار کی سجادہ نشینی بھی ہوا کرتی تھی جو نہ جانے کس جھگڑے میں ان سے چھن گئی تھی مگر باپ ابھی تک باتوں میں اس کا حوالہ دیا کرتا تھا۔ سجادے کے بغیر بھی وہ خود کو سجادہ نشین ہی شمار کرتا تھا اور زمین گو کہ کل ساٹھ ستر ایکڑ تھی مگر نخرا اور زمیندارانہ شان و شکوہ میں وہ کسی بڑے جاگیردار سے کم نہیں تھا۔

اختر حسین نے ایک لڑکے کو دوڑا کر اس کے لئے چائے منگوائی مگر باپ چائے چھوڑ

کر اٹھ کھڑا ہوا اور کچھ رقم نکال کر اس کی طرف پھینک کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا......... "آئندہ میں آؤں تو مجھے تمہارے کمرے میں طبلہ سارنگی یا اس طرح کی کوئی اور منحوس چیز نظر نہیں آنی چاہئے........."

"ابا جی......... رکئے تو سہی......... میری بات تو سنئے........." اختر حسین اس کے پیچھے لپکا مگر باپ مڑ کے دیکھے بغیر تیزی سے ہاسٹل کی سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔

باپ کے جانے کے بعد اختر حسین دیر تک سر تھامے بیٹھا رہا لیکن دھیرے دھیرے اس کے دل میں جیسے ردعمل کا زہر جمع ہونے لگا۔ قطرہ قطرہ یہ زہر جمع ہوتا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے اس کے رگ و پے میں پھیلنے لگا۔ آخر وہ اکبر حسین ہی کا بیٹا تھا۔ اکبر حسین والی ضد اور انا اس میں بھی موجود تھی۔ یہ چیزیں اسے ورثے میں ملی تھیں۔

بہت سے سلگتے ہوئے سوالوں نے اس کے ذہن میں گھر کر لیا......... یہ والدین اپنی اولاد سے اتنی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ ان کے کسی بے ضرر سے شوق کے معاملے میں اتنے ضدی......... اتنے ہٹ دھرم کیوں ہو جاتے ہیں؟ چھوٹی چھوٹی باتوں کو انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں؟ کبھی کہیں رشتہ طے کرنے کے معاملے میں اڑ جاتے ہیں' کسی معمولی سے نکتے کا سہارا لے کر اعلان کر دیتے ہیں......... نہیں......... تمہاری شادی وہاں نہیں ہو سکتی۔ سو سال پہلے اس لڑکی کے پردادا نے تمہارے پردادا سے یہ کہہ دیا تھا......... یا......... یہ لڑکی فیشن ایبل ہے تمہارے لئے اچھی بیوی ثابت نہیں ہو سکتی' تمہاری زندگی کو جہنم بنا دے گی اور ساس کو زندہ درگور کر دے گی......... کبھی انہیں اعتراض ہو جاتا ہے کہ لڑکی بہت قدامت پسند ہے۔ یہ تو دوسروں کے سامنے آئے گی تو ہمیں شرم آئے گی۔ آخر بعض والدین' والدین ہونے کی اتنی بھاری قیمت کیوں وصول کرتے ہیں؟ کیوں وہ اولاد کی چھوٹی چھوٹی معصوم تمناؤں کے پھول اپنے قدموں تلے کچلتے رہتے ہیں؟

وہ سوچتا اور اس کا ذہن باغی ہوتا رہا۔ اس کے خیال میں باپ کا غصہ بے جا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ گلوکاری ترک نہیں کرے گا۔ دل ہی دل میں اس فیصلے پر پہنچتے ہوئے اس نے ایک بار پھر ہارمونیم اپنے قریب کھسکایا اور نیچی آواز میں فراز کی غزل گانے لگا۔

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں

آج اس کی آواز میں معمول سے زیادہ سوز تھا۔ وہ کسی کی یاد میں یہ غزل نہیں گا رہا تھا لیکن دھیرے دھیرے نہ جانے کیا ہوا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اسے یاد ہی نہ رہا کہ وہ گاتے اور روتے روتے کب قالین پر آڑا ترچھا لیٹا اور کب سو گیا۔ اس کے روم میٹ نے آکر اسے جگایا۔ اس وقت بھی اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

اگلے ماہ اس کا باپ ہاسٹل آیا تو ہارمونیم' طبلہ وغیرہ اسی طرح کمرے میں موجود تھے۔

اکبر حسین کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ شاید اس نے بڑی مشکل سے خود کو وہ آلات موسیقی اٹھا کر کمرے سے باہر پھینکنے سے باز رکھا تھا۔ اختر حسین نے جلدی سے اس کے لئے ایک کرسی خالی کی لیکن اکبر حسین نے بیٹھنے کی زحمت نہیں کی۔

اکبر حسین جب بولا تو اس کا لہجہ بظاہر پرسکون تھا لیکن اس کی تہہ میں طوفان کروٹیں لے رہے تھے۔ "تمہیں ہاسٹل والے بھی یہ چیزیں کمرے میں رکھنے سے منع نہیں کرتے؟؟" اس کے سوال میں حیرت بھی شامل تھی۔

"میں نے اجازت لے رکھی ہے ابا جی!" اختر حسین نے سر جھکا کر جواب دیا۔ "میں ایسے وقت میں اور اس طریقے سے ریاض کرتا ہوں کہ کسی کے آرام یا کسی کی پڑھائی میں خلل نہ پڑے............"

پھر اس کے لہجے میں ہلکا سا خوف جھلک آیا۔ "یونیورسٹی والے میرے ساتھ اس لئے بھی نرمی برتتے ہیں کہ یونیورسٹی کی تقریبات میں بھی تو اسٹیج پر میں ہی گاتا ہوں۔ بات یہ بھی ہے کہ............ یہ تو صرف طبلہ سارنگی وغیرہ ہیں............ لڑکوں نے تو آج کل ہاسٹلوں میں نہ جانے کیا کچھ رکھا ہوا ہے۔ اب وہ پہلے زمانوں والا ڈسپلن اور کنٹرول کہاں رہا لڑکوں پر............"

"ہاں بیٹا! یہی تو خرابی پیدا ہو گئی ہے............" اکبر حسین ٹھنڈی سانس لے کر بولا............ "ڈسپلن اور کنٹرول تو ہمارے ملک میں ہر شعبے میں بالکل ختم ہو گیا ہے............ اور جب ڈسپلن اور کنٹرول ختم ہو جائے تو شہروں اور جنگلوں میں کوئی خاص فرق نہیں رہتا............"

پھر وہ گویا اصل موضوع پر واپس آتے ہوئے بولا............ "تمہارے کمرے میں ان چیزوں کی موجودگی بتا رہی ہے کہ تم نے میری بات نہ ماننے کا فیصلہ کر لیا ہے؟"

"ابا جی! میں آپ کی منت کرتا ہوں............ آپ میرے اس شوق کے پیچھے نہ پڑیں............" اختر حسین کے لہجے میں التجا تھی............ "آپ یقین کریں آج کے زمانے میں یہ کوئی معیوب بات نہیں رہی بڑے بڑے معزز، تعلیم یافتہ اور دولت مند گھرانوں کے لڑکے تو کیا، لڑکیاں تک گانے بجانے کا شوق رکھتی ہیں............"

"مجھے معلوم ہے بیٹا!" اکبر حسین اس کی بات کو کاٹتے ہوئے بولا............ "قیامت کی جو نشانیاں بتائی گئی تھیں، یہ انہی میں سے ایک ہے............"

اختر حسین گویا اس کے الفاظ پر توجہ دیئے بغیر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا............ "اب تو میں بڑی اچھی اچھی محفلوں میں بھی گانے لگا ہوں۔ میری آواز کو پسند کیا جاتا ہے۔ ابھی پرسوں ہی ایک محفل میں ہمارے ملک کے ایک بہت بڑے گلوکار مجھ سے کہہ رہے تھے............"

"وہ جو کچھ کہہ رہے تھے مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں برخوردار!" باپ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا............ "اور جو کچھ میں کہتا ہوں اس سے شاید تمہیں کوئی دلچسپی نہیں............ لیکن میں کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر میں نے تمہیں کسی محفل میں لوگوں کے سامنے ان کی تفریح طبع کے لئے گاتے بجاتے دیکھ لیا تو شاید میرے ہاتھوں تمہارا قتل ہو جائے............"

اختر حسین خاموش رہا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ چہرے پر ہلکی سی سرخی تھی۔ اکبر حسین ایک گہری سانس لے کر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا............ "برخوردار! تم نے زندگی میں بے شمار ایسے کام کئے ہیں جو مجھے پسند نہیں تھے لیکن میں نے تم پر اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی............ تم نے بال بڑھائے، میں خاموش رہا۔ تم نے بڑے بڑے پھولوں والی رنگ برنگی شرٹیں اور جینز پہننا شروع کی، میں کچھ نہ بولا۔ تم نے کبھی مونچھیں منڈوائیں، کبھی بڑھائیں میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہر دور کے مطابق تم نے ہر فیشن کا ساتھ دیا لیکن میں کبھی ناراض نہیں ہوا............ مگر آزادی کی ایک حد ہوتی ہے بیٹا! میرے پاس تمہارے لئے جتنی آزادی تھی وہ میں تمہیں دے چکا ہوں............ اب میرے صبر کو نہ آزماؤ برخوردار! میں جتنا شفیق ہوں، اتنا ہی سخت گیر بھی ہوں............ تم نے ابھی صرف میری شفقت دیکھی ہے، غصہ نہیں دیکھا............"

اختر حسین کا سر جھکا رہا اور زبان بند رہی۔ باپ چند لمحے منتظر سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا لیکن اسے مطلوبہ جواب سننے کو نہ ملا۔ بالآخر اکبر حسین فیصلہ کن لہجے میں بولا............ "آئندہ میں خود یہاں نہیں آؤں گا۔ صرف خط لکھ کر پوچھوں گا کہ تم نے یہ شوق چھوڑ دیا ہے یا نہیں؟ اگر تم نے یہ لعنتی شوق چھوڑ دیا ہو گا تب میں تم سے ملنے آؤں گا اور تب ہی تم گھر آ سکو گے۔ ورنہ ہم سمجھ لیں گے کہ تم ہمارے لئے اور ہم تمہارے لئے............"

اس نے جملہ مکمل نہیں کیا اور رخصت ہو گیا۔

چند دن بعد اختر حسین کو باپ کا خط ملا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے لکھا............ "امید ہے تم نے گانے بجانے کا شوق ترک کر دیا ہو گا۔ تمہیں یقیناً اس مسئلے کی سنگینی کا احساس ہو گیا ہو گا۔ تم ایک خطرناک دوراہے پر کھڑے ہو۔ ایک طرف تمہارا باپ ہے، دوسری طرف تمہارا شوق"۔

اختر حسین نے اس خط کا جواب ہی نہیں دیا۔ درحقیقت اس نے جواب دینے کی کوشش تو کی۔ وہ کئی بار خط لکھنے بیٹھا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس طرح اپنے جذبات کا اظہار کرے۔ کس طرح اپنے موسیقی کے شوق کا دفاع کرے۔ موسیقی ایک مہلک نشے کی طرح اس کی رگ و پے میں [illegible]

چکا تھا۔ اسے معلوم تھا تحریر میں ان سب باتوں کو دہرانا فضول تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اس کے خیال میں کچھ بھی لکھنا فضول تھا۔ اس کے باپ کے ذہن میں جو خیال بیٹھ چکا تھا اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں نکال سکتی تھی۔

لیکن قابل ذکر بات یہ تھی کہ وہ بھی اپنے فیصلے پر یکسو ہو چکا تھا۔ وہ کسی قیمت پر موسیقی کو خیرباد کہنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ اب اس فیلڈ میں بہت محنت کر چکا تھا۔ لوگ تو بے استادے ہوتے ہوئے بھی دھوم مچا رہے تھے' نام کما رہے تھے اور خود کو بڑے گلوکار سمجھ رہے تھے۔ اس نے تو بہت سے اساتذہ کی خدمت میں بڑا وقت صرف کیا تھا۔ جس سے جو حاصل کر سکا تھا' کیا تھا۔

وہ محض تکے سے گلوکار نہیں بن گیا تھا۔ اس نے محنت کی تھی۔ اسے سروں کی سمجھ تھی۔ وہ گا بھی سکتا تھا۔ بہت سے ساز بجا بھی سکتا تھا.......... اور اب اسے موسیقی سے عشق ہو گیا تھا۔ عشق میں لوگ تخت و تاج چھوڑ دیتے ہیں۔

باپ کو اس کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا اس کے لئے اس کا مطلب سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ اختر حسین کو چند دن بعد پھر باپ کی طرف سے دوسرا خط ملا۔ اس میں نہایت رسمی سے الفاظ میں ادھر ادھر کی باتوں کے بعد لکھا تھا.......... "مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم پر میرے سمجھانے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ شاید اس میں تمہارا بھی کوئی قصور نہیں برخوردار! قیامت کو تو آخر آنا ہی ہے اور قرب قیامت کی نشانیوں کو مکمل ہونا ہے.......... یہ قرب قیامت ہی کا اثر ہے کہ اولاد کی نظر میں والدین محترم نہیں رہے' موسیقی محترم اور محبوب ہو گئی ہے۔ تمہیں تمہارا شوق مبارک.......... مجھے معلوم ہے تمہیں مزید مہلت دینے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ آخر تم میرے ہی بیٹے ہو۔ تمہیں میں نہیں سمجھوں گا تو کون سمجھے گا۔ مجھے معلوم ہے تم اپنا ارادہ نہیں بدلو گے لیکن ایک موہوم سی امید کے سہارے میں تمہیں مزید پندرہ دن کی مہلت دے رہا ہوں۔ اگر پندرہ دن تک بھی مجھے تمہاری طرف سے کوئی اطلاع موصول نہ ہوئی کہ تم اس شوق سے تائب ہو گئے ہو تو میں مجبوراً تمہیں عاق کر دوں گا۔ اس کے بعد میرے اور تمہارے درمیان کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ میری جو بھی تھوڑی بہت زمین جائداد ہے یہ میں مرتے وقت کسی خیراتی ادارے کے لئے چھوڑ جاؤں گا.........."

اس خط کو پڑھتے ہوئے اختر حسین ایک بار پھر رو دیا لیکن عجیب بات تھی وہ روتا تھا تو دل میں سوز و گداز بڑھتا تھا۔ سوز و گداز بڑھتا تھا تو دل میں موسیقی کی محبت کچھ اور بڑھ جاتی تھی۔ وہ پرسوز اشعار کے دامن میں پناہ لینا چاہتا تھا۔ اس روز بھی وہ ہارمونیم لے کر بیٹھا اور دیر تک ایک ہی شعر کی گردان کرتا رہا۔ نہ جانے کس کس طرز پر اسے دہراتا رہا اور آنسو اس کے رخساروں پر پھیلتے رہے۔ فیض کا یہ شعر اس نے جتنی بار بھی دہرایا' اس

دل پر اتنی ہی خراشیں پڑیں مگر یہی شعر گویا ان خراشوں کے لئے مرہم بھی تھا۔

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شب ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

بیس پچیس دن بعد اسے ڈاک میں ایک تہہ شدہ اخبار موصول ہوا اس کی اوپر کی تہہ پر ہی چھوٹا سا ایک اشتہار نظر آ رہا تھا جس کے گرد سرخ روشنائی سے موٹی سی لکیر کھینچی ہوئی تھی۔ اس اشتہار کے ذریعے اکبر حسین نے "عوام الناس" کو مطلع کیا تھا کہ اس نے اپنے اکلوتے بیٹے اختر حسین کو اس کی نافرمانی اور ناپسندیدہ افعال کی وجہ سے اپنی منقولہ اور غیر منقولہ جائداد سے عاق کر دیا ہے۔

عوام الناس تو معلوم نہیں مطلع ہوئے تھے یا نہیں لیکن اختر حسین کو ضرور اطلاع ہو گئی۔ دوسرے دن اسے اپنے باپ کے وکیل کی طرف سے تصدیق اور توثیق کا ایک باضابطہ خط بھی موصول ہو گیا تھا جس میں اسے تفصیلی طور پر مطلع کیا گیا تھا کہ اسے عاق کر دیا گیا ہے۔

اختر حسین کا دل ایک بار ڈگمگایا مگر پھر مجروح انا آڑے آئی۔ ضد ایک بار پھر اس کے راستے میں حائل ہو گئی۔ اس نے سر تسلیم خم کرنے کا ارادہ صرف ایک لمحے کے لئے کیا لیکن دوسرے ہی لمحے ترک کر دیا۔ وہ اپنے سابقہ فیصلے پر قائم رہا۔ اسے کچھ کچھ یہ بھی امید تھی باپ کی ناراضگی عارضی ثابت ہو گی۔ ایک نہ ایک دن وہ اسے ضرور معاف کر دے گا۔ چنانچہ اس ساری کارروائی پر بھی اس نے دم سادھے رکھا.......... لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس روز اس نے ہارمونیم پر دھیمی آواز میں خود اپنے لئے منیر نیازی کی یہ غزل گانا شروع کی

زندہ رہیں تو کیا ہے جو مر جائیں ہم تو کیا
دنیا سے خامشی سے گزر جائیں ہم تو کیا

جب وہ اس شعر پر پہنچا۔

اب کون منتظر ہے ہمارے لئے وہاں
شام آ گئی ہے لوٹ کے گھر جائیں ہم تو کیا

تو روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ اس کا روم میٹ کمرے میں نہیں تھا۔ ورنہ شاید وہ بھی پریشان ہو جاتا۔

شب و روز گزرتے گئے۔ اختر حسین اپنے گاؤں پہلے بھی شاذ و نادر ہی جاتا تھا۔ اب تو گویا گاؤں سے ناتا ہی ٹوٹ کر رہ گیا۔ اس نے بھی کوئی خط نہ لکھا اور باپ کی طرف سے بھی کوئی خط نہ آیا۔ باپ سے تجدید تعلق کی جو امید اس کے دل میں جاگزیں تھی وہ بھی دھیرے دھیرے دم توڑ گئی۔

دونوں طرف ہی انا کی دیواریں بلند تھیں اور کوئی بھی انہیں گرانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ جھکنا دونوں میں سے کسی کی سرشت میں نہیں تھا۔ ایسی صورت حال میں عموماً مائیں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں لیکن اختر حسین کی ماں اس دنیا میں نہیں تھی۔ ماں زندہ ہوتی تو شاید اپنی مامتا سے مجبور ہو کر باپ بیٹے کے درمیان خلیج کو پاٹنے کے لئے اپنے سے جتن کرتی۔

گھر سے منی آرڈر اور ڈرافٹ آنا بند ہوئے تو گویا اختر حسین کی معاشی شہ رگ کٹ گئی۔ شروع شروع میں زندگی کی گاڑی دھکیلنے میں اختر کو کافی دشواریاں پیش آئیں۔ اس کا باپ گو کہ بڑا زمیندار نہیں تھا لیکن اس نے کبھی اختر حسین کے لئے اخراجات کی کوئی حد مقرر نہیں کی تھی۔

اختر کا رہن سہن ہمیشہ کافی حد تک شاہانہ ہی رہا تھا لیکن جب روپے پیسے کی آمد بند ہوئی تو وہ گویا کسی خوشگوار خواب سے چونکا۔ اس نے کفایت شعاری اور پھر کنجوسی کی سطح پر آنے کی کوشش کی۔ ہاسٹل کے اخراجات کچھ زیادہ نہیں تھے لیکن جب آمدن کا کوئی ذریعہ نہ ہو تو چھوٹے چھوٹے خرچ بھی پہاڑ لگتے ہیں۔ ہاسٹل میں رہنے کے باوجود کراچی جیسے شہر میں زندگی گزارنا کچھ آسان نہ تھا۔

پہلے اس کی اسپورٹس موٹر سائیکل بکی۔ پھر بیش قیمت گھڑی.......... اس کے بعد سونے کے لاکٹ اور انگوٹھی کی باری آئی۔ اس کے بعد بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزیں فروخت ہوئیں۔ ہر چیز کو فروخت کرنا اختر کے لئے بجائے خود ایک مشکل مرحلہ ہوتا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے زندگی میں اس قسم کے ذلت آمیز مرحلوں سے بھی گزرنا پڑے گا۔ جب بیچنے کے لئے کچھ نہ رہا تب اختر حسین کی سمجھ میں آیا کہ چیزیں بیچ بیچ کر ہمیشہ گزارہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کوئی نہ کوئی مستقل ذریعہ آمدنی ہونا ضروری تھا.......... چنانچہ اس نے اپنے شاہانہ مزاج پر جبر کرتے ہوئے نوکری کی تلاش شروع کی۔

دو برسوں میں اس نے کئی چھوٹی موٹی پرائیویٹ نوکریاں کیں۔ رسی جل گئی تھی مگر ابھی بل نہیں گیا تھا۔ مزاج میں ہلکی سی نخوت اب بھی باقی تھی۔ کسی جگہ مالک کو اس کا رویہ پسند نہیں آتا تھا اور کہیں اسے مالک کا طرز عمل نہیں بھاتا تھا۔ یوں کہیں بھی اس کی زیادہ عرصے نبھتی نہیں تھی۔

بہرحال اب زندگی اس کے لئے زیادہ خوفناک نہیں رہی تھی۔ قدرے تنگدستی سے سہی، لیکن گزر بسر بہرحال ہو رہی تھی۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھتا جا رہا تھا۔ اس میں کچھ خود اعتمادی آ رہی تھی۔ اسے یقین آنے لگا تھا کہ اگر گھر سے منی آرڈر یا ڈرافٹ نہ آئیں تب بھی زندہ رہا جا سکتا ہے۔

تعلیم ادھوری رہ گئی تھی لیکن اس دوران شوق کی آبیاری جاری تھی۔ چھوٹی موٹی

نجی محفلوں میں لوگ اسے بصد شوق گانے بجانے کے لئے بلاتے رہتے تھے لیکن ان محفلوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اختر حسین ان محفلوں میں معاوضہ طے کر کے نہیں جاتا تھا۔ بھاؤ تاؤ کرنا اس کی عادت نہیں تھی اور ابھی اس کا ایسا کوئی نام اور مقام بھی نہیں تھا کہ لوگ اس سے بات کرتے وقت پہلے معاوضے والی بات کو ضروری سمجھتے۔ کچھ اس کی گمنامی کی وجہ سے اور کچھ اس کے شرمیلے سے انداز و اطوار کی وجہ سے لوگ اسے شوقیہ فنکار ہی سمجھتے تھے۔

بعض بڑے سیٹھ یا سرکاری دربار میں رسائی رکھنے والے غیر سرکاری لوگ اور کھاتے پیتے طبقوں کے بعض دوسرے لوگ تو گویا اختر حسین کو اپنی نجی محفلوں میں مدعو کر کے ہی بڑا احسان کرتے تھے۔ ان کی نجی محفلیں بعض اوقات کچھ زیادہ ہی نجی ہو جاتی تھیں۔ جنہیں مدعو کیا جاتا تھا انہیں "اپنا" سمجھ کر مدعو کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے "اپنوں> سے روپے پیسے کی بات تو نہیں ہوتی۔ بجٹ کی ساری تان "اپنوں" ہی پر آ کر ٹوٹتی تھی۔

کھانا، مشروبات کیٹرنگ سروس کے دوسرے اخراجات.......... اور دوسری نہ جانے کس کس مد میں کتنا خرچ ہو جاتا تھا لیکن کھانے کے بعد ترنگ میں آ کر گاؤ تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھنے والوں کا دل بہلانے والے اور سوز دل سے سروں کا چراغ جلانے والے گلوکار کے معاوضے کا کسی کو خیال ہی نہیں آتا تھا.......... کیونکہ وہ مشہور نہیں تھا.......... ٹی وی اور کیسٹوں وغیرہ کے ذریعے اپنا نام اسٹیبلش کر کے نہیں آیا تھا۔ بڑے لوگ یہی سوچتے تھے کہ انہوں نے اسے اپنے دوستوں اور اپنی عورتوں کے درمیان بٹھایا تھا.......... اس لئے یہی اعزاز کیا کم تھا؟

یہ محفلیں خواہ کتنی بھی خوبصورت اور کتنی بھی سرور بخش ہوتیں لیکن ان کا معاملہ "رات گئی بات گئی" والا تھا۔ دوسرے دن کسی کو یاد نہیں رہتا تھا کہ کل انہوں نے کس گانے والے سے کیا سنا تھا۔

اختر حسین کے دل میں آگے بڑھنے اور اوپر آنے کی جو لگن جو تپش موجود تھی، اسے قرار نہیں آ سکتا تھا۔ ایک چھوٹی سی تبدیلی البتہ یہ آئی تھی کہ پہلے اگر کبھی کوئی اس قسم کی محفلوں میں گانے کے معاوضے کی بات کرتا بھی تھا تو اختر کو اچھا نہیں لگتا تھا لیکن اب اگر کوئی دو چار سو روپے بھی اس کی جیب میں ڈال دیتا تھا تو وہ واپس کرنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔

ایسی راتوں کا اسے انتظار بھی رہتا تھا۔ خوشبوؤں سے مہکتے ماحول میں، رنگا رنگ ملبوسات، چمکتے دمکتے چہروں، خوبصورت مسکراہٹوں اور مترنم قہقہوں کے درمیان وقت اچھا گزر جاتا۔ اچھا کھانے کو ملتا۔ میزبان کی گاڑی لینے آ جاتی اور واپس بھی چھوڑ جاتی۔

ایک رات ایسی ہی ایک محفل میں آخری آئیٹم یعنی گانے سے فارغ ہو کر وہ عالیشان

اور طویل و عریض بنگلے کے ڈرائیو وے میں پام کے درخت تلے کھڑا تھا۔ میزبان میاں بیوی برآمدے میں رنگا رنگ لائٹوں میں کھڑے، مہمانوں کو رخصت کر رہے تھے۔ اختر حسین منتظر تھا کہ وہ مہمانوں سے فارغ ہوں تو اسے گھر بھجوانے کا انتظام کریں۔ میزبان کا ڈرائیور حالانکہ گاڑی لئے سامنے کھڑا تھا لیکن اختر کو معلوم تھا کہ مالک کے حکم کے بغیر وہ اپنی جگہ سے ہلے گا بھی نہیں۔

دفعتہ" ساڑھی میں ایک سرو قد عورت جس کے سراپا میں شاخ گل کی سی لچک تھی، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اختر حسین کے قریب آ رکی۔ اس کے چمکیلے سیاہ ریشمی بال کھلے تھے اور اس کی کمر پر لہرا رہے تھے۔ اس کے وجود سے کسی بیش قیمت کلون کی مہک اٹھ رہی تھی۔

اختر حسین کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اس نے پارٹی کے دوران کئی بار اس عورت کو دیکھا تھا۔ وہ گوری چٹی اور خوبصورت تھی لیکن اختر حسین کو اس میں سب سے بڑی دلکشی یہ نظر آئی تھی کہ اس کے ہونٹوں پر مستقلاً" ایک من موہنی سی مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ وہ کسی کی طرف متوجہ نہ ہوتی اور کسی سے بات نہ کر رہی ہوتی تب بھی مسکراہٹ اس کے لبوں پر منجمد سی رہتی۔ دلکش مسکراہٹ گویا اس کی شخصیت کا ایک خوبصورت حصہ تھی۔

"ہائے مسٹر اختر! آپ بہت اچھا گاتے ہیں.........." وہ انگریزی میں بولی.......... "خصوصاً" فوک گانے میں آپ کا جواب نہیں.........." اس کی آواز بھی بے حد مترنم تھی۔ اس کے انداز گفتگو، اس کی حرکات و سکنات میں بے پناہ خود اعتمادی تھی۔

"بہت شکریہ.......... آپ کو میرا گانا اچھا لگا.......... یہ میری عزت افزائی ہے.........." اختر حسین نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

جس طبقے کی وہ عورت نظر آ رہی تھی، اس طبقے کی عورتوں کے منہ سے اختر حسین نے بارہا اپنی گائیکی کی تعریف سنی تھی۔ کئی لڑکیوں نے تو اسے نہ جانے کس کس گلوکار سے بڑا گلوکار قرار دے دیا تھا۔ انہوں نے اس کا ایڈریس اور فون نمبر بھی مانگا تھا لیکن جب انہیں معلوم ہوا تھا کہ اختر شہر کے ایک دور دراز اور قدرے غریبانہ سے علاقے کی ایک بلڈنگ میں، ایک کمرے میں رہتا تھا جس میں فون بھی نہیں تھا، تو ان کا جوش و خروش کچھ ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔

اختر کو ابھی شوبزنس کی ہوا نہیں لگی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ابھی صحیح معنوں میں شوبزنس کی دنیا میں داخل بھی نہیں ہوا تھا۔ کچھ اس کی فطرت بھی نہیں تھی کہ جھوٹ بولتا، گپیں ہانکتا اور جھوٹی شان بنانے کی کوشش کرتا۔ وہ کلفٹن یا ڈیفنس میں رہنے والے کسی دوست کا ایڈریس دے کر کام چلانے کی کوشش کر سکتا تھا لیکن اس کا فلسفہ یا

نظریہ یہی تھا کہ وہ جو کچھ تھا، سوفیصد اسی حالت میں اگر کسی کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا تو پھر مصنوعی سہاروں اور جھوٹی باتوں سے کسی کی نظر میں اونچا ہونا بعد میں زیادہ تکلیف دہ ہو سکتا تھا۔

اونچے طبقے کی لڑکیوں اور عورتوں کے منہ سے اپنے گانے کی تعریف سن کر اب اختر حسین کو ہمت افزائی کا احساس ضرور ہوتا تھا، یہ ایک فطری سی بات تھی لیکن اب اس کی آنکھوں میں دھندلے اور بے عنوان خواب نہیں لہراتے تھے۔

عورت بلاجھجک مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے روانی سے انگریزی میں اپنا تعارف کراتے ہوئے بولی.......... "میرا نام نگہت افروز ہے.......... میں گرین لینڈ ہوٹل میں گیسٹ ریلیشنز منیجر ہوں.........."

اختر حسین نے ہچکچاہٹ آمیز سے انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ ایک نپا تلا کاروباری سا مصافحہ تھا اور دوسرے ہی لمحے اختر کو احساس ہوا کہ خاتون کا لہجہ بھی نہایت نپا تلا اور کاروباری سا تھا لیکن اس کی خوبصورت مسکراہٹ اور مترنم آواز نے اس میں کاروباری کھردرا پن نہیں رہنے دیا تھا۔ اس میں ایک ملائمت ایک شیرینی سی پیدا کر دی تھی۔ اس دلکش مسکراہٹ اور شیریں لہجے کی وجہ بھی اختر کی سمجھ میں آ گئی۔ آخر وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی گیسٹ ریلیشنز منیجر تھی۔ اس کے انداز گفتگو میں یہ خوبیاں تو ضروری تھیں۔ یہ اس عہدے کے لئے اس کی کوالیفکیشن کا ایک حصہ تھا۔

نگہت افروز اسی روانی سے بات جاری رکھتے ہوئے بولی.......... "مسٹر اختر حسین! یہ بتائیے کیا آپ کسی ایسی ملازمت میں دلچسپی رکھتے ہیں جس میں آپ کو صرف گانا ہی پڑے.......... وہ بھی کبھی کبھار؟ ماحول نہایت عمدہ ہو۔ شرائط معقول ہوں۔ تنخواہ اچھی خاصی ہو؟"

ایک لمحے کے لئے اختر کو شبہ ہوا کہ شاید نگہت افروز اس سے مذاق کر رہی ہے لیکن پھر اسے خود ہی اپنا یہ خیال غلط محسوس ہوا۔ نگہت افروز ایک سنجیدہ اور اپنے کام سے کام رکھنے والی عورت معلوم ہوتی تھی۔

اچھی ملازمت اب اختر کو خواب و خیال کی بات محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ یہ بھی سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر ایسی کون سی ملازمت ہو سکتی تھی جس میں صرف گانا ہی پڑے.......... اور وہ بھی کبھی کبھار؟ اس قسم کے کام ملازمت کے تحت تو نہیں ہوتے تھے.......... اسے نہیں معلوم تھا کہ نگہت افروز ہوٹل کے مالکان کے سامنے ایک عدد "ہاؤس سنگر" کی اسامی پیدا کرنے کی بات کر چکی تھی۔ انہوں نے منظوری بھی دے دی تھی لیکن اب جلدی میں کوئی معقول آدمی نہیں مل رہا تھا۔

جن کا ذرا بھی نام تھا، ان کے نخرے زیادہ تھے۔ وہ ملازمت کر کے، بندھ کے بیٹھنے

کے لئے تیار نہیں تھے۔ گمنام قسم کے اور ادھر ادھر شوقیہ یا نیم شوقیہ انداز میں گانے والوں میں کوئی بے سرا اوز بے استاد تھا' محض ٹی وی دیکھ دیکھ کر سنگر بن گیا تھا اور کسی کی شخصیت اس قابل نہیں تھی کہ اسے فائیو اسٹار ہوٹل میں آرکسٹرا کے ساتھ اسٹیج پر کھڑا کیا جا سکتا۔

اختر حسین میں یہ دونوں خوبیاں نظر آتی تھیں۔ اس نے غزلیں بھی سنائی تھیں' ٹی وی اور فلموں کے نغمے بھی اور لوک نغمے بھی.......... سب کچھ اس نے اعتماد سے گایا تھا' سر میں گایا تھا اور وہ ہینڈسم نوجوان تھا.......... لیکن آسودہ حال یقیناً نہیں تھا۔ غربت نے اس کی شخصیت کو ذرا دھندلایا ہوا تھا لیکن نگہت افروز کی تجربہ کار نگاہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ذرا سے اچھے حالات میسر آتے ہی اس کی شخصیت' اس کا فن نکھر آئے گا' پالش ہو جائے گا۔ وہ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں آنے والے طبقوں کی نظر میں جلد ہی جچ جائے گا.......... اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ ضرورت مند بھی معلوم ہوتا تھا۔

اختر حسین نے سوچ بچار میں زیادہ وقت ضائع نہیں کیا اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے انگریزی میں ہی بولا.......... "اگر واقعی سب کچھ ایسا ہی ہو جیسا آپ بتا رہی ہیں تو میرا خیال ہے مجھے انکار نہیں کرنا چاہئے"۔

"بالکل ٹھیک.........." نگہت افروز چٹکی بجاتے ہوئے بولی پھر اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر اختر کی طرف بڑھایا.......... "آپ کل شام چار بجے ہوٹل میں آ کر مجھ سے ملئے.......... اتفاق سے کل ہمارے ہاں ایک میٹنگ ہے۔ ہوٹل کے تینوں پارٹنر یعنی تینوں ڈائریکٹر صاحبان موجود ہوں گے۔ اسی وقت بات فائنل ہو جائے گی.........."

اس نے ایک ادائے خاص سے ہاتھ کی تین انگلیاں ہلائیں' اپنے یاقوتی ہونٹوں کو پھیلاتے ہوئے مسکراہٹ کو ذرا اور واضح کیا پھر خدا حافظ کہہ کر نپے تلے انداز میں قدم اٹھاتی' کھٹ کھٹ کرتی اپنی چھوٹی سی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ اختر حسین کارڈ انگلیوں میں دبائے' اس کے جانے کے بعد بھی دیر تک گم صم سا کھڑا رہا۔

دوسرے روز اختر نے دوپہر کے کھانے کے بعد سے ہی انٹرویو کی تیاری شروع کر دی۔ اس کے کوٹ پرانے ہو چکے تھے۔ اس نے شلوار قمیض پہن کر جانے کا فیصلہ کیا۔ اس کی نظر میں جو شلوار قمیض بہترین تھیں وہ نکال کر اس نے پورے ایک گھنٹے میں' خوب جان مار کر استری کی۔ جوتے پالش کر کے چمکائے' شیشی کی تہہ میں بچا کھچا کلون اپنے اوپر چھڑکا اور تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ گرین لینڈ جا پہنچا۔

وہ بالکل ٹھیک وقت پر پہنچا تھا۔ نگہت افروز نے پہلے اسے دیکھا پھر اپنی سڈول کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھا۔ نپی تلی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر موجود تھی لیکن یہ دیکھ کر اس میں ہلکی سی گرم جوشی آ گئی کہ اختر بالکل صحیح وقت آیا تھا۔

نگہت کے آراستہ و پیراستہ آفس میں دو افراد پہلے سے موجود تھے اور اختر نے اندازہ یا کہ اس کی آمد سے پہلے زور و شور سے کسی مسئلے پر گفتگو جاری تھی۔ نگہت نے اختر کو ب طرف صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ انٹرکام پر کسی سے بات کی پھر اپنی مخصوص مسکراہٹ ے ساتھ بولی.......... "مسٹر اختر حسین! آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ ڈائریکٹر احبان ابھی میٹنگ سے فارغ نہیں ہوئے"۔

"کوئی بات نہیں.........." اختر نے دھیمے لہجے میں کہا۔ اس کے خیال میں سیٹھ احبان کے سامنے جانے سے پہلے اس کا کچھ دیر انتظار کر لینا ہی اس کے حق میں بہتر تھا۔ ں کے اعصاب میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ خفیف سی گھبراہٹ اس پر طاری تھی۔ اسے امید ی کہ انتظار کے بہانے وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پا لے گا۔

نگہت افروز دوبارہ زور و شور سے' اپنے سامنے بیٹھے دو نوجوانوں سے بحث و تمحیص ں مصروف ہو گئی۔ تب اختر کو اندازہ ہوا کہ وہ کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی سے آئے ہوئے ے۔ چند منٹ بعد اختر کے لئے چائے آ گئی۔

چائے ختم کرنے تک اس کے اعصاب کافی حد تک پرسکون ہو چکے تھے۔ نگہت نے یک بار پھر انٹرکام پر بات کی اور ریسیور رکھ کر جلدی سے اٹھتے ہوئے بولی "میرے ساتھ یئے.......... سیٹھ صاحب کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں کم از کم مینجنگ ائریکٹر ایک بار ضرور آپ کا گانا سن لیں۔ دراصل یہ اسامی ایک طرح سے زبردستی پیدا کی جا رہی ہے۔ اس لئے میں چاہتی ہوں آپ کو براہ راست انہی کی مرضی سے رکھا جائے تو بہتر ہے گا.........."

تینوں ڈائریکٹر صاحبان جنرل مینجر کے کمرے میں موجود تھے۔ مینجنگ ڈائریکٹر' جن کے ٹل میں سب سے زیادہ شیئرز تھے' تھری پیس سوٹ میں تھے اور بڑی بارعب شخصیت کے لک نظر آ رہے تھے۔

اختر کا خیال تھا کہ تعارف کے بعد باضابطہ انٹرویو شروع ہو گا لیکن اس کے بجائے فروز نے ہوٹل کے بال روم سے طبلہ اور ہارمونیم منگوا لیا۔ اس کی کوشش تھی کہ ایم ڈی احب جلدی سے گانا سن لیں کیونکہ وہ بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے۔ ساؤنڈ پروف کمرے کا روازہ بند کر دیا گیا۔ ہارمونیم اختر نے سنبھالا۔ طبلے پر سنگت دینے کے لئے ایک سازندہ آ چکا ا۔ ایک عجیب عجلت کے سے عالم میں گانے کا انتظام ہو رہا تھا۔ اختر نے اکھڑے اکھڑے ے انداز میں گانا شروع کیا۔

رہا گردشوں میں ہر دم مرے عشق کا ستارہ
کبھی ڈگمگائی کشتی کبھی کھو گیا کنارہ

اس کی آواز صحیح طور پر اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی کیونکہ گانا ایک افتاد کی طرح

اس پر لاد دیا گیا تھا۔ اسے موڈ بنانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ویسے بھی ایک دفتر میں بند ہو
گانے کا یہ اس کا پہلا اتفاق تھا۔ وہ بھی شہر کے تین بڑے سیٹھوں کے سامنے........... اس
نے ان کے نام سن رکھے تھے ان میں سے ہر ایک شہر کا بزنس مینگینٹ تھا۔

اختر پریشان تھا کہ ان کا ذوق نہ جانے کتنا بلند ہو اور کہیں سر کے اوپر نیچے ہو جا
سے ان میں سے کوئی سیٹھ برا ہی نہ منا جائے۔ بہرحال اس نے جلد ہی اپنی آواز کو سنبھا
لیا اور اعتماد سے گانے لگا۔ تینوں سیٹھ پتھرائے ہوئے چہرے لئے اس کی طرف دیکھ رہ
تھے۔

یہ دیکھ کر اختر حسین کا دل مایوسی سے ڈوبا جا رہا تھا کہ سیٹھوں کی آنکھوں میں
پسندیدگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ اس کے دل کو تھوڑا بہت سہارا صرف اس احساس سے
رہا تھا کہ نگہت افروز کی آنکھوں میں اس کی آواز کے لئے خاصی پسندیدگی تھی........... با
وہ گانا سنتے ہوئے کچھ کھو سی گئی تھی کہ اس کی مخصوص کاروباری سی مسکراہٹ بھی اس
ہونٹوں سے غائب ہو گئی تھی۔

غزل ختم ہونے پر ایم ڈی صاحب بولے........... "اے........... اپنا اکھتر صاحب
یہ گانا مانا تو بالکل ٹھیک اے........... اور یہ کستی کا ڈگمگانا بھی ٹھیک اے........... مگر ا
سمجھ میں یہ نئیں آیا کہ کنارا کیسے کھو گیا نیں........... کدھر کھو گیا نیں؟ کنار تو پہاڑ
مافک اپنی جگہ پر موجود رہتا اے نیں...........؟"

اختر نے قدرے بوکھلا کر نگہت افروز کی طرف دیکھا۔ اسے باقی ہر قسم کے سوال
توقع ہو سکتی تھی۔ وہ اپنی ذات کے بارے میں، سر اور راگ کے بارے میں ہر سوال
جواب دینے کے لئے تیار تھا مگر یہ بتانا اس کے بس سے باہر تھا کہ کنارہ کیسے کھو
تھا...........

لیکن نگہت افروز بالکل پرسکون تھی۔ اس کے لئے گویا اس قسم کے سوالات معمو
کی بات تھے۔ اس نے گہری سانس لے کر کندھے اچکائے اور بلنت کو سنبھالتے ہو
بولی........... "یہ شاعری واعری تو ایسے ہی ہوتی ہے سر! آپ یہ بتائیں کہ آواز تو ٹھیک
نا؟ مہمانوں کو پھڑکا دے گی........... مرغی کی مافک..........."

اختر حسین کو نہیں معلوم تھا کہ خالص امریکی لہجے میں انگریزی بولنے والی نگہت اف
اس لہجے میں بھی بات کرنا جانتی ہو گی۔

ایم ڈی صاحب نرم پڑتے ہوئے بولے........... "تم بولتی ہو تو پھر ٹھیک ای ہو
نیں........... اب تم اس چھوکرے کو ادھر بینڈ ماسٹر کے پاس بھیج دو........... وہ دیکھ لیو
کہ اس کو کیا کچھ بجانا آتا اے........... وہ اس کو پاس کر دیوے تو اس کو ایڈمن صاب
نوکری کی چٹھی دلا دو........... ٹھیک اے؟"

"بالکل ٹھیک اے سر! آپ نے پاس کر دیا تو سمجھیں سب نے پاس کر دیا..........."
نگہت افروز گہری سنجیدگی سے بولی........... "آپ کو تو آواز کی اتنی پہچان ہے۔ آپ نے تو
حامد رشیدی کو اس کی زندگی کا پہلا گانا سن کر ہی بتا دیا تھا کہ ایک روز وہ بہت بڑا گلوکار بنے
گا اور بہت نام پیدا کرے گا..........."

"ہاں........... تم نے کھوب یاد دلایا نگہت افروز...........!" سیٹھ صاحب کے
ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ کچھ کھو سے گئے........... "اس وقت امارا کستوں پر
سلائی مسینیں بیچنے کا کاروبار تھا۔ ام نے حامد رسیدی کا گانا سن کر اس کو سلائی مسین انعام
میں دیا تھا۔ اس ٹیم کوئی اس کو جانتا نئیں تھا..........."

پھر جیسے سیٹھ صاحب کو کچھ یاد آیا۔ وہ چونکتے ہوئے بولے........... "آج کل کدھر
اے حامد رسیدی؟"

"ان کا تو عرصہ ہوا انتقال ہو گیا ہے سر!" نگہت افروز نے بتایا۔

"اوہ........... اناللہ........... بڑا اپھسوس ہوا سن کر..........." انہوں نے ٹھنڈی
سانس لی اور گھڑی دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

اچانک ان کی نظر ایک بار پھر اختر پر پڑ گئی اور انہیں گویا یاد آ گیا کہ انہوں نے اختر
سے اس کی ذات کے بارے میں کوئی سوال ہی نہیں کیا تھا۔ وہ سر کھجاتے ہوئے
بولے........... "اے........... اپنا اکھتر حسین صاب! آپ کیا کھاندانی گانے والے ہیں؟"

نگہت افروز مختصر سی ملاقات میں اس کے بارے میں مختصراً ہی کچھ تو ضروری باتیں
پوچھ چکی تھی۔ اس موقع پر بھی جواب اختر کے بجائے اسی نے دیا........... "سر! خاندانی
گانے بجانے والے تو اب اس کام کو چھوڑتے جا رہے ہیں۔ ان کی اولادیں تو فن کو خیرباد کہہ
کر مڈل ایسٹ وغیرہ میں نوکری ڈھونڈتی پھر رہی ہیں........... اس فیلڈ میں تو اب دوسرے
لوگ آ کر چھا گئے ہیں........... اب یہ اختر صاحب کو ہی لیجئے........... اچھے خاصے زمیندار
کے بیٹے ہیں..........."

"جمیندار کے بیٹے...........؟" سیٹھ صاحب چونکے........... "تو پھر یہ جیادہ
ار........... میرا مطلب ہے تنکھا جیادہ تو نئیں مانگیں گے...........؟ اپن نے تم کو بتا دیا
ا کہ اس اسامی کے لئے کتنی گنجائش ہے..........."

"ان سب مسئلوں کو آپ چھوڑ دیں سر! یہ سب باتیں طے کرنا آپ کے اسٹاف کا
ام ہے..........." نگہت بولی۔

"ٹھیک اے........... ٹھیک اے..........." ایم ڈی صاحب نے اطمینان سے سر ہلایا
ر رخصت ہو گئے۔

اختر حسین جب نگہت افروز کے ساتھ اس کمرے سے نکلا تو ایئرکنڈیشننگ کی ٹھنڈک

کے باوجود اس کے جسم سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ راہداری میں آکر اس نے تشکر بھ
نظروں سے نگہت کی طرف دیکھا اور دھیمی آواز میں بولا.......... "سارا انٹرویو تو دراص
آپ نے دیا ہے۔ میں تو بس ایک ڈمی تھا.........."

"ڈمی تو خیر تم نہیں تھے.......... گانا تو تمہی نے سنایا.......... میں گانا نہیں گا
تھی.........." نگہت مسکراتے ہوئے بولی۔

اختر ہچکچاتے ہوئے بولا.......... "جب آپ کو معلوم تھا کہ سیٹھ صاحب سر سنگ
کے بارے میں کچھ نہیں جانتے' تو آپ انہیں میرا گانا سنوانے پر کیوں مصر تھیں؟"

"تمہاری بھلائی کے لئے.........." نگہت نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ وہ بہت
اختر کو "تم" کہہ کر مخاطب کرنے لگی تھی۔ اختر کو اس لہجے میں اپنائیت کی یہ ہلکی سی مہ
بہت بھلی محسوس ہوئی۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی.......... "میں نے تمہیں بتایا نا کہ یہ اسامی میں
اس ہوٹل میں پہلی مرتبہ خود نکالی ہے اور زبردستی نکالی ہے۔ میں چاہتی ہوں نچلے ملاز
کوئی سازش کر کے اس تجربے کو ناکام نہ بنا دیں۔ اب تمام ملازمین پر یہ تاثر رہے گا کہ
ڈمی صاحب نے خود تمہارا انٹرویو لیا ہے اور تمہیں رکھا ہے۔ یعنی تم براہ راست "اوپر
آئے ہو۔ اب کوئی تمہیں تنگ کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ مجھے معلوم ہے فنکار لو
کو جب تک ذہنی سکون اور یکسوئی میسر نہ ہو وہ اچھے طریقے سے اپنے فن کا مظاہرہ نہیں
سکتے۔ اب تم سکون سے اپنی ملازمت جاری رکھ سکو گے۔ کوئی تمہیں بلیک میل نہیں کر
گا۔ بہانے بنا کر تمہیں نکلوانے اور تمہاری جگہ کسی اپنے بے سرے یار دوست یا شنا
لانے کی کوشش نہیں کرے گا.........."

اختر حسین کو ابھی ملازمتوں کے نشیب و فراز کا کوئی خاص تجربہ نہیں تھا۔ اس کی
میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ نگہت افروز کی نوازش اور سرپرستی کا شکریہ کس زبان سے
کرے۔

نگہت افروز نے اختر کو شکریئے کا موقع نہیں دیا۔ اختر اس کا شکریہ ادا کرنے کے
تمہید ہی باندھ رہا تھا کہ وہ اس کا مطلب سمجھتے ہوئے بات کاٹ کر بولی..........
بس.......... بس.......... ان تکلفات کی کوئی ضرورت نہیں اس ہوٹل کو تم جیسے ا
شخص کی ضرورت تھی۔ اتفاق سے تم مجھے نظر آ گئے میں نے تمہارے فن کا مظاہرہ دیکھ
تمہیں گاتے سن لیا میں نے تمہیں بلا لیا تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ اب تم ایسا کرو
ہمارے چیف میوزیشین سے بھی مل لو.......... میں اسے اپنے کمرے میں ہی بلوا
ہوں.........."

خوش قسمتی سے اختر باقی مراحل سے بھی بخیر و خوبی گزر گیا اور آخرکار تقرر نامہ

کے ہاتھ میں آگیا۔ ملازمت کی شرائط اور تنخواہ وغیرہ کے بارے میں پڑھ کر اس نے اطمینان
کی سانس لی۔ نوکری واقعی اس کی افتاد طبع کے عین مطابق تھی' کام وام کوئی خاص نہیں تھا'
تنخواہ معقول اور ماحول نہایت خوبصورت۔

اس کے کام کا وقت قواعد و ضوابط کے مطابق چھ بجے شام سے شروع ہوتا تھا لیکن وہ
چار بجے ہی آکر ہوٹل کے کافی بار میں بیٹھ جاتا تھا۔ لوگ پیسے خرچ کر کے وہاں بیٹھتے تھے
اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ مفت میں نہ صرف بیٹھ سکتا تھا بلکہ اسے رات کا کھانا اور دو
مرتبہ کافی بھی مفت مل سکتی تھی۔ اختر محسوس کرتا کہ وہ ملازمت نہیں' عیاشی تھی۔ اسے
یقین نہیں آتا تھا کہ کبھی کبھی قسمت انسان پر یوں بھی مہربان ہو سکتی ہے۔

چھ بجے اس کی ڈیوٹی شروع ہوتی تو وہ نئے سرے سے سجائے گئے بال روم میں آکر
آرکسٹرا میں شامل ہو جاتا اور ضرورت پڑنے پر کوئی ایک آدھ ساز بجانے لگتا ورنہ فارغ ہی
بیٹھا رہتا۔ اپنے فن کا اس سے زیادہ مظاہرہ تو وہ دوستوں کی فرمائشوں پر کرتا رہا تھا نہ جانے
کتنی ہی محفلوں میں اس نے رات رات بھر بلامعاوضہ گایا تھا اب جو ڈیوٹی اسے دینا پڑتی تھی
وہ تو اس کے لئے کوئی معانی ہی نہیں رکھتی تھی۔

بال روم میں رات نو بجے کے بعد گاہکوں کی آمد شروع ہوتی تھی کچھ جوڑے رقص
کرتے کچھ غالباً" ان کی نقل کرتے کیونکہ ان کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں رقص آتا
نہیں تھا کچھ جوڑے بیٹھ کر محض انہیں دیکھا کرتے۔

گاہکوں کی اطلاع کے لئے آرکسٹرا کے اسٹیج کے پیچھے دیوار پر جلی حروف میں ایک بینر
پر یہ اعلان لکھ کر بھی لگا دیا گیا تھا کہ معزز مہمان چاہیں تو لوک دھنوں یا نغموں اور غزلوں
وغیرہ کی فرمائش کر سکتے ہیں۔ اعلان انگریزی' اردو' دونوں زبانوں میں لکھ کر لگایا گیا تھا مگر
بہت کم مہمان اس پیشکش سے استفادہ کرتے۔

بیشتر ویٹرز' کافی بار میں کام کرنے والی ہوٹل کی اکلوتی ویٹرس' وہاں کا کاؤنٹر کلرک'
استقبالیہ کلرک اور عملے کے دیگر کئی افراد اختر حسین کو اچھی طرح پہچاننے لگے تھے کیونکہ وہ
اپنی ڈیوٹی کے وقت سے پہلے آکر چائے یا کافی پینے کے دوران انہی لوگوں سے گپ شپ
کرتا رہتا تھا۔

کافی بار کے ادھیڑ عمر کاؤنٹر کلرک تجمل حسین اور ویٹرس شہلا سے تو اس کی خاصی بے
تکلفی ہو گئی تھی۔ تجمل حسین ایک کم گو اور بال بچے دار شخص تھا لیکن اختر کی خوش خلقی
وجہ سے' عمر کے تفاوت کے باوجود اس سے گھل مل گیا تھا اور گھریلو مسائل پر بھی اس سے
تبادلہ خیال کر لیتا تھا۔

ویٹرس شہلا فربہی مائل سرخ و سپید لڑکی تھی اس کی آنکھیں نیلی اور بال بھورے
تھے۔ عمر پچیس چھبیس سال ہو گی لیکن' وہ اپنی عمر سے کچھ بڑی' بڑی سی لگتی تھی۔ نقوش

بے حد عام سے تھے لیکن سرخ و سپید رنگ' بھورے بالوں اور نیلی آنکھوں کی وجہ سے خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔

اس کا یونیفارم بھڑکتے' نارنجی رنگ کے شلوار قمیض اور برطانوی ایئر ہوسٹسوں جیسی ٹوپی پر مشتمل تھا اس یونیفارم میں وہ روزانہ شام کو کافی بار کی چھوٹی چھوٹی میزوں اور کاؤنٹر کے درمیان چکراتی پھرتی تھی تو بلاشبہ قیامت ڈھاتی تھی۔ پورے ہال میں اور کہیں بھی کوئی ویٹرس سرو نہیں کرتی تھی صرف کافی بار میں ایک ویٹرس رکھ چھوڑنے میں ہوٹل والوں کی کیا مصلحت تھی' یہ اختر حسین نہیں سمجھ سکا تھا۔

بعد میں اختر کو پتہ چلا کہ پورے ہوٹل میں ویٹرس رکھنے کی اجازت نہیں ملتی تھی صرف کافی بار میں ایک ویٹرس یا کاؤنٹر کلرک لڑکی ملازم رکھنے کی اجازت ملی تھی........... وہ بھی بڑی مشکل سے.......... شاید اس لئے ہوٹل والے کہتے تھے کہ ہوٹلنگ کا بزنس اب بڑا مشکل ہو گیا تھا۔ ہر بات پر اعتراض ہوتا تھا۔

شہلا کی تعلیم صرف میٹرک تھی لیکن جب وہ چھوٹی تھی تو ان کے گھریلو حالات اچھے تھے' کچھ عرصہ انگلش میڈیم اسکول میں پڑھنے کا موقع مل گیا تھا اور کچھ کرسچین لڑکیوں سے بھی اس کی دوستی رہی تھی جس کی وجہ سے وہ نہ صرف انگریزی سمجھ لیتی تھی بلکہ خاصی روانی سے بول بھی لیتی تھی۔ اسے ہوٹل میں ملازمت دلانے میں یہی "کوالیفی کیشن" اس کے سب سے زیادہ کام آئی تھی کہ وہ انگریزی سمجھ اور بول سکتی تھی۔

اس کوالیفی کیشن کی بنیاد پر اسے ریسپشنسٹ' آفس سیکرٹری یا ٹیلی فون آپریٹر وغیرہ کی نوکری بھی مل سکتی تھی.......... اور اس نے اس قسم کی دو تین ملازمتیں کی بھی تھیں لیکن کہیں تنخواہ بہت کم تھی کہیں اسے مالک کی حد سے زیادہ "نظر عنایت" کی وجہ سے بھاگنا پڑا اور کہیں تنخواہ زیادہ تھی تو وہ کمپنی فراڈ نکلی۔ شہلا خود پکڑ دھکڑ کی لپیٹ میں آتے آتے بچی۔

شہلا کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ نو افراد پر مشتمل ایک کنبے کی واحد کفیل تھی وہ ایک ماہ بھی بے روزگار رہنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ جونہی ہوٹل میں ویٹرس کی ضرورت کا اشتہار آیا' اس نے اس ملازمت کے لئے اپلائی کرنے میں بھی ذرا تامل نہ کیا.......... کم از کم فائیو اسٹار ہوٹل کا نام تو تھا اور پھر کہنے کو اسامی ویٹرس کی تھی لیکن تنخواہ اس کی تمام سابقہ ملازمتوں سے زیادہ تھی.......... کیونکہ صرف مشروبات سرو کرنا ہی نہیں' بعض گاہکوں کے گھٹیا ذہنوں کے ابال اور سوقیانہ مذاق کو برداشت کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔

ٹپ بھی اسے خوب ملتی تھی۔ اسی لئے وہ اکیلی نو افراد پر مشتمل کنبے کی ضرورتیں نہایت عمدگی سے پوری کر رہی تھی۔ ٹپ شروع شروع میں اسے کچھ معیوب سی لگی۔ اسے قبول کرنے کو اس کا جی نہ چاہا لیکن مجبوریاں بہت سے احساسات کو سلا دیتی ہیں۔ شہلا بھی رفتہ رفتہ ٹپ قبول کرنے اور مسکرا کر شکریہ ادا کرنے کی عادی ہو گئی۔ وہ ہر طبقے کی نفسیات

کو خوب سمجھنے لگی تھی دولت مند اس پر اپنی دولت مندی کی دھاک بٹھانے کے لئے فراخدلی سے ٹپ دیتے تھے اور مڈل کلاسیے' دولت مند نظر آنے کے لئے حیثیت سے بڑھ کر ٹپ دیتے تھے۔

کافی بار ہی ہوٹل کا وہ واحد حصہ تھا جہاں عموماً" مڈل کلاسیوں کی بھی رسائی رہتی تھی۔ انہیں یا تو کوئی آسودہ حال شخص کسی کام کی غرض سے وہاں ملنے کا وقت دے دیتا تھا یا پھر وہ خود ہی پچاس روپے جیب میں ڈال کر "عیاشی" کی غرض سے وہاں آ بیٹھتے تھے اور چوبیس روپے کی چائے کے ساتھ ویٹرس کو پیسٹری کے طور پر شامل سمجھتے تھے۔

اونچے ماحول کا اپنا ایک رعب' ایک اثر ہوتا ہے۔ عموماً" اس ہوٹل میں بیٹھ کر ہر طبقے کے لوگ تمیز دار' مہذب اور شائستہ نظر آنے کی کوشش کرتے تھے لیکن چھچھورے لوگ ہر طبقے میں ہوتے ہیں۔ خصوصاً" ایسے چھچھورے لوگ جو اپنے چھچھورے پن پر قابو نہیں رکھ سکتے' خواہ وہ کہیں بھی بیٹھے ہوں کبھی ایسے لوگوں کی آنکھیں اور کبھی زبان کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ جاتی تھی جو اس کی سماعت پر خراش ڈال جاتی تھی۔ ایسے لوگوں کو شہلا پیٹھ پیچھے خوب برا بھلا کہتی تھی حالانکہ اس نے اپنے دعوے کے مطابق خود کو چکنا گھڑا بنا لیا تھا لیکن پھر وہ خود ہی کہتی کہ کبھی کبھی چکنے گھڑے پر بھی کوئی بوند ٹھہر جاتی ہے۔

نگہت افروز بھی کبھی فارغ وقت میں دو چار منٹ کے لئے کافی بار میں آ بیٹھتی تھی۔ اختر اس کے سامنے بچھا جاتا تھا وہ جب بھی شکر گزاری کے اظہار کے لئے خوبصورت ترین الفاظ تلاش کر کے' اٹک اٹک کر انہیں ادا کرنے کی کوشش کرتا تو نگہت فوراً" اس کی بات کاٹ دیتی' موضوع بدل دیتی اور پھر پرخیال انداز میں اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے' سوچوں کی نہ جانے کون سے بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگتی۔

کافی بار میں ہی اختر نے پہلی مرتبہ اس عورت کو دیکھا تھا اور دیر تک دیکھتا ہی رہ گیا تھا..........!

وہ عورت تھی ہی ایسی کہ اسے دیکھتے وقت پلک جھپکانا بڑا تکلیف دہ عمل محسوس ہوتا تھا۔ اس کی عمر پینتیس سے کم نہیں رہی ہو گی لیکن اس کے حسن اور کشش کا چاند ذرا بھی تو نہیں گہنایا تھا۔

اس کا سراپا اس پکے ہوئے رسیلے پھل سے مشابہ تھا جو کسی بھی لمحے شاخ سے ٹوٹ کر گرنے والا تھا اور جس میں ان گنت پھولوں کی مہک بھی مقید تھی۔ جس تک پہنچنے کے لئے شاید بہت سے ہاتھ اٹھے تھے مگر ایسا لگتا تھا کہ کسی کے لئے بھی اس تک رسائی بہت مشکل تھی۔

بعد میں تو اختر کو بہت سی دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی شادی کو کم از کم بارہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن اختر نے جب پہلی مرتبہ اسے دیکھا تھا تو یہ

سمجھا تھا کہ شاید وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جن کے لئے ہم پلہ رشتہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ان کی شادی میں کچھ تاخیر ہو جاتی ہے۔

اس روز وہ فرنچ شیفون کی سفید ساڑھی میں تھی جو بڑی اپنائیت سے اس کے بھرے بھرے جسم کے نشیب و فراز سے چمٹی ہوئی تھی۔ اس کا قد عام عورتوں سے اونچا اور رنگت محض گوری ہی نہیں اس میں ماہتاب کی سی چمک بھی تھی۔

اس کی نیلی آنکھیں جھیل کی طرح نہیں، سمندر کی طرح گہری تھیں جن کی تہہ میں نہ جانے کیا کچھ چھپا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی دیوی کا سا تقدس اور چال میں کسی ملکہ کی سی تمکنت تھی۔ اس کے ملکوتی حسن کو لفظوں میں بیان کرنا اختر کے خیال میں ناممکن ہی تھا اسے صرف محسوس کیا جا سکتا تھا۔

حسن اختر کے لئے کوئی نئی انوکھی یا کسی دوسری دنیا کی چیز نہیں تھا اس کی بہت سی شامیں حسین چہروں کے دائرے میں گزری تھیں لیکن کوئی چہرہ، کوئی سراپا شاید انسان کے لاشعور یا اس کے تصور میں چھپا ہوتا ہے وہ ایک خیالی، ایک افسانوی سی چیز ہوتا ہے......... لیکن اچانک وہ انسان کو حقیقی شکل میں نظر آتا ہے تو اس کے حواس پر بجلی سی گر پڑتی ہے۔

اختر شاید اسی لئے اس عورت کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا تھا اس کی آمد سے گویا بار کے دھندلائے ہوئے سے ماحول میں اجالا پھیل گیا تھا۔ اس نے کافی بار کا وہ آرائشی پردہ اٹھایا جو موٹے موٹے موتیوں اور منکوں کی لڑیوں سے بنا ہوا تھا اس پردے کو چھیڑنے پر مترنم گھنٹیاں بج اٹھتی تھیں لیکن آج اس کی آمد پر گھنٹیاں بجی تھیں تو ان میں ترنم کچھ زیادہ ہی تھا۔

بظاہر اس نے کسی کی طرف بھی نہیں دیکھا لیکن اختر نے محسوس کیا کہ وہ ایک ہی نظر میں اس چھوٹے سے ہال کا جائزہ لے چکی تھی اور نہ جانے کس چیز کا اطمینان کرنے کے بعد کاؤنٹر کی طرف بڑھی تھی۔ ایک مسحور کن خوشبو کا جھونکا اس کے ہم رکاب تھا۔

کافی بار میں اس وقت کوئی گاہک نہیں تھا اختر ایک کونے میں سب سے پیچھے والی میز پر بیٹھا تھا اسے وہاں کی کافی بہت اچھی لگتی تھی۔ اس عورت کی آمد سے پہلے وہ اپنے کوٹے کی دوسری کافی بھی ختم کر چکا تھا اور اس وقت مینو پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ اسنیک کے عجیب و غریب ناموں پر غور کر رہا تھا لیکن اس عورت کو دیکھنے کے بعد وہ دوبارہ مینو کی طرف متوجہ ہونا بھول گیا تھا۔

کاؤنٹر انگریزی کے حرف "ایل" کی ساخت کا تھا۔ شہلا اس کے ایک سرے پر اسٹول پر بیٹھی تھی۔ وہ عورت کاؤنٹر کے دوسرے سرے کی طرف آ رہی تھی جہاں تجمل حسین اس کے استقبال کے لئے اس عالم میں کھڑا تھا کہ انکساری اور اشتیاق سے اس کی باچھیں کھلی

پڑ رہی تھیں۔

شہلا نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش نہیں کی وہ صرف میزوں پر سرو کرتی تھی۔ کاؤنٹر کے سامنے اسٹولوں پر بیٹھنے والوں کو تجمل حسین ہی سرو کرتا تھا۔

وہ عورت تجمل حسین کے عین سامنے اسٹول پر بیٹھ گئی اور اس طرح اس کے سراپا میں کچھ ایسا تغیر آیا کہ اس پر نظر ڈالنا ہی گویا قیامت کا باعث ہو گیا نہ جانے کیوں وہ اس جگہ کچھ اجنبی سی لگ رہی تھیں۔ کافی بار......... اس کا کاؤنٹر......... اس کا اسٹول گویا اس کے شایان شان نہیں تھا۔ اسے شاید کہیں اور ہونا چاہئے تھا کسی ریزروڈ اور وی آئی پی ٹیبل پر......... یا پھر شاید ملکہ کے لباس میں کسی تخت پر.........!

اختر گو کہ کاؤنٹر کے اس سرے سے خاصے فاصلے پر بیٹھا تھا لیکن کافی بار میں سکوت اتنا زیادہ تھا کہ تجمل حسین نے جب دھیمے لہجے میں بات شروع کی تو اختر کو اس کی آواز کافی حد تک صاف سنائی دی۔

"آپ بہت دنوں بعد نظر آئیں ہیں بیگم رمنا رئیس!" وہ کہہ رہا تھا۔

اختر کو یہ جان کر حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا کہ وہ عورت "بیگم" تھی۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ اس نے جتنی بیگمات کو دیکھا تھا ان میں سے زیادہ تر ایسی تھیں کہ اس کے ذہن میں لفظ "بیگم" کے ساتھ عجیب سا تصور وابستہ ہو گیا تھا۔ اسے کچھ یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے بیگم صاحبہ کہلانے کے لئے جسم پر چربی کی تہیں اور چہرے پر میک اپ کی تہیں ہونا ضروری تھا۔ بعض بیگمات کو اس نے چربی کی تہوں کے بغیر بھی دیکھا تھا لیکن انہوں نے بھی ہیر اسٹائل، لباس یا میک اپ کے معاملے میں اپنی عمر کی مناسبت کا خیال رکھنے کی بجائے کچھ ایسی حد سے زیادہ جدت پسندی کا ثبوت دیا تھا کہ اچھی بھلی مضحکہ خیز دکھائی دینے لگی تھیں......... مگر انہیں شاید خود اپنی مضحکہ خیزی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

جواباً" عورت بھی گو کہ مدھم ہی لہجے میں بولی تھی مگر اس کی آواز کی کھنک نے اختر کے دل میں گدگدی سی کر دی۔

"رئیس کی طبیعت پچھلے دنوں کچھ زیادہ خراب رہی"۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "میرا زیادہ تر وقت ملک بھر کے اسپتالوں سے مزید نامور اسپیشلسٹوں کو تلاش کرنے میں صرف ہوتا رہا۔ باہر کے بھی کچھ ڈاکٹروں سے رابطہ کرنا پڑا۔ زندگی میں جو تھوڑی بہت تفریح کی گنجائش تھی، وہ بھی ختم کرنا پڑی وقت ہی نہیں ملتا تھا کہ کہیں نکلتی"۔

"اوہ.........!" تجمل حسین نے ہمدردانہ لہجے میں محض اتنا کہا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بات کرنے میں اپنی طرف سے حتی الامکان احتیاط برت رہا تھا کہ کوئی فاضل اور غیر ضروری لفظ زبان سے نہ نکلنے پائے۔

"لاؤ ہماری بلیک کافی تو نکالو........." بیگم رمنا رئیس نے قدرے تھکے تھکے سے

لہجے میں کہا............ حالانکہ گھر پر تو پیتی رہتی ہوں لیکن یہاں بیٹھ کر اور خصوصاً" تمہارے
ہوٹل کی بلیک کافی میں جو مزہ ہے وہ گھر پر کہاں............"

تجمل حسین نے مزید خاکسارانہ انداز میں اپنے دانتوں کی نمائش کی وہ اپنی بو درست
کی اور کاؤنٹر کے نیچے سے ایک بلوریں جگ نکال کر کاؤنٹر پر رکھا پھر اس نے موٹی کاغذ میں
لپٹا ہوا' جراثیم سے پاک ایک مگ نکال کر احتیاط سے کاؤنٹر پر رکھا اور اس میں کافی انڈیل
بیگم رمنا رئیس کی طرف کھسکا دیا۔ وہ چھوٹی چھوٹی چسکیاں لینے لگی۔

کچھ دیر بعد اس نے مگ خالی کر کے کاؤنٹر پر تجمل کی طرف کھسکاتے ہوئے مسکرا
کہا............ "ایک مگ سے تو گویا طلب ہی پوری نہیں ہوئی ایک اور بھر دو............"

تجمل نے مگ دوبارہ بھر دیا بیگم رمنا رئیس نے اسے بھی پہلے ہی کی طرح دھیرے۔
دھیرے ختم کیا اس کے بعد وہ کہنیاں کاؤنٹر پر ٹکا کر گویا مراقبے میں چلی گئی۔

کافی بار میں پھیلا ہوا سکوت کچھ اور گہرا ہو گیا۔ شہلا نے اپنے اسٹول پر دو ایک مر
پہلو بدلا پھر اٹھ کر کافی بار کی حدود سے باہر جا کھڑی ہوئی۔ تجمل اس دوران کاؤنٹر صاف
کرنے' کافی اور اسنیکس وغیرہ بنانے کی مشینوں کا جائزہ لینے میں اپنے آپ کو مصروف
ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کئی منٹ بعد بیگم رمنا رئیس نے سر اٹھایا اور یوں گرد و پیش کا جائزہ لیا جیسے محض
اچٹتی نظروں سے درودیوار کو دیکھ رہی ہو۔ بظاہر اس نے اختر کو بھی نہیں دیکھا تھا لیکن ا
کو احساس تھا کہ وہ اس کا تفصیلی جائزہ لے چکی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ تنہا ایک گو
میں کسی مجسمے کی طرح ساکت بیٹھا عجیب سا ہی لگ رہا تھا۔ بیگم رمنا رئیس کی آنکھوں
نمی سی جھلک آئی تھی جو کافی بار کی مدھم روشنی میں سیال چاندی کی طرح جھلملا رہی تھی
رخساروں پر مناسب میک اپ کی ہلکی سی سرخی تو پہلے سے موجود تھی لیکن اب رخسار
عجیب سے انداز میں تمتما رہے تھے۔

گرد و پیش کا غیر محسوس انداز میں جائزہ لینے کے بعد وہ ایک بار پھر تجمل کی طرف متو
ہوئی اور مغموم سے انداز میں مسکرا دی۔ کافی بار میں داخل ہوتے وقت وہ جتنی تازہ دم ا
شگفتہ نظر آ رہی تھی' اب اتنی ہی تھکی تھکی اور دل شکستہ سی دکھائی دے رہی تھی۔

لیکن کیفیات کی ان تبدیلیوں سے اس کے حسن و کشش میں کوئی کمی واقع نہیں ہ
تھی............ بلکہ اب تو جیسے اس کے حسین چہرے کے گرد ایک عجیب سا ہالہ نظر آنے
تھا جس نے اس کے ایک ایک نقش کو اجاگر کر دیا تھا۔ اس کے چہرے کی صباحت میں
ملاحت کی آمیزش کر دی تھی۔

"چیک دے دو............" اس نے قدرے بوجھل سی آواز میں تجمل سے کہا۔

تجمل نے ایک فولڈر اس کے سامنے رکھ دیا جس میں بل موجود تھا جسے ازراہ شائستگی

چیک" کہا جاتا تھا۔

بیگم رمنا رئیس نے فولڈر کھولا اور بل نکال کر ادائیگی کرنے کے بجائے اس پر دستخط
کر دیئے فولڈر بند کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ جب دروازے کی طرف چلی تو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے قدموں تلے ماربل کا
فرش نہیں' کوئی جھیل تھی جس کی سطح پر کنول کھلے ہوئے تھے اور ان پر پاؤں رکھتی ہوئی وہ
ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف جا رہی تھی اس کی کمر کے سامنے شاخ گل کی
لچک ہیچ تھی۔

وہ جا چکی تو گویا رنگ' خوشبو' چاندنی' موسیقی اور خوبصورتی سے سجا ہوا ایک مسحور
کن خواب ٹوٹ گیا اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس دوران اختر ایک بے عنوان سے سحر
میں گرفتار رہا تھا لیکن اس کے باوجود رمنا رئیس کا آنا' وہاں بیٹھنا' بلیک کافی پینا............ یہ
سارا عمل اس کے دل میں کچھ کھٹکا تھا۔

پہلی بات تو یہی تھی کہ کافی بار میں آ کر اسٹول پر بیٹھنا ہی بیگم رمنا رئیس جیسی
عورت کے شایان شان معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ ڈائننگ ہال میں بیٹھ کر بھی کافی طلب کر سکتی
تھی............ بلکہ اس جیسی شخصیت تو ہوٹل میں کہیں بھی بیٹھ کر کافی طلب کرتی تو شاید
ویٹر دوڑے دوڑے لے کر جاتے............ اسے بطور خاص' بغلی حصے میں واقع اس کافی بار
تک چل کر آنے کی زحمت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

دوسری بات یہ تھی کہ تجمل کاؤنٹر پر بیٹھنے والے گاہکوں کو ہمیشہ پیچھے پینٹری میں رکھے
ہوئے الیکٹرک جگ یا پیر کولیٹر سے کافی نکال کر دیتا تھا جب کہ بیگم رمنا رئیس کے لئے
اس نے خاص طور پر کاؤنٹر کے نیچے سے وہ خوبصورت بلوریں جگ نکالا تھا جو اختر نے اس
سے پہلے کافی بار میں نہیں دیکھا تھا پھر اس نے جو کافی مگ میں انڈیلی وہ سیاہی مائل نہیں'
شفاف سرخ تھی۔

مگ پر ہلکی سی دھندلاہٹ بھی ابھر آئی تھی جیسے اس میں کوئی ٹھنڈا مشروب انڈیلا گیا
ہو............ تجمل نے کاؤنٹر کے نیچے سے جو جگ نکالا تھا وہ کھٹکے دار ڈھکنے والا تھا اس نے
جگ بھی یقیناً فریج یا ڈیپ فریزر سے نکالا تھا کیونکہ اس پر ہلکی سی دھندلاہٹ موجود تھی جس
کا مطلب تھا کہ اس میں ٹھنڈا مشروب موجود تھا۔

جب کہ بیگم رمنا رئیس نے کولڈ کافی یا آئس کافی طلب نہیں کی تھی بلیک کافی طلب
کرنے کا مطلب عام طور پر گرم کافی طلب کرنا ہی ہوتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دو
مگ ختم کرنے کے بعد بیگم رمنا رئیس کے چہرے پر اور آنکھوں میں جو تبدیلی آئی تھی
وہ............

یہ سب کچھ اختر کے لئے تعجب خیز ضرور تھا لیکن کوئی ایسا معمہ نہیں تھا جسے وہ حل

نہ کر پاتا۔ اس نے گھڑی دیکھی ابھی اس کی ڈیوٹی شروع ہونے میں خاصی دیر تھی وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور تجمل حسین کے سامنے اسی اسٹول پر جا بیٹھا جس پر کچھ دیر پہلے تک پیکر انسانی میں وہ قیامت براجمان تھی۔

"بڑی اونچی چیز ہیں آپ بھی انکل تجمل..........!" وہ آہستہ سے کاؤنٹر پر ہاتھ مار کر بولا.......... "آپ کا تو وہ معاملہ ہے کہ.........." وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے.......... کبھی کبھار ہمیں بھی اسی جگ میں سے بلیک کافی پلا دیا کریں جو ماہ رخوں کے لئے رکھا ہوا ہے۔ آخر ہمارا بھی دو مگ کا کوٹہ منظور ہے۔ دو مگ سے زیادہ بھی ہو جائے تو فکر کی کوئی بات نہیں اس کے پیسے تنخواہ میں سے کٹ جایا کریں گے.........."

تجمل حسین کے ہونٹوں پر خشکی آ چکی تھی جسے دور کرنے کے لئے اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور مسکرانے کی کوشش کی.......... "تم نے اپنی زندگی کے جو حالات مجھے سنائے تھے.......... جو داستان غم قسطوں میں بیان کی تھی اس سے میں تو تمہیں سیدھا سادا دیہاتی سمجھتا تھا.......... تم تو خاصی کمینی چیز ہو.........."

"سیدھا سادا تو میں ضرور ہوں اور دیہاتی بھی ہوں.........." اختر نے تسلیم کیا.......... "لیکن احمق ہرگز نہیں ہوں.......... لڑکپن سے شہر میں ہوں.......... یونیورسٹی میں پڑھا ہوں اور تقریباً ہر طبقے میں اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا ہے مجھے.......... جس شخص نے زندگی میں دو چار مرتبہ بھی باقائمی ہوش و حواس بلیک کافی پی ہو وہ بلیک کافی اور رم میں فرق دور سے محسوس کر سکتا ہے.......... لیکن یہ چکر کیا ہے؟"

"چکر کچھ بھی نہیں.........." تجمل حسین گہری سانس لے کر اور سر جھکا کر بولا.......... "چکر صرف پیسے کا ہے میرے جوان جوان بچے ہیں تنخواہ میں گزارہ نہیں ہوتا اس قسم کے دو چار افراد کی مختلف قسم کی خدمات انجام دینے پر مجھے چار پیسے فالتو مل جاتے ہیں"۔

"لیکن یہ خاتون کچھ ایسی مسکین قسم کی تو نہیں تھیں کہ انہیں چھپ چھپا کر چسکی لگانے کی ضرورت پیش آئے"۔ اختر نے ذرا آگے کو جھکتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا.......... "بار موجود ہے کسی ہال میں بیٹھ کر بھی منگوا سکتی ہیں ان کے سامنے انکار کی جرات کس کافر میں ہو گی.........."

"یہ بات نہیں ہے.........." تجمل نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس سے بھی نیچی آواز میں بولا.......... "آج کل کافی سختی ہے بار صرف غیر ملکیوں.......... بلکہ غیر مسلموں کے لئے ہے.......... اور پھر تم شاید اس عورت کو نہیں جانتے اس لئے اس کی پوزیشن کو نہیں سمجھتے اس کے بارے میں اسکینڈل بننے کے امکانات کچھ زیادہ ہی رہتے ہیں اس لئے وہ ہر معاملے میں بہت زیادہ محتاط رہتی ہے"۔

"گھر پر بھی شوق پورا کر سکتی ہے"۔ اختر نے خیال ظاہر کیا۔

"گھر پر بھی شوق پورا کرتی ہو گی.........." تجمل قدرے بے نیازی سے بولا "لیکن ظاہر ہے انسان کو کبھی کبھار باہر بھی نکلنا ہوتا ہے.......... اور اس جیسی عورت کو کسی وقت بھی، کہیں بھی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ اس صورت میں مجھ جیسے خادم کام آتے ہیں اور کسی کو کانوں کان پتا نہیں چلتا.......... سوائے تم جیسے باریک بین اور جاسوس ٹائپ لوگوں کے.........."

"ویسے میرا مشورہ ہے کہ آئندہ کے لئے تم لوگ کوڈ ورڈ بدل لو.........." اختر مسکراتے ہوئے بولا.......... "اس سے کہو کہ بلیک کافی نہ طلب کیا کرے بلکہ کوئی سا "کولا" طلب کیا کرے اس طرح تمہیں بھی آسانی ہو جائے گی کسی "کولا" کی بوتل سے نکال کر باقاعدہ برف وغیرہ ڈال کر پیش کر سکو گے اور مجھ جیسے کسی باریک بین کی نظر میں آنے سے محفوظ رہو گے۔ انسان احتیاط کرے تو پوری طرح کرنی چاہیے"۔

"ہاں.......... تجویز تمہاری معقول ہے.........." تجمل پر خیال نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلا کر بولا۔

ان کے درمیان گفتگو نیچی آواز میں ہی جاری تھی ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اختر بولا.......... "ویسے بائی دا وے.......... یہ عورت تھی کون؟ اس کی پوزیشن کیوں نازک ہے؟" اس کے لہجے میں تجسس تھا۔

"رمنا نام ہے اس کا.......... سیٹھ رئیس احمد کی بیوی ہے کبھی نام سنا ہے سیٹھ رئیس احمد کا؟" تجمل نے پوچھا۔

"نام تو سنا ہوا سا لگتا ہے.........." اختر ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "یا پھر شاید کہیں اخبار وغیرہ میں پڑھا ہے.........."

"ہاں.......... اخبارات میں عموماً اس کا نام آتا رہتا ہے اور کچھ عرصہ پہلے تک تو بڑی کثرت سے چھپتا تھا کیونکہ اس وقت وہ اپنے پیروں پر چلنے کے قابل تھا اور شہر کی بہت سی تقریبات میں مہمان خصوصی ہوا کرتا تھا.........." تجمل اب قدرے پرسکون ہو کر بتانے لگا۔

لیکن اسی لمحے جیسے اسے پھر کوئی خیال آ گیا اور اس کی گھبراہٹ لوٹ آئی وہ ذرا خوفزدہ نظروں سے اختر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا.......... "دیکھو پیارے بھتیجے! وہ بلیک کافی والی بات کا کسی سے ذکر مت کرنا۔ ہم لوگ.......... یعنی میں، تم، شہلا اور دو چار دوسرے لوگ یہاں فیملی کی طرح ہیں ایک دوسرے کے راز ہمارے پاس ایک دوسرے کی امانت ہیں"۔

"نصیحتوں کی ضرورت نہیں مجھے کسی کی مخبری کرنے، کسی کے پیٹ پر لات مارنے اور

کسی کمزوریوں کو اچھالنے کا قطعاً" کوئی شوق نہیں پردہ پوشی کرنے والا آدمی ہوں.........
تم مجھے رمنا اور رئیس کے بارے میں بتاؤ........." اختر کے لہجے میں بے تابی جھلک رہ
تھی۔

تجمل دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے بولا "بہت دولت مند
آدمی ہے سیٹھ رئیس صرف نام کا رئیس نہیں' سچ مچ رئیس ہے۔ ٹیکسٹائل میگنیٹ
ہے' ٹیکسٹائل انڈسٹری کا بادشاہ سمجھ لو......... لیکن یہ اس کی......... یا پھر شاید رم
رئیس کی بدقسمتی ہے کہ وہ عمر میں رمنا کے باپ کے برابر ہے رمنا اس کی دوسری بیوی ہے
پہلی بیوی مر چکی ہے اگر اس سے سیٹھ رئیس کی کوئی اولاد ہوتی تو شاید رمنا ہی کے برابر
ہوتی........."

اس نے ٹھنڈی سانس لی اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد سلسلہ کلام جوڑا.........
"مگر اس سے بھی زیادہ بڑی ٹریجڈی یہ ہوئی کہ دو تین سال قبل اس کی کار ایک تیز رفتار
ٹرک سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گئی۔ ڈرائیور تو موقع پر ہی ہلاک ہو گیا......... لوگ کہتے
ہیں کہ اس حادثے میں سیٹھ رئیس کا زندہ بچ جانا اس کی خوش قسمتی تھی مگر میرے خیال
میں تو یہ اس کی بدقسمتی ہی تھی کیونکہ اس کی ریڑھ کی ہڈی کو کچھ ایسا نقصان پہنچا کہ وہ ہمیشہ
کے لئے اپاہج ہو کر رہ گیا........."

تجمل حسین گویا اس ٹریجڈی سے ذاتی طور پر متاثر تھا وہ ایک بار پھر تاسف زدہ سے
انداز میں خاموش ہو گیا اس دوران ایک غیر ملکی سفید فام جوڑا سوئمنگ پول سے اٹھ کر کاؤ
بار میں آ بیٹھا۔

شہلا فوراً" اندر آ گئی اس نے ان سے آرڈر لیا اور آ کر تجمل کو بتایا۔ تجمل مطلوبہ
چیزیں پینٹری سے اٹھا کر ٹرے میں سجا کر اس کے حوالے کر چکا اور شہلا انہیں سرو کرنے
کے بعد اپنے مخصوص اسٹول پر بیٹھ چکی تو تجمل نے سلسلہ کلام جوڑا۔

"بیگم رمنا اور سیٹھ رئیس کے دو تین عزیز اسے دنیا بھر کے مشہور ڈاکٹروں کے پاس
لئے پھرے مہینوں وہ غیر ممالک میں زیر علاج رہا اس کے جسم کی اور تو تقریباً" سب ہی
خرابیوں کا علاج ہو گیا لیکن ریڑھ کی ہڈی کو جو نقصان پہنچا تھا اس کا صحیح طور پر مداوا نہیں ہو
سکا......... تاہم اتنا ضرور ہوا کہ اب وہ کبھی کبھار بیساکھیوں کے سہارے چند قدم چل لیتا
ہے......... لیکن بس کبھی کبھار......... ورنہ اکثر وہ بستر پر ہی دراز رہتا ہے یا پھر موٹر
والی ایک خاص قسم کی وہیل چیئر پر تھوڑا بہت ادھر ادھر آ جا لیتا ہے۔ باری باری ڈیوٹی دینے
والی تین نرسیں اس کی مستقل ملازم ہیں بستر اور وہیل چیئر سے ہی وہ اپنا سارا بزنس کنٹرول
کرتا ہے"۔

اختر اس جگ بیتی میں کھو سا گیا تھا وہ ایک ٹک تجمل کی طرف دیکھتے ہوئے خاموشی

سے یہ سب کچھ سن رہا تھا تجمل کی دھیمی آواز اسے کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی
تھی۔

تجمل بات جاری رکھتے ہوئے بولا......... "سیٹھ رئیس کی کوئی اولاد نہیں ہے پہلی
بیوی سے نہ دوسری بیوی سے......... حالانکہ دوسری شادی اس نے دو ہی بڑی وجوہات
کے تحت کی تھی ایک تو اولاد کے لئے......... دوسرے رمنا کے بے پناہ حسن سے متاثر ہو
کر۔ سیٹھ رئیس کے مرنے کے بعد اس کی زیادہ تر دولت و جائداد کی وارث رمنا ہی ہو گی۔
تم خود سوچو کہ ان حالات میں رمنا کی پوزیشن کیا ہے؟ جو عورتیں اس پوزیشن میں ہوتی ہیں
انہیں ہر قدم پر' ہر موڑ پر اسکینڈل بننے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے اس لئے رمنا پھونک پھونک کر
قدم رکھتی ہے........."

"بے شک........." اختر خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ "لیکن خواہ وہ محاورتاً"
پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہو یا حقیقتاً' سچی بات یہ ہے کہ ہر صورت میں اس کا پھونک
پھونک کر قدم رکھنا نہ جانے کتنے دلوں پر قیامت ڈھاتا ہو گا"۔

"زیادہ خوابوں اور خیالوں میں کھونے کی ضرورت نہیں"۔ تجمل تنبیہہ کے سے انداز
میں بولا۔ "میں یہ بتانے لگا تھا کہ رمنا رئیس بھی دولت مندی سے پوری طرح لطف اندوز
ہونا چاہتی ہے۔ تمام تفریحات سے لطف اٹھانا چاہتی ہے' تمام آسائشوں سے مستفید ہونا چاہتی
ہے۔ کچھ معاملات میں کسی نہ کسی طرح من مانی کر لیتی ہے۔ کچھ معاملات میں چھپ چھپا
کر کام چل جاتا ہے اور کچھ میں مجبوریاں مکمل طور پر ہی آڑے آ جاتی ہیں۔ یہ ہیں وہ
باتیں جو میرے اور چند دوسرے لوگوں کے علم میں ہیں"۔

تجمل حسین خاموش ہو گیا اور ہاتھ ملنے کے بعد غور سے انہیں دیکھنے لگا جیسے لکیروں
کی تلاش کر رہا ہو۔

اختر نے ایک طویل سانس لی اور ترحم آمیز لہجے میں بولا۔ "بیچاری......... دولت
کی قیدی.........! کتنی حسرت رکھتے ہیں لوگ دولت مند ہونے کی' لیکن اکثر دولت مندوں
کی زندگی میں جھانکو تو خوف آنے لگتا ہے"۔

"تمہیں آتا ہو گا......... لوگوں کو نہیں آتا"۔ تجمل منہ بنا کر بولا۔

ویٹرس شہلا جو اس دوران غالباً" ڈسپلن کا خیال رکھتے ہوئے خاموش تھی' قریب آ کر
سرگوشی میں تجمل سے مخاطب ہوئی۔ "اگر تمہاری الف لیلیٰ ختم ہو گئی ہو تو ایک گلاس پانی پلا
دو"۔

تجمل حسین اس کی طرف دیکھ کر مربیانہ انداز میں مسکرایا۔ اس نے الیکٹرک واٹر کولر
سے پانی کا ایک گلاس بھر کر شہلا کے سامنے رکھ دیا۔ شہلا گلاس اٹھاتے ہوئے تجمل کی طرف
اشارہ کر کے اختر سے مخاطب ہوئی۔ "یہ جو اپنے تجمل میاں ہیں نا......... یہ اس ہوٹل کی

بلبل ہزار داستان ہیں۔ شہر کے ہر قابل ذکر فرد کی کہانی ان کے پاس ہے“۔

”کیوں نہ ہو“۔ تجمل ذرا فخر سے مسکرایا۔ ”عمر گزر گئی ہے اچھے ہوٹلوں میں نوکر کرتے ہوئے“۔

”باقی عمر بھی انشاء اللہ یونہی گزر جائے گی“۔ شہلا نے گھونٹ بھر کر ترکی بہ ترکی کہا

”شاید..........“ تجمل حسین ٹھنڈی سانس لے کر بولا اور ایک بار پھر اپنے ہاتھوا کی لکیروں میں جیسے کچھ تلاش کرنے لگا۔

پانی کا گلاس خالی کر کے شہلا نے اپنی گول مٹول سی کلائی پر بندھی چھوٹی سی گھڑی نظر ڈالی اور اختر سے مخاطب ہوئی۔ ”تم ابھی تک یہاں منہ لٹکائے کیوں بیٹھے ہو؟ تمہارا با روم جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ جاؤ.......... شاید آج کوئی قسمت کا مارا تمہاری ڈراؤنی آوا میں کوئی المیہ گیت سننا گوارا کر لے“۔

”لیکن پہلے دن تو تم نے میرا گیت سن کر کہا تھا۔ ”مسٹر اختر! آپ کی آواز میں جاد ہے۔ بڑی جلدی رائے بدل لی تم نے؟“ اختر اس کی طرف جھکتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔

”جلدی کہاں بدلی ہے رائے“۔ شہلا گویا برا مناتے ہوئے بولی۔ ”یہ پورے ایک پہلے کی بات ہے اس وقت میری عمر کم تھی تمہیں معلوم ہے کہ ایک ماہ میں انسان کو اچھ خاصی عقل آ جاتی ہے“۔

”اور ایک ماہ میں اچھا بھلا انسان پاگل بھی ہو جاتا ہے“۔ اختر نے ٹھنڈی سانس لے کر اٹھتے ہوئے کہا۔

کافی بار میں ان تینوں کے درمیان دبی دبی آواز میں روزانہ ہی اس طرح کی گپ شپ اور نوک جھونک چلتی تھی۔ شاید اسی لئے وہ بڑے اچھے موڈ میں بال روم میں پہنچا تھا۔ آج بھی موڈ تو اس کا اچھا ہی تھا لیکن وہ روز کی طرح اپنے ذہن کو ہلکا پھلکا محسوس نہیں کر ر تھا۔ گڈمڈ خیالوں کی جھیل میں بار بار ایک ہی چہرہ تیرنے لگتا تھا۔

وہی ماہتاب سا چہرہ.......... وہی آنکھوں میں نمی کی جھلملاہٹ.......... یاقوتی ہونٹوں پر وہی خفیف سا کھنچاؤ.......... وہی تمتماتے رخساروں سے پھوٹتی تپش ک احساس..........!

یہ سب کچھ جیسے اس کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا.......... لیکن پھر اس نے بہ صد کوشش یہ سارے نقوش اپنی لوح ذہن سے مٹا دیئے۔ اسے خود بھی احساس تھا کہ بلاوجہ خیال آرائی اس کے لئے موزوں نہیں تھی۔ خوابوں خیالوں میں کھو کر زیادہ دور نکلنا اس کے حق میں اچھا نہیں تھا۔ ساتھ ہی اسے اس بات پر حیرت بھی تھی کہ آخر یہ چہرہ اس کے محسوسات میں کیوں اس طرح کھب کر رہ گیا تھا؟

اس ہوٹل میں روزانہ ہی اسے ایک سے ایک بڑھ کر شعلہ بردوش پیکر، ایک سے

ایک بڑھ کر مقناطیسی چہرے اور ایک سے بڑھ کر ایک ساحر شخصیت نظر آتی تھی۔ پھر اس پختہ العمر عورت میں آخر ایسی کیا بات تھی؟

شاید اس کی تمکنت.......... شاید اس کی مسکراہٹ کی تہہ میں چھپی ہوئی یاسیت.......... شاید دلکشی کے پردے میں چھپی ہوئی اس کی محزونیت.......... شاید اس کی ہنستی آنکھوں کی گہرائی سے جھانکتا ہوا ملال.......... یا پھر شاید بے عیب مجسمے کی طرح تراشا ہوا اس کا وجود اختر کی ذات میں سوئے ہوئے کسی محروم و تشنہ کام انسان کو جگا گیا تھا۔

وہ بال روم میں آیا اور اسٹیج کے اس حصے میں بیٹھ گیا جو آرکسٹرا کے لئے مخصوص تھا۔ سازندے اپنے ساز درست کر رہے تھے اور ایک دوسرے سے سر ملانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اکا دکا جوڑے ہال میں موجود تھے اور شاید رقص کے لئے ایک دوسرے سے صلاح مشورے کر رہے تھے۔

باقاعدہ موسیقی شروع ہونے تک بال روم میں کئی جوڑے آ گئے اور رقص شروع ہو گیا کچھ دیر پہلے تک وہاں جو ویرانی پھیلی ہوئی تھی وہ ایک دلکش ہنگامے میں بدل گئی اختر کی نظریں تھرکتے جسموں پر جمی تھیں لیکن اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ آج پہلی بار وہ اتنے ہنگامہ خیز ماحول میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔

اتنا تنہا تنہا اس نے اپنے آپ کو اس وقت بھی محسوس نہیں کیا تھا جب اس کی ماں کا انتقال ہوا تھا اور نہ ہی اس وقت ایسے احساس تنہائی نے اس پر غلبہ پایا تھا جب اس کے باپ نے اسے عاق کیا تھا۔

دفعتہ“ اس کی روح میں سرشاری کی لہر دوڑ گئی اور اس کے احساس تنہائی کی برف تیزی سے پگھلنے لگی۔

وہی حشر ساماں.......... رمنا رئیس بال روم میں داخل ہو رہی تھی۔!!

اختر حسین پر جیسے سحر سا طاری ہو گیا۔ وہ ایک ٹک رمنا رئیس کی طرف دیکھے جا رہا تھا جس کی ہر جنبش قدم کے ساتھ گویا فرش اور در و دیوار ہلکورے لے رہے تھے۔ اختر اسے سرتاپا دیکھ رہا تھا اور اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی عورت اتنی خوبصورت بھی ہو سکتی ہے۔

سر سے پاؤں تک تو قدرت نے اسے جس حسن سے نوازا تھا وہ اپنی جگہ تھا لیکن اس کی چال، اس کی مسکراہٹ، اس کی حرکات و سکنات اور اس کے انداز تکلم میں بھی حسن تھا۔ کافی بار میں اختر ذرا دور سے اس کی دھیمی آواز بھی سن چکا تھا۔ کسی کو اتنی دھیمی آواز میں باتیں کرتے سن کر اس کی آواز کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا ذرا مشکل تھا۔ لیکن اختر حسین سر سنگیت کی دنیا کا آدمی تھا۔ آواز آشنا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ بیگم رمنا رئیس کی آواز بھی غضب کی تھی قدرت نے شاید اسے زندگی کی ہر خوبصورتی سے نوازا تھا۔ کسی

بھی پہلو سے کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔
سفید بالوں والا ایک شخص رمنا رئیس کے ساتھ تھا۔ وہ شخص ایک نفیس سوٹ
تھا اس کے بال سفید ضرور تھے لیکن جسم میں خم یا چہرے پر شکنیں نہیں تھیں۔ اس
رنگت سرخ و سپید اور آنکھوں میں جوانوں کی سی چمک تھی۔ رمنا کے شوہر کے بار
تو کافی بار کا کاؤنٹر کلرک اختر کو بتا چکا تھا کہ وہ معذور تھا۔ اس لئے سفید بالوں والا یہ
رمنا کا شوہر تو نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ غالباً رمنا کے شوہر کا کوئی دوست تھا۔
وہ جو کوئی بھی تھا اختر کو اس کی خوش بختی پر رشک آرہا تھا کہ وہ رمنا رئیس کے
بشانہ چلا آرہا تھا لیکن اسے شاید اپنی اس خوش بختی کا احساس تک نہیں تھا۔ وہ بہت
پروا نظر آرہا تھا۔ کسی بھی چیز کی طرف اس کی کچھ زیادہ توجہ نہیں تھی۔ حتیٰ کہ ر
طرف بھی نہیں اسے شاید صرف وقت کی پروا تھی وہ بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔
وہ ایک میز پر بیٹھتے بیٹھتے اٹھ کھڑا ہوا چند لمحے بعد وہ دونوں بھی رقص کرتے جو
میں شامل ہو چکے تھے۔ اختر کو اس شخص کی خوش نصیبی پر اور بھی زیادہ رشک آ
غنیمت تھا کہ وہ سازندوں میں سب سے پیچھے کھڑا تھا ورنہ شاید دوسرے سازندے ا
کر ضرور حیران ہوتے کہ آخر وہ اتنا سحرزدہ کیوں نظر آرہا تھا۔
رمنا کی آمد سے پہلے اختر حسین مشینی سے انداز میں گٹار بجا رہا تھا۔ اسے کئی
اور مغربی ساز بجانے آتے تھے لیکن اس کی ڈیوٹی عموماً صرف گٹار بجانے پر لگتی تھی۔
اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نوجوان تھا اور فیشن ایبل نظر آتا تھا۔ اس لئے اس کی شخصیت
کے ساتھ زیادہ میل کھاتی تھی۔
رقص کا پہلا راؤنڈ ختم ہوا تو رمنا اور اس کا ساتھی ایک میز پر جا بیٹھے اختر ا
سے بھی دیکھ سکتا تھا کہ رمنا کی ستواں ناک پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں شبنم کی طرح
اٹھی تھیں تاہم آنکھوں میں تیرتی ہوئی نمی کی دھندلاہٹ کچھ کم ہو چکی تھی اور اب
آنکھیں بھی اس کی مسکراہٹ کا کچھ کچھ ساتھ دینے لگی تھیں۔
انہوں نے اپنے لئے کولڈ ڈرنک منگوائی اور باتوں کے دوران دھیرے دھیرے
لینے لگے۔ اس دوران دوسرا راؤنڈ شروع ہو چکا تھا مگر وہ رقص کے لئے نہیں اٹھے۔
دفعتہً بیگم رمنا رئیس کی نظر اس بینر پر پڑی جس پر جلی حروف میں مہمانو
لئے فرمائشی نغمے سنانے کا اعلان تحریر تھا۔ اس میں اب یہ بھی لکھ دیا گیا تھا کہ گلو
حسین مہمانوں کی فرمائش پوری کریں گے۔
بینر کو پڑھتے ہوئے بیگم رمنا رئیس کی آنکھیں سکڑ گئیں اور کشادہ روشن
ہلکی سی شکنیں ابھر آئیں گویا وہ اس اعلان پر غور کر رہی ہو پھر اس نے اپنے ساتھی ک
جھکتے ہوئے مسکرا کر کچھ کہا۔ دونوں نے گویا باہم کچھ مشورہ کیا پھر رمنا نے اشارے ۔

لو بلایا۔
کچھ دیر بعد اختر کے پاس ایک چٹ پہنچی جس پر انگریزی میں لکھا تھا۔ "اگر تمہیں ہیر
آتی ہے تو سنا دو.......... بیگم رمنا رئیس"۔
ہیر گانے میں تو اختر حسین کو ملکہ حاصل تھا مگر آج تک شہر میں شاذ و نادر ہی اس
ے کسی نے ہیر سنانے کی فرمائش کی تھی۔ خاص طور پر اس فائیو اسٹار ہوٹل کے ماحول میں
اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی اس سے ہیر سنانے کی فرمائش بھی کر سکتا ہے۔
زیادہ تر اس سے دو چار مشہور انگریزی نغمے سنانے کی فرمائش کی جاتی تھی یا پھر ٹی وی
پر ہٹ ہونے والے نوجوان نسل کے گلوکاروں کے نغموں کی فرمائشیں آتی تھیں۔ یہ سب
قل کا کام تھا۔ اختر حسین بادل نخواستہ نقلیں اتارتا رہتا تھا کبھی اس سے کسی نے نہیں پوچھا
تھا کہ وہ کچھ اوریجنل بھی گا سکتا تھا یا نہیں؟
وہ کچھ اوریجنل گانا چاہتا تھا اپنی تیار کی ہوئی کچھ دھنوں پر نغمے اور غزلیں سنانا چاہتا تھا
لیکن کوئی اس قسم کی فرمائش ہی نہیں کرتا تھا ہر ایک فرمائش کرنے والے کے ذہن میں پہلے
ہی سے کوئی نہ کوئی نغمہ موجود ہوتا تھا۔
ہیر سنانا بھی کوئی ایسا خاص اوریجنل کام نہیں تھا وہ بھی ایک لوک چیز تھی لیکن آسان
نہیں تھی۔ ہر کوئی ہیر نہیں گا سکتا تھا۔ اختر حسین نے اس میں بڑی محنت کی تھی لیکن اس
کی یہ محنت گویا ضائع جا رہی تھی۔ آج تک اس نے محفلوں میں صرف ایک آدھ مرتبہ ہی
ہیر سنائی تھی۔
لیکن آج جیسے اس کی محنت وصول ہونے کا دن آگیا تھا۔ ہیر کی فرمائش کی گئی تھی
اور وہ بھی اس شخصیت کی طرف سے جس کے بارے میں اختر کو گمان تک نہیں تھا کہ وہ
ایسی کسی چیز میں دلچسپی لے سکتی تھی۔ اس تصور سے اختر کی رگ و پے میں سنسنی دوڑ گئی
کہ اب وہ بیگم رمنا رئیس کی نظر میں آئے گا۔
فرط مسرت سے اس کے اعصاب میں ایک عجیب سی تھرتھری پیدا ہو گئی۔ یہ اشتیاق کا
ریلا تھا۔ ملے جلے سے جذبات کا سیلاب تھا جو اسے بہائے لئے جا رہا تھا۔ وہ اس شخصیت
کے حضور آواز کا نذرانہ پیش کرنے جا رہا تھا جس کے حسن و تمکنت اور جلال آمیز
خوبصورتی نے اسے پہلی نظر میں ہی مبہوت کر دیا تھا۔
رقص کا دوسرا راؤنڈ ختم ہوا تو اختر مائیک سنبھالے اسٹیج پر آگے آیا اس نے رمنا کی
آنکھوں میں ہلکی سی شناسائی کی لہر ابھرتے دیکھی جیسے وہ بہ زبان خموشی کہہ رہی ہو۔
اچھا.......... تو تم وہی ہو جو کافی بار میں بیٹھے تھے؟ گویا اس کی نظر اتنی سطحی بھی نہیں تھی
جتنی بظاہر معلوم ہوتی تھی۔
اختر نے حتی الامکان ٹھہرے ٹھہرے اور پرسکون لہجے میں اعلان کیا۔ "ایک حسین اور

معزز مہمان نے ہیر سنانے کی فرمائش کی ہے جس پر مجھے خوشگوار حیرت محسوس ہو رہی ہے کیونکہ ہم لوگ اپنے لوک ورثے کے کچھ زیادہ قدر دان نہیں رہے۔ ہم ان خوبصورت خزانوں کو چھوڑ کر نہایت سستی اور سطحی چیزوں کے شیدائی ہوتے جا رہے ہیں۔ میں اپنے معزز مہمان کی فرمائش پوری کرتے ہوئے خوشی محسوس کر رہا ہوں"۔

رمنا دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ دور سے ایک ٹک اس کی طرف رکھ رہی تھی اس کی پلکیں بوجھل تھیں۔ آنکھوں میں نشیلا پن تھا۔

اختر کے اعلان کے ساتھ اسٹیج کی فاضل روشنیاں بجھ گئیں اور صرف اسپاٹ لائٹ کا دائرہ اختر پر رہ گیا یکدم ہی ماحول کچھ ایسا ہوگیا تھا جیسے کوئی اسٹیج شو پیش کیا جا رہا ہو۔ ہال کی روشنیاں بھی مدھم ہوگئیں۔

اختر نے ہیر شروع کی تو اس کی آواز کچھ بہتر نہیں تھی لیکن ایک آدھ منٹ میں ہی وہ سر میں آگیا اور پھر ایسا سماں بندھا کہ انگریزی دھنیں سننے والے اور ہیر نہ سمجھنے والے بھی سدھ بدھ بھول گئے اور ہال میں ایسا سکوت چھا گیا جیسے وہاں کوئی موجود ہی نہیں تھا۔ خفیف سی بھی کوئی ایسی آواز نہیں تھی جو موسیقی کے زیر و بم یا اختر کی آواز کے اتار چڑھاؤ میں خلل ڈالتی۔

ہیر گاتے وقت اختر حسین کو گویا اپنا ہوش نہیں رہتا تھا چند لمحے بعد اس پر وہی بے خودی سی طاری ہوگئی ہیر کے منتخب حصے سنانے کے بعد بتدریج اس کی آواز نیچی ہوتی گئی اور وہ خاموش ہوگیا اس کے ساتھ ہی جیسے چند لمحے کے لئے کائنات خاموش ہوگئی۔

اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں وہ جیسے فضائے بسیط میں لامحدود بلندیوں تک پرواز کر کے واپس زمین پر آیا تھا حاضرین اس کے سامنے دھندلی روشنی میں اپنی اپنی نشستوں پر بت بنے بیٹھے تھے۔ کئی سیکنڈ بعد بتیاں دوبارہ روشن ہوئیں تو انہیں تالیاں بجانے کا ہوش آیا پھر جب تالیاں بجنا شروع ہوئیں تو یوں محسوس ہونے لگا جیسے اب کبھی نہیں تھمیں گی۔

خاصی دیر بعد جا کر تالیوں کا شور تھما۔ زندگی میں کئی بار خاص خاص لوگوں کی محفل میں اختر کو داد ملی تھی لیکن ایسی گرم جوشی اختر نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی آج تو ویسے بھی بات ہی کچھ اور تھی۔

اختر کی آنکھیں نہ جانے کیوں نم سی ہوگئیں لیکن جس کے لئے اس نے گایا تھا وہ بت بنی بیٹھی تھی اس کی نظریں اسٹیج ہی کی طرف تھیں لیکن در حقیقت وہ نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی اور کس دنیا میں گم تھی۔

پھر روشنیاں مزید تیز ہوئیں اور تالیاں کا شور مدھم پڑا تو وہ چونکی مگر تالیاں اس نے تب بھی نہیں بجائیں بس اسٹیج پر کھڑے اختر کی طرف دیکھ کر مسکرا دی عجیب افسردگی میں

لپٹی ہوئی مسکراہٹ تھی اچانک وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اختر اس وقت سازندوں کی قطار میں کھڑا ہونے کے لئے واپس جانے ہی لگا تھا لیکن رمنا کو اٹھتے دیکھ کر رک گیا وہ اسی طرف آرہی تھی اختر کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

وہ کچھ اس انداز سے آرہی تھی جیسے کوئی ملکہ اپنے تخت کی طرف آرہی ہو لیکن اس پرحمکنت چال میں دلوں کی دھڑکنوں کو اتھل پتھل کر دینے کی طاقت بھی تھی۔

اسٹیج کے قریب آکر وہ رکی اور دھیمے لہجے میں بولی۔ "ایک مدت کے بعد کسی کی آواز میں اتنا سوز محسوس کیا ہے"۔

یہ کہہ کر اس نے پرس میں ہاتھ ڈالا کچھ نوٹ گنے اور اختر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "فن کی کوئی قیمت نہیں ہوتی یہ مجھے معلوم ہے لیکن یہ پانچ ہزار روپے کا نذرانہ محض میری ستائش کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے ایک سامع کی طرف سے محض حقیر سا تحفہ ہے قبول کر لو"۔

پانچ ہزار روپے فی الحال اختر کی مہینے بھر کی تنخواہ بھی نہیں تھی لیکن اس نے ان نوٹوں کی طرف دیکھا بھی نہیں وہ تو اس وقت ایک ٹک رمنا رئیس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا وہ ایک سرو قد عورت تھی لیکن اس وقت اسٹیج سے نیچے کھڑی تھی اس لئے اختر کو جھک کر اس کی طرف دیکھنا پڑ رہا تھا لیکن پھر بھی وہ خود کو ہی چھوٹا محسوس کر رہا تھا۔

مائیک کی وجہ سے رمنا رئیس کی مدھم سی آواز بھی حاضرین تک پہنچ گئی تھی اور انہوں نے سن لیا تھا کہ وہ اختر کو پانچ ہزار روپے کے انعام سے نوازنا چاہ رہی تھی۔ اختر کو اپنے کانوں کی لویں تپتی محسوس ہوئیں۔

اس نے تھوک نگلا اور پروقار سے انداز میں سیدھا ہوتے ہوئے دھیمے لہجے میں لیکن مائیک پر بولا۔ "معافی چاہتا ہوں خاتون! میں کبھی انعام کے طور پر نقد رقم نہیں لیتا۔ آپ کی پسندیدگی اور داد و تحسین میرے لئے سب سے بڑا انعام ہے"۔

"ٹھیک ہے.......... پہلے نہیں لیتے ہوگے لیکن آج لے لو کسی کا تحفہ قبول کرنے سے انکار نہیں کیا کرتے"۔ رمنا رئیس کے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں اصرار بھی تھا اور تحکم بھی، درخواست بھی تھی اور ضد بھی۔

شاید اسے توقع نہیں تھی کہ کوئی اس کے دست نوازش سے انعام لینے سے انکار بھی کر سکتا ہے۔ شاید اسے دھچکا سا لگا تھا۔ شاید وہ اچھا محسوس نہیں کر رہی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ سب کے سامنے اس سے رقم لینے کا تصور اختر حسین کو اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اسے اپنے کانوں کی لویں تپتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"اگر یہ تحفہ نقد رقم کی صورت میں نہ ہوتا تو میرے لئے ایک اعزاز ہوتا"۔ اختر حسین ملائمت اور عاجزی سے بولا "لیکن میں معذرت چاہتا ہوں.......... نقد رقم کا تحفہ

مجھے اچھا محسوس نہیں ہوتا میں آپ کا بہت ہی ممنون.......... بہت ہی شکر گزا
ہوں.......... یہ میری آواز کی خوش نصیبی ہے کہ اسے آپ جیسا مداح میس
آیا.......... لیکن پلیز اصرار نہ کیجئے وہ لوگ جو سچ مچ صرف آواز کے.......... فن کے
ستار ہوتے ہیں ان سے پیسے لینا مجھے اچھا نہیں لگتا کوئی اور چیز ہوتی تو میں ضرور اسے ا
لئے باعث فخر سمجھ کر لے لیتا۔

"کوئی اور چیز.........." رمنا رئیس نے خوابناک سے لہجے میں دہرایا پھر ا
پرس میں جھانک کر ایک لپ اسٹک نکالتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے بولی۔ کوئی اور چیز
میرے پاس یہ لپ اسٹک ہی ہے جو میں تمہاری خدمت میں پیش کر سکتی ہوں"۔

مائیک کے ذریعے حاضرین میں سے بیشتر تک یہ آواز پہنچ گئی اور انہوں نے قہقہہ ا
اختر کو اپنے رخسار کچھ اور تپتے محسوس ہوئے لیکن وہ بظاہر سنجیدگی سے بولا۔ "میرے لئے
بھی قابل قبول ہے۔ قابل ذکر بات یہ نہیں ہوتی کہ کیا دیا جا رہا ہے بلکہ دیکھا یہ جاتا ہے
کون دے رہا ہے اور کس جذبے کے تحت دے رہا ہے۔ آپ کا قدر دانی کا جذبہ میر
لئے سب سے زیادہ اہم ہے"۔

اس نے لپ اسٹک لے کر جیب میں رکھ لی بیگم رمنا رئیس وہیں کھڑی ایک لمحے
سے اس کی طرف دیکھتی رہی اب وہ حقیقتاً" سنجیدہ نظر آ رہی تھی اور ہال میں بھی خامو
چھا چکی تھی۔

معمول کے مطابق اب رقص کا تیسرا راؤنڈ شروع ہونا تھا اختر مغربی موسیقی د
والے سازندوں میں شامل ہونے کے لئے رمنا سے اجازت طلب کرنے ہی لگا تھا کہ وہ ا
اٹھا کر اسے روکتے ہوئے بولی۔ "کچھ غزل کی گائیکی میں بھی عمل دخل ہے"؟

اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ کیا جواب دے وہ قدرے انکساری سے مسکرا دیا عمل د
تو اسے ہر طرح کی گائیکی میں تھا اس کے سامنے تو سوال یہ ہوتا تھا کہ کون کیا سننا چاہتا
اور کون کس طرح کی موسیقی کا شعور رکھتا ہے۔

وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ "گا تو میں سبھی کچھ لیتا ہوں میڈم! اب یہ تو سننے والوں
ذوق پر منحصر ہے کہ وہ مجھ سے کیا سننا چاہتے ہیں"۔

"اچھا.......... ایسا کرو.......... کوئی مغموم غزل سنا دو"۔ رمنا رئیس کچھ سو
ہوئے بولی۔ اختر نے اب مائیک کا سوئچ آف کر دیا تھا تاکہ اس کی اور رمنا کی گفتگو دوسر
لوگ نہ سن سکیں۔

"مغموم غزل..........؟" اختر مسکرایا۔ "گویا آپ کو بھی اداس ہونا اچھا لگتا ہے
وہ ایک بار پھر اس کا سرتاپا جائزہ لے رہا تھا اس کے ڈائمنڈز کے زیورات اس کی بیش
ساڑھی اور اس کی چمکتی دمکتی شخصیت دور ہی سے دولتمندی کا پتہ دیتی تھی۔ دیکھنے وا

شاید اس پر رشک کرتے ہوں گے اور یقیناً" یہی سمجھتے ہوں گے کہ وہ خوشیوں میں کھیلتی
ہوگی اداسی اسے چھو کر بھی نہیں گزری ہوگی مگر وہ ایک اداس سی غزل کی فرمائش کر رہی
تھی۔

اختر کے سوال میں چھپی حیرانی کو محسوس کرتے ہوئے وہ بولی۔ "اس میں حیرانی کی کیا
بات ہے؟ اداس ہونے میں بھی ایک لذت پنہاں ہے۔ شاید خوشی سے بھی زیادہ ہمارے ہاں
تو ویسے بھی زیادہ تر لوگ اداس ہی رہتے ہیں کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے اداسی ہمارا
کلچر ہے۔ ہماری سوسائٹی میں سولہ سولہ سال کی لڑکیاں رسالوں میں سے درد بھرے اشعار جمع
کرتی ہیں اور دردناک افسانے پڑھ کر روتی دھوتی فلمیں اور ڈرامے دیکھ کر تنہائی میں گھنٹوں
آنسو بہاتی ہیں۔ اداسی ہمارے معاشرے کا مزاج ہے اگر ہم خود اداس نہیں ہوتے تو ہمارے
اردگرد کے لوگ ہمیں اداس کر دیتے ہیں کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

"جی نہیں.........." اختر نے نفی میں سرہلاتے ہوئے نہایت دھیمی آواز میں کہا
رمنا رئیس جس طرح کی عورت نظر آتی تھی اس سے اس قسم کی گفتگو کی توقع نہیں کی
جاسکتی تھی اب تک تو اختر کو زیادہ تر یہی تجربہ ہوا تھا کہ اس قسم کی عورتیں شاید بیوٹی
پارلرز' کپڑوں' زیورات وبئی اور ہانگ کانگ وغیرہ میں شاپنگ اور اپنی اپنی دولت مندی کے
بھونڈے اظہار کے علاوہ کوئی بات کر ہی نہیں سکتی تھیں لیکن یہ عورت یقیناً" مختلف تھی۔

وہ ایک بار پھر اسی مخمور سے انداز میں مسکرائی اور اک ادائے خاص سے بولی۔ "تو پھر
سناؤ کوئی مغموم غزل"۔

وہ واپس اپنی میز پر جا بیٹھی جہاں اس کا سفید بالوں والا ساتھی اس کے انتظار
میں.......... یا پھر کسی اور وجہ سے بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔

اختر نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور مائیک آن کرتے ہوئے بولا۔ "معزز خواتین و
حضرات! ہماری ایک معزز مہمان نے غزل کی فرمائش کی ہے اگر غزل آپ لوگوں کے ذوق
سماعت پر گراں گزرے تو معاف فرمائیے گا"۔

اس نے غزل کے ساتھ مغموم کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا اس کے لہجے میں جو خفیف
سا طنز پنہاں تھا معلوم نہیں اسے کوئی سمجھا تھا یا نہیں لیکن حاضرین نے پرجوش انداز میں
تالیاں بجا کر گویا اس بات کا اظہار کرنے کی کوشش کی کہ وہ اتنے بھی بد ذوق نہیں تھے وہ
بھی غزل سننے کا شوق اور ذوق رکھتے تھے۔

اختر نے قتیل شفائی کی ایک بھولی بسری سی غزل شروع کی۔

یہ اداس اداس ٹھنڈک جو اسیر ہے پون میں
کہیں بجلیاں نہ بھر دے کسی گوشہ چمن میں

اختر نے ایک مدت پہلے بڑی محنت سے اس کی طرز تیار کی تھی اور جس درد و سوز

کے ساتھ وہ اسے گا رہا تھا ہال میں واقعی ایک اداس اداس سی ٹھنڈک اتر آئی لوگ اپنی گپ شپ اپنے قہقہے اپنا ہنسی مذاق بھول گئے اور ہمہ تن گوش ہوگئے ہال میں اختر کی آواز کے زیر و بم اور سازوں کی سنگت کے سوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

اختر نے یہ شعر پڑھتے ہوئے بطور خاص رمنا رئیس کی طرف دیکھا۔

یہ عجیب فصل گل ہے کہ کسی بھی گل کی رنگت
نہ جچی مری نظر میں نہ رچی ترے بدن میں

رمنا رئیس ایک ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکائے مبہوت سی بیٹھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی اختر نے اس سے پہلے یہ غزل چند خاص خاص محفلوں میں ہی گائی تھی لیکن اب اسے یوں لگ رہا تھا کہ آج کی محفل سے زیادہ خاص محفل تو کبھی منعقد ہی نہیں ہوئی تھی بڑے ہی ٹھہراؤ کے ساتھ اس نے یہ شعر گایا۔

میں لئے لئے پھرا ہوں غم زندگی کا لاشہ
کبھی اپنی خلوتوں میں کبھی تیری انجمن میں

بیگم رمنا رئیس کا ساتھی کبھی رمنا کے چہرے کی طرف اور کبھی اختر کی طرف دیکھ رہا تھا اس کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں سی نمودار ہونا شروع ہو رہی تھیں۔ شاید اسے رمنا کی محویت گراں گزر رہی تھی کیونکہ رمنا کی توجہ اس کی طرف سے بالکل ہٹ گئی تھی اختر اس وقت اس شعر پر پہنچ چکا تھا۔

ترے غم میں بہہ گیا ہے مرا ایک ایک آنسو
نہیں اب کوئی ستارہ جو چمک سکے گگن میں

اس شعر پر تو رمنا رئیس ہی نہیں دیگر سامعین بھی گویا تڑپ اٹھے۔ واہ واہ کا شور بلند ہوا اور اختر کو وہ شعر دوبارہ پھر سہ بارہ پڑھنا پڑا۔

پھر وہ اس شعر پر پہنچا جو رسالوں اخباروں کے پسندیدہ اشعار والے کالموں میں اتنی مرتبہ شائع ہوا تھا کہ شاید ہر شخص نے ہی عمر کے کسی دور میں پڑھ رکھا تھا لیکن شاعر کا نام شاید بہت کم لوگوں کو معلوم تھا۔

مری مفلسی سے بچ کر کہیں دور جانے والے
یہ سکوں نہ مل سکے گا تجھے ریشمی کفن میں

اختر نے اس یقین کے ساتھ یہ شعر پڑھا تھا کہ شعر کبھی پرانا نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی تہہ میں چھپے ہوئے جذبے کبھی ماند پڑتے ہیں۔ اس کی آواز نے گویا اس شعر کو نیا پن دے دیا تھا۔ اس پر بھی اسے خوب داد ملی بالآخر وہ مقطع پر پہنچا۔

میں قتیل وہ مسافر ہوں جہان بے بسی کا
جسے شام ہوگئی ہو کسی اجنبی وطن میں

ادھر اس کی آواز سکوت میں مدغم ہوئی ادھر حاضرین نے تالیاں بجا بجا کر در و دیوار ہلا دیئے۔ اختر نے کئی بار جھک کر ان کا شکریہ ادا کیا پھر اس نے رمنا رئیس کی طرف دیکھا وہ اب بھی تالیاں نہیں بجا رہی تھی بس ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکائے اسی طرح مبہوت بیٹھی تھی۔

اختر کو پیچھے جا کر آرکسٹرا میں شامل ہونا پڑا رقص کے تیسرے راؤنڈ کے لئے موسیقی شروع کرنا تھی چند لمحے بعد ہال میں مغربی موسیقی شروع ہوئی تو ماحول گویا یکسر ہی بدل گیا بہت سے جوڑے رقص کرنے لگے۔ طویل و عریض ہال میں جو چھوٹی چھوٹی میزیں موجود تھیں وہ دیواروں کے ساتھ لگی ہوئی تھیں انہی میں سے ایک میز پر رمنا رئیس بیٹھی تھی۔ ہال چونکہ رقص کرنے والوں سے بھر گیا تھا اس لئے رمنا' اختر کی نظر سے اوجھل ہو گئی تھی۔ وہ رقص کرنے والے جوڑوں کے درمیان نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ غالباً" رقص کے لئے نہیں اٹھی تھی۔

اس راؤنڈ کے اختتام پر اختر کو ایک اور چٹ ملی اس پر لکھا تھا۔ "فارغ ہو جاؤ تو کچھ دیر کے لئے ہماری میز پر آجانا کچھ دیر گپ شپ رہے گی" "رمنا"

اختر نے وہ چٹ مٹھی میں بھینچ لی۔ اس کے ہر مسام جاں میں گویا ٹھنڈک سی اتر آئی۔ اس نے جب کافی بار میں رمنا رئیس کو دیکھا تھا تو اسے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ آج ہی اس سے متعارف بھی ہو جائے گا اس کے پاس بھی جا بیٹھے گا اس سے باتیں بھی کرے گا اسے تو وہ آسمان کی بلندیوں پر جھلملاتا ہوا ایک ایسا خوبصورت ستارہ دکھائی دی تھی جسے وہ صرف دیکھ ہی سکتا تھا اس کے قریب جانے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔

رقص کا چوتھا دور ختم ہوا تو اختر فارغ ہوگیا وہ اپنے دل میں مچلتے اشتیاق کو چھپائے متانت کا لبادہ اوڑھے بیگم رمنا رئیس کی میز پر پہنچا تو وہ بدستور ایک حسین مجسمے کی طرح ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکائے ساکت بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے کا چاند اس کے ہاتھ پر تھا اور آنکھوں کی جھیلیں پرسکون تھیں۔

اختر کو سامنے پاکر گویا ان جھیلوں میں ہلکا سا تلاطم پیدا ہوا۔ اختر نے مودبانہ انداز میں سلام کیا اس نے سر کی خفیف سی جنبش اور بولتی آنکھوں سے اس کے سلام کا جواب دیا پھر اسے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا جس پر کچھ دیر پہلے تک اس کا ساتھی بیٹھا تھا۔ اب وہ تنہا نظر آ رہی تھی۔

اختر نے بیٹھنے سے قبل محتاط سے انداز میں ادھر ادھر دیکھا گویا اسے اندیشہ ہو کہ اس کے وہاں بیٹھنے کو رمنا کا ساتھی اس کی گستاخی نہ سمجھ لے اور برا نہ منا جائے دھیمے لہجے میں اس نے پوچھ ہی لیا۔ "آپ کے ساتھی غالباً" کہیں چلے گئے ہیں"؟

"ہاں" وہ خوابناک سے انداز میں مسکرائی۔ "اس کے پاس تفریح کے لئے صرف ایک گھنٹہ تھا بہت بڑا بزنس مین ہے.......... اور تمہیں شاید علم ہو کہ کاروباری لوگوں کے پاس

ہر کام کے لئے نپا تلا وقت ہوتا ہے ساڑھے گیارہ والی فلائٹ سے اسے امریکہ جانا
یہیں سے ائرپورٹ روانہ ہوگیا ہے"۔

"اوہ........." اختر نے صرف اتنا کہا اور مخملیں گدے والی کرسی پر یوں بیٹھ گ
ذرا سی بے احتیاطی سے کرسی کی ٹانگیں ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو۔

"میرا نام رمنا رئیس ہے"۔ اس نے اپنا تعارف کرایا۔

"مجھے معلوم ہے......... آپ کی چٹیں ملنے سے پہلے ہی معلوم ہوچکا تھا۔" اختر
ارادی طور پر کہہ گیا۔"

رمنا نے ذرا چونک کر اپنی خوبصورت بھنویں اچکاتے ہوئے سوالیہ سے انداز میں
کی طرف دیکھا تو وہ گویا وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "معروف اور حسین لوگوں کو غائبانہ
پر جان لینا کچھ مشکل نہیں ہوتا"۔

"اس ان ڈائریکٹ تعریف کا شکریہ"۔ افسردگی میں لپٹی ہوئی اس کی مسکراہٹ
گہری ہوگئی اختر کے سامنے کافی بار میں اس نے کافی کی آڑ میں رم کے جو دو گلاس پئے
معلوم نہیں وہ خالص رم کے تھے یا ان میں کوئی سوڈا وغیرہ ملا ہوا تھا۔ بہرحال رمنا کے
سے ذرا بھی خمار کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ صرف آنکھوں کے گوشوں میں کچھ گلابی ڈور
چھلک رہے تھے۔ وہ بھی خمار کی نہیں تھکن کی پیداوار معلوم ہوتے تھے۔

"میرا نام تو آپ کو معلوم ہو ہی چکا ہوگا۔" اختر نے ہچکچاہٹ آمیز سے لہجے میر
پھر اسٹیج کی طرف اشارہ کیا۔ "بینر پر بھی لکھا ہوا ہے"۔

ہال میں اب اکادکا جوڑا ہی رہ گیا تھا موسیقی محض رسمی طور پر دھیمی دھیمی بج
تھی اختر کو احساس تھا کہ کئی آنکھیں ان کی طرف متوجہ تھیں جن میں اس کے سا
سازندوں کی آنکھیں بھی شامل تھیں۔

"نام نہ بھی معلوم ہوتا تب بھی میں جاننے کی کوشش نہ کرتی۔" وہ کھنک دار
میں بولی اس کھنک سے اختر کے دل میں گدگدی سی ہونے لگی وہ بات جاری رکھتے ہو
بولی "ناموں میں کیا رکھا ہے انسان کو اس کا کام زندہ رکھتا ہے۔ وہ شعر شاید تم نے سن
ہو۔

ہم روح سفر ہیں ہمیں ناموں سے نہ پہچان
کل اور کسی نام سے آجائیں گے ہم لوگ

"جنہیں موت کے بعد بھی زندہ رہنا ہوتا ہے وہ نام کے محتاج نہیں ہوتے ان
کوئی کمال ہوتا ہے مجھے خوشی ہے کہ تمہارے پاس واقعی فن ہے تم محض لال ہری نیلی
بے ہنگم شرٹ پینٹ پہن کر اور اچھل کود کر گلوکار بننے کی کوشش نہیں کر رہے"۔

"ہمت افزائی کا بہت شکریہ"۔ اختر نے حقیقی ممنونیت سے کہا "مجھے نہیں معلوم

کہ آپ کے طبقے میں بھی شعر و موسیقی کا ذوق رکھنے والے اور فضا شناس لوگ موجود ہوتے
ہیں"۔

"ہر طبقے میں ہر طرح کے لوگ موجود ہوتے ہیں کسی بھی طبقے کے بارے میں کوئی
حتمی رائے قائم نہیں کرنی چاہئے"۔ رمنا بولی۔

"درست ہے"۔ اختر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"خیر......... چھوڑو ان باتوں کو۔" رمنا نے اپنا مرمریں ہاتھ بے پروائی سے ہلایا۔ "
یہ بتاؤ کہ اتنا کرب' اتنا دکھ' اتنا سوز کہاں سے سمیٹ لیا تم نے اپنی آواز میں"؟

"زمانے ہی کا دیا ہوا تحفہ ہے"۔ اختر نے ان سمندر جیسی آنکھوں میں جھانکا مگر ان
میں ایسا غضب کا ٹھہراؤ تھا کہ اسے نظر چراتے ہی بن پڑی۔

"یہ کم عمری اور ایسا روگی لہجہ......... اس لہجے کی تہہ میں کوئی کہانی بول رہی
ہے"۔ رمنا نے دوسری ہتھیلی بھی ٹھوڑی تلے ٹکالی۔ "ہوسکے تو کل مجھے وہ کہانی سنانا۔ آج
تو تمہاری پرسوز آواز میں ہیر اور پھر قتیل کی غزل سننے کے بعد مجھ میں مزید کوئی دردناک
بات سننے کا قطعاً حوصلہ نہیں"۔

"کہانی کچھ ایسی دردناک بھی نہیں......... اور نہ ہی اتنی طویل ہے"۔ اختر نے
ہونٹوں پر حتی الامکان زندہ ولانہ مسکراہٹ سجائے رکھنے کی کوشش کی اور نہایت اختصار سے
دو تین منٹ میں اپنی داستان حیات سنا ڈالی۔

بات ختم کرتے ہوئے وہ بولا۔ "یہ کوئی ایسی دردناک کہانی تو نہیں عام سی کہانی ہے
دنیا میں بہت سے لوگوں کے ساتھ ایسا ہوتا رہتا ہے"۔

"ہاں......... دنیا میں تو لوگوں کے ساتھ نہ جانے کیا کچھ ہوتا رہتا ہے لیکن یہ سوز
یہ درد ہر ایک کی آواز میں نہیں آتا تمہیں شاید یہ خاص طور پر ودیعت ہوا ہے"۔ رمنا
بولی۔

"شاید"۔ اختر کا لہجہ مبہم سا تھا۔

اختر اپنی داستان حیات پر مزید کسی تبصرے کا منتظر تھا کہ رمنا نے اچانک گویا مدہوشی
سے چونک کر گھڑی دیکھی اور قطعی غیر متوقع طور پر اٹھتے ہوئے بولی۔ "اب میں چلتی ہوں
ورنہ میرے معذور اور بیمار شوہر کو شک کا سانپ ڈسنے لگے گا"۔

"میں آپ کو باہر تک چھوڑنے چلتا ہوں"۔ اختر ذرا ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے بولا۔

"نہیں......... نہیں......... اس کی ضرورت نہیں........." رمنا نے ہاتھ کے
اشارے سے اسے منع کیا پھر وہ یکدم ہی وہاں سے چلی گئی اور گویا ماحول کا تمام رنگ تمام
خوشبو تمام خوبصورتی ساتھ لے گئی۔

اختر نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے اپنے آپ کو بے حد ہونق محسوس کیا اس نے

کھسیاہٹ آمیز انداز میں ادھر ادھر دیکھا پھر بال روم سے نکل کر کافی بار میں واپس آگ
اب کافی گاہک نظر آ رہے تھے۔ کاؤنٹر کلرک تجمل حسین اور ویٹرس شہلا دونوں ہ
مصروف نظر آ رہے تھے۔

اختر ایک کولڈ ڈرنک لے کر ایک کونے میں جا بیٹھا اور دھیرے دھیرے چسکیاں
لگا اس کا ذہن اب بھی رمنا رئیس کے تصور میں پھنسا ہوا تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا ک
اس نے اتنا اچھا گایا تھا اور رمنا جیسی عورت نے اس کی آواز کو اتنا سراہا تھا۔

آدھی رات ہونے کو آئی تو بیشتر گاہک رخصت ہوگئے شہلا فارغ ہوئی تو وہ اخ
قریب ہی اسٹول پر آ بیٹھی۔ اختر نے محسوس کیا کہ اس کا موڈ بے حد خراب تھا۔

"کیا بات ہے؟ یہ پھولا ہوا منہ مزید کیوں پھولا ہوا ہے؟ کام زیادہ کرنا پڑ گیا ہے"
اختر نے اسے چھیڑا۔

"مسئلہ کام کا نہیں"۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "کام تو ہم عورتیں تم م
سے زیادہ کر سکتی ہیں لیکن عورت کے ساتھ ہر جگہ ہی ناانصافی ہوتی ہے خاص طور پر
ویٹرس کی تو جیسے کوئی عزت ہی نہیں"۔ اس کے چہرے پر تمتماہٹ تھی۔

"آخر ہوا کیا"؟ اختر نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

"تم خود ہی دیکھو.......... ہم لوگوں کی شفٹ رات کو دو بجے ختم ہوتی ہے
اور دوسرے ملازموں کو.......... جن میں زیادہ تر مرد ہی ہوتے ہیں ہوٹل کی گاڑی
چھوڑنے جاتی ہے اور مجھے لڑکی ہونے کے باوجود رکشے میں جانا پڑتا ہے۔ تمہیں کچھ ا
ہے کہ رات کے دو بجے ایک اکیلی لڑکی کو رکشے میں یہاں سے نیو کراچی جانے میں ک
مسائل پیش آ سکتے ہیں؟"

اختر ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا اسے وہاں کام کرتے کافی دن ہو چلے تھے
اسے نہیں معلوم تھا کہ شہلا رات کے دو بجے شہر کے اس مرکزی علاقے سے رکشے میر
کراچی جاتی تھی۔

شہلا بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "پرسنل منیجر کا کہنا ہے کہ میرے گھر کی طرف
راستے میں چونکہ کوئی اور ملازم نہیں رہتا اس لئے مجھ اکیلی کو چھوڑنے کے لئے ہوٹل
وین نہیں جا سکتی۔ چنانچہ مجھے صرف ٹرانسپورٹ الاؤنس دے دیا جاتا ہے ٹرانسپورٹ
دی جا سکتی۔ میں ٹرانسپورٹ الاؤنس اس کے منہ پر مارنے کے لئے تیار ہوں مجھے الاؤ
نہیں ٹرانسپورٹ چاہئے لیکن کوئی میری سنتا ہی نہیں"۔

"یہ تو واقعی بڑی افسوس ناک صورت حال ہے"۔ اختر دھیمے لہجے میں بولا۔

"پرسنل منیجر جان بوجھ کر مجھے تنگ کر رہا ہے اس کی وجہ تم آسانی سے سمجھ سکتے
وہ مجھ سے خوش نہیں ہے.......... اور اسے خوش رکھنا میرے بس کی بات بھی نہیں

لگتا ہے یہ نوکری بھی مجھ سے زیادہ دن نہیں نبھے گی۔ پرسنل منیجر کی صورت مجھے مکروہ لگنے
لگی ہے۔ نفرت ہوتی جا رہی ہے مجھے اس سے.......... اس نے شاید مجھے کچھ اور طرح کی
لڑکی سمجھ کر رکھا تھا میں اس کی توقعات پر پوری نہیں اتری"۔

"تو تمہارا جھگڑا ہوگیا اس سے"؟ اختر نے پوچھا۔

"ہاں.......... آج حالانکہ میں نے بڑی عاجزی سے اسے اپنا مسئلہ سمجھانے کی
کوشش کی تھی لیکن وہ حسب عادت فرعون بنا رہا"۔ شہلا برہمی سے بولی۔ "ایک تو اپنی قوم
میں یہ بھی بڑی مکروہ عادت ہے کہ ذرا سا کسی کو اختیار مل جائے وہ فوراً" دم پر کھڑا ہو جاتا
ہے۔ یکدم فرعون بن جاتا ہے سمجھ لیتا ہے کہ اگر اس نے ذرا بھی انکساری یا خوش خلقی
دکھائی تو اس کی توہین ہو جائے گی۔ شاید اس سے کچھ چھن جائے گا"۔

اختر خاموشی اور قدرے افسردگی سے اس کی طرف دیکھتا رہا وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا
لیکن اس کے ذہن میں خیالات کا ایک ہجوم تھا اس کی سوچیں گڈمڈ تھیں وہ کچھ بھی نہ کر
سکا۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد شہلا کی برہمی کچھ کم ہوئی تو وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ "
شروع میں چند دن تو مجھ سے بڑی حماقت ہوئی"۔

"کیا"؟ اختر نے ذرا چونکتے ہوئے پوچھا۔

"میں رات کو ڈیوٹی دے کر نکلتی تھی تو ہوٹل کے سامنے سے ہی تھوڑے بہت
انتظار کے بعد جو رکشا ملتا تھا اس میں بیٹھ کر چل دیتی تھی رکشے میں بیٹھتے ہی عموماً" رکشے والا
مجھ سے بے ہودہ انداز میں گفتگو شروع کر دیتا تھا۔ تم میری سادگی دیکھو کہ مجھ الو کی دم کو
شروع شروع میں سمجھ ہی نہیں آئی کہ چکر کیا ہے پھر مجھے پتا چلا کہ میں ہوٹل کے سامنے
سے بیٹھتی تھی اور رات کو اس وقت اتنی دور جاتی تھی تو رکشے والا فوراً" ہی مجھے کوئی ایسی
ویسی لڑکی سمجھ لیتا تھا مجھے تقریباً" ہر رکشا ڈرائیور کے سامنے وضاحت کرنا پڑتی کہ میں اس
ہوٹل میں کام کرتی ہوں اور میری ڈیوٹی شام سے رات گئے تک کی ہے اس کے باوجود اس
کا رویہ عجیب سا ہی رہتا"۔

"ظاہر سی بات ہے" اختر نے سر ہلایا۔

"اس کے بعد میں نے دو کام کئے ایک تو میں نے یونیفارم میں ہی جانا شروع کر دیا
حالانکہ بے چاری ایک ویٹرس کی یونیفارم کی کیا وقعت ہے لیکن یونہی بس ذرا ایک امپریشن
سا رہتا ہے۔ شکر ہے میرے پاس ہوٹل کی ملازمت کا کارڈ بھی موجود رہتا ہے دوسرا کام میں
نے یہ کیا کہ ایک ذرا بوڑھے اور شریف سے رکشے والے کو دیکھ کر اس سے بات کر لی کہ
اگر اسے ٹائم سوٹ کرتا ہو تو وہ روزانہ ہی رات کو مجھے یہاں سے لے لیا کرے وہ مان گیا
تب کچھ سکون ہوا"۔

"چلو........ شکر ہے تمہارا مسئلہ حل ہوگیا"۔ اختر نے گہری سانس لی۔

"حل کہاں ہوا ہے"۔ شہلا تیزی سے بولی۔ "ابھی تو میں نے تمہیں اپنے پچیس فیصد مسائل بھی نہیں بتائے صرف رکشے والے ہی لفنگوں کی طرح پیش نہیں آتے تھے راستے میں پولیس والے بھی روک لیتے تھے۔ ایک چوراہے پر ان سے جان چھوٹتی تو کسی اور جگہ پر اچانک وہ کسی اندھیرے گوشے سے یوں نکل کر سامنے آتے جیسے کسی بہت بڑے مجرم کو پکڑنے کے لئے کمانڈو ایکشن کر رہے ہوں۔ رات کے دو ڈھائی بجے رکشے میں اکیلی لڑکی کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آجاتی یوں سمجھو کہ تقریباً" ہر رات تھانے جاتے جاتے بچتی ہوں۔ ہوٹل میں آنے والے دو ایک معزز گاہکوں کے حوالے کام آجاتے ہیں ورنہ اب تک دو چار مرتبہ تو تھانے کی ہوا کھا ہی چکی ہوتی اور اس کے بعد تم سمجھ ہی سکتے ہو کہ میرا کیا حشر ہوتا۔ ہوٹل والوں سے تو مجھے کسی مدد کی توقع نہیں تھی"۔

اختر ایک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا شہلا بالوں کی ایک لٹ پیشانی سے ہٹاتے ہوئے بولی۔ "ابھی میری داستان غریب حمزہ ختم نہیں ہوئی۔ گزشتہ رات ایک موٹر سائیکل پر لدے ہوئے تین لڑکے میرے پیچھے لگ گئے۔ بے چارہ رکشے والا بوڑھا تھا لیکن اللہ اسے اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے........ اس نے جوانوں سے زیادہ ہمت دکھائی اور مجھے ان ڈاکو اور وحشت گرد قسم کے نوجوانوں سے بچا کر نکال کر لے گیا وہ پولیس والے اور موبائلیں جو روزانہ راستے میں کئی جگہ نظر آتی تھیں اس دوران کہیں نظر نہیں آئیں جب وہ خبیث صورت لڑکے موٹر سائیکل لہرا لہرا کر میرا تعاقب کر رہے تھے اور رکشا روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

پھر اچانک ہی شہلا نے پوچھا۔ "یہ ہر وقت گشت پر نظر آنے والی پولیس عام طور پر ایسے موقعوں پر کہاں غائب ہو جاتی ہے؟"

اختر بے بسی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا بلکہ شاید کسی کے پاس بھی نہیں تھا اس نے تو یونیورسٹی کے زمانے میں ایسے بھی مناظر دیکھے تھے کہ لڑکوں کا ایک گروہ مل کر ایک تنہا اور نہتے لڑکے کو چھریوں، سریوں اور ڈنڈوں سے مسلسل وار کر کے چلتی سڑک پر قتل کر رہا تھا اور پولیس کی گاڑیاں چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھیں مگر کوئی اس لڑکے کو بچانے نہیں آیا۔

مرنے والا مر چکا ہوتا یا اغوا ہو چکا ہوتا تو اس کے بعد الٹی سیدھی کارروائی شروع ہوتی تھی وہ بھی محض خانہ پری کے لئے۔

اس نے بارہا یہ مناظر دیکھے تھے۔ وہ شہلا کے سوال کا کیا جواب دیتا؟

اختر چند لمحے یونہی خاموشی سے شہلا کی طرف دیکھتا رہا۔ بات بظاہر کتنی معمولی تھی۔ ایک لڑکی کو رات گئے اپنی ڈیوٹی ختم کر کے گھر جانا ہوتا تھا لیکن عملی طور پر یہ مسئلہ کتنا سنگین

تھا۔ یہ صرف شہلا ہی کا حوصلہ تھا جو اس مسئلے کا سامنا کر رہی تھی اور آج پہلی بار اس کا ذکر زبان پر لائی تھی۔

شہلا قدرے افسردگی سے بولی۔ "اب تم ہی بتاؤ........ ان حالات میں' میں کس طرح نوکری جاری رکھ سکتی ہوں؟ ظاہر ہے مجھے یہ نوکری بھی چھوڑنی پڑے گی۔ صرف پرسنل منیجر کی بدنیتی کی وجہ سے۔ حالانکہ وہ چاہے تو میرا مسئلہ حل کر سکتا ہے لیکن وہ جان بوجھ کر حل نہیں کر رہا"۔

پھر اس نے چھت کی طرف دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "معلوم نہیں کب مجھے کوئی ایسی نوکری ملے گی جس میں کوئی مجھے بلیک میل کرنے والا نہیں ہوگا........ تنخواہ اچھی ہوگی........ بے وقت کی ڈیوٹی اور ٹرانسپورٹ کا مسئلہ نہیں ہوگا........ اور جس میں میری تھوڑی بہت عزت بھی ہوگی!؟"

اختر نے آج تک شہلا کو ایسی افسردگی سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک انتہائی زندہ دل اور ہنس مکھ لڑکی تھی۔ بدترین حالات میں بھی ہنستی بولتی رہتی تھی اور اپنے نجی مسائل کو کبھی زیر بحث نہیں لاتی تھی۔

پچھلے ہی منگل کی بات تھی اختر نے اسے اس عالم میں ڈیوٹی دیتے دیکھا تھا کہ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور اسے میزوں کے درمیان چلتے پھرتے دیکھ کر نہ جانے کیوں اختر کو کئی بار شبہ سا ہوا کہ وہ لڑکھڑا کر گر نہ پڑے۔ آخر کار کافی بار کچھ دیر کے لئے گاہکوں سے خالی ہوا تو وہ مضمحل سے انداز میں کاؤنٹر پر آ بیٹھی اور تعجل سے پانی کا گلاس لے کر دو گولیاں کھانے لگی۔

"تمہاری طبیعت آج ٹھیک نہیں ہے۔ کیا ہوا؟" اختر نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ معمولی سی حرارت ہے"۔ وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"کتنی حرارت ہے؟ تم نے تھرمامیٹر سے ٹمپریچر لیا تھا؟" اختر نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔ لیا تھا۔ ایک سو تین بخار ہے"۔ اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"ایک سو تین بخار ہے اور تم اسے معمولی حرارت کہہ رہی ہو؟ دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟ اوپر سے تم ڈیوٹی پر آ گئی ہو جہاں زیادہ تر کھڑے رہنا اور چلنا پھرنا پڑتا ہے۔ ایک آدھ دن آرام نہیں کر سکتی تھیں؟" اختر تیزی سے بولا۔

"نہیں"۔ وہ گولیاں پانی سے نگلنے کے بعد بولی۔ "میں کسی کو شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی"۔

"اس میں شکایت کی کیا بات ہے؟ بیماری کی حالت میں چھٹی تمہارا حق ہے"۔ اختر

پرزور لہجے میں بولا۔

اختر عمر میں شاید اس سے دو چار سال ہی چھوٹا تھا لیکن اس نے کچھ اس طرح مربیا
اور بزرگانہ انداز میں اختر کی طرف دیکھا گویا وہ ایک عمر رسیدہ عورت ہو اور اختر چھوٹا
بچہ۔

"اس سوسائٹی میں کس کا کیا حق ہے اور کسے کس حد تک اس کا حق مل ر
ہے.......... اگر یہ مسائل حل ہوگئے ہوتے تو کیا معاشرے کی یہ حالت ہوتی جو اس وقت
ہے؟" وہ ترحم آمیز سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"دیکھو.......... مجھے معلوم ہے کہ تم کم پڑھی لکھی ہونے کے باوجود بہت عقلم
بہت باشعور ہو لیکن یہ موقع اس قسم کی بحث کا نہیں"۔ اختر ملائمت سے بولا۔ "یہ بتاؤ
ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں یا نہیں؟"

"ڈاکٹر کے پاس..........؟" شہلا نے استہزائیہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ
"فوری طور پر ڈاکٹر کے پاس کون جاتا ہے؟ پہلے اپنا علاج سب خود کرنے کی کوشش کر
ہیں۔ جب مسئلہ بہت سنگین ہو جاتا ہے تب بادل نخواستہ ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں"۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔ بخار معمولی چیز نہیں ہے بعض اوقات بگڑ جاتا ہے
تمہیں ڈاکٹر کے پاس جانا چاہئے تھا"۔ اختر نے اصرار کیا۔

"مجھے معلوم ہے بخار میں کون سی دوائیں استعمال ہوتی ہیں۔ میڈیکل اسٹور سے
کر استعمال کر رہی ہوں۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایک آدھ دن میں ٹھ
ہو جاؤں گی"۔ وہ بظاہر بے پروائی سے بولی مگر اس کے لہجے میں اضمحلال تھا۔

"لیکن یہ غلط طریقہ ہے"۔ اختر بولا۔

"میرے منے..........! میرے چندا..........! تم معلوم نہیں کون سی دنیا میں ر
ہو"۔ شہلا ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "ہاں زیادہ تر لوگ اسی طرح کرتے ہیں۔ تمہ
معلوم ہے ہمارے ملک میں نوے فیصد لوگ حقیقت میں ڈاکٹر کے پاس جانا افورڈ ہی نہ
کرسکتے اور اگر وہ جاتے ہیں تو درحقیقت اپنا پیٹ کاٹ کر علاج کے اخراجات پورے کر
ہیں۔ ورنہ زیادہ تر لوگوں کی کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ لوٹ پوٹ کر خود ہی ٹھیک ہو جا
یا سستے قسم کے طریقوں سے کام چلا لیں"۔

"اچھا بابا..........!" اختر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "تم جیسے بقراطوں سے تو
فضول ہے۔ مجھے معلوم ہے تم مانو گی تو نہیں لیکن میں اپنا اخلاقی فرض ادا کرنا چاہتا ہوں۔
تم چاہو تو میں تمہیں اسی وقت ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں"۔

"تمہارا بہت بہت شکریہ۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرو
نہیں ہے"۔ وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

دو دن تک وہ اسی طرح گولیاں اور کیپسول پھانکتی رہی اور ڈیوٹی دیتی رہی۔ بالآخر
ٹھیک ہو ہی گئی لیکن اس کا سرخ و سپید چہرہ کئی دن تک زرد زرد سا رہا۔

اس روز اختر نے اگر اس سے نہ پوچھا ہوتا تو شاید وہ ذکر بھی نہ کرتی کہ وہ بخار میں
پھنک رہی تھی۔ اس قسم کی لڑکی تھی وہ۔ اپنے ذاتی مسائل اور نجی تکلیفوں کا ذکر کبھی زبان
پر نہ لانے والی۔ وہ ہر وقت ہنستی مسکراتی نظر آتی تھی لیکن اس کے انداز میں پھکڑ پن نہیں
ہوتا تھا۔ اس کی حس مزاح بہت عمدہ تھی۔ اکثر باتوں میں وہ بڑی خوبصورتی سے مزاح کا پہلو
نکال لیتی تھی۔ تیز بخار کے دوران بھی اس کی وہ دلکش مسکراہٹ معدوم نہیں ہوئی تھی
جس کی وجہ سے اس کا چہرہ نوعمر لڑکیوں جیسا دکھائی دیتا تھا۔

ٹرانسپورٹ کا مسئلہ بھی وہ یقیناً کئی ماہ سے بھگت رہی تھی لیکن آج پہلی بار اس کا ذکر
زبان پر لائی تھی۔

اختر حسین خیالات کی دنیا سے باہر آتے ہوئے بولا۔ "محض اس مسئلے کی وجہ سے
تمہیں نوکری نہیں چھوڑنی چاہیے۔ تمہیں جنرل منیجر سے بات کرنی چاہیے"۔

"ایک ویٹرس کی بات کون سنتا ہے؟ یہ جو دفتری گرگے ہوتے ہیں نا.......... یہ ہر
چیز کا پکا بندوبست کرنے کے بعد ہی کسی کو تنگ کرتے ہیں۔ میں جنرل منیجر سے بات کروں گا
تو پرسنل منیجر ایک منٹ میں ثابت کر دے گا کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے اور
اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ہمارے ہاں اوپر سے نیچے تک یہی تو ہو رہا ہے۔ دفتری گورکھ
دھندوں کے ذریعے آپ جس کام کو چاہیں صحیح ثابت کر دیں چاہے وہ غلط ہو اور جس کام کو
چاہیں غلط ثابت کر دیں، چاہے وہ صحیح ہو اور نوکریوں میں تو رولز اینڈ ریگولیشنز چلتے ہیں نا"۔

پھر وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "اس کے علاوہ ایک بات اور ہے۔ ہوٹل میں
اچھے اچھے عہدوں پر جتنے بھی لوگ ہیں وہ سیٹھ صاحبان کے اپنے عزیز رشتے دار یا ذات
برادری کے لوگ ہیں۔ اس طرح میری بات کی وقعت اور کم ہو جاتی ہے"۔

"اچھا.......... میں جنرل منیجر سے یا گیسٹ ریلیشنز منیجر مس نگہت افروز سے بات
کروں گا"۔ اختر بولا۔

"بس.......... بس رہنے دو۔ زیادہ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں"۔ شہلا ہاتھ
اٹھاتے ہوئے بولی۔ "تم اپنی نوکری نہ ہاتھ سے گنوا دینا۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔ مجھے
معلوم ہے تم صاف دلی اور نیک نیتی سے میری وکالت کرنے جاؤ گے لیکن ایک لڑکا ایک
لڑکی کی حمایت میں بولے تو ہماری سوسائٹی میں اس کا کچھ اور مطلب لیا جاتا ہے۔ میں نہیں
چاہتی کہ ہوٹل کے ملازموں میں کسی کے اشارے پر کوئی اسکینڈل مشہور کر دیا جائے"۔

"اوہ..........!" اختر کو گویا جھٹکا سا لگا اور وہ خیالات کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگا۔
ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ "لیکن میرا مشورہ بہرحال یہی ہے کہ تم نوکری

چھوڑنے کے بجائے اپنا مسئلہ حل کرنے کی کوشش جاری رکھو۔ جب تک تمہارا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا' میں تمہیں چھوڑ آیا کروں گا اور اسی رکشے میں واپس آجایا کروں گا۔ میں تو ہوٹل کے قریب ہی رہتا ہوں"۔

شہلا زیادہ دیر سنجیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اپنے سنگین ترین مسائل پر بھی ہنستے رہنے کی اس کی عادت عود کر آئی اور وہ اپنی مسکراہٹ سے ماحول کے بوجھل پن کو کم کرتے ہوئے بولی۔ "اور اگر راستے میں گشتی پولیس نے ہمیں روک کر ہم پر آوارہ گردی یا فحش حرکات کی دفعہ عائد کر دی تو..........؟"

"تم کہہ دینا کہ ہم میاں بیوی ہیں"۔ اختر بھی مسکراتے ہوئے بولا۔

"اس میں دو قباحتیں ہیں"۔ شہلا اپنے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولی۔ "پہلی بات تو یہ کہ......... سنا ہے پولیس والے اس دعوے کے جواب میں مونچھوں پر تاؤ دے کر کہتے ہیں۔ "ہاں بچو! پہلے سب یہی کہتے ہیں لیکن تھانے پہنچ کر سچ بولنے لگتے ہیں۔ مجھے خطرہ ہے کہ ہم سے بھی یہ کہا جائے گا"۔

"ہم ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں گے اور اپنے بیان پر قائم رہیں گے"۔ اختر پرعزم لہجے میں بولا۔

"ثابت قدمی تو وہ ہم دونوں کی ایک منٹ میں نکال دیں گے"۔ شہلا بولی۔ "بہرحال...... اس کے علاوہ بھی دوسری قباحت یہ ہے کہ تمہارے منہ سے میاں بیوی والا دعویٰ اور بھی ناموزوں لگے گا۔ تم تو صورت سے ہی شادی شدہ نہیں لگتے۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی چھڑے ملنگ ہو۔ ابھی تمہاری شکل پر شادی شدہ لوگوں والی مسکینی پیدا نہیں ہوئی"۔

"تمہارے خیال میں شادی شدہ لوگوں کی شکلوں پر مسکینی ہوتی ہے؟" اختر نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ زیادہ تر شادی شدہ لوگوں کے چہروں پر ایک خاص قسم کی مسکینی ہوتی ہے"۔ شہلا وثوق سے بولی۔

"بھئی تم بہت تجربہ کار معلوم ہوتی ہو"۔ اختر نے سرہلایا۔

"دس سال ہوگئے ہیں گھر سے باہر دھکے کھاتے ہوئے"۔ وہ پرخیال انداز میں کاؤنٹر کو گھورتے ہوئے مسکرائی۔ "اور نوکری بھی ہمیشہ ایسی ملی ہے جس میں مردوں کا بھی پتا پانی ہو جائے"۔

پھر یکدم ہی جیسے اس کی ذات میں چھپا ہوا درد ابھر آیا اور اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ وہ سچ مچ سنجیدہ ہوگئی۔

اس نے سرسراتی سی آواز میں سرگوشی کی۔ "میں تمہیں دوست اور ہمدرد سمجھتے

ہوئے ایک راز کی بات بتاؤں اختر؟"

اختر نے ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "ہاں......... ہاں......... بتاؤ"۔ وہ حیران تھا کہ شہلا کی سنجیدگی یکدم اداکاری سے حقیقت میں کیوں ڈھل گئی تھی۔

"میں تمہیں اس لئے بھی اپنے ساتھ اپنے گھر نہیں لے جاسکتی کہ میں اپنی ماں کی آنکھوں میں خوف اور دہشت کے سائے نمودار ہوتے نہیں دیکھ سکتی"۔

"خوف اور دہشت کے سائے؟" اختر نے حیرت سے دہرایا۔ پھر وہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "کیا میری صورت بہت ڈراؤنی ہے؟"

"نہیں' نہیں......... تم تو اچھے خاصے ہینڈسم لڑکے ہو۔ ماڈلنگ بھی کرسکتے ہو"۔ شہلا تیزی سے بولی۔ "اور تمہاری سب سے بڑی خوبصورتی یہ ہے کہ تمہارے چہرے پر ایک عجیب سی معصومیت موجود ہے جو آج کل کے نوجوانوں کے تو کیا' بچوں کے چہروں پر بھی دیکھنے کو نہیں ملتی۔ نوجوان تو بالکل ہی شکلوں سے درندے لگتے ہیں یا عمروعیار"۔

"تعریف کا بہت بہت شکریہ۔ تم چاہو تو آج رات کا کھانا یہاں میری طرف سے کھا سکتی ہو۔ میرے حساب میں لکھوا دینا"۔ اختر شاہانہ لہجے میں بولا۔ وہ ماحول کا بوجھل پن کم کرنے کے لئے گفتگو میں دوبارہ شگفتگی لانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن شہلا کی سنجیدگی میں فرق نہ آیا۔

وہ بدستور نیچی آواز میں بولی۔ "جو بات میں کہنا چاہتی ہوں وہ شاید تم سمجھ نہ پاؤ لیکن میں سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں.........."

اس نے مضطربانہ سے انداز میں تھوک نگلا پھر سامنے رکھے گلاس میں سے ایک گھونٹ بھر کر بولی۔ "جب بھی کسی اتفاق کے تحت کسی بھی شخص کو میرے گھر تک جانا پڑتا ہے' میری ماں دہشت زدہ اور گم صم سی ہو جاتی ہے۔ میں اس کے محسوسات سمجھتی ہوں.........." وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوگئی۔

"لیکن میں کچھ نہیں سمجھا"۔ اختر بولا۔

"امی کو اندیشہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب میری اس شخص سے رسم و راہ بڑھے گی۔ وہ گھر میں آنا جانا شروع کرے گا۔ بالآخر ایک روز وہ خود یا اس کے گھر والے میرے لئے رشتے کا پیغام لے کر آجائیں گے اور میں ہاں کر دوں گی"۔

"تو اس میں دہشت زدہ ہونے کی کیا بات ہے؟" اختر نے پہلے سے زیادہ حیرت سے کہا۔ "سب والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ بیٹی کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں"۔

"لیکن جب بیٹی خود بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو تو پھر صورت حال مختلف ہو جاتی ہے۔ اسے صورت میں وہ ذمہ داری نہیں رہتی' ضرورت بن جاتی ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرو اختر! ہم کرائے کے مکان میں رہتے ہیں۔ میرے پانچ چھوٹے بھائی بہن

ہیں۔ بھائی تو خاصے چھوٹے ہیں۔ گھریلو ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹانے کے قابل نہیں ہوئے۔ بہنیں بھی کمسن اور معصوم ہی ہیں۔ سب اردو میڈیم اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں۔ ایک میں ہی ہوں جس پر گھر کا دارومدار ہے اور جو اس دنیا کے جنگل میں بے خوف وخطر نکل سکتی ہے"۔

اختر ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ نظر چراتے ہوئے بولی۔ "ذرا سوچو اختر! اگر میں شادی کرکے میاں کے گھر سدھار جاؤں تو میرے گھر کا کیا بنے گا؟ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ میرے والد اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میرے بعد گھر کی کفالت کون کرے گا؟ بھوک تنگدستی اور ناداری بہت خوفناک چیز ہے اختر! میں اپنی ماں کے خوف کو بجا سمجھتی ہوں"۔ وہ اختر کی طرف دیکھ کر ایک بار پھر مجروح سے انداز میں مسکرائی اور سر جھکا لیا۔

مسئلہ بہت نازک' الجھا ہوا اور درد آمیز تھا۔ اختر اس پر اظہار خیال کے لئے محتاط الفاظ تلاش کرنا چاہتا تھا۔ ابھی وہ اس کوشش میں مصروف ہی تھا کہ کافی بار میں کچھ گاہک آ گئے اور شہلا ان سے آرڈر لینے کے لئے مستعدی سے ان کی میز پر جا پہنچی۔

اختر کا دل بوجھل ہوچکا تھا۔ زندگی کی حقیقتیں بہت تلخ تھیں وہ جوں جوں راہ حیات پر قدم بڑھا رہا تھا۔ ایک سے ایک بدصورت اور خوفناک حقیقت سامنے آ رہی تھی۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ بچپن اور لڑکپن کیسا سنہرا دور تھا جب وہ ماں باپ کی پناہ میں تھا۔ اس کا ذہن محدود تھا۔ اسے دنیا اور اس کے مسائل کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ جوں جوں عملی زندگی کے دروازے ایک ایک کر کے وا ہو رہے تھے' محسوسات پر ایک سے ایک بڑھ کر خوفناک تلخی حملہ آور ہو رہی تھی۔

اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ آگہی اپنی جگہ واقعی ایک بڑا عذاب تھی۔ اس کے لئے ایک بڑی مصیبت یہ تھی کہ اس کے سینے میں ایک حساس دل تھا۔ اس کے لئے ہر طرح کی آگہی ایک آزمائش تھی۔ اسے کچھ کچھ اندیشہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اس دنیا میں زندہ رہنے کے لئے حساس دل خاصا ناموزوں تھا۔ حساس لوگ اس سوسائٹی میں مس فٹ تھے۔ یہاں تو وہی سکھ چین سے زندہ رہ سکتے تھے جو لاشوں پر بھنگڑے ڈالتے تھے۔ گھروں کو آگ لگا کر نعرے لگاتے تھے۔ قتل و غارت کی خبریں چٹخارے لے کر بیان کرتے تھے۔

ایک حساس شخص جس کا دل ہر ایک کی تکلیف پر تڑپتا تھا' کڑھتا تھا' دکھتا تھا وہ بھلا اس سوسائٹی میں کیونکر زندہ رہ سکتا تھا جہاں قدم قدم پر ایک دکھ منہ کھولے کھڑا تھا۔ جہاں ہر چہرے کے پیچھے ایک دکھیا سی کہانی پوشیدہ تھی۔ جہاں ہر قہقہے کی کھنک کے پیچھے آنسوؤں کی چمک تھی۔ جہاں ہر سینہ فگار تھا اور ہر دل زخمی۔ کس کس کے زخم پر مرہم رکھے اور کس کس کی دلجوئی کیجئے؟ کسے اپنا سینہ کھول کر دکھایئے؟"

اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ہر وقت ہنستی' مسکراتی اور قہقہے لگاتی شہلا اپنے

[...]ن میں اتنے دکھ' اپنے ذہن میں اتنی گمبھیر سوچیں سمیٹے بیٹھی ہوگی۔ اسے یہ تو معلوم تھا [...] وہ ایک کٹھن زندگی گزار رہی ہے' مقابلہ کر رہی ہے لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کے [مس]تقبل میں تو کوئی سہانا خواب بھی نہیں۔ وہ تو اپنے دروازۂ دل پر کسی حسین امید کو دستک [...] نہیں دینے دیتی تھی لیکن پھر بھی وہ کتنی بلند حوصلہ لڑکی تھی۔ ہر وقت ہنستی رہتی تھی۔ [...]ر نے محسوس کیا تھا کہ جو لوگ زیادہ قہقہے لگاتے رہتے تھے وہ عام طور پر زیادہ دکھی ہوتے [...]ے۔

اپنی بوجھل سوچوں میں الجھا وہ ہوٹل کی عمارت سے نکل کر کمپاؤنڈ کے اس حصے میں [...] بیٹھا جہاں خوبصورتی اور آرائش کی غرض سے ایک فوارہ بنا ہوا تھا۔ فضا میں اچھلتا ہوا اس [...]ا پانی روشنیوں کی مدد سے ست رنگا نظر آتا تھا اور یہ رنگ گردش کرتے رہتے تھے۔

دنیا بھی اس کے خیال میں اس فوارے ہی کی طرح تھی۔ ہر پل اس کے رنگ اور [ر]نگوں کے زاویے بھی بدلتے رہتے تھے لیکن کوئی بھی رنگ اصلی نہیں تھا۔ محض روشنیوں [کی] پیداوار تھا۔ نظر کا دھوکا تھا۔

کسی بھی رنگ کو ثبات حاصل نہیں تھا۔ کبھی خوشی کا رنگ......... تو کبھی دکھ کا رنگ۔ ایک پل میں ہنسی کا رنگ تو دوسرے پل میں آنسوؤں اور یاسیت کا رنگ۔ ایک پل [م]یں خوشیوں اور دوسرے پل میں اداسیوں کا رنگ۔

چند لمحے پہلے تک رمنا رئیس سے تعارف حاصل ہونے کی خوشی سے اس کے دل [م]یں گدگدی سی ہو رہی تھی تو اس کے کچھ ہی دیر بعد شہلا کی باتوں نے اسے اداس کر دیا تھا۔

پھر اس نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ یہ دونوں ہی جذبے اس کے لئے بے معنی اور بے سود تھے۔ بیگم رمنا رئیس سے اگر اسے تعارف حاصل ہوگیا تھا تو اس میں خوشی سے اچھلنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ اس کے تصور کی رسائی سے بھی اونچی عورت تھی اور شادی شدہ تھی۔

آج تو اس نے اختر کو اپنی میز پر بلا لیا تھا۔ کل شاید اسے یاد بھی نہیں رہے گا کہ اختر حسین تھا کون۔ اس کہانی کا کوئی انجام نہیں مل سکتا تھا اس لئے اس پے مسرور ہونا محض شیخ چلی کے نقش قدم پر چلنے والی بات تھی۔

باقی رہا شہلا کا سوال۔ تو اس کے لئے بھی وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے خود ہی اس امکان کو مسترد کر دیا تھا اور اختر کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی نجی زندگی کی حدود سے نکال باہر کر دیا تھا۔ گویا اس کے پاس نہ تو خوش ہونے کی کوئی معقول وجہ موجود تھی اور نہ ہی اداس ہونے کی۔ کیسی خالی خالی' بے وجہ اور بے جواز سی زندگی تھی!

ایک اور عجیب بات تھی کہ اداسی کسی نہ کسی روپ میں' کسی نہ کسی انداز میں ہر

انسان کی زندگی میں موجود تھی۔ بیگم رمنا رئیس جو حسن و دلکشی کا ایک بے مثال نمونہ تھی، ہیروں کے زیور پہنتی تھی، کروڑوں میں کھیلتی تھی وہ بھی اداس تھی۔ شہلا جو سات افراد کے کنبے کی واحد کفیل تھی، ایک سو تین بخار میں بھی ویٹرس کے طور پر ڈیوٹی دیتی تھی، جس کی زندگی میں امید کی کرن نہیں تھی، جو شاید خود کو دھوکا دینے کے لئے ہر وقت ہنستی رہتی تھی، وہ بھی اندر سے اداس تھی۔

تو پھر خوشی کہاں تھی؟ یہی سوچتا ہوا اختر اس رات گھر چلا گیا اور یہی سوچتا ہوا سو گیا۔

دوسری رات اس کی زندگی میں خوشی اور مسرت کا پل پھر بھاری ہو گیا۔ وہ اس طرح کہ بیگم رمنا رئیس ایک بار پھر ہوٹل آئی تھی۔ اختر نے ایک بار پھر اسے کافی بار میں بلیک کافی کی آڑ میں رم کے دو مگ ختم کرتے دیکھا۔ اختر نے اپنی زندگی میں یہ پہلی عورت دیکھی تھی جو شاید خالص رم پیتی تھی اور وہ بھی اچھی خاصی مقدار میں۔

اختر نے بہت اونچے طبقے کی اکا دکا عورتوں کو دیکھا تھا کہ بہت ہی اڑتی تھیں تو تھوڑی بہت بیئر پی لیتی تھیں۔ ایک آدھ عورت کو اس نے وہسکی بھی پیتے دیکھا تھا مگر اتنی مقدار میں نہیں جتنی مقدار میں رمنا رئیس پیتی تھی۔

اس رات رمنا نے اسے پھر اپنی میز پر بلالیا اور گفتگو کا آغاز ایک بار پھر اسی جملے سے کیا۔ "اس عمر میں اتنا درد کہاں سے سمیٹ لیا تم نے اپنی آواز میں؟"

اس کے لہجے میں آج بھی خمار کا بوجھل پن تھا اور دوبارہ ایک ہی سوال سے گفتگو کا آغاز کرتے وقت اس کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی اختر سے مل چکی تھی لیکن اختر نے جب وہی جواب دیا جو وہ گزشتہ رات دے چکا تھا تو رمنا معترضانہ سے انداز میں انگلی اٹھاتے ہوئے بولی۔ "یہ جواب تو تم کل بھی دے چکے ہو۔ آج تمہیں کوئی نیا جواب سوچنا چاہیے تھا۔ سوال بے شک پرانا ہو لیکن جواب انسان کو نیا دینا چاہیے"۔

پھر وہ نہ جانے کیا سوچ کر کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس کے رخساروں پر شفق کی سرخی چھلک آئی۔ "شاید تم سمجھ رہے ہو کہ میری یادداشت کمزور ہے۔ مجھے یاد نہیں رہا ہو گا کہ کل تم نے کیا کہا تھا۔ بلکہ شاید یہی یاد نہیں رہا ہو گا کہ میں کل سے تم ملی تھی۔ یہی سوچ رہے تھے نا تم؟"

اختر ذرا کھسیانے سے انداز میں مسکرا دیا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ وہ عورت اس کے خیالات پڑھ سکتی تھی۔ غیر ارادی سے انداز میں وہ کہنا چاہتا تھا کہ نشے میں انسان کی یادداشت کسی حد تک تو متاثر ہوتی ہے لیکن بروقت اس نے یہ الفاظ ہونٹوں میں دبا لئے۔ اسے خیال آگیا تھا کہ رمنا رئیس اپنی مے نوشی کے طریقہ کار کو ایک راز سمجھتی تھی۔ اس خوش فہمی کا طلسم ٹوٹ جانے پر اس کا ردعمل نہ جانے کیا ہوتا؟

اختر کو ویسے بھی کسی کی نجی زندگی میں دخل دینا اچھا نہیں لگتا تھا۔ جبکہ رمنا رئیس

سے تو ویسے بھی یہ اس کی صرف دوسری ملاقات تھی۔ وہ خاموش رہا اور اس کے حسن پرشکوہ کے جلوے نگاہوں میں سمونے کی کوشش کرنے لگا۔ آج رمنا سیاہ ساڑھی میں تھی۔ گویا ایک چاند تھا جو تاریکی کے پردوں میں مقید تھا مگر چاندنی تھی کہ کہیں نہ کہیں سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

آج اس نے بال روم میں موجودگی کے دوران رقص وغیرہ کے اختتام پر اختر کو فرمائش بھیجی تھی کہ وہ کوئی پاکستانی فلمی گانا سنائے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی لکھا تھا۔ "فرمائش بے شک چیپ معلوم ہوتی ہے لیکن گانا چیپ نہیں ہونا چاہیے"۔

اختر نے ایک لمحے سوچا پھر یہ نغمہ شروع کیا۔

تم ضد تو کر رہے ہو ہم کیا تمہیں سنائیں
نغمے جو کھو گئے ہیں ان کو کہاں سے لائیں

اختر نے محسوس کیا تھا کہ نغمے کے دوران رمنا نے ٹشو پیپر سے آنکھیں پونچھیں تھیں یا پھر شاید اختر کو وہم ہوا تھا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ وہ اپنی ہی آواز کے مدوجزر میں گم تھا۔ اب جبکہ وہ رمنا کی میز پر بیٹھا تھا تو رمنا اس گانے پر تبصرہ کرتے ہوئے بولی۔ "میں یہ نغمہ ایک نجی محفل میں خود مہدی حسن صاحب سے بھی سن چکی ہوں اور مہدی حسن صاحب یقیناً تم سے بہتر گلوکار ہیں لیکن آج میری جو کیفیت ہوئی ہے وہ اس روز نہیں ہوئی تھی جب میں نے مہدی حسن صاحب سے سنا تھا۔ شاید وقت وقت کی بات ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی کیفیات اور محسوسات سب تبدیل ہوتے رہتے ہیں"۔

"اس میں تو کوئی شک نہیں"۔ اختر نے تائید کی۔

"بعض اوقات کوئی بات، کوئی نغمہ، کوئی غزل، کوئی گیت سرسری سے انداز میں سماعتوں سے گزر جاتا ہے اور کبھی وہی چیز انسان پر رقت پیدا کر دیتی ہے اور اس کے دل میں سوز و گداز پیدا کر دیتی ہے"۔

"ہاں.........." رمنا رئیس نے سر ہلایا۔ "شاید یہی وجہ ہے کہ لڑکپن اور نوعمری میں جو گیت اچھے لگتے ہیں وہ میری عمر میں آ کر بیگانہ محسوس ہونے لگتے ہیں اور اپنی کشش کھو بیٹھتے ہیں اور جو گیت بچپن یا لڑکپن میں اچھے نہیں لگتے، سمجھ میں نہیں آتے، ذرا پکی عمر میں آ کر ان میں ایسی دلکشی اور معنویت پیدا ہو جاتی ہے کہ دل تڑپ اٹھتا ہے"۔

"آپ نے یقیناً موسیقی پر خاصی توجہ دی ہے"۔ اختر نے خیال ظاہر کیا۔

"میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتی کہ موسیقی کو بہت سمجھتی ہوں لیکن کسی زمانے میں میرے پاس کلاسیکل، سیمی کلاسیکل، غزلوں اور عام فلمی گانوں تک کا بہت بڑا ذخیرہ تھا لیکن پھر رفتہ رفتہ ہر چیز سے دلچسپی کم ہوتے ہوتے تقریباً ختم ہی ہو گئی۔ لیکن کل تمہیں گاتے سنا تو گویا دلچسپی ایک نئے سرے سے ابھر آئی ہے۔ کچھ نہ کچھ سننے کا شوق جیسے ایک بار پھر

انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا ہے"۔

"یہ شاید میری خوش قسمتی ہے"۔ اختر مسکراتے ہوئے بولا۔

ایک لمحے کے توقف سے رمنا بولی۔ "کچھ نغمے ہوتے ہیں جو ہمیشہ ہر عمر میں ہی دل کو اپیل کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض بڑے سادہ' عام فہم اور فلمی ہوتے ہیں۔ ہم اپنے جھوٹے سوشل اسٹیٹس کی وجہ سے بعض اوقات انہیں ناک بھوں چڑھا کر سنتے ہیں لیکن کبھی کبھی اپنی اداس سی تنہائیوں میں اپنے مصنوعی خول سے باہر آ کر خلوص دل سے سنتے ہیں تو ہماری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور بظاہر سیدھے سادے' سطحی اور معمولی سے الفاظ ہمارے گنجلک دکھوں کے ترجمان بن جاتے ہیں"۔

اختر حسین دم بخود اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ زیادہ تر انگریزی دھنوں پر تھرکنے والی ایک سرمایہ دار عورت اردو نغموں اور گیتوں کے بارے میں اتنی گہرائی سے اظہار خیال کر سکتی ہے۔

رمنا نے اسے گم صم دیکھا تو مسکراتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے مجھے اب نغموں اور گیتوں کے موضوع پر اپنی تقریر بند کر دینی چاہیے اور سناؤ.......... کیا حال چال ہے؟"

"بس.......... ٹھیک ہوں۔ گزر رہی ہے زندگی"۔ اختر بولا۔

"تمہارے لہجے میں کوئی خاص گرمجوشی یا خوشی نہیں ہے.........." وہ جیسے کچھ پوچھتے پوچھتے رک گئی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے شاید اپنا سوال بدل دیا۔ اصل سوال اس کے دل میں ہی کہیں رہ گیا اور اس کے بجائے اس نے پوچھا۔ "تمہیں کبھی ریڈیو ٹی وی یا فلم میں گانے کا چانس نہیں ملا؟ اتنی خوبصورت آوز ہے تمہاری"۔

"کبھی صحیح طور پر کوشش نہیں کی"۔ اختر آہستگی سے بولا۔ "کسی سے واقفیت ہی نہیں نکلی.......... اور یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ واقفیت کے بغیر استقبالیہ سے آگے نکلنا بھی محال ہے"۔

رمنا دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اختر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ویسے بھی شاید میں اس قسم کے لوگوں میں سے ہوں جو اپنے فن پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں اور گھر بیٹھے سوچتے رہتے ہیں کہ شاید ان کا فن خود بخود کسی کو ان کے دروازے تک کھینچ لائے گا۔ اس قسم کے لوگ عام طور پر گھر ہی بیٹھے' انتظار کرتے کرتے بوڑھے ہو کر فوت ہو جاتے ہیں"۔

رمنا نے ہلکا سا مترنم قہقہہ لگایا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ اختر کی باتوں سے محظوظ ہو رہی تھی۔ اگر باتوں سے نہیں' تو شاید وہ اس کی سادگی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اختر سنجیدگی سے بولا۔ "ریڈیو' ٹی وی' فلم

اسٹیج.......... ہر جگہ ایک ہجوم ہے۔ ہر تیسرے فرد کو یقین ہے کہ وہ فنکار ہے۔ ہر جگہ ہجوم کی صورت میں لوگ بیٹھے گڑگڑا رہے ہیں کہ انہیں چانس دیا جائے۔ ایک محفل میں' میں نے ایک ٹی وی پروڈیوسر کو کہتے سنا کہ ٹی وی پر بعض ایسے بھی لوگ آتے ہیں جو کسی ڈرامے میں محض دو لائنوں کا رول لینے کے لئے اسلام آباد سے کسی مرکزی وزیر کی سفارش لے کر پہنچے ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ سن کر اور اس قسم کی صورت حال دیکھ کر میں اور شرمندہ ہو جاتا ہوں۔ کچھ اور پیچھے ہٹ جاتا ہوں۔ اپنے خول میں سکڑ کر سمٹ جاتا ہوں۔ بنیادی طور پر میں ایک شرمیلا سا آدمی ہوں۔ میں سب کے سامنے بیٹھ کر تو کیا' تنہائی میں بھی کسی کے سامنے گڑگڑا نہیں سکتا۔ بھیک نہیں مانگ سکتا"۔

"شرمیلا نہیں.......... خوددار کہو"۔ رمنا رئیس بدستور مسکراتے ہوئے بولی۔

"شاید دونوں ہی باتیں ہیں"۔ اختر متذبذب لہجے میں بولا۔ "کچھ شرمیلا پن بھی ہے۔ کچھ خودداری بھی ہے۔ ظاہر ہے مجھ جیسے لوگوں کے حصے میں کچھ نہیں آتا۔ جو تھوڑی بہت شہرت وغیرہ ملنی ہوتی ہے وہ انہی لوگوں کو ملتی ہے جو اس ریٹ ریس میں حصہ لیتے ہیں۔ گرتے پڑتے بھاگتے رہتے ہیں۔ میں ذرا عافیت پسند بھی ہوں۔ اب تو ویسے ہی یہاں محدود ہو کر بیٹھ گیا ہوں"۔ اس نے گرد و پیش کی طرف اشارہ کیا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ "گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے"۔

"مقصد یہ کہ تم نے ذرا بھی کوشش نہیں کی؟" رمنا کو جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"بس دو سال پہلے ریڈیو کے لئے آڈیشن دیا تھا۔ وہ بھی ایک جاننے والا موسیقار زبردستی لے گیا تھا۔ ریڈیو والوں نے کہا کہ نتیجہ آپ کو بذریعہ ڈاک بھیج دیا جائے گا۔ آج تک تو موصول نہیں ہوا۔ میں نے بھی پلٹ کر معلوم نہیں کیا"۔ اختر نے بتایا۔

"بہت ہی بے نیاز قسم کی چیز معلوم ہوتے ہو"۔ بیگم رمنا رئیس گویا اس کی طرف دیکھتے ہوئے اب بھی محظوظ ہو رہی تھی۔ دفعتہ" اس نے قدرے آگے جھک کر سرسری سے لہجے میں پوچھا۔ "کیا خیال ہے.......... اگر اگلے ہفتے ٹی وی سے تمہارا نغمہ نشر ہو تو کیسا رہے؟"

اختر ایک لمحے کے لئے تو کچھ بھی نہ بول سکا۔ پھر دھیرے سے ہنس کر بولا۔ "کیوں مذاق کرتی ہیں آپ!"

"ابھی ہماری شناسائی اتنی پرانی نہیں ہوئی کہ میں تم سے مذاق کرنے لگوں"۔ وہ گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے..........؟" اختر الجھن زدہ سے لہجے میں بولا۔ "سفارش خواہ کتنی بھی اونچی ہو لیکن ٹی وی والوں کی سچ مچ کچھ ٹیکنیکل مجبوریاں تو ہوتی ہیں۔ ان کے پروگرام کافی پہلے سے شیڈیولڈ ہوتے ہیں.......... طے شدہ ہوتے ہیں' بلکہ بعض اوقات تو

کسی پروگرام کی بہت سی ایڈوانس ریکارڈنگز بھی موجود ہوتی ہیں۔ وہ اچانک تو مجھے بیچ میں نہیں گھسیٹ سکتے"۔

"یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے۔ تمہیں ان لمبے چوڑے چکروں میں نہیں پڑنا چاہیے۔ زیادہ ٹیکنیکل باریکیاں میں خود بھی نہیں جانتی لیکن اتنا ضرور ہوتا ہے کہ بہت سے پروگراموں کا آئیڈیا اور پائلٹ تو منظور شدہ ہوتا ہے لیکن ایڈوانس ریکارڈنگز موجود نہیں ہوتیں.......... اور اگر ہوں بھی' تو ان میں تھوڑا بہت رد و بدل کرکے ایک آدھ شخصیت کو ایڈ جسٹ کرنا کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہوتا"۔

"ہاں.......... اس حد تک تو ممکن ہے"۔ اختر دھیمے لہجے میں بولا۔

"میں بھی صرف اسی حد تک بات کر رہی ہوں۔ آغاز کے طور پر تو یہی کافی ہے۔ میں یہ تھوڑا ہی کہہ رہی ہوں کہ اسی ہفتے میں یکدم کوئی ایسا پروگرام شروع ہو جائے گا جس میں صرف تم گلوکاری کا مظاہرہ کرو گے۔ فی الحال کسی چلتے ہوئے پروگرام میں تمہارا صرف ایک آدھ آئٹم آجائے۔ ٹی وی پر تمہاری شکل تو نمودار ہو جائے۔ کیمرے کا اور ناظرین کا تم سے تعارف تو ہو جائے۔ پھر دیکھا جائے گا کہ مزید کیا ہوسکتا ہے"۔ رمنا سمجھانے کے سے انداز میں بولی۔

پھر وہ جیسے کچھ سوچتے ہوئے مسکرائی۔ "بعض اوقات تو کسی کی پہلی ہی چیز ایسی ہٹ ہو جاتی ہے کہ اسے آئندہ کسی سفارش کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ وہ دھڑا دھڑ باقی سیڑھیاں چڑھتا چلا جاتا ہے۔ شاید تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہو جائے"۔

"اب ایسی بھی توپ چیز نہیں ہوں میں"۔ اختر قدرے انکساری اور شرمیلے پن سے بولا۔ "بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی فنکار اسٹیج پر اور نجی محفلوں میں بڑا زبردست لگتا ہے لیکن ٹی وی پر پہنچتا ہے تو کچھ خاص نہیں لگتا۔ زیادہ اپیل نہیں کرتا۔ ہوسکتا ہے یہ محض آپ کا حسن نظر ہو کہ میں بہت اچھا فنکار ہوں۔ ٹی وی پر پہنچ کر بالکل ٹھس ہو جاؤں"۔

"میرے خیال میں تو تمہارا معاملہ اس کے بالکل الٹ ہے"۔ رمنا کی مہربان مسکراہٹ روشن تر ہوگئی۔ "تم ان فنکاروں میں سے ہو جو اسٹیج پر.......... اور نجی محفلوں میں جتنے اچھے معلوم ہوتے ہیں' ٹی وی پر پہنچ کر اس سے کہیں زیادہ غضب کی چیز نظر آسکتے ہیں۔ تمہیں یہ تو یقین ہے ناکہ تمہارے پاس فن ہے.......... خوداعتمادی ہے۔ تم تکے سے بنے ہوئے گلوکار نہیں ہو؟"

"جی نہیں"۔ اختر مضبوط لہجے میں بولا۔ "اس شوق کو میں نے ان گنت رت جگوں کا خون پلایا ہے۔ بہت ریاضت کی ہے۔ اس کے پیچھے تعلیم ادھوری رہ گئی۔ گھر بار چھوٹ گیا۔ محبت کرنے والا باپ چھوٹ گیا.........." اس کے لہجے میں ارتعاش سا آگیا۔ ایک

لمحے کے لئے اسے اندیشہ محسوس ہوا کہ اس کی آواز بھرا جائے گی۔ اس کے حلق میں آنسوؤں کی نمی پھیل رہی تھی لیکن وہ جلدی سے اسے پی گیا۔ اسے ابتدائی ملاقاتوں کے دوران ہی رمنا رئیس کے سامنے بھرائی ہوائی آواز میں بات کرنے کا تصور ہی بہت برا سا محسوس ہوا۔

اس نے جلدی سے خود کو سنبھال لیا اور اپنی دانست میں رمنا کو احساس نہیں ہونے دیا کہ اس کی آواز میں لرزش یا ارتعاش آیا تھا۔ صرف ایک لمحے کے توقف سے وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں اس فن سے کچھ حاصل بھی کرسکوں گا یا نہیں۔ مجھے شہرت نصیب ہوگی یا نہیں۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر.......... کوئی منصوبہ بندی کئے بغیر.......... کوئی منزل نظر کے سامنے رکھے بغیر میں تو بالکل دیوانوں کی طرح اس شوق میں لگا رہا۔ ایک عجیب سی تشنگی' ایک عجیب سی آگ ہے جو مجھے اندر ہی اندر جھلساتی رہتی ہے۔ ایک بے عنوان سی لگن ہے جو مجھے نہ جانے کہاں لے جانا چاہتی ہے"۔

"یہ آگے بڑھنے کی لگن ہے۔ کسی بھی میدان میں آگے بڑھنے کی لگن انسان کا سرمایہ ہوتی ہے۔ یہ لگن.......... یہ ایمبیشن تمہارا بھی سرمایہ ہے لیکن اب تک تم نے اسے دبا کر رکھا ہوا ہے۔ تمہارا شرمیلا پن اور خودداری تمہارے ایمبیشن کے راستے میں حائل ہے۔ تمہارے پاس فن ہے۔ تمہیں آگے بڑھنے کا حق حاصل ہے۔ تمہیں اس کے لئے کوشش کرنی چاہیے"۔ رمنا پرزور لہجے میں بولی۔

"لیکن.......... میں نے کہا نا کہ میں اس ریٹ ریس میں.......... چوہوں کی اس دوڑ میں حصہ نہیں لے سکتا۔ ان دروازوں پر دستکیں دینے کی کوشش نہیں کرسکتا جن پر پہلے ہی ہجوم لگا ہوا ہے اور ہر کوئی دوسرے کو دھکیل کر.......... کچل کر.......... دروازہ توڑ کر اندر جانے کی فکر میں ہے"۔ اختر بے بسی سے بولا۔

"یہ تمہارے راستے کی پہلی رکاوٹ ہے۔ اسے میں دور کروں گی"۔ رمنا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگلے ہفتے ٹی وی سے تمہارا نغمہ نشر ہوگا"۔ وہ ایک بار پھر ذرا آگے کو جھک آئی۔ "یہ پروڈیوسر بھی بہت بڑے فنکار ہوتے ہیں۔ گلوکاروں اور اداکاروں نے بھی بڑے فنکار۔ یہ جب کسی کو ٹرخانے پر آتے ہیں تو اسے استقبالیہ سے آگے نہیں آنے دیتے اور اگر کسی کے لئے کچھ کرنے پر آتے ہیں تو اسے راتوں رات کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں۔ تم شیڈیولڈ پروگراموں وغیرہ کی فکر چھوڑو۔ کسی نہ کسی پروگرام کے شیڈول میں تمہارے لئے گنجائش نکل ہی آئے گی۔ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تم صرف مجھے اپنا ایڈریس اور فون نمبر دے دو"۔

"فون نمبر..........؟" اختر قدرے پریشان ہو کر بولا.......... "فون تو میرے ہاں

نہیں ہے............"

"تمہارے ہاں فون نہیں ہے؟" رمنا رئیس نے کچھ اس طرح حیرت سے پوچھا گویا اختر نے کہہ دیا ہو کہ اس کے مکان پر چھت نہیں ہے۔

"میرے ہاں تو اور بھی بہت سی چیزیں نہیں ہیں............" اختر مسکراتے ہوئے بولا............ "درحقیقت میرا تو کوئی باقاعدہ گھر ہی نہیں ہے۔ ایک مکان میں ایک چھوٹا سا ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا ہے۔ بہت تھوڑا سا سامان ہے میرا............ مسافروں کی طرح رہتا ہوں۔ اس کمرے میں زیادہ جگہ میرے موسیقی کے آلات نے گھیر رکھی ہے"۔

پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ ذرا چونکتے ہوئے بولا............ "مگر میری مکان مالکن کے ہاں فون ہے۔ ان کا موڈ خوشگوار ہو تو میرا فون آنے پر مجھے بلالیتی ہیں یا پیغام دے دیتی ہیں............" اختر نے اپنا ایڈریس اور مکان مالکن کا فون نمبر ایک کاغذ پر لکھ کر رمنا کی طرف بڑھا دیا۔ وہ کچھ زیادہ پرامید نہیں تھا لیکن اس نے یہی سوچا تھا کہ ایڈریس اور فون نمبر دینے میں تو کوئی حرج نہیں تھا۔

رمنا کاغذ احتیاط سے تہہ کرکے پرس میں رکھتے ہوئے بولی۔ "یعنی تم صحیح معنوں میں بیچلر لائف گزار رہے ہو۔ شادی وادی کا ارادہ نہیں ہے کیا؟" سوال بظاہر نہایت سرسری سے لہجے میں کیا گیا تھا۔

"شادی............؟" اختر استہزائیہ سے انداز میں ہنسا............ "یہاں اکیلے زندگی گزارنا مشکل ہو رہا ہے۔ اب میں اتنا بھی خودغرض نہیں ہوں کہ اپنے ساتھ کسی اور کی بھی زندگی خراب کر ڈالوں............"

"بعض اوقات' خراب ہوتی ہوئی زندگی شادی سے سنور بھی جاتی ہے"۔ رمنا گہری نظر سے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی پھر اس نے بے پروائی سے ہاتھ ہلایا............ "خیر............ چھوڑو............ میں اب چلتی ہوں"۔ وہ یکدم ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ جانے کے لئے وہ اسی طرح اچانک ہی اٹھ کھڑی ہوتی تھی جیسے وہ انسان نہیں' کوئی مشینی گڑیا ہو اور کسی نے اچانک اس کا کوئی غیر مرئی بٹن دبا دیا ہو۔

اس کے جانے کے بعد اختر دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ پھر وہ اٹھ کر کافی بار میں آگیا۔ شہلا تھکے تھکے سے انداز میں دیوار کے قریب ایک اسٹول پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ کافی بار میں حالانکہ اب کوئی گاہک نہیں تھا لیکن شہلا کی ڈیوٹی ختم ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ اس لئے وہ وہیں بیٹھی نظر آ رہی تھی۔

اختر کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر اس کی مخصوص شریر سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس مسکراہٹ سے اس کے چہرے پر گویا روشنی سی پھیل جاتی تھی۔ افسردگی' تھکن اور اضمحلال کی دھندلاہٹ یکدم دور ہو جاتی تھی۔ اس کے چہرے کے عقب سے گویا ایک نیا چہرہ طلوع

ہوتا تھا۔

اختر نے تحمل سے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس لیا اور شہلا کے قریب جا بیٹھا۔ شہلا جلدی سے نیچے فرش پر گویا کچھ تلاش کرنے لگی۔

"کیا دیکھ رہی ہو فرش پر؟" اختر نے حیرت سے پوچھا۔

شہلا دوبارہ سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے معصومیت سے بولی............ "وہ............ دراصل تمہاری باچھیں کچھ اتنی پھیلی جا رہی تھیں کہ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کوئی دانت نکل کر نیچے نہ گر پڑا ہو"۔

اختر نے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا۔ شہلا کندھا اچکا کر بے پروائی سے بولی............ "میں جھوٹ تھوڑا ہی بول رہی ہوں۔ کاش تم نے کافی بار میں داخل ہوتے وقت سامنے دیوار پر لگے آئینے میں اپنی شکل دیکھی ہوتی۔ تمہاری باچھیں پھیل کر کانوں سے جا لگی تھیں"۔

اختر اب بھی کچھ نہ بولا۔ بدستور اسے گھورتا رہا۔ شہلا بے نیازی سے بولی............

"بھئی مانا کہ شہر کی ایک بہت بڑی عورت جس کا شوہر صرف نام کا نہیں' بلکہ سچ مچ کا رئیس ہے' تم پر مہربان ہو رہی ہے لیکن اس میں اتنی باچھیں کھلانے کی کیا بات ہے؟ کسی کی ذرا سی نظر کرم پر اتنی بھی باچھیں نہیں پھیلانی چاہئیں کہ انسان اچھا بھلا مکی ماؤس نظر آنے لگے"۔

"تمہیں کس نے بتا دیا کہ اس قسم کی کوئی عورت مجھ پر مہربان ہو رہی ہے؟" اختر نے اپنا لہجہ بارعب بنانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی ذرا دیر پہلے مجھے ایک کام سے بال روم میں جانا پڑا تو تم دونوں بڑا سر سے سر جوڑے بیٹھے تھے۔ فون نمبروں کے تبادلے ہو رہے تھے"۔ وہ استہزائیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

اختر ذرا چونکا۔ اس نے بال روم میں شہلا کو نہیں دیکھا۔ حالانکہ بال روم میں اس وقت زیادہ رش بھی نہیں تھا جب وہ رمنا کے ساتھ میز پر بیٹھا تھا۔ کیا وہ واقعی رمنا سے گفتگو میں یا اس کے حسن بلاخیز کی دید میں اتنا محو تھا کہ اسے بال روم میں شہلا کی آمد کا بھی پتہ نہیں چلا تھا؟

اپنے ہی دل میں ابھرنے والے اس قسم کے سوالوں سے بچنے کے لئے اختر نے بات کو مذاق میں اڑانے کی کوشش کی اور مصنوعی سنجیدگی سے بولا۔ "مجھے معلوم ہے تم کسی کام سے نہیں' بلکہ میری جاسوسی کرنے بال روم میں گئی ہوگی اور مجھے اس خوبصورت عورت کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر فوراً جیلس ہوگئی ہوگی............ مجھے معلوم ہے تم بہت جیلس لڑکی ہو۔ تم میں حسد اور رقابت کا مادہ کسی اونٹ سے بھی زیادہ ہے"۔

"جیلس ہوتی ہے میری جوتی.........."

"ہاں......... یقیناً جوتی بھی جیلس ہوتی ہوگی۔ آخر وہ تمہاری ہی جوتی ہے"۔ اختر جلدی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"ایک تو تم سے اگر محلے کا جمعدار بھی ہنس کر بات کرلے تو تم خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہو.........." شہلا منہ بنا کر بولی۔

"جمعدار نہیں.......... جمعدرانی کہو"۔ اختر نے تصحیح کی۔

اب گویا شہلا کی اس کو گھورنے کی باری تھی۔ وہ ایک لمحے خاموشی سے اسے گھورتی رہی اور پھر جارحانہ لہجے میں بولی......... "مجھے کیا ضرورت ہے تمہاری جاسوسی کی۔ تم خود اپنے اعمال کا چلتا پھرتا اشتہار ہو.........."

"تم مانو نہ مانو مس شہلا اکرام.........! لیکن مجھے معلوم ہے تم دل ہی دل میں.......... چپکے چپکے مجھ سے محبت کرتی ہو"۔ یہ کہتے اختر نے کسی فلمی ہیرو کے اسٹائل میں بال بھی ماتھے پر جھکالئے۔

"محبت......... اور تم سے.........؟" شہلا منہ پر ہاتھ رکھ کر بچیوں کی طرح کھی کھی کرنے لگی......... "تم سے محبت کرنے سے تو بہتر ہے انسان کسی رکشے سے محبت کرنے لگے۔ کسی کھمبے سے محبت کرنے لگے......... کم از کم رکشا انسان کو کسی منزل تک تو پہنچا دیتا ہے......... کھمبے پر لگا ہوا حقیر سا بلب کسی تاریک گلی میں روشنی تو بکھیرتا ہے........."

"میں محسوس کر رہا ہوں جب سے تمہیں گھر لے جانے کے لئے وہ شریف سا رکشے والا ملا ہے، تمہاری طبیعت میں عجیب رکشا پسندی سی پیدا ہوگئی ہے"۔ اختر متاسفانہ سے انداز میں بولا۔

"ہاں........." شہلا بلا تامل بولی۔ "رکشا تم سے بہتر ہے وہ کم از کم کسی کو گھر تو پہنچا دیتا ہے"۔

"میں صرف جھوٹے کو اس کے گھر تک پہنچا سکتا ہوں"۔ اختر ٹھنڈی سانس لے کر بولا......... "ویسے......... مذاق سے قطع نظر......... میں نے تو تمہیں گھر سے بہت آگے......... بہت آگے......... خوابوں کے نگر تک پہنچانے کی پیشکش کی تھی۔ تم نے خود ہی تو مجھے اپنی والدہ اور اپنے مسائل سے ڈرا کر بٹھا دیا......... کہو تو کل آجاؤں تمہاری والدہ سے تمہارا رشتہ مانگنے؟"

"میں ایش ٹرے اٹھا کر تمہارے سر پہ ماروں گی"۔ شہلا نے کاؤنٹر پر رکھی ہوئی کرسٹل کی بھاری ایش ٹرے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"کمال ہے.........!" اختر ٹھنڈی سانس لے کر بولا......... "نہ تم محبت کا اقرار

کرتی ہو......... نہ رشتہ مانگنے کے لئے گھر آنے دیتی ہو اور نہ ہی کسی اور سے میری دوستی ہوتے دیکھ کر خوش ہوتی ہو۔ آخر تم چاہتی کیا ہو؟"

شہلا گھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم اب دفع ہو جاؤ"۔

"کیا بے درد زمانہ آگیا ہے"۔ اختر نے ایک اور آہ بھری......... "لڑکیاں کیسی مادیت پرست اور غیر رومانی سی ہوگئی ہیں۔ رشتوں اور لڑکوں کے بجائے رکشوں اور کھمبوں کی باتیں کرتی ہیں۔ خوبرو اور ہینڈسم لڑکوں کے سر پر محبت کا تاج سجانے کے بجائے ایش ٹرے مارنے کی باتیں کرتی ہیں۔ خدایا.........! دنیا کہاں جا رہی ہے!"

"دنیا اپنے گھر جا رہی ہے۔ رات کے دو بج رہے ہیں۔ تم بھی اپنے گھر جاؤ اور آرام سے بستر پر لیٹ کر اس دولت مند جادوگرنی کے سپنے دیکھو"۔ شہلا چمکارنے کے سے انداز میں بولی۔

"تم بہت سنگدل لڑکی ہو"۔ اختر کراہ کر بولا۔

"میں صرف لڑکی ہوں۔ دل میرے پاس نہیں ہے۔ وہ میرے گھریلو مسائل کی بھینٹ چڑھ گیا ہے........." وہ سپاٹ لہجے میں بولی اور جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اختر بھی اٹھتے ہوئے بولا......... "چلو......... میں تمہیں چھوڑنے چلتا ہوں۔ کم از کم آج تو مجھے اجازت دے دو کہ میں تمہیں گھر تک چھوڑ آؤں"۔

"نہیں........." شہلا کے لہجے میں سختی در آئی......... "زندگی کے راستے پر میری تنہا سفر کرنے کی عادت برقرار رہنے دو۔ اس میں خلل مت ڈالو........."

"عجیب لڑکی ہو تم!" اختر نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"شاید......... لیکن اس دولت مند ساحرہ سے کم عجیب ہوں"۔ اس نے ایک کیبنٹ سے اپنا پرس نکال کر کندھے پر لٹکایا اور جاتے جاتے رک کر بولی۔

"ویسے......... ایک دوستانہ سا مشورہ ہے......... اس عورت سے ہوشیار رہنا"۔

"ارے تم تو خواہ مخواہ سنجیدہ ہو رہی ہو"۔ اختر بے پروائی سے ہنستے ہوئے بولا......... "اسے میری آواز ذرا پسند آگئی ہے......... ایک آدھ فرمائش کر دیتی ہے......... اور بس۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں......... اس سے میری واقفیت رسمی ہے اور غالباً رسمی ہی رہے گی۔ وہ عمر میں مجھ سے بڑی ہے......... شادی شدہ......... ایک کروڑ پتی کی بیوی ہے۔ میرا اس کا کیا میل؟ میں ایک کنگال، قلاش، گمنام اور معمولی سا گویا......... میں اتنا بھی تخیل پرست نہیں ہوں کہ اس سے کوئی تعلق خاطر استوار کرنے کے خواب دیکھنے لگوں........."

شہلا خاموشی سے سر جھکائے اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ اختر بات جاری رکھتے

ہوئے بولا......... "یہ "دو اور دو چار" کا زمانہ ہے۔ لوگ سفاکی کی حد تک حقیقت پسند ہوگئے ہیں۔ اب لوگ خواب صرف سیاست میں دیکھتے ہیں......... باقی سب معاملات میں بڑے حقیقت پسند ہیں۔ پڑوسی کے گھر شیرینی بھی بھیجی جاتی ہے تو اپنی اور اس کی حیثیت دیکھ کر بھیجی جاتی ہے......... مجھ پر اور بیگم رمنا رئیس پر تو وہی محاورہ صادق آتا ہے کہ "کہاں راجہ بھوج اور کہاں کنگو تیلی........."

وہ خود استہزائی کے سے انداز میں ہنسا......... "میری زندگی میں فی الحال خوابوں کا گزر نہیں......... اس کے بارے میں خواب دیکھنے کی مجھ میں جرات نہیں......... اور تمہارے بارے میں خواب دیکھنے کی مجھے اجازت نہیں......... میں تو زندگی کے راستے پر ایک تہی دامن مسافر ہوں۔ ڈونٹ وری اباؤٹ می........."

ہوٹل کی حدود سے باہر' سڑک کے کنارے رکشا شہلا کے انتظار میں کھڑا تھا۔ رکشے والا وقت کا بڑا پابند معلوم ہوتا تھا۔ اختر نے شہلا کو خدا حافظ کہا اور سیٹی بجاتا پیدل اپنے ٹھکانے کی طرف چل دیا۔ اس نے شہلا کو نہیں بتایا تھا کہ رمنا نے اگلے ہفتے ٹی وی سے اس کا نغمہ نشر کروانے کی بات کی ہے۔ اس کے خیال میں اس خواب میں رنگ بھرنے کا امکان بہت کم تھا اس لئے وہ قبل از وقت اس قسم کی کوئی بات کرکے بعد میں اپنا تمسخر اڑوانے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

دوسرے دن گیارہ بجے اس کی آنکھ کھلی لیکن وہ بستر سے نہیں نکلا۔ وہ عام طور پر دیر سے ہی سو کر اٹھتا تھا اور تیار ہو کر دوپہر کے قریب اپنے کمرے سے نکلتا تھا۔ ناشتہ اور دوپہر کا کھانا وہ اکٹھا ہی کھالیتا تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر آوارہ گردی کرنے کے بعد وہ کمرے میں واپس آتا تھا اور کھڑکیاں دروازے بند کرکے کچھ دیر ریاض کرتا تھا۔

وہ مکان کافی بڑا تھا جس کی نچلی منزل پر ایک کمرے میں وہ رہتا تھا۔ اوپر کی منزل پر مکان مالکن کا کنبہ تھا۔ نیچے کی منزل پر دوسرے چند کرائے دار بھی رہتے تھے لیکن اختر کی خوش قسمتی تھی کہ وہ سب چھڑے چھانٹ تھے۔ جس وقت وہ ریاض کرتا تھا اس وقت وہ سب اپنے اپنے کاموں پر گئے ہوتے تھے۔ اوپر کی منزل تک اختر اور اس کے ہارمونیم کی آواز نہیں جاتی تھی ورنہ شاید اس کے مشغلے پر اعتراضات ہوا کرتے۔ اس سے پہلے ایک چھوٹا سا فلیٹ اختر کو اس لئے چھوڑنا پڑا تھا کہ اس کے پڑوسی اس کے شوق کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھے جو اب اس کا پیشہ بن چکا تھا۔

وہ بستر ہی میں کروٹیں بدل رہا تھا جب اسے مکان مالکن کی کرخت آواز سنائی دی......... "اے اختر!......... تم جاگ گئے ہو یا ابھی سو ہی رہے ہو؟"

"آیا آنٹی......... ایک منٹ"۔ اختر ہڑبڑا کر چادر پھینک کر بستر سے نکلا۔ ایک لمحے کے لئے تو وہ پریشان سا ہوگیا کہ آج آنٹی اسے کیوں بلا رہی تھیں۔ اسے یاد آیا کہ وہ تو

کرایہ بھی تین چار روز پہلے دے چکا تھا۔

اس نے دروازہ کھول کر جھانکا۔ آنٹی بالکونی میں کھڑی تھیں۔ خلاف معمول ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور اس وقت تو اختر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا جب انہوں نے بیٹا کہہ کر مخاطب کی۔

"تمہارا فون ہے بیٹا!" انہوں نے خاصی محبت سے اطلاع دی۔ اب یہ دوسری بات تھی کہ ان کی آواز کافی کرخت تھی۔ قدرت کے کاموں میں کسی کا کیا دخل؟ بہرحال ان کے لہجے سے اختر کو اندازہ ہوگیا کہ ان کا موڈ خوشگوار تھا۔

"یااللہ.........! یہ صبح ہی صبح کس کا فون آگیا"۔ اختر خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکلا۔ آنٹی نے اس کی بڑبڑاہٹ بھی سن لی اور سر پر ہاتھ مار کر بولیں۔ "خدا کی پناہ! تمہارے لئے یہ صبح ہے؟ دنیا اپنے آدھے کام نمٹا چکی ہے"۔

اختر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر بالکونی میں پہنچا تو آنٹی خاصے مہربان انداز میں مسکراتے ہوئے بولیں......... "ٹی وی اسٹیشن سے فون ہے۔ دیکھو بیٹا.........! تمہیں اپنا سمجھ کر کہہ رہی ہوں۔ اگر ٹی وی پر تمہاری واقفیت ہے تو ذرا کسی سے بات تو کرنا......... وہ میرا بھانجا نومی ہے نا......... اسے ایکٹنگ کا بڑا شوق ہے۔ کسی پروڈیوسر سے کہنا اسے بھی کسی ڈرامے میں رکھ لے........."

اختر کو بے اختیار ہنسی آگئی لیکن یہ ہنسی ایک کراہ سے مشابہ تھی۔ وہ آنٹی کے پیچھے پیچھے لاؤنج کی طرف بڑھتے ہوئے بولا......... "آنٹی! میں نے تو خود آج تک ٹی وی اسٹیشن کی شکل نہیں دیکھی"۔

"تو پھر یہ فون کہاں سے آگیا؟" آنٹی نے پلٹ کر شک زدہ نظروں سے اسے گھورا۔

"معلوم نہیں......... میں خود حیران ہوں۔ شاید غلطی سے آگیا ہو۔ میں تو خود ٹی وی پر کام حاصل کرنے کے لئے کسی سفارش کی تلاش میں ہوں"۔

"ارے تو پھر جلدی سے تلاش کرو نا سفارش......... اور جہاں اپنے لئے تلاش کرو گے وہاں ہمارے نومی کے لئے بھی تلاش کرلینا"۔ آنٹی نے تاکید کی۔

"بہت بہتر"۔ اختر نے جان چھڑانے کے لئے سعادت مندی سے کہا۔ اس وقت تک وہ لاؤنج میں فون کے پاس پہنچ چکا تھا۔ دھڑکتے دل سے اس نے میز سے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے بڑی خوش خلقی سے سلام کے بعد کسی نے تصدیق چاہی......... "آپ اختر حسین ہی بول رہے ہیں نا؟"

"جی ہاں........." اختر نے جواب دیا۔

"میں عارف بول رہا ہوں۔ ٹی وی کے بڑے مشہور پروڈیوسر ہیں۔ نیاز احمد صاحب......... آپ نے نام تو سنا ہی ہو گا اور ٹی وی پر بھی دیکھا ہوگا......... زیادہ تر

موسیقی کے پروگرام کرتے ہیں۔ میں ان کا اسسٹنٹ ہوں۔ آج کل بھی ہمارا پروگرام "جواں ترنگ" آپ دیکھ ہی رہے ہوں گے"۔ دوسری طرف سے بولنے والے نے یہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔

اختر کو کچھ صحیح طور پر یاد نہیں تھا کہ اس نے نیاز احمد اور عارف کے نام ٹی وی پر دیکھے تھے یا نہیں.......... اس وقت ویسے بھی اچانک بستر سے نکل کر بھاگے آنے کی وجہ سے اس کا سر گھوم سا رہا تھا۔ سب سے بڑی ستم ظریفی یہ تھی کہ کافی عرصے سے اس کے پاس ٹی وی ہی نہیں تھا۔ زیادہ مفلسی کے دنوں میں اس کا چھوٹا سا رنگین ٹی وی بک چکا تھا اور دوبارہ خریدنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی تھی لیکن یہ بات وہ اسسٹنٹ پروڈیوسر عارف سے نہیں کہہ سکتا تھا۔

چنانچہ وہ دھیمے سے لہجے میں بولا.......... "جی.......... جی ہاں.......... میں دیکھ رہا ہوں.......... بہت اچھا پروگرام ہے.......... نیاز احمد صاحب بڑے باصلاحیت پروڈیوسر ہیں اور ان کے پروگراموں کی کامیابی میں یقیناً آپ کا بھی بڑا ہاتھ ہوگا.........." اختر کو گفتگو میں اپنی یہ منافقت خود بھی اچھی نہیں لگی لیکن یہ سب کچھ غیر ارادی سے انداز میں اس کے منہ سے نکلتا چلا گیا۔ اس نے یہی سوچا تھا کہ ٹی وی کا ایک اسسٹنٹ پروڈیوسر اس جیسے گمنام شخص کو فون کر رہا تھا' اپنا اور اپنے پروگرام کا تعارف کرا رہا تھا' تو تھوڑی بہت رسمی سی تعریف تو اس کا حق بنتی تھی۔

"شکریہ.......... شکریہ اختر صاحب! زیادہ مشکل کام تو اسسٹنٹ کے ہی حصے میں آتے ہیں"۔ یہ کہتے ہوئے عارف کی آواز کچھ نیچی ہوگئی۔ شاید پروڈیوسر اس کے آس پاس کمرے میں کہیں بیٹھا تھا۔

اسسٹنٹ اپنے مخصوص ہنگامی سے انداز میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا.......... "اختر صاحب! یہ بتایئے آپ آج تین بجے ٹی وی اسٹیشن تشریف لا سکتے ہیں؟"

اختر کو حیرت تھی کہ اسسٹنٹ اس سے اتنے مودبانہ لہجے میں کیوں بات کر رہا تھا۔ وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا.......... "خیریت تو ہے؟"

"جی ہاں.......... خیریت ہی ہے۔ تین بجے آپ کا آڈیشن ہے۔ اگر آپ آج تین بجے تشریف نہ لا سکتے ہوں تو پھر کل تین بجے ضرور آجایئے گا"۔

"نہیں.......... نہیں.......... میں آج ہی آجاؤں گا"۔ اختر جلدی سے بولا۔ "مجھے ایسی کوئی خاص مصروفیت نہیں ہے"۔

"ٹھیک ہے.......... تو پھر آج تین بجے ہم آپ کے منتظر ہوں گے"۔ اسسٹنٹ نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

اختر نے بھی آہستگی سے ریسیور رکھ دیا لیکن چند سیکنڈ وہ خواب کے سے عالم میں

وہیں کھڑا رہا۔ آنٹی اس وقت اندر تھیں۔ دفعتاً" اختر اپنی خواب کی سی کیفیت سے چونکا اور جلدی سے وہاں سے نکل بھاگا۔ اسے اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ آنٹی دوبارہ نہ آجائیں اور اپنے بھانجے نومی کے لئے سفارش کا قصہ ایک بار پھر نہ شروع کر دیں۔ ابھی تو اسے خود اپنے آڈیشن کے لئے بلائے جانے پر ہی یقین نہیں آرہا تھا۔ بیٹھے بٹھائے یہ بلاوا آجانا اس کے لئے ایک معجزے سے کم نہیں تھا۔

یہ اس کی زندگی کی پہلی ایسی خبر تھی جس پر اس کا خوشی سے رقص کرنے کو جی چاہ رہا تھا اور اس خواہش پر ضبط کرنے کی کوشش میں اس کے اعصاب کھنچنے لگے تھے۔

پھر اس نے خود کو سمجھایا.......... "خوش فہمی کے راستے پر اتنا آگے بڑھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ آڈیشن تو سال میں ہزاروں لوگوں کا ہوتا ہے مگر چانس کتنوں کو ملتا ہے؟ لہٰذا صرف آڈیشن کی خبر سن کر سنہرے مستقبل کے خواب دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ذرا صبر و سکون سے دیکھو آگے کیا ہوتا ہے"۔

اس کے اعصاب میں ارتعاش کچھ کم ہوا تو وہ باہر جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔ اس کا ارادہ تھا کہ ہوٹل میں کھانا وغیرہ کھانے کے بعد ادھر سے ہی ٹی وی اسٹیشن روانہ ہو جائے گا۔

ہوٹل میں کھانا کھانے کے دوران وہ رمنا رئیس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس عورت نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا تھا اس کی رسائی بھی یقیناً اونچی سطح پر تھی۔ تب ہی یہ ممکن ہوسکا تھا کہ کل رات اس کی رمنا سے بات ہوئی تھی اور آج صبح ٹی وی سے فون آگیا تھا۔ اتنی جلدی کچھ ہو جانے کے بارے میں تو اختر نے سوچا بھی نہیں تھا۔

ڈھائی بجے تک وہ کھانے اور چائے وغیرہ سے فارغ ہوا۔ وقت گویا بہت سست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ بالآخر اس نے ریستوران سے نکل کر رکشا پکڑا اور ٹی وی اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا۔

زندگی میں کئی بار وہ اس سادہ' سپاٹ اور بے رنگ سی عمارت کے سامنے سے گزرا تھا جسے دیکھ کر مشکل سے یقین آتا تھا کہ اسی عمارت کے اندر کروڑوں لوگوں کی زندگیوں میں تفریح کی رنگینیاں بکھیرنے کا اہتمام ہوتا تھا' انہیں تھوڑی بہت خبروں سے آگاہ کیا جاتا تھا اور چھوٹے بڑوں کے دل بہلاوے کا سامان ہوتا تھا۔ ساتھ ساتھ سنجیدہ مسائل پر غور و فکر کا بھی حق ادا کرنے کی اپنی سی کوشش کی جاتی تھی۔

گیٹ پر تو ریلوے کراسنگ کی طرح بیریئر گرا ہوا تھا۔ مسلح محافظ کھڑا تھا۔ اختر نے قریب ہی دیوار میں بنی ہوئی محراب نما چھوٹی سی کھڑکی کا رخ کیا جہاں دو تین افراد پہلے ہی ریسپشنسٹ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ انہیں فلاں پروڈیوسر نے بلایا ہے اور استقبالیہ کلرک بے نیازی سے انہیں بتا رہا تھا کہ فون پر کئی بار اس پروڈیوسر سے تصدیق

کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن وہ سیٹ پر موجود نہیں تھے' اس لئے انہیں باہر کھڑے رہ کر انتظار کرنا پڑے گا۔

وہ لوگ مایوس سے ہو کر ایک طرف کو کھڑے ہوگئے۔ اختر اس روزن زنداں سے اندر جھانکتے ہوئے ایک لمحے کے لئے ہچکچایا۔ اسے اندیشہ محسوس ہوا کہ اس کا بھی وہی انجام نہ ہو جو اس سے پہلے اندر جانے کے خواہش مندوں کا ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھا' اندر استقبالیہ کمرے میں بھی کئی افراد لوہے کی کرسیوں اور میلے کچیلے صوفے پر موجود تھے۔ کمرہ بہت چھوٹا تھا اور کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

میز پر دو استقبالیہ کلرک موجود تھے زیادہ ڈیلنگ ایک ہی کر رہا تھا۔ دوسرا غالباً اسے اسسٹ کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ تک تو اختر کی کچھ بولنے کی ہمت ہی نہیں پڑی۔ اس دوران کلرکوں نے بھی اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ وہ بیک وقت کئی افراد سے بحث و تمحیص میں الجھے ہوئے تھے۔ اختر اس دوران کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔

کمرے کے دروازے پر ایک مشہور لوک گلوکارہ گوٹے کناری والے زرق برق کپڑے پہنے کھڑی تھی اور کھرکھراتی آواز میں کلرک سے پوچھ رہی تھی کہ اندر جانے کے لئے اس کا پاس بن گیا یا نہیں.......... استقبالیہ عملے کی ایک لڑکی ایک ملاقاتی خاتون کی تلاشی لینے کے لئے اسے بغلی کمرے میں لے جا رہی تھی۔ کلرک بیک وقت لوگوں کی باتوں کے جواب بھی دے رہے تھے' فون سے بھی الجھ رہے تھے' پاس بھی بنا رہے تھے اور بیچ بیچ میں ایک دوسرے سے ہنسی مذاق بھی کر رہے تھے۔ سب کام بیک وقت ہو رہے تھے اس لئے کوئی بھی کام صحیح نہیں ہو رہا تھا۔

اچانک کلرک نے اختر کی طرف دیکھا اور بیزاری سے کہا.......... "جی.......... آپ فرمایئے؟"

راستے میں ٹریفک کے بے تحاشا دھویں' گرد' رکشے کے جھٹکوں اور ایک بے عنوان سے اضطراب نے گویا اپنا اثر دکھا دیا تھا۔ اختر نے بولنے کی کوشش کی تو اس کے حلق سے بھی لوک گلوکارہ ہی کی طرح ایک عجیب کھرکھراتی سی آواز برآمد ہوئی.......... "جی........ وہ مجھے پروڈیوسر نیاز صاحب نے بلوایا تھا.........." اپنی آواز پر اسے خود ہی بڑی شرم آئی' کیا اس آواز کے ساتھ وہ آڈیشن دینے آیا تھا؟

"اچھا.......... تو آپ کو بلوایا گیا ہے.......... آپ خود سے نہیں آئے؟" کلرک نے استہزائیہ سے انداز میں کہا.......... "اسم گرامی کیا ہے آپ کا؟"

"جی.......... اختر حسین.........." اختر نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بتایا۔

کلرک نے ٹیبل کیلنڈر پر لکھے ہوئے کچھ ناموں پر نظر دوڑائی اور یکدم بدلے ہوئے لہجے میں بولا.......... "ہاں.......... ہاں.......... آپ کا نام موجود ہے"۔ اس نے چند

سیکنڈ میں پرچی بنا کر اس کے ہاتھ میں تھما دی اور قدرے مودبانہ سے انداز میں بولا۔ "اندر جانے سے پہلے ایک منٹ کے لئے آپ یہاں آجایئے گا سیکیورٹی والے ذرا ایک نظر ڈال لیں.........."

اختر وہ پرچی مسلح گارڈ کو دکھا کر اندر پہنچا۔ اس وقت استقبالیہ کمرے میں ایک پریس فوٹوگرافر صوفے پر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے پوچھ رہا تھا کہ اس کے لئے کیمرہ اندر لے جانے کا پاس آج کی تاریخ میں بن جائے گا یا نہیں؟ ایک سیکیورٹی گارڈ نے اختر کو صرف تھپک کر دیکھا اور اندر جانے کی اجازت دے دی۔

کمپاؤنڈ عبور کرکے شیشے کا دروازہ کھول کر لابی میں داخل ہوا تو ائیر کنڈیشنڈ عمارت کی خنک ہوا نے اس کا استقبال کیا۔ اندر اس وقت قبرستان کا سا سناٹا تھا.......... لاکھوں گھروں میں ہنگامہ برپا کئے رکھنے والی عمارت میں اس قدر خاموشی؟" اختر نے حیرت سے سوچا۔ یہ تضاد اسے بہت عجیب لگا۔

اسی دوران ایک خاتون کے سینڈلوں کی ٹک ٹک نے سکوت ذرا کم کر دیا۔ وہ خاتون ایک راہداری سے برآمد ہوئی اور ٹک ٹک کرتی اختر کے قریب سے گزرتی باہر چلی گئی۔ اس کے چہرے پر اتنا گہرا میک اپ تھا کہ اصلی جلد دیکھنے کے لئے اس کی تہیں شاید کھرچنا پڑتیں۔ خوشبو کا ایک جھونکا پیچھے چھوڑتے ہوئے وہ شیشے کے دروازے سے باہر جا چکی تو اختر نے ایک طویل سانس لی۔

"........تو یہ تھی وہ عمارت جس میں داخل ہونا بھی اسے جوئے شیر لانے کے برابر محسوس ہوتا تھا!" اس نے اردگرد دیکھتے ہوئے سوچا۔ اب اس کے اعصاب پرسکون ہوچکے تھے۔ وہ اپنے آپ کو پراعتماد محسوس کر رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ اب اگر گانے سے پہلے ایک کپ چائے مل گئی تو اس کا گلا صاف ہو جائے گا اور وہ اچھا آڈیشن دے سکے گا لیکن اگر چائے میسر نہ آئی تو وہ صرف دو گھونٹ پانی پی کر بھی کام چلا لے گا' بشرطیکہ پانی زیادہ ٹھنڈا نہ ہو۔ باقاعدہ گلوکار بننے کے بعد اسے ہر چیز کھاتے پیتے وقت سوچنا پڑتا تھا کہ وہ اس کے گلے کو تو نقصان نہیں دے گی۔

دفعتاً" لابی کا سکوت درہم برہم ہوگیا۔ تین چار افراد سامنے کی راہداری سے چلے آ رہے تھے۔ وہ کسی بات پر قہقہے لگا رہے تھے اور ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار رہے تھے پیچھے پیچھے دو لڑکیاں بھی تھیں۔ وہ آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ اختر کو ان کی شکلیں مانوس سی محسوس ہوئیں۔ وہ سب غالباً ٹی وی آرٹسٹ تھے۔

اختر لابی کے وسط میں ساکت کھڑا تھا۔ وہ سب اسے شک زدہ سی نظروں سے گھورتے ہوئے اس کے قریب سے نکلتے چلے گئے۔ اختر ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ پروڈیوسر نیاز کا کمرہ کس طرف ہے لیکن اس کی ہمت نہ پڑی۔ وہ سب بہت شریر سے دکھائی دے رہے تھے۔

اختر کو اندیشہ تھا کہ وہ اسے بے وقوف بنانا نہ شروع کر دیں۔ وہ اس وقت خود کو کالج میں قدم رکھنے والا فرسٹ ائیر فول محسوس کر رہا تھا۔

اسی دوران اسے راہداری سے ایک اور شخص برآمد ہوتا دکھائی دیا۔ وہ وردی میں تھا اور چپڑاسی معلوم ہوتا تھا۔ اختر نے اس سے پروڈیوسر نیاز کے کمرے کے بارے میں پوچھنا مناسب سمجھا۔

اس نے اختر کا سرتاپا جائزہ لیا۔ کان پر لگی ہوئی سگریٹ اتار کر سیدھی کی اور پھر سیڑھیوں کی طرف کرتے ہوئے بولا.......... "اوپر چلے جاؤ میاں! پہلی منزل پر پہنچتے ہی پہلے دائیں ہاتھ مڑ جانا۔ پھر بائیں ہاتھ مڑ جانا سامنے ہی کمرے کے دروازے پر نیاز صاحب کے نام کی تختی نظر آجائے گی"۔

اختر با آسانی اس دروازے پر پہنچ گیا۔ نہایت شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے دروازے پر آہستگی سے دستک دی لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ اندر اتنے زور و شور سے کئی افراد کے درمیان گفتگو جاری تھی کہ اس کی دستک کی حیثیت نقار خانے میں طوطی کی آواز جتنی بھی نہیں تھی۔

قدرے ہچکچاہٹ کے بعد اس نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ سگریٹوں کے دھوئیں نے یکدم اس کے چہرے پر یلغار کی۔ اندر اتنا ہجوم تھا کہ پروڈیوسر کی میز نظر نہیں آ رہی تھی۔ بھانت بھانت کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اختر پر ایک بار پھر خفیف سی مایوسی نے حملہ کیا۔ اتنی بھیڑ بھاڑ اور ہنگامے میں کیا پروڈیوسر اس کی طرف توجہ دے سکے گا؟ وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا۔

اس بھیڑ بھاڑ میں راستہ بنانا ہی تو اسے ہمیشہ سے ایک مشکل کام محسوس ہوتا رہا لیکن اب وہ اس کمرے تک پہنچ ہی گیا' کسی نے اس کے لئے بند دروازے کھول ہی دیئے تھے تو اب اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔

وہ اندر پہنچا تو بھیڑ کے درمیان اسے پروڈیوسر کی صورت نظر آئی۔ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ وہی پروڈیوسر ہو سکتا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ گریبان کھلا تھا۔ ہونٹوں کے گوشے میں سگریٹ جھول رہی تھی جسے منہ سے نکالے بغیر وہ بات کر رہا تھا اور الفاظ کی دھن پر سگریٹ گویا رقص کر رہی تھی۔

اس کے دائیں ہاتھ پر بیٹھا ایک سانولا سا شخص میز سے طبلے کا کام لیتے ہوئے پروڈیوسر کو کچھ سنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

پروڈیوسر ماتھے پر ہاتھ مار کر بولا.......... "خدا کی پناہ! تم لوگ منہ اٹھا کر ٹی وی پر گانے کے لئے آجاتے ہو اور تمہیں بنیادی سروں تک کا پتا نہیں.......... خدا کے بندے یہ کومل سروں میں گایا جانے والا نغمہ ہے اور تم اسے تیور سروں میں گانے کی کوشش کر

رہے ہو.........."

"سر! میں دوبارہ گاتا ہوں.........." وہ شخص سعادت مندی سے بولا لیکن اس وقت تک پروڈیوسر ایک دوسرے نوجوان کی طرف متوجہ ہو چکا تھا جو عقب سے اس کے بائیں کندھے پر جھکا ہوا تھا۔ وہ نوجوان بڑے بڑے اور شوخ رنگوں کے پھولوں والی شرٹ اور نیلی جینز میں تھا جس پر چمڑے کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ اس کے گلے میں لاکٹ' ہاتھ میں کڑا اور ایک کان میں بندا تھا۔ اس کے بال اتنے لمبے تھے کہ وہ ذرا زیادہ جھکا تو پروڈیوسر کے منہ پر آ پڑے۔

پروڈیوسر نیاز ایک جھٹکے سے سر پیچھے کرتے ہوئے بولا.......... "یار اپنے بالوں کو قابو میں رکھو.......... میرے منہ پر گر رہے ہیں۔ ساتھ ہی جوئیں بھی میری طرف منتقل ہو رہی ہیں"۔

جو لوگ یہ جملہ اس شور شرابے میں سن پائے انہوں نے قہقہہ لگایا لیکن نوجوان ذرا بھی کھسیانا ہوئے بغیر اپنے بال سمیٹتے ہوئے بولا.......... "سر! وہ میں نے پرائیویٹ پروڈکشن والوں سے اپنا ایک قومی نغمہ کا وڈیو ریکارڈ کروا کے دیا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ ٹی وی نے وہ پروگرام خرید لیا ہے اور وہ آپ کی نگرانی میں اگلی سہ ماہی میں ٹیلی کاسٹ ہو گا؟"

پروڈیوسر کی عینک ناک پر پھسل آئی تھی۔ وہ اسے درست کرتے ہوئے نوجوان کو گھور کر بولا.......... "میرے چندا! میری جان.......... ایلوس پریسلے کے روحانی شاگرد! میں نے فون پر اس سلسلے میں بتایا تو تھا۔ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی؟"

"سر! میں نے سوچا خود آپ سے مل کر معلوم کرلوں.........." نوجوان کے لہجے میں استقلال تھا۔

"بھائی! ابھی پرائیویٹ پروڈکشن والوں سے پروگرام خریدنے کا ٹی وی والوں نے صرف شوشا چھوڑا ہے اور لوگوں نے کیسٹ لے کر اسلام آباد پہنچنا شروع کر دیا ہے۔ کچھ لوگ تو اپنے بھانجے بھتیجوں کی سالگرہ اور عقیقے وغیرہ کے وڈیوز لے کر بھی پہنچ گئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ بھی کسی نہ کسی پروگرام میں چل سکتی ہیں۔ اوپر سے ایسے بعض لوگوں کے رشتے دار بھی وزارت اطلاعات اور مواصلات میں بیٹھے ہوئے ہیں وہ سفارشی فون بھی کرنے لگتے ہیں۔ لیکن فی الحال ہم یہ بات منہ سے نکال کر بہت پچھتا رہے ہیں۔ ہمارے حال پر رحم کرو۔ یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آ رہی۔ میرا خیال ہے ہم لوگ پرائیویٹ پروڈکشن کبھی بھی نہیں خریدیں گے۔ یہ میں تمہیں اسلام آباد کی خبر بتا رہا ہوں"۔

"لیکن سر! آپ وہ کیسٹ دیکھ تو لیتے"۔ نوجوان مایوس ہوئے بغیر بولا۔

"میں نے دیکھی تھی بھائی!" نیاز احمد ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "اسی رات سے مجھے ڈراؤنے خواب آنے لگے ہیں۔ وہ تم نے قومی نغمے گائے ہیں؟"

"یس سر!" نوجوان نے متانت سے جواب دیا۔

"خدا کی پناہ!" نیاز احمد نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ "میں سمجھا تھا کہ تم ناظرین پر چیزیں کھینچ کھینچ کر مار رہے ہو اور آخر میں اچھل کر خود ان پر جا گرو گے۔ تمہاری تو باچھوں سے کف بھی بہہ رہا تھا۔ کیا مرگی کی حالت میں گا رہے تھے؟"

"نہیں سر!" نوجوان نے ذرا بھی شرمندہ ہوئے بغیر سنجیدگی سے جواب دیا۔ "وہ قومی نغمہ تھا۔ اس میں کچھ جوش و خروش دکھانا ضروری تھا میں نے اس میں اپنے جذبات ڈالے تھے سر! ہمارے ڈائریکٹر نے بھی یہی کہا تھا"۔

"وہ قومی نغمہ تھا لیکن تم نے اسے جنگلی نغمہ بنا دیا تھا۔ حرام ہے جو ڈیڑھ دو مصرعوں کے علاوہ کچھ سمجھ میں آیا ہو.......... اور وہ بھی غلط تھے۔ چچا غالب سن لیتے تو صدمے سے دوبارہ انتقال کر جاتے۔ وہ جو تم ایک مصرع گا رہے تھے اس کا مطلب تو بتاؤ.......... ظلم و ستم توڑ دیں گے' یہ ظلم و ستم کا خاتمہ کرتے تو سنا تھا۔ یہ ظلم و ستم توڑ دیں گے' اس کا کیا مطلب ہوا؟"

"سر! وہی مطلب تھا کہ ہم ظلم و ستم کا خاتمہ کر دیں گے"۔ نوجوان نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"بہت خوب.......... بہت خوب.......... ماشاء اللہ!" نیاز احمد نے سر ہلایا۔ "یہ شاعری کس کی تھی؟"

"میری اپنی تھی سر!" نوجوان کے لہجے میں فخر جھلک آیا۔

"اور میوزک کس کا تھا؟"

"وہ بھی میرا اپنا ہی تھا سر!"

"سبحان اللہ! اور شکل بھی تمہاری اپنی ہی تھی۔ کوئی ایک چیز تو کسی دوسرے کی ڈال لیتے۔ ویسے یہ تمہیں شاعری کرنے کا خیال کیونکر آیا؟"

"سر! نوزی کی شاعری پڑھ کر"۔ نوجوان نے جواب دیا۔

"یہ نوزی کون ہے؟"

"ہمارا خانساماں ہے سر! نام تو اس کا نذر حسین ہے لیکن چونکہ اسے دوسروں کی ٹوہ میں رہنے کی عادت ہے اس لئے ہم اسے نوزی کہتے ہیں"۔

"وہ شاعری کرتا ہے؟"

"یس سر!"

"وہ یقیناً شاعری کے ساتھ وہی سلوک کرتا ہوگا جو بھنڈی توری اور مرغی کے ساتھ کرتا ہوگا۔ اس سے متاثر ہو کر تم شاعری کرتے ہو۔ ظاہر ہے پھر تو تمہاری شاعری کا معیار یہی ہو سکتا ہے۔ تمہارا جو دوسرا مصرع مجھے یاد رہ گیا ہے میں ابھی تک اس کا بھی مطلب

سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ مصرع تھا۔ "میرے وطن سے ہے مجھ کو وفا" اس کا کیا مطلب ہوا؟"

"یہی کہ میں اپنے وطن کا وفادار ہوں"۔ نوجوان نے تشریح کی۔

"سبحان اللہ.......... سبحان اللہ! تم چاہتے ہو تمہاری یہ عظیم شاعری اور عظیم اچھل کود ٹی وی سے نشر ہو؟" نیاز احمد نے گویا دل پر جبر کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہماری وڈیو ضرور نشر ہوگی اور" نوجوان کے لہجے میں پہلی بار باغیانہ سا اعتماد جھلک آیا۔ "یہ شاعری جس پر آپ اعتراض کر رہے ہیں اسے آپ کے اسکرپٹ ایڈیٹر نے پاس کر دیا ہے"۔

"ضرور کر دیا ہوگا"۔ نیاز احمد نے سر ہلایا۔ "ویسے ہمارے سینٹر کے جو اسکرپٹ ایڈیٹر ہیں وہ ٹھیک چار بجے سموسے کھانے میرے کمرے میں آئیں گے۔ ان سے تو میں پوچھ لوں گا۔ انہوں نے یہ شاعری پڑھی نہیں ہوگی' صرف سونگھی ہوگی"۔

"سر! وہ ہمارے ڈائریکٹر صاحب خود بھی ٹی وی کے سابق پروڈیوسر ہیں۔ انہوں نے اسلام آباد میں بات کر لی ہے۔ ان کے بڑے ٹھیک ٹھاک تعلقات ہیں سر! وہ بتا رہے تھے کہ یہ وڈیو ٹی وی سے ضرور ریلیز ہوگا"۔ نوجوان نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بتایا۔

"یقیناً.......... یقیناً.........." نیاز احمد نے سر ہلایا۔ "اسلام آباد سے یہ ضرور نشر ہو جائے گا۔ تم لوگ اپنا زیادہ زور ادھر ہی رکھو۔ مجھے اس معاملے میں مت گھسیٹو۔ ویسے بھی پرائیویٹ پروڈکشن چلانے یا نہ چلانے کا فیصلہ جب بھی ہوگا' ظاہر ہے اسلام آباد میں ہی ہوگا اور میرا خیال ہے اس کام میں ابھی برسوں لگ جائیں گے۔ ہم لوگوں کو تو اس قسم کا کوئی اختیار ہی نہیں ہے۔ اس لئے تم میرے پیچھے لگ کر اپنا اور میرا وقت ضائع مت کرو"۔

نیاز احمد نے گویا ایک جج کی طرح کسی مقدمے کا فیصلہ سنا دیا اور نوجوان کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس کے اردگرد موجود لوگ زور و شور سے آپس میں باتوں میں مصروف تھے لیکن اختر حسین اس نوجوان سے نیاز احمد کے مکالمے میں اتنا محو ہو گیا تھا کہ اپنی آمد کا مقصد بھی بھول گیا تھا۔

اسی دوران اختر کے سامنے کھڑا ہوا کوئی شخص ہٹ گیا اور نیاز احمد کی نظر براہ راست اختر پر پڑی۔ شاید اسے کچھ احساس ہوا کہ کمرے میں اختر کی صورت کچھ اجنبی تھی اور وہ کسی سائل کے سے انداز میں کھڑا تھا۔ شاید اسی لئے نیاز احمد نے عینک کے عقب میں آنکھیں سکیڑتے ہوئے خود ہی اس سے پوچھ لیا۔ "جی.......... فرمائیے.......... آپ کس سلسلے میں آئے ہیں؟"

اختر چونکا اور ذرا ہچکچاہٹ کے ساتھ بولا۔ "جی.......... وہ.......... میرا نام اختر حسین ہے۔ آج تین بجے آپ نے مجھے آڈیشن کے لئے بلایا تھا"۔

"اوہ.......... تو آپ ہیں اختر صاحب! آیئے.......... آیئے آگے آ جایئے آپ اتنا پیچھے کیوں کھڑے ہیں میں تو آپ کا انتظار کر رہا تھا"۔ نیاز احمد کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا اختر اسے بتا نہ سکا کہ وہ تو کئی منٹ سے وہاں کھڑا تھا آگے بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے اپنی کرسی ایک طرف کو کھسکائی تو اختر ایک قدم آگے بڑھا۔

نیاز احمد نے گرم جوشی سے اس سے مصافحہ کیا۔ اختر کو اس گرم جوشی کی توقع نہیں تھی۔ خصوصاً" لمبے بالوں والے نوجوان کی درگت بنتے دیکھ کر وہ ذرا ڈر گیا تھا حالانکہ لمبے بالوں والا نوجوان بھی یقیناً" کسی لمبی ہی سفارش کے بل بوتے پر بات کر رہا تھا لیکن نیاز احمد محض ایک پروڈیوسر ہوتے ہوئے بھی اسے گھاس نہیں ڈال رہا تھا۔ اس کے اسلام آباد والے حوالوں کو بھی خاطر میں نہیں لا رہا تھا جب کہ اختر تو ویسے بھی صرف آڈیشن کے لئے آیا تھا۔ آڈیشن کی ریڈیو ٹی وی والوں کی نظر میں بھلا کیا اہمیت تھی۔ اکثر اوقات تو یہ محض خانہ پری ہوتی تھی کسی کو ٹرخانے کا ایک ذریعہ ہوتا تھا۔ اس سے پہلے اختر ایک بار ریڈیو آڈیشن دینے گیا تھا تو اسے برآمدے میں دوسرے امیدواروں کے ساتھ گھنٹوں کھڑے رہنا پڑا تھا۔

نیاز احمد کے سامنے ہی کرسی پر گورا چٹا فیشن ایبل سا نوجوان بیٹھا ہوا تھا جس کے چہرے پر خوشحالی کی چمک تھی اور اس کا لباس بتا رہا تھا کہ وہ کسی کھاتے پیتے گھرانے کا فرد تھا۔ شاید اسی کے ثبوت کے طور پر وہ انگلیوں میں گاڑی کی چابیاں بھی گھما رہا تھا۔ وہ بڑی نخوت سے ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔

نیاز احمد اسے گھورتے ہوئے بولا "تم یہاں کیوں ایک گھنٹے سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھے ہو؟ پہلے کیا یہاں بھیڑ کم ہے جو تم بھی سر پر سوار ہو"۔

نوجوان نے یکدم ٹانگ پر سے ٹانگ ہٹالی۔ اس کی نخوت یک لخت ہوا ہو گئی وہ بھیگی بلی نظر آنے لگا عاجزانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولا۔ "سر! وہ.......... آپ نے مجھے بلایا تھا ریہرسل کے لئے"۔

"بھئی ریہرسل کیا خاک کراؤں؟" ابھی وہ شاعر صاحب نغمے ہی لکھ کر نہیں لائے۔ اچھا.......... ایسا کرو.......... پہلے تم یہ کرسی تو خالی کرو.......... اور جا کر چائے سموسوں کا بندوبست کرو پھر کچھ سوچتے ہیں اب میں پرائیویٹ پروڈکشن والوں کی طرح تمہیں یہ اجازت تو دے نہیں سکتا کہ شاعری بھی تم خود ہی کر لاؤ"۔

نوجوان نے کرسی فوراً" چھوڑ دی لیکن نیاز کی طرف جھکتے ہوئے ذرا پرامید سے لہجے میں بولا۔ "سر! یہ پرائیویٹ پروڈکشن کا کیا چکر ہے؟ کیا ایسا کوئی سلسلہ چل رہا ہے؟"

"ارے بھائی! تم اس چکر میں مت پڑو"۔ نیاز احمد ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "ایسے ہی کسی

نے شوشا چھوڑ دیا ہے اول تو یہ کام بہت مشکل ہے۔ اگر ٹی وی پرائیویٹ پروڈکشن دکھانے کا سلسلہ شروع بھی ہوا تو اس میں کئی سال لگ جائیں گے۔ ابھی سے اس چکر میں انرجی ضائع مت کرو فی الحال میں جو کام کہہ رہا ہوں وہ کرو"۔

"بہتر سر!" نوجوان نے سعادت مندی سے کہا اور تیزی سے رخصت ہو گیا۔

اختر ابھی تک مودبانہ سے انداز میں کھڑا تھا۔ نیاز احمد کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ میں نے آپ کے لئے خالی کرائی ہے جلدی سے بیٹھ جایئے یہاں کی کرسیاں وزارت کی کرسیوں سے بھی جلدی دبوچ لی جاتی ہیں"۔

اختر مسکراتے ہوئے بیٹھ گیا اور تب اسے احساس ہوا کہ برابر کی کرسی پر سفید چست ریشمی لباس میں ایک خوش شکل لڑکی بیٹھی تھی جس کے کلون کی دھیمی دھیمی مہک سگریٹوں کے دھوئیں کی بو کا مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لڑکی نے متجسس سی نظروں سے اختر کی طرف دیکھا اور تب اختر کو یاد آیا کہ وہ ایک جانی پہچانی ماڈل تھی۔ اختر اسے کئی اشتہاروں میں دیکھ چکا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ماڈلنگ کرنے والی ایک لڑکی موسیقی کے پروگرام کے پروڈیوسر کے پاس کس سلسلے میں بیٹھی تھی لیکن پھر اسے خود ہی احساس ہوا کہ اس قسم کے سوالوں پہ غور کرنا حماقت تھی۔ شاید ماڈل کو گلوکاری کا شوق چرایا ہو۔ ویسے بھی شوبزنس کے تو سب شعبے ایک دوسرے میں گڈمڈ تھے۔ مصنف اداکاری کر رہے تھے اور اداکار ڈرامے لکھ رہے تھے۔ کمپیئر شاعری کر رہے تھے۔ شاعر کمپیئرنگ میں مصروف تھے بعض لوگ بیک وقت سارے کام کر رہے تھے یہ سلسلہ تو چلتا ہی رہتا تھا۔

لڑکی کے پرلے ہاتھ پر سانولا سا ایک نوجوان اس کے کندھے سے کندھا جوڑے بیٹھا تھا۔ اس کی مونچھیں چنگیز خان کی مونچھوں سے مشابہ تھیں لیکن اس کے چہرے پر مسکینی اور خبط الحواسی تھی وہ بے ترتیب کاغذوں کا ایک بہت بڑا انبار گود میں لئے بیٹھا تھا وہ شاید اس انبار میں کچھ تلاش کر رہا تھا لیکن اب اختر کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

وہیں بیٹھے بیٹھے وہ لڑکی کے سامنے بازو پھیلاتے ہوئے مصافحے کے لئے اختر کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔ "مجھے عارف کہتے ہیں نیاز صاحب کا اسٹنٹ ہوں' آپ کو فون میں نے ہی کیا تھا"۔

معلوم نہیں کیوں اس نے یہ جتانا ضروری سمجھا تھا کہ فون اسی نے کیا تھا حالانکہ اختر یہ بات محض اس کا نام سن کر بھی سمجھ سکتا تھا اس نے خوشی سے عارف سے مصافحہ کیا۔ بیچ میں بیٹھی ماڈل کبھی اختر کی طرف دیکھ رہی تھی' کبھی عارف کی طرف' خاصی تاخیر سے عارف نے اپنا ہاتھ واپس کھینچا۔

نیاز احمد نے عارف کو ذرا سخت سی نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے اختر

صاحب کے آڈیشن کے انتظامات کر لئے؟"

"سر! انتظامات تو بس مکمل ہیں نہیں صرف اسٹوڈیو بی کے خالی ہونے کا انتظار ہے۔ وہاں ڈراما سیریل جھونپڑی کے آخری سین کی ریکارڈنگ ہو رہی ہے تقریباً آدھے گھنٹے کا کام ہے۔ ان کے سیٹ پر ہی اختر صاحب کا گانا ریکارڈ کر لیں گے بیک گراؤنڈ میں استعمال کرنے کے لئے سیٹ برا نہیں ہے۔

"ٹھیک ہے.......... ٹھیک ہے"۔ نیاز احمد بیزاری سے ہاتھ ہلا کر بولا۔ "لیکن تم اصل پروگرام کا کیا کر رہے ہو اگلے بدھ کو پروگرام آن ایئر جانا ہے اور ابھی تک ایک گانا بھی نہیں ہوا"۔

"سر! وہ ہمارے شاعر افسردہ صاحب نغمے لکھ کر لائیں تبھی کام کچھ آگے بڑھے گا"۔ عارف گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "آج چار بجے کا وعدہ ہے ان کا ابھی سوا تین ہوئے ہیں۔ ہمیں چھ بجے تک ان کے آنے کی امید رکھنی چاہئے۔ ایک تو اس شخص کے گھر پر فون بھی نہیں ہے اور موصوف رہتے بھی اللہ میاں کے پچھوڑے"۔

"لیکن یہ افسردہ کو کیا ہو گیا ہے یار؟ پہلے تو یہ یہیں بیٹھے بیٹھے آدھے گھنٹے کے نوٹس پر تین چار نغمے لکھ دیا کرتا تھا"۔ نیاز احمد بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔

"سر! آپ بار بار بھول جاتے ہیں کہ افسردہ صاحب کی اب شادی ہو گئی ہے اور آپ نے ان کی شادی میں شرکت بھی کی تھی"۔ عارف نے یاد دلایا۔

"ارے ہاں.......... یاد آیا.........." نیاز احمد سرہلاتے ہوئے بولا پھر گویا اسے کچھ یاد آیا چونکتے ہوئے بولا۔ "یار! وہ افسردہ نے شادی کے موقع پر کوٹ دوسرے رنگ کا اور پتلون دوسرے رنگ کی کیوں پہن رکھی تھی؟ کیا اس موقع پر بھی کسی نے اس غائب دماغی اور خبط الحواسی پر اسے نہیں ٹوکا؟"

"آپ کو نہیں معلوم سر؟ اس کی وجہ غائب دماغی اور خبط الحواسی نہیں تھی اس کے پیچھے تو ایک درد ناک کہانی سینہ گزٹ کے ذریعے ٹی وی کا بچہ بچہ وہ کہانی سن چکا ہے"۔ عارف بولا۔

"میں اب تک کیوں اس کہانی سے محروم ہوں؟" نیاز احمد نے حیرت سے سوال کیا۔

"دراصل افسردہ صاحب درزی کے ہاں سے سوٹ لے کر ایک ہینگر پر لٹکائے ایک دوست کے پیچھے بیٹھے موٹر سائیکل پر لے کر آ رہے تھے۔ سوٹ کو انہوں نے انصاف کے ترازو کی طرح اٹھایا ہوا تھا راستے میں کہیں کوٹ کے اندر ہینگر پر سے پتلون پھسل کر گر گئی اور افسردہ صاحب کو پتہ ہی نہیں چلا عین اسی دن شادی تھی اس لئے ...."۔

"اوہ مائی گاڈ..........!" نیاز احمد نے پیشانی پر ہاتھ مارا "لیکن یار.......... شادی کے بعد یہ شخص کام میں اتنا ست کیوں ہو گیا ہے؟"

"سر! شادی سے پہلے وہ صرف تخلص کی حد تک افسردہ تھے اب سچ مچ افسردہ ہو گئے ہیں۔ غمگین قسم کے نغمے تو پھر بھی آسانی سے لکھ لیتے ہیں لیکن ذرا شوخ اور مسرت بھرے گیت لکھنے میں انہیں بڑی دقت ہونے لگی ہے"۔ عارف نے بتایا۔

"ارے یار..........! ٹی وی کے لئے شاعری کون سی مشکل ہے خوشبو چاندنی.......... چنبیلی.......... بہار.......... پیا ملن.......... پھول.......... ڈالی.......... پتے بوٹے.......... دھنک.......... کھنک.......... اس قسم کے بندھے سو ڈیڑھ سو الفاظ ہیں جنہیں ردیف قافیے وزن اور وزن میں لانا ہوتا ہے افسردہ تو اس کام میں بہت ایکسپرٹ ہے پروفیشنل ہے اس مرتبہ آنے دو میں ذرا اس کی خبر لوں گا ویسے بھی ہماری شاعری کون سنتا ہے زیادہ تر لوگ تو گلوکار یا گلوکارہ کو ہی دیکھتے رہتے ہیں"۔

اختر خاموش بیٹھا یہ ساری گفتگو اور ارد گرد ابھرتی ہوئی دوسری بھانت بھانت کی آوازیں سن رہا تھا۔ نیاز احمد چند لمحے کے لئے اپنے مسئلے میں الجھ کر اسے گویا بالکل بھول گیا تھا۔ اچانک ہی اسے گویا اختر دوبارہ یاد آیا اور اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ "آپ کو تھوڑی دیر انتظار کی زحمت اٹھانا پڑے گی اسٹوڈیو خالی ہو جائے تو ہم ایک آدھے گھنٹے میں یہ کام نمٹالیں گے صرف آپ ہی کا آڈیشن لینا ہے تب تک آپ یہ فارم پر کر دیں"۔ اس نے میز کی دراز سے ایک فارم نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا اختر کو محض اپنے کوائف اس میں درج کرنا تھے۔

اختر فارم پر کر کے فارغ ہی ہوا کہ سموسوں سے بھری ایک طشتری لے کر ایک بیرا کمرے میں آن پہنچا۔ ماڈل اور اختر کے سوا باقی سب لوگ سموسوں پر ٹوٹ پڑے۔ نیاز احمد نے نہایت اصرار کے ساتھ دعوت تو انہیں بھی دی تھی لیکن انہوں نے معذرت کر لی تھی۔ اختر گلا خراب ہونے کے ڈر سے بلا ضرورت بازار کی چیزیں نہیں کھاتا تھا اور ماڈل کو غالباً اپنے وزن کا خیال تھا۔

کچھ دیر بعد چائے آ گئی چائے نوشی میں بہرحال اختر نے شرکت کر لی۔ اس کے کپ رکھتے ہی نیاز احمد نے عارف کو حکم دیا۔ "تم اختر صاحب کو لے جا کر ان کا میک اپ تو کراؤ.......... تھوڑی ریہرسل کرا دو.......... یہاں تو کچھ نہیں ہو سکتا تیاریاں مکمل ہو جائیں تو مجھے بلوا لینا"۔

اختر' عارف کے ساتھ چل دیا' میک اپ وغیرہ کے مرحلے سے گزرنے کے بعد عارف اسے اسٹوڈیو میں لے گیا۔ وہاں ڈرامے کی ریکارڈنگ ختم ہو چکی تھی لیکن سیٹ ہٹایا نہیں گیا تھا۔ اس منظر میں فٹ پاتھ' درخت اور بجلی کا کھمبا وغیرہ شامل تھے۔ عارف نے اسے کیمرے کا سامنا کرنے' حرکات و سکنات پر قابو رکھنے اور ریکارڈنگ کی اصطلاحات وغیرہ کو سمجھنے کے سلسلے میں ضروری ہدایات دیں۔ آڈیشن کے لئے اسے ایک پرانا ہی نغمہ دیا گیا جس

کا میوزک ٹریک پہلے ہی سے تیار شدہ موجود تھا۔

اختر کی پہلے آڈیو اور پھر وڈیول ریکاڈنگ مکمل ہو گئی تو پروڈیوسر نیاز احمد سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا اور دوستانہ سے انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ٹہلتے ہوئے ہارڈ بورڈ کی ایک دیوار کے قریب پہنچ کر نیچی آواز میں بولا۔ "یہ ٹیپ میں آج ہی ایڈٹ کرا کے دیکھ لوں گا ویسے میں ابھی سے آپ کو بتا دیتا ہوں کہ آپ او کے ہیں۔ مجھے ڈر تھا کہ آپ بھی زیادہ تر سفارشی لوگوں کی طرح کمزور چیز نہ ہوں لیکن آپ بہرحال فنکار ہیں"۔

"شکریہ"۔ اختر کے لہجے میں حقیقی ممنونیت تھی۔

"تاہم رسمی طور پر نتیجہ جاننے کے لئے کل فون کر لیجئے گا اور پرسوں اس اصل گانے کی ریہرسل اور ریکاڈنگ کے لئے آ جایئے گا جسے ہم جوان ترنگ میں شامل کریں گے وہ پروگرام اگلے بدھ کو آن ایئر جائے گا"۔ یہ کہہ کر نیاز احمد نے سگریٹ سلگائی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد نیاز احمد پرخیال سے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے آپ کو پروموٹ تو کرنا ہی ہے.......... لیکن کام ذرا آہستہ آہستہ ہو گا تاکہ مجھ پر کوئی الزام نہ آ جائے محسوس یہی ہونا چاہئے کہ آپ زینہ بہ زینہ آگے بڑھ رہے ہیں"۔

پھر وہ مشورہ دینے کے سے انداز میں بولا۔ "ویسے تو جلدی ہی اسٹیج اور پریس کے لوگ خود بخود آپ کی طرف متوجہ ہوں گے لیکن اگر آپ ابھی سے ان سے پبلک ریلیشننگ شروع کر دیں تو زیادہ اچھا ہے۔ آپ تو ہوٹل میں گاتے ہیں وہاں تو بڑے بڑے کام کے لوگ آتے ہیں.......... بلکہ آپ کو تو کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ بیگم صاحبہ سے ہی کہہ دیجئے گا کہ وہ آپ کو اسٹیج اور پریس کے کچھ خاص خاص لوگوں سے متعارف کرا دیں۔ اونچی سطح پر ہر کام کا اور ڈھنگ کا آدمی بیگم صاحبہ کو جانتا بھی ہے اور مانتا بھی ہے.......... اور آپ ان کے عزیز ہیں امید ہے آپ بہت لمبا سفر بہت تھوڑے عرصے میں طے کر لیں گے"۔

اختر خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بیگم صاحبہ سے اس کی مراد یقیناً" رمنا رئیس تھی اس کے رویے اور گفتگو سے ظاہر ہو رہا تھا کہ رمنا نے خود نیاز احمد کو اپروچ نہیں کیا تھا بلکہ نیاز کو اختر کے بارے میں ہدایات کہیں اوپر سے ملی تھیں۔ رمنا نے اختر کو اپنا عزیز ظاہر کیا یہ بھی اس کے لئے گویا ایک اعزاز تھا لیکن یہ جان کر اس کے دل میں اپنی غربت کا احساس کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ اگر کبھی کسی نے آ کر دیکھ لیا کہ وہ کہاں رہتا ہے اور کس حال میں رہتا ہے تو وہ کیا سوچے گا؟ بیگم رمنا رئیس کا عزیز.......... اور اس حال میں..........؟ یہ سوچتے ہوئے اس کے جسم میں لہو کی گردش ذرا سست پڑنے لگی تاہم وہ نیاز احمد کے مشوروں پر سعادت مندی سے سرہلاتا رہا اس نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لی تھی کہ دولت مندوں کے سبھی رشتے دار تو دولت مند نہیں ہوتے۔

ٹہلتے ٹہلتے وہ نیاز احمد کے کمرے میں واپس آ گئے جہاں اب بھیڑ چھٹ چکی تھی نیاز احمد کرسی سنبھالتے ہوئے بولا۔

"پرسوں جب آپ آئیں تو اپنے طور پر بھی کوئی ایسا نغمہ یا غزل تیار کر کے لائیں جو نوجوان کے پروگرام کے لئے موزوں ہو۔ نہ زیادہ بوجھل اور حد سے زیادہ سنجیدہ ہو اور نہ ہی چیپ بس کوئی ہلکی پھلکی سی چیز ہو لیکن کوشش کریں کہ کسی ایسے شاعر کا کلام ہو جو اسی شہر میں دستیاب ہو کیونکہ ہمیں شاعر سے بھی کنٹریکٹ سائن کرانا پڑتا ہے اور ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم کہیں اور سے کنٹریکٹ سائن کروا کے منگوا سکیں"۔

اختر نے اثبات میں سرہلا دیا نیاز احمد بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میرا پروگرام جواں ترنگ' تو آپ دیکھ ہی رہے ہوں گے اس کا پیٹرن نہ تو حد سے زیادہ جدید ہے اور نہ ہی زیادہ پرانا ہمارے گلوکار نہ تو وحشیانہ قسم کی اچھل کود کرتے ہیں اور نہ ہی اس قسم کی ایکٹنگ کرتے ہیں جیسے انہیں چودہ سو وولٹ کرنٹ لگ گیا ہو لیکن میرے پروگرام گنڈیری پسند طبقے کے لئے بھی نہیں ہوتے"۔

"گنڈیری پسند طبقہ..........؟" اختر نے حیرت سے دہرایا۔

"اوہ.......... آپ نہیں سمجھے ہوں گے"۔ نیاز احمد نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ "آپ نے دیکھا ہو گا موسیقی کے اکثر پروگراموں میں گلوکار ایک چھوٹے سے گول پلیٹ فارم پر بیٹھ کر ہارمونیم سامنے رکھ کر کچھ پتھرایا ہوا سا چہرہ لے کر گاتا ہے۔ جس گول سے چبوترے پر بیٹھ کر وہ گاتا ہے اسے ہم لوگ گنڈیری کہتے ہیں بعض لوگوں کو ابھی تک گانے کا یہی انداز بہت پسند ہے انہیں ہم گنڈیری پسند طبقہ کہتے ہیں"۔

"اوہ..........!" اختر اس وضاحت پر گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"میں اپنے پروگراموں کو اعتدال پر رکھنے کی کوشش کرتا ہوں"۔ نیاز احمد بولا۔ "نہ تو انہیں ایسا بناتا ہوں کہ وہ موسیقی کے بجائے ریسلنگ کے پروگرام معلوم ہونے لگیں اور نہ ہی انہیں ایسا رنگ دینے کی کوشش کرتا ہوں کہ مسرت بھرے نغمے پر بھی رونے کو جی چاہنے لگے۔ اس حساب سے ایک آئٹم آپ تیار کر کے لے آیئے گا پرسوں تک ہمارے پاس بھی نغمے آ چکے ہوں گے میں ان میں سے ایک آپ کے لئے بچا کر رکھ لوں گا اس کی ریہرسل آپ یہاں آ کر ہی کر لیجئے گا۔ دونوں میں سے جو چیز اچھی بن گئی اسے پروگرام میں شامل کر لیں گے"۔

"جی.......... بہت بہتر"۔ اختر نے سعادت مندی سے سرہلایا۔ "اب مجھے اجازت ہے؟"

"ٹھیک ہے کل مجھے فون کر لیجئے گا"۔ نیاز احمد نے کرسی سے کھڑے ہو کر اسے رخصت کیا۔ لوگوں کو گویا خبر مل گئی تھی کہ نیاز احمد اپنے کمرے میں آ گیا ہے۔ فوراً" ہی ان

کی آمد شروع ہو گئی تھی اختر ابھی دروازے تک نہیں پہنچا تھا کہ سانولا سا ایک نوجوان جس کے بال لمبے اور منتشر تھے، ٹائی ڈھیلی ہو کر گلے میں جھول رہی تھی ایک بریف کیس بغل میں دبائے کمرے میں داخل ہوا پتلی دبلی سی ایک لڑکی اس کے پیچھے تھی جس نے اپنے بالوں کا گنبد سا بنا رکھا تھا۔

ان پر نظر پڑتے ہی نیاز احمد نے اختر کو آواز دی۔ "اختر صاحب! ابھی آپ مت جایئے واپس آ جایئے"۔

اختر قدرے حیرانی سے نیاز کی میز پر واپس جا پہنچا نیاز احمد بے یقینی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "بھئی آپ بہت ہی خوش قسمت نوجوان معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کی آمد اتنی مبارک ثابت ہوئی ہے کہ آج ہمارے شاعر افسردہ صاحب زندگی میں پہلی بار اسی وقت پر آن پہنچے ہیں جس کا انہوں نے وعدہ کیا تھا........."

یہ کہتے ہوئے اس نے اس سانولے سے نوجوان کی طرف اشارہ کیا جو اختر کے سامنے ہی کمرے میں داخل ہوا تھا۔ بھڑکیلے نارنجی سے لباس والی دبلی پتلی لڑکی اس کے شانہ بہ شانہ تھی اور مسلسل مسکرائے جا رہی تھی۔

نیاز احمد اور افسردہ ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے پھر نیاز نے اختر کو بھی اس سے متعارف کرایا۔ اختر نے افسردہ کا نام تو خاصا سنا تھا اس کا خیال تھا کہ وہ کوئی ادھیڑ عمر کا شخص ہو گا لیکن وہ اس کے اندازے سے کم عمر نکلا تھا۔ وہ پان چبا رہا تھا سگریٹ اس کی انگلیوں میں لرز رہی تھی ناک پر سستا سا ایک سیاہ چشمہ ٹکا ہوا تھا جسے اتار کر اس نے بغور اختر کا جائزہ لیا پھر بریف کیس میز پر پٹختے ہوئے ایک کرسی پر ڈھیر ہو کر بولا۔ "بھئی نیاز صاحب! چائے منگوایئے ہم نارتھ کراچی سے رکشے میں آ رہے ہیں اور ہمارے دماغ کی چولیں ہل گئی ہیں"۔

"آپ کے دماغ کوئی چول سیدھی تو پہلے ہی نہیں تھی۔ اب چولیں ہل بھی گئی ہیں؟" نیاز احمد نے تشویش سے پوچھا۔

"ہا......... ہا......... ہا......... ہا........." افسردہ نے نیاز احمد کے ہاتھ پہ ہاتھ مارتے ہوئے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ "یار نیاز صاحب! ایک تو آپ مذاق بہت کرتے ہیں"۔

"بس......... آپ کی سنجیدہ شاعری پڑھ پڑھ کر میری طبیعت مزاحیہ سی ہو گئی ہے"۔ نیاز بولا وہ سب بیٹھ چکے تھے افسردہ کے ساتھ آنے والی لڑکی کا تعارف نگار کے نام سے کرایا گیا تھا۔ وہ بدستور خاموشی سے مسکرائے جا رہی تھی۔ وہ عام سے نین نقش کی لڑکی تھی لیکن اس کی مسکراہٹ خوبصورت تھی۔ اس بات کا شاید اسے خود بھی علم تھا اس لئے وہ مسلسل مسکرائے جا رہی تھی۔ اختر نے محسوس کیا کہ کوئی غم ناک خبر سن کر بھی اسے اپنے

ہونٹوں سے مسکراہٹ ہٹانے میں کچھ دیر لگتی ہو گی۔

نیاز احمد نے فون پر کینٹین والے کو چائے کا آرڈر دیا اور دوبارہ افسردہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ "حضرت! آپ کا بریف کیس میز پر پھینکنے کا انداز بتا رہا ہے کہ آپ کچھ لکھ لائے ہیں"۔

"ارے......... بس......... کچھ پوچھو مت"۔ افسردہ نے اپنے لمبے لمبے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ بالوں میں خاصی مٹی نظر آ رہی تھی۔ "میں نے آپ کے سارے گلے شکوے دور کر دیئے ہیں۔ اپنے حصے کے اگلے تین پروگراموں کے نغمے لکھ لایا ہوں باقی آپ کو دوسرے شاعروں سے لینے ہی ہیں بہرحال میری طرف سے نغمے ہی نغمے حاضر ہیں........." اس نے بریف کیس کو تھپتھپایا۔

پھر افسردہ خود ہی اپنی بات پر پھڑک اٹھا۔ "واہ......... کیا بات نکلی ہے منہ سے نغمے ہی نغمے میں تو کہتا ہوں اگلے کوارٹر میں بھی اگر آپ کو موسیقی کا پروگرام ملا تو یہی نام رکھ دینا نغمے ہی نغمے، عمدہ نام ہے"۔

"ارے افسردہ صاحب! یہ بات کر کے تو آپ نے ہمیں بھی افسردہ کر دیا۔ میرا مطلب ہے اپنے جیسا افسردہ نہیں بلکہ سچ مچ کا افسردہ"۔ نیاز ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "اپنی قسمت میں موسیقی کے پروگرام کہاں یہ تو اس کوارٹر میں ہی معلوم نہیں کیسے مل گیا۔ موسیقی کے پروگراموں کا تو بس ان خاتون پروڈیوسر کو ٹھیکہ ملا ہوا ہے مستقل طور پر"۔

"دل چھوٹا نہ کریں نیاز صاحب! آپ کا "جواں ترنگ" ہٹ جا رہا ہے۔ اگلے کوارٹر میں بھی موسیقی کا پروگرام اپنے ہی کھاتے میں سمجھیں یہ درویشوں کی پیشگوئی ہے لکھ کر رکھ لیں یہ بات"۔ افسردہ سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

"اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔ خیر چھوڑیں ان باتوں کو آپ اپنی یہ عمرو عیار کی زنبیل تو کھولیں دیکھیں کیا مال مسالا لائے ہیں آپ"۔ نیاز نے افسردہ کے پرانے سے بریف کیس کی طرف اشارہ کیا۔

"کھولتے ہیں ایسی جلدی بھی کیا ہے ذرا چائے تو آ جانے دیں"۔ افسردہ کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

"ویسے......... افسردہ صاحب! میری مانیں تو آپ یہ غزلیں وغیرہ بریف کیس میں رکھ کر مت گھوما کریں اوپر سے آپ اتنی محبت سے اسے بغل میں دبائے رکھتے ہیں کوئی ڈاکو دیکھ لے گا تو سمجھے گا معلوم نہیں یہ حضرت اس بریف کیس میں کتنی رقم دبائے جا رہے ہیں۔ کہیں کوئی پستول وغیرہ دکھا کر چھین کر نہ لے جائے"۔ نیاز احمد بولا۔

"ڈاکو بھی آپ کی طرح بڑے مردم شناس ہوتے ہیں نیاز صاحب! وہ ہمیں پہچاننے میں غلطی نہیں کرتے ہوں گے ہم تو صورت سے ہی شاعر نظر آتے ہیں اگر یہ بات نہ ہوتی

تو اب تک لٹ چکے ہوتے یہ بریف کیس چھینا جا چکا ہوتا"۔ افسردہ مسکراتے ہوئے بولا۔ اور اگر غلطی سے کبھی کوئی ڈاکو یہ بریف کیس لے بھی گیا تو سر پر ہاتھ رکھ کے روئے گا میں سے تو چند تصاویر بتاں اور حسینوں کے خطوط بھی نہیں نکلیں گے چند پرا اسکرپٹ............ ردی کاغذ چند غزلیں............ چند نظمیں............ چند گیت ان کے علاوہ اس میں کیا رکھا ہے"۔

"ہاں"۔ نیاز نے سر ہلایا۔ "حسینوں کے خطوط اور تصاویر بتاں تو آپ نے شادی کے بعد نکال دی ہوں گی بریف کیس سے"۔

"ارے ہاں بھئی............" افسردہ کو جیسے کچھ یاد آیا اور وہ چونک کر سیدھے ہو ہوئے بولا۔ "وہ آپ نے نگار کے بارے میں کیا سوچا؟" اس نے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑ کی طرف اشارہ کیا۔ "پچھلے ہفتے آپ نے اس کا جو ویڈیو بنوایا تھا وہ کیسا لگا؟"

"افسردہ صاحب!" نیاز نے مصنوعی سنجیدگی سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "اب آپ کی شادی ہو گئی ہے اب تو آپ ادھر ادھر کی لڑکیوں کی سفارشیں کرنا چھوڑ دیں۔ آ کی بیوی کو معلوم ہو گیا تو آپ کا کیا حشر ہو گا؟"

"وہ دن آنے سے پہلے ہی تو میں چاہتا ہوں کہ جتنی لڑکیوں کی سفارش کر سکتا ہو کر ڈالوں"۔ افسردہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "بلکہ سچ پوچھو تو شادی کے بعد تو لڑکیوں سفارش کرنے کو زیادہ جی چاہنے لگا ہے۔ اب تو وہ لڑکیاں بھی یاد آتی ہیں جن سے اس زمانے میں ملاقات ہوئی تھی جب کوئی ٹی وی اسٹیشن میں گھسنے بھی نہیں دیتا تھا اگر اب مل جائیں تو ان سب کی بھی سفارش کر ڈالوں"۔

"ان سب کی آوازیں اب اپنے چار چار چھ چھ بچوں کو ڈانٹتے ڈانٹتے بہت بری چکی ہوں گی اب تو خطرے کے سائرن کے طور پر کام آتی ہوں گی"۔ نیاز احمد نے خیال ظا کیا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ان سبھی کو گلوکارہ بننے کا شوق تو نہیں تھا ان میں کسی کو پینٹنگ سے شغف تھا کوئی افسانہ نگار بننا چاہتی تھی کوئی شاعرہ بننے کا عزم رکھتی تھ اور کوئی ٹی وی آرٹسٹ بننا چاہتی تھی۔ آہ............ کیا لڑکیاں تھیں"۔ افسردہ نے ٹھنڈ سانس لی۔

"شکر ہے ان کی زیادہ عرصے آپ سے شناسائی نہیں رہی ورنہ وہ گھر کی رہتیں گھاٹ کی"۔ نیاز احمد بولا۔

"دیکھیں نیاز صاحب! آپ نگار کو مجھ سے برگشتہ کرنے کی کوشش نہ کریں میں ا بتا چکا ہوں کہ ایک روز یہ ملک کی صف اول کی گلوکارہ بنے گی یہ درویشوں کی پیش گوئی اسے آپ دل پر لکھ لیں"۔ افسردہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"اب میرے دل پر مزید پیش گوئیاں لکھنے کی جگہ نہیں رہی"۔ نیاز بولا پھر وہ براہ راست لڑکی سے مخاطب ہوا۔ "دیکھو بی بی! تم افسردہ صاحب کی پیش گوئی پر نہ جانا یہ اس سے پہلے بھی تقریباً" دو سو اسی لڑکیوں کے بارے میں پیش گوئی کر چکے ہیں کہ وہ ملک کی عظیم گلوکارہ بنیں گی وہ باقی سب کچھ بن گئی ہوں گی بس گلوکارہ نہیں بن سکیں"۔

"نیاز صاحب............!" لڑکی کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولی۔ "افسردہ صاحب کی سفارش اپنی جگہ ہے لیکن میں اپنی صلاحیتوں کے بل پر آگے بڑھنا چاہتی ہوں۔ بس تھوڑی سی آپ کی نظر کرم چاہئے ویسے گائیگی ہمارا جدی پشتی کام ہے"۔ عجیب کھرکھراتی ہوئی سی آواز تھی اس کی تاہم اختر کو معلوم تھا کہ کسی گانے والے کو عام گفتگو کرتے دیکھ کر اس کی آواز کے بارے میں فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عام گفتگو میں تو اکثر گانے والوں کی آواز کھرکھری ہی محسوس ہوتی تھی لیکن جب وہ سر میں آ کر گانا شروع کرتے تھے تو آواز بدل جاتی تھی۔

لڑکی اپنی اسی میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "آپ نے پرائیویٹ اسٹوڈیو میں میرا جو ویڈیو تیار کرایا تھا وہ تو دیکھ لیا ہو گا کیا رائے ہے میرے بارے میں آپ کی؟ مجھے چانس مل سکتا ہے یا نہیں؟"

نیاز احمد نے سر جھکا کر کن انکھیوں سے اختر کی طرف دیکھا شاید وہ جائزہ لے رہا تھا کہ پرائیویٹ اسٹوڈیو میں وڈیو تیار کرانے کا ذکر سن کر اختر زیادہ چونکا تو نہیں؟ مگر اختر چہرے پر محض رسمی سی دلچسپی کا تاثر لئے ان کی گفتگو سن رہا تھا وہ ابھی تک سمجھ نہیں سکا تھا کہ نیاز احمد نے اسے جاتے جاتے روک کیوں لیا تھا۔

نیاز احمد گویا اختر کی طرف سے مطمئن ہو کر دوبارہ لڑکی کی طرف متوجہ ہوا اور سگریٹ کا گہرا کش لے کر بولا۔ "سچی رائے بتاؤں یا منافقانہ؟"

"سچی بات بتائیں جی منافقانہ باتیں تو ہم صبح سے رات تک اور رات سے صبح تک سنتے ہی رہتے ہیں"۔ لڑکی بولی اس لمحے وہ اختر کو بہت سچی سچی سی لگی ورنہ اس سے پہلے اسے لڑکی کی ہر ادا اور ہر لفظ سے تصنع جھلکتا محسوس ہو رہا تھا۔

"سچی بات یہ ہے نگار............!" نیاز گہری سانس لے کر بولا۔ "کہ تم میں صرف دو خوبیاں ہیں ایک تو یہ کہ تم لڑکی ہو دوسرے یہ کہ تمہاری مسکراہٹ بہت خوبصورت ہے"۔

لڑکی کا چہرہ بجھ بجھ سا گیا خوبصورت مسکراہٹ ماند پڑ گئی وہ ذرا دھیمی آواز میں بولی۔ "بس............؟ اور کچھ نہیں............؟"

"اور کچھ نہیں"۔ نیاز اس سے نظر چراتے ہوئے بولا۔ "گانا وانا ابھی تمہارے بس کی بات نہیں تمہیں چاہئے کہ دو چار سال کسی اچھے استاد کی شاگردی کرو"۔

"میں نے آپ کو بتایا تو تھا جی............ کہ میں تو بچپن سے ہی استاد مکرم علی خان

کی شاگرد ہوں۔ چھ سال کی عمر سے ان سے گانا سیکھ رہی ہوں"۔ لڑکی گویا رد کئے جانے
صدمے سے سنبھلتے ہوئے بولی۔

"تو پھر استاد مکرم علی سے کہو کہ وہ خود کچھ عرصہ کسی اچھے استاد کی شاگردی کرے
نیاز احمد بلا تامل بولا۔

افسردہ نے اسی لمحے اپنی شکن آلودہ قمیض پر سے ایک انگلی سے گرد جھاڑ کر کچھ
سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بھئی نیاز صاحب! کبھی کبھی تو آپ حد سے زیادہ ہی بدلحاظ
سفاک سے ہو جاتے ہیں یکدم ہی دل شکنی کی باتیں شروع کر دیتے ہیں"۔

"ایک پروڈیوسر کو اکثر اس حد تک سفاک ہونا ہی پڑتا ہے"۔ نیاز بولا۔ "خاص طو
میں تو کسی کو جھوٹی امید دلانے کی نسبت پہلی ہی مرتبہ اسے سچی بات بتا دینا بہتر سمجھتا ہوا
دل شکنی کی تکلیف صرف ایک بار ہوتی ہے جھوٹے وعدوں کی تکلیف بار بار ہوتی ہے"۔

پھر شاید وہ لڑکی کے چہرے پر پھیلنے والی مایوسی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا
سوچ کر بولا۔ "لیکن فی الحال تم اپنے شوق کی تسکین کے لئے کوئی دوسرا راستہ اختیار کر
ہو میں تمہیں کسی ڈرامہ پروڈیوسر سے متعارف کرائے دیتا ہوں ڈرامے کے میدان میں ؛
گنجائش ہوتی ہے ہر طرح کا آدمی کہیں نہ کہیں' کسی نہ کسی طرح کھپ جاتا ہے لیکن گا
کا مسئلہ بڑا نازک ہے۔ اس میں جب تک انسان کے پاس آواز نہ ہو وہ نہیں چل سکتا۔ ا
میں یہ تو کر نہیں سکتا کہ اسکرین پر چہرہ اور خوبصورت مسکراہٹ تو تمہاری دکھاؤں اور آ
پیچھے ملکہ ترنم نور جہاں کی ڈال دوں۔ تم فی الحال ٹی وی پر آنے کا شوق ڈرامے کے ذر
پورا کرنے کی کوشش کرو"۔

"کہیں ڈرامے کا پروڈیوسر بھی بہت سارے چکر لگوانے کے بعد یہی نہ کہہ دے
نگار کے لہجے میں اندیشے تھے۔

"نہیں میں تمہیں ایسے پروڈیوسر کے پاس نہیں بھیجوں گا ایسے پروڈیوسر کے پا
بھیجوں گا جو تم سے کوئی نہ کوئی کام لے ہی لے گا تمہارا ٹی وی پر آنے کا شوق بہرحال پو
ہو جائے گا"۔ نیاز احمد نے بڑے خلوص سے وعدہ کیا پھر وہ افسردہ کی طرف متوجہ ہو
ہوئے بولا۔ "اب ذرا نغمے نکالئے آپ کو دیکھ کر میں نے اختر صاحب کو جاتے جاتے رو
لیا ہے"۔

افسردہ نے بریف کیس کھولا اوز کاغذوں کا ایک پلندہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا ؛
احمد نے ان پر سرسری نظر ڈالی اور بولا۔ "آپ کے پاس ان سب کی نقل تو موجود ہے نا؟"

"ہاں میں نے فوٹو اسٹیٹ کروا لی ہیں"۔ افسردہ نے جواب دیا۔

نیاز احمد نے وہ سارے کاغذ اختر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ میں ان میں
کوئی بھی ایک نغمہ........ جو آپ کو اچھا لگے........ اپنے لئے لے جائیے اور ہو

تو پرسوں اپنے طور پر اس کی کوئی دھن بنا کر لے آئیے گا مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ موسیقار
بھی ہیں اس سے کافی آسانی ہو جائے گی ہمارا موسیقار آپ کی دھن سن لے گا اگر وہ اچھی
ہوئی تو اسے ہی استعمال کر لیں گے ورنہ ہمارا موسیقار کچھ بنا لے گا۔ مقصد یہ کہ مل جل کر
کام کر لیں گے میں چاہتا ہوں زیادہ سے زیادہ صاحب فن قسم کے لوگ مل جل کر کئی کئی
چیزیں تیار کرتے رہیں اور ان میں سے جو بہتر ہو ٹی وی پر پیش کر دی جائے۔ میرا طریقہ کار
یہی ہے ایک آدھ آئٹم آپ اپنا بھی تیار کر کے لائیے گا اگر دونوں ہی چیزیں اچھی بن گئیں
تو ایک اگلے پروگرام میں بھی ڈال لیں گے"۔

"بہت بہتر"۔ اختر نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور حتی الامکان توجہ سے نغمات کا
مطالعہ کرنے لگا۔

اس کے خیال میں یہ ایک اعزاز ہی تھا کہ نیاز احمد نے اسے سب سے پہلے اپنی پسند کا
نغمہ چننے کا اختیار دے دیا تھا۔ اس کا آڈیشن بھی یقیناً ایک رسمی کارروائی تھا اسے پرسوں نغمہ
ریکارڈ کرانے تقریباً" یقینی طور پر ہی آنا تھا جب کہ اپنے سامنے وہ نیاز احمد کے منہ سے ایک
لڑکی کے لئے انکار سن چکا تھا یہ سب کچھ اس کے لئے بالکل خلاف توقع تھا۔ اس نے ٹی
وی کے بارے میں بہت افسانے سن رکھے تھے بیشتر لوگوں کو اس نے یہی کہتے سنا تھا کہ لڑکی
کو ٹی وی پر سفارش کی ضرورت ہی نہیں تھی لڑکی ہونا بجائے خود ایک سفارش تھا۔

اس کا ذہن ان گنت خیالات میں الجھا ہوا تھا تاہم اس نے اپنے لئے ایک نغمہ چن ہی
لیا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اسے وہ اچھے سروں میں گا سکتا تھا اس کی دھن بھی اچھی بننے
کی امید تھی اور اس کے بول بھی جاندار تھے جس دوران وہ نغمے کے انتخاب میں محو تھا
کمرے میں اس دوران بوجھل سی خاموشی ہی طاری رہی شاید نگار کی افسردگی کے اثرات ہوا
میں بھی پھیل گئے تھے۔ اختر خود بھی اپنے دل میں تاسف کی لہر محسوس کر رہا تھا۔ کسی بھی
شخصیت کا کسی بھی سلسلے میں مسترد کیا جانا ایک بڑا ہی اذیت ناک عمل تھا' خوابوں کی شکست
تھی۔

نیاز احمد نے اس کا منتخب کردہ نغمہ دیکھ کر سر ہلایا اور کاغذ دوبارہ اس کی طرف بڑھا دیا
اختر کاغذ تہہ کر کے احتیاط سے جیب میں رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اجازت طلب کر کے باہر آ
گیا۔

ٹی وی اسٹیشن کی عمارت سے نکل کر وہ پیدل اسٹیڈیم روڈ کی طرف چل دیا۔ سڑک
پر پہنچ کر وہ کونے پر ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو کر گویا اپنے حواس درست کرنے لگا اس
کا دماغ گھوم رہا تھا وہ ٹی وی اسٹیشن میں صرف دو گھنٹے گزار کر آیا تھا۔

لیکن اسے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک طویل سفر طے کر کے آ رہا تھا ایک
الگ ہی دنیا سے گزر کر آ رہا تھا اور یہ سب کچھ اسے خواب خواب سا لگ رہا تھا۔

اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس جیسے بے وسیلہ لوگ جن کامیابیوں کے لئے برسوں تک و دو کرتے رہتے تھے وہ کسی کے ایک اشارے پر جھولی میں آگئی تھیں اس امر کا تو اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ سہارے کتنے اہم ہوتے ہیں اس پہلو پر تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا اور نہ ہی اسے کبھی یہ گمان گزرا تھا کہ تلاش کئے بغیر ہی خود بخود کوئی سہارا اس کے سامنے آ کھڑا ہو گا۔

پھر اسے یونیورسٹی میں بدمعاش اور لفنگے قسم کے لڑکوں کے ایک گروپ کے درمیان ہونے والی بات چیت یاد آگئی وہ اس روز مجبوراً" ان لوگوں کے درمیان بیٹھا تھا بیٹھا کیا تھا بس پھنس گیا تھا۔ وہ اس قسم کے لڑکے تھے جو پڑھائی کے سوا دنیا کے باقی ہر کام میں بہت تیز ہوتے ہیں۔ بہت چالاک' عیار' سفاک اور موقع پرست جو اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے کچھ بھی کر گزرتے تھے سیاست میں بھی زیادہ تر اسی قسم کے لڑکے آگے رہتے تھے۔

بات ہو رہی تھی کہ ہر کامیابی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اختر کے نزدیک تو اس کہاوت کا مطلب یہی تھا کہ عورت کے ہاتھوں اچھی تربیت پا کر ہی انسان بڑی کامیابیوں سے ہمکنار ہوتا ہے یعنی اس عورت سے مراد ماں تھی یا پھر کبھی ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ اپنی رسائی سے بہت اونچی کسی عورت کو پانے کی لگن میں مرد اتنی محنت کرتا تھا کہ ناممکن کو ممکن بنا کر دکھا دیتا تھا اس صورت میں بھی کہا جا سکتا تھا کہ اس شخص کی کامیابی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ تھا۔

لیکن اختر کی یہ تشریح سن کر ایک نہایت خرانٹ قسم کے لڑکے جاوید نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا تھا۔

"کس دنیا میں رہتے ہو بھولے بادشاہ؟ ایک زمانہ گزر چکا ہے کہ بہت سے محاوروں کے مفہوم تبدیل ہو چکے ہیں رفتہ رفتہ باقی محاوروں کے مفہوم بھی تبدیل ہو جائیں گے"۔

"کیا مطلب؟" اختر نے سادگی سے پوچھا تھا۔

"ابے الو کی دم!" جاوید نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا تھا "یہ جو بات کی جاتی ہے نا.......... کہ ہر بڑی کامیابی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ آج کے دور میں اس سے مراد وہ عورت ہوتی ہے جسے سیڑھی بنا کر مرد آگے بڑھتا ہے اپنا کوئی بڑا کام کرا لیتا ہے اس کے بعد بس کامیابیاں ہی کامیابیاں.......... یا پھر کامیابیاں تو اس کے کھاتے میں پہلے بھی بہت سی موجود ہوتی ہیں۔ دنیا کی ہر نعمت اور آسائش اس کے پاس موجود ہوتی ہے لیکن قناعت اس کے نصیب میں نہیں ہوتی وہ سب کچھ سمیٹ لینا چاہتا ہے سب کچھ فتح کر لینا چاہتا ہے اس کے لئے وہ ہر حربہ استعمال کرتا ہے جہاں روپیہ چل سکتا ہے وہاں روپیہ.......... اور جہاں روپیہ بھی الجھی ہوئی ڈوریوں کو نہیں سلجھا سکتا وہاں کوئی خوبصورت سی عورت جاتی ہے اور اپنی نازک مرمریں انگلیوں سے بڑی بڑی مضبوط گرہیں

کھول کر چلی آتی ہے۔ وہ عورت کوئی بھی ہو سکتی ہے.......... اور اب تو وہ زمانہ آن لگا ہے کہ وہ عورت اس کی اپنی بیوی بھی ہو سکتی ہے۔ کہیں کوئی بہت بڑا ٹھیکہ پھنسا ہوا ہے.......... روپیہ بھی اپنا کام دکھا رہا ہے.......... مگر رات کو کسی کی خوبصورت' فیشن ایبل بیوی دبے قدموں اہرام مصر جیسے خاموش سے کسی بنگلے داخل ہوتی ہے اور اس کی واپسی پر ٹھیکے کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے۔ کہیں انکوائری ہو رہی ہے.......... رات کے سناٹے میں کسی کی حسین داشتہ کسی پر تعیش بنگلے میں قدم رکھتی ہے اور انکوائری اس کے قدموں میں ہی دم توڑ دیتی ہے۔ کوئی چھوٹا.......... مگر ترقی کی بے پناہ ہوس رکھنے والا افسر کسی بڑے افسر کی دعوت کرتا ہے اور کھانے کے بعد اپنی حسین بیوی کو بڑے افسر کے ساتھ میز پر گپ شپ کرتے چھوڑ کر خود سگریٹ لینے چلا جاتا ہے اور کئی گھنٹے بعد واپس آتا ہے تو اس کے لئے ترقی کی راہیں کھل چکی ہوتی ہیں۔ اب سمجھ میں آیا اس کہاوت کا مطلب؟ زمانہ بہت بدل گیا ہے میرے چاند! بلکہ زمانہ تو خیر نہ جانے کب سے بدلا ہوا ہے لیکن تم جیسے لوگ سادگی کی چادر اوڑھ کر نہ جانے کس غار میں سوتے رہتے ہیں یا پھر شاید تمہاری انفارمیشن سروس بہت کمزور ہے۔ آج کے دور میں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر نظر رکھنے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرو بھولے بادشاہ! ورنہ کوئی تمہیں بیچ کر کھا جائے گا۔ تمہاری داستان تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں"۔

آج سڑک کے کنارے درخت تلے کھڑے کھڑے اختر کو یہ بھولی بسری سی گفتگو یاد آئی تو اچانک ہی اسے لہو اپنی رگوں میں سرد ہوتا محسوس ہوا ایک سوال اچانک ہی ناگ کی طرح پھن پھیلائے اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

"کہیں وہ خود بھی انہی لوگوں میں شمار ہونے تو نہیں جا رہا تھا جن کی کامیابی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا تھا؟"

اس سوال نے یکدم ہی گویا اسے ڈس لیا!

بہت دیر تک اختر وہیں درخت کے نیچے دم بخود کھڑا رہا اور اندر ہی اندر اپنے آپ سے لڑتا رہا۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنے آپ کو قائل کر لیا کہ اس کا شمار ان لوگوں میں نہیں ہو سکتا تھا جو عورت کو سیڑھی بناتے ہیں۔

اس کی تو رمنا رئیس سے کوئی شناسائی کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اس نے تو رمنا سے فرمائش نہیں کی تھی کہ وہ اسے ٹی وی پر کام دلائے۔ رمنا نے خود ہی اس کی آواز سننے کے بعد پوچھا تھا کہ اسے کبھی ٹی وی پر گانے کا اتفاق ہوا ہے یا نہیں؟ اختر نے اسے حقیقت حال بتا دی تھی کہ اس نے تو کبھی ٹی وی کا رخ ہی نہیں کیا۔ تب رمنا خود ہی اس کی مدد کرنے پر تل گئی تھی اختر کو صحیح طور پر معلوم بھی نہیں تھا کہ اس نے کون سی جادو کی چھڑی گھمائی تھی کہ اختر کے لئے وہ بند دروازہ کھل گیا تھا۔

جب وہ اندر ہی اندر اپنے آپ کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو گویا اس کی رو
پر سے کوئی بوجھ اتر گیا وہ اپنے خیالات کی دنیا سے باہر آ گیا۔ اس نے گھڑی دیکھی اس کے
پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ گھر جاتا اور ٹی وی پروڈیوسر نیاز احمد کے دیئے ہوئے نغمے پر کا
شروع کرتا اسے اب ہوٹل پہنچنا تھا اسے ابھی سے اندازہ ہونے لگا تھا کہ اسے اگر ہوٹل م
اور ٹی وی پر گانے کا شوق بیک وقت پورا کرنا ہے تو اسے بڑی محنت کرنا پڑے گی' جان کھپا
پڑے گی۔

پروڈیوسر نیاز احمد نے اسے بتا دیا تھا کہ زیادہ تر ریہرسلیں اور ریکارڈنگ شام سے لے
کر رات گئے تک ہوتی ہیں۔ انہی اوقات میں اختر کے لئے ہوٹل میں موجود رہنا ضروری تھا
لیکن پھر اپنے اندیشوں پر وہ خود ہی مسکرا دیا۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ ابھی تو آغا
بھی نہیں ہوا اور اس نے پریشان ہونا شروع کر دیا ہے جب ٹی وی پر مصروفیت بڑھے گی ت
دیکھا جائے گا۔ وقت کے مسئلے کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔

اس نے ایک رکشا روکا اور ہوٹل آ گیا وہ بہت خوش تھا گلوکار ہونے کے باوجود وہ
کبھی تنہائی میں گنگناتا نہیں تھا لیکن آج وہ گنگنا رہا تھا۔ وہ کسی کو یہ خبر سنانا چاہتا تھا کہ آج
اس کا آڈیشن ہوا تھا وہ کافی بار میں پہنچا تو سب سے پہلے اس کی نظر ویٹرس شہلا پر پڑی لیکن
وہ اسے یہ خوشخبری سناتے سناتے رک گیا اسے خود ہی احساس ہو گیا تھا کہ محض آڈیشن ہو
جانا کوئی بڑی خبر نہیں تھی۔

لیکن شہلا کو ذرا فرصت میسر آئی تو وہ اس کے قریب اسٹول پر بیٹھتے ہوئے
بولی........ "کیا بات ہے........ آج تو تم بار بار اس بلی کی طرح مسکرا رہے ہو جس
نے حال ہی میں کوئی چوہا شکار کیا ہو"۔

حالانکہ اختر اپنی دانست میں اس وقت بالکل سنجیدہ تھا اسے اس احساس سے حیرت
ہوئی کہ شہلا اس کے مزاج اور اس کی کیفیات کو کتنی اچھی طرح سمجھتی تھی وہ گویا اس کی
ذات میں جھانک سکتی تھی اس کے اندر کے موسم کا جائزہ لے سکتی تھی حالانکہ وہ اس کی
طرف غور سے دیکھتی تک نہیں تھی سرسری نظر سے اس کی طرف دیکھ کر اکثر بے پروائی
سے اپنے تراشیدہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کوئی بات کر دیتی تھی۔ مگر وہ بات بالکل
درست ہوتی تھی۔

"جس قسم کی مثال تم دے رہی ہو ایسی مثالیں لڑکیوں سے بات کرتے وقت زیادہ
مناسب رہتی ہیں"۔ اختر سنجیدگی سے بولا۔ "ویسے تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ آج
کل بلیاں بھی چوہے نہیں کھاتیں۔ وہ حفظان صحت کے اصولوں پر عمل کرتی ہیں انہیں
معلوم ہو گیا ہے کہ چوہے نری بیماری ہیں........ وہ صاف ستھرے ذبیحہ بکرے یا گائے کا
گوشت تلاش کرتی ہیں........ تبھی تم دیکھ نہیں رہیں کہ آج کل چوہوں کی آبادی کتنی

بڑھ گئی ہے؟ بعض جگہ تو چوہا اور بلی ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے پائے جاتے ہیں"۔
شہلا نے ایک لمحے کے لئے بغور اس کی طرف دیکھا اور تیکھے لہجے میں بولی "بات کیا
ہے؟ بڑی عمدگی سے بات ٹالنے کی کوشش کر رہے ہو"
اختر اسے آڈیشن کے بارے میں بتاتے بتاتے رہ گیا کبھی کبھی وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ
ایک دوسرے کے بہت اچھے راز دار' بہت اچھے دوست ہیں اگر وہ اپنی اپنی جگہ حالات کے
قیدی نہ ہوتے تو شاید ایک دوسرے کے لئے زندگی کے اچھے ساتھی بھی ثابت
ہوتے........
اس نے سر جھٹکا اور جلدی سے بات ٹالنے کی مزید کوشش کی "میں صرف اس لئے
خوش ہوں کہ آج میں ایک نئے نغمے کی بہت اچھی دھن تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا
ہوں"۔
"یہ خوشی کا نہیں غم کا مقام ہے" شہلا ٹھنڈی سانس لے کر بولی "کیونکہ اب تم اپنی
بے سری آواز سے اس دھن کا بیڑا غرق کرو گے"۔
اس سے پہلے کہ اختر جوابی حملے کے لئے مناسب الفاظ تلاش کرتا کافی بار میں چند ایک
گاہک آ گئے اور شہلا ان سے آرڈر لینے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنی ائیر ہوسٹسوں جیسی
ٹوپی اس نے جلدی سے دوبارہ سر پر جمالی تھی۔
اختر بار بار کن انکھیوں سے کافی بار کے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے رمنا کا
انتظار تھا لیکن وہ نہیں آئی حتیٰ کہ اختر کا بال روم میں جانے کا وقت ہو گیا اور وہ اٹھ کھڑا
ہوا۔

بال روم میں بھی وہ رمنا رئیس کی آمد کا منتظر رہا اس کی نظر دروازے پر ہی لگی رہی
لیکن وہ نہ آئی۔ اختر کا دل بجھ سا گیا وہ اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے جتنے الفاظ جمع کئے
بیٹھا تھا وہ سب گویا دھیرے دھیرے اپنے معانی کھو بیٹھے تھے' خوشبو کھو بیٹھے تھے اسے کچھ
ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ لفظوں کا گلدستہ لئے زندگی کے پلیٹ فارم پر کسی کا منتظر کھڑا
تھا مگر آنے والا نہیں آیا تھا اور گلدستہ مرجھا گیا تھا۔
دوسرے روز اختر خلاف معمول جلد سو کر اٹھا اور ہارمونیم لے کر بیٹھ گیا۔ وہ اس
نغمے کے لئے دھن تیار کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو اسے ٹی وی پروڈیوسر نیاز احمد نے دیا تھا
وہ جلد ہی ایک اچھی سی دھن تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا یہ اس کے لئے کوئی مشکل کام
نہیں تھا اسے امید تھی کہ دھن پروڈیوسر اور سامعین کے دلوں کو بھا جائے گی۔
پروڈیوسر نے اس سے کہا تھا کہ وہ اپنے طور پر بھی کوئی نغمہ منتخب کر کے اس کی
مشق کر کے آئے۔ دونوں میں سے جو نغمہ بہتر ہوا وہ پروگرام میں شامل کر لیا جائے گا اور
اگر دونوں ہی نغمے اچھے ہوئے تو دونوں ہی کو مختلف پروگراموں میں شامل کر لیا جائے گا۔

اختر نے ایسے بہت سے نغمے تیار کر رکھے تھے جن کی دھنیں اس کی اپنی تھیں اور جنہیں
مختلف محفلوں میں سنا چکا تھا معروف شعراء کی بہت سی غزلیں ایسی تھیں جن پر وہ داد سم
چکا تھا۔ اختر کے لئے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب بہت مشکل تھا۔ تاہم اس نے پروڈیو
کی ہدایات کے مطابق جواں ترنگ پروگرام کی مناسبت سے ایک نغمہ منتخب کر ہی لیا۔

دوپہر کو وہ کھانا کھانے نکلا تو اس نے پروڈیوسر نیاز احمد کو فون کیا۔ بڑی مشکل سے
وی کا نمبر ملنے کے بعد اس کا نیاز احمد سے رابطہ قائم ہوا تو وہ بلا تمہید بولا مبارک ہو ا
صاحب! آپ آڈیشن میں کامیاب ہو گئے ہیں کل شام چار بجے ریکارڈنگ کے لئے آ جا
گا۔

حالانکہ اسے اسی جواب کی توقع تھی لیکن ذہن کے کسی گوشے میں ناکامی کا خوف
موجود تھا نیاز احمد کا جواب سن کر جیسے دل سے اندیشوں کے کانٹے نکل گئے وہ مطمئن و مس
واپس آیا۔

وہ رمنا کا شکریہ ادا کرنے کے لئے بے چین تھا لیکن رمنا اس رات بھی ہوٹل ؟
نظر نہ آئی۔ اسے نہ تو رمنا کا ایڈریس معلوم تھا اور نہ ہی اس کے پاس اس کا کوئی فون نم
تھا لیکن پھر اس نے خود ہی محسوس کیا کہ اگر اس کے پاس رمنا کا ایڈریس یا فون نمبر مو
ہوتا تب بھی شاید وہ اس سے رابطہ کرنے کی جرات نہ کرتا ابھی اس سے اس کی رسم و
اس حد تک نہیں تھی۔

دوسرے روز اس نے فون پر بہانہ کر کے ہوٹل سے چھٹی کی اور ریکارڈنگ کے ل
ٹی وی اسٹیشن جا پہنچا۔ نیاز احمد کے کمرے میں بھیڑ بھاڑ تھی ایک جانی پہچانی گلوکارہ بھی مو
تھی لیکن نیاز نے ان سب کو کمرے میں ہی چھوڑ دیا اور اختر کو لے کر اسٹوڈیو میں آ گیا۔

وہاں سیٹ لگا ہوا تھا سازندے موجود تھے اختر نے سنا تھا کہ ریہرسلوں اور ریکارڈنگ
میں بہت وقت ضائع ہوتا تھا لیکن نیاز احمد نے شاید کچھ اس طرح انتظامات کئے ہوئے تھے کہ
اختر کا وقت ضائع نہ ہونے پائے۔ اختر نے سازندوں کو دھنیں سمجھائیں اور ریہرسل کے طو
پر پہلے نیاز کو دونوں نغمے سنائے۔

نیاز احمد نے سروں کے اتار چڑھاؤ میں معمولی سا رد و بدل کیا اور بولا۔ "یہ تو دونوں
ہی ٹھیک ہیں دونوں ہی چل جائیں گے۔ کوشش کرتے ہیں کہ دونوں ہی آج ریکارڈ ہو
جائیں۔ ہمارے شاعر افسردہ والا نغمہ آئندہ پروگرام میں ڈال لیں گے دوسرے شاعر والا نغ
اس کے بعد دوسرے یا تیسرے پروگرام میں ڈال لیں گے تب تک شاعر صاحب سے اجازت
کا مرحلہ بھی طے ہو جائے گا ہم انہیں یہ نہیں بتائیں گے کہ نغمہ ریکارڈ ہو چکا ہے ورنہ وہ
کہیں پھیل نہ جائیں"۔

اختر ٹی وی کے لئے نیا سہی لیکن بہرحال منجھا ہوا گلوکار تھا اور پھر نیاز احمد کی تمام تر

ازشات اس کے ساتھ تھیں ریکارڈنگ میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی دونوں نغموں کا آڈیو اور
ڈیو تیار کرا کے وہ جلد ہی فارغ ہو گیا۔

اسے رخصت کرتے وقت نیاز نے بتایا اگلے بدھ کو شام ساڑھے سات بجے جواں
ترنگ میں آپ کا پہلا نغمہ ٹیلی کاسٹ ہو گا۔

اختر ان الفاظ کی مدھر سی بازگشت ذہن میں لئے گھر آ گیا۔ یہ سب کچھ ابھی تک اسے
ایک خوشگوار خواب ہی لگ رہا تھا...... رمنا...... جس کی بدولت یہ خوبصورت
باب اس کی زندگی میں آیا تھا خود نہ جانے کہاں غائب تھی۔

بدھ کا دن بھی آ گیا لیکن رمنا سے ہوٹل میں نظر نہ آئی اختر کے لئے جادو کی چھڑی
لا کر وہ مہربان پری خود نہ جانے کس دیس کی طرف پرواز کر گئی تھی اختر کو اس کے یوں
غائب ہو جانے پر ایک عجیب سا اضطراب بھی تھا اور ایک طرح کا ملال بھی۔ آخر وہ کیوں
نہیں آ رہی تھی اختر یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

بدھ کی شام وہ ہوٹل میں تقریباً" سب ہی ملازموں کو بتا چکا تھا کہ ساڑھے سات بجے
ٹی وی سے اس کا نغمہ نشر ہونے والا ہے۔ صرف شہلا کو بتانے کا موقع نہیں مل سکا تھا شہلا
اس شام بہت مصروف تھی نہ جانے کیوں اس شام کافی بار میں مستقل رش تھا اختر کافی دیر
سے وہاں بیٹھا شہلا کو یہ خبر سنانے کے لئے بے چین تھا۔

آخر کار سات بجے کے قریب شہلا کو فرصت میسر آئی اور وہ ناک سے پسینہ پونچھتی
اس کے برابر اسٹول پر آ بیٹھی وہ کچھ شوں شوں بھی کر رہی تھی۔

"یہ ریلوے انجن کی سی آواز کیوں نکال رہی ہو؟" اختر نے پوچھا۔

"ذرا زکام سا ہو رہا ہے"۔ شہلا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کمال ہے اس سے پہلے تو کبھی مینڈکی کو زکام ہوتے نہیں دیکھا"۔ اختر مصنوعی
حیرت سے بولا۔

شہلا نے اسے گھورا لیکن کچھ بولی نہیں خاموشی سے پانی پینے لگی اختر گھڑی دیکھتے
ہوئے بولا۔ "آج ساڑھے سات بجے ٹی وی دیکھنا نہ بھولنا"۔

"کیوں...... کیا تم قوم سے خطاب کرنے والے ہو؟" شہلا نے گلاس کاؤنٹر پر
رکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہی سمجھ لو...... لیکن مابدولت سر کی زبان میں قوم سے خطاب کریں گے"۔
اختر نے مصنوعی شان بے نیازی سے کہا۔

"سر سے تمہارا کیا تعلق؟ ہم نے تو تمہیں آج تک سروں کی مٹی پلید کرتے ہی
دیکھا ہے"۔ شہلا منہ بنا کر بولی۔

"شاید اسی لئے مابدولت ٹی وی پر پہنچ گئے ہیں اختر مصنوعی اکڑ دکھاتے ہوئے بولا۔

آج ساڑھے سات بجے جواں ترنگ میں دیکھنا اور سننا"۔

"مجھے کیا پڑی ہے"۔ شہلا کندھے اچکا کر بولی۔ "میں نہیں چاہتی مجھے رات
ڈراؤنے خواب آئیں"۔

"تم اس اعزاز سے محروم رہنا چاہتی ہو تو تمہاری مرضی"۔ اختر نے لاپروائی سے
اور اٹھ کر لاؤنج میں آگیا جہاں ٹی وی موجود تھا۔ اس نے دیکھا کہ ہوٹل کے ویٹر وغیرہ
جگہوں پر جمع ہونے کی کوشش کر رہے تھے جہاں ٹی وی سیٹ موجود تھے لیکن ساتھ ساتھ
بیچاروں کا دھیان کام میں بھی پھنسا ہوا تھا۔

اختر ایک گوشے میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہاں روشنی زیادہ نہیں تھی۔ لاؤنج میں چ
ایک ملکی اور غیر ملکی مہمان موجود تھے جو نہایت بے دلی اور نیم توجہی سے کبھی کبھی ٹی وی کی
طرف دیکھ لیتے تھے' ورنہ ان میں سے کچھ تو باتوں میں مصروف تھے اور کچھ شام کے
اخبارات دیکھ رہے تھے۔

بالاخر ٹی وی پر اشتہارات کا سلسلہ رکا اور اناؤنسر نے پروگرام "جواں ترنگ" شروع
ہونے کا اعلان کیا۔ دو تین جملوں میں اس نے پہلے گلوکار کا تعارف کرایا گو کہ اسے تعارف
کی ضرورت نہیں تھی وہ نوجوان نسل کا خاصا جانا پہچانا گلوکار تھا۔

اس کے بعد ایک گلوکارہ کی باری آئی۔ وہ بھی کچھ ایسی نئی نہیں تھی۔ مختلف
پروگراموں میں کئی بار ٹی وی پر آ چکی تھی۔ اس نے ایک پرانی گلوکارہ کا گایا ہوا مقبول نغ
سنایا۔ اوریجنل چیز نہیں تھی' لیکن لڑکی کی آواز بہرحال اچھی تھی۔ پرانی گلوکارہ کی آواز کے
معیار کو تو نہیں پہنچ سکتی تھی لیکن لڑکی نے اپنی سی محنت کی تھی۔

بالاخر پروگرام کی کمپیئر نے اختر کا نام لیا تو اختر کے دل کی دھڑکن بے حد تیز ہو گئی
اور رگ و پے میں چونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ کمپیئر اس کا تعارف نہایت خوبصورت اور ہمت
افزاء انداز میں کرا رہی تھی۔ پھر اختر نے اپنے آپ کو ٹی وی پر دیکھا۔

ویسے تو نغمے کی ریکارڈنگ کے دوران بھی اختر اسٹوڈیو میں اپنے سامنے چند فٹ کے
فاصلے پر نصب شدہ ایک ٹی وی سیٹ (مانیٹر) پر اپنے آپ کو دیکھتا رہا تھا لیکن اب ایڈیٹنگ
وغیرہ کے بعد تو اس کی شخصیت اور پرفارمنس میں مزید نکھار آگیا تھا۔ وہ خودپرست نہیں تھا
اسے آج پہلی بار اپنے آپ کو اسکرین پر دیکھ کر احساس ہوا تھا کہ وہ ایک وجیہہ نوجوان تھا
شوبزنس اور گلیمر کی دنیا میں وہ اجنبی اور ان فٹ نہیں لگتا تھا۔

اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کی آواز یا شخصیت نے لاؤنج میں موجود چند لوگوں
کو ٹی وی کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ لاؤنج میں روشنی کم تھی اور اختر ویسے بھی
ایک کونے میں بیٹھا تھا ورنہ شاید کوئی اسے دیکھ کر پہچان بھی لیتا کہ اس وقت ٹی وی پر اسی
کا نغمہ چل رہا تھا اسے پہلی بار احساس ہوا کہ ایک نوآموز اور ابھرتے ہوئے فنکار کے دل

ں یہ خواہش موجود ہوتی ہے کہ لوگ اسے دیکھیں اور پہچانیں۔ اس تمنا میں بہت سے نئے
نکار چھچھوری حرکتیں بھی کرنے لگتے تھے لیکن اختر میں بہرحال ایک خاص وضع داری اور
بے عنوان سا شرمیلا پن موجود تھا۔ وہ اسی صوفے پر اسی گوشے میں دبکا بیٹھا رہا۔

دفعتہ" اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے کھڑا تھا اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا
ہ شہلا تھی جو یقیناً کافی دیر سے اس کے پیچھے کھڑی تھی۔

اختر اٹھ کھڑا ہوا اور نیچی آواز میں بولا۔ "دیکھا.......... مابدولت کے فن کی کشش
تمہیں یہاں کھینچ لائی نا"۔

"اوہ.......... اچھا.........." شہلا بھی نیچی آواز میں بولی۔ "یہ جو ابھی ذرا دیر پہلے
ایک مسخرہ سا' نیلے پیلے کپڑے پہنے ٹی وی پر چھلانگیں لگا رہا تھا اور لٹو کی طرح گھوم رہا تھا' وہ
تم تھے؟"

"تم خواہ کچھ بھی کہو مس شہلا اکرام..........!" اختر مصنوعی نخوت سے کالر درست
کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن حقیقت یہ ہے کہ چند لمحے پہلے تمہیں مستقبل کے ایک عظیم اور
مشہور گلوکار کا ٹی وی پر پہلا نغمہ سننے کا اتفاق ہوا ہے.......... بلکہ یوں کہو کہ شرف حاصل
ہوا ہے"۔

"ویسے تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں یہاں کوئی نغمہ وغیرہ نہیں بلکہ سردرد
کی گولیوں کا اشتہار دیکھنے آئی تھی۔ سوچ رہی ہوں آج گھر جاتے وقت ان گولیوں کا پورا ڈبا
خرید لے کر جاؤں۔ اصل میں کل تمہیں بال روم میں گاتے سن لیا تھا۔ تب سے سر کا درد
ٹھیک ہی نہیں ہو رہا۔ ٹیسیں سی اٹھ رہی ہیں"۔ شہلا کنپٹیاں مسلتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

اختر اس کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔ "اگر تم کسی اچھے ڈاکٹر
کے پاس جاتیں تو وہ تمہیں فوراً" بتا دیتا کہ اس کی وجہ کسی کا گانا وغیرہ سننا نہیں
ہے.......... بلکہ سردرد کی وجہ صرف یہ ہے کہ اندر بہت سی جگہ خالی ہے اگر خالی جگہ
میں بھیجہ موجود ہوتا تو اتنی ٹیسیں نہ اٹھا کرتیں"۔

شہلا نے کوئی جواب دینا چاہا مگر پھر گھڑی دیکھ کر تیزی سے کافی بار کی طرف واپس
چل دی۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ مزید ایک منٹ کے لئے بھی ڈیوٹی سے غیر حاضر
رہنے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

اس کے جانے کے بعد اختر بھی بال روم کی طرف چل دیا راستے میں کئی ویٹروں'
کلرکوں اور عملے میں چند دوسرے لوگوں نے اسے مبارکباد دی۔ ہوٹل کے ملازموں میں یہ
خبر پھیل چکی تھی کہ کچھ دیر پہلے واقعی ٹی وی پر اس کا نغمہ چلا تھا۔

وہ ابھی بال روم میں جا کر اپنا گٹار وغیرہ چیک کر رہا تھا کہ ایک ویٹر نے اسے آکر
پرسنل مینجر کا پیغام دیا۔ پرسنل مینجر نے اسے اپنے آفس میں بلایا تھا۔

وہ آفس میں پہنچا تو خلاف معمول پرسنل مینجر نے خاصی گرمجوشی سے اس کا استقبا
کیا۔ اختر دل میں ڈر رہا تھا کہ پرسنل مینجر کہیں اعتراض نہ کر دے کہ وہ ہوٹل کی نوکر
کے دوران ادھر ادھر وقت دے رہا تھا اور ان کی اجازت کے بغیر کہیں اور گا رہا تھا۔

لیکن خلاف توقع پرسنل مینجر نے بڑی خوش خلقی سے اسے بیٹھنے کے لئے کہا ا
کمرے کے کونے میں رکھے ہوئے چھوٹے سے ٹی وی سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہو
بولا۔ "کسی نے مجھے بتایا تھا کہ آج تم ٹی وی پر آؤ گے۔ میں اس لئے خاص طور پر ٹی و
دیکھ رہا تھا۔ ٹھیک ٹھاک گایا تم نے"۔

"شکریہ سر!" اختر نے انکساری سے کہا۔

"ہمارے ہوٹل میں کام کرنے کا یہی فائدہ ہے۔ لوگوں سے تعلقات بنتے ہیں"۔ مینجر
فخر سے بولا۔ یقیناً تمہیں پروڈیوسر نے یہاں گاتے سنا ہو گا اور ٹی وی پر گانے کی دعوت د
ہو گی؟"

"نہیں سر!" اختر دھیمے لہجے میں بولا۔ "ٹی وی پروڈیوسر بہت کم کہیں جاتے ہیں اور
جاتے بھی ہیں تو ٹیلنٹ کی تلاش میں نہیں جاتے۔ اپنی ذاتی اور نجی مصروفیات کے سلسلے
میں کہیں جاتے ہیں۔ وہ ٹی وی اسٹیشن پر بند کمروں میں بیٹھے ہیں جہاں ان تک پہنچنا جوئے
شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ملک بھر کا ٹیلنٹ وہیں ان پر دھاوا بولتا رہتا
ہے۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ لوگ کس طرح ان کی بوٹیاں نوچتے ہیں اور کیسی کیسی
سفارشیں لے کر آتے ہیں"۔

"یعنی تم بھی سفارش کے ذریعے ٹی وی پر پہنچے ہو؟" پرسنل مینجر کے لئے گویا یہ ایک
حیرت انگیز انکشاف تھا۔

"یس سر!" اختر نے سر جھکا کر کہا۔ "کسی نے میری سفارش کی تھی۔ آپ کو معلوم
ہی ہے میں جھوٹ نہیں بولتا۔ چاہے کوئی باصلاحیت ہو یا بے صلاحیت۔ ٹی وی پر اکثر لوگوں
کو سفارش ہی کی ضرورت پڑتی ہے۔ قصور ٹی وی والوں کا بھی نہیں ہے سر! وہاں بھیڑ بہت
زیادہ ہے پروڈیوسروں پر فنکار اس طرح برس رہے ہیں جس طرح گنجے کے سر پر اولے"۔

پرسنل مینجر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "اوہ.......... رئیلی..........؟"

"یس سر!" اختر نے افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "لیکن اگر مجھے مزید
چانس مل گئے اور کبھی میں بڑا سنگر بن گیا.......... بہت مشہور ہو گیا تو میں بھی اخبار اور
رسالے والوں کے سامنے بیٹھ کر شاید ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ یہی کہوں گا کہ میں تو
بس فلاں محفل میں یونہی ذرا گنگنا رہا تھا.......... فلاں پروڈیوسر نے سن لیا اور پھڑک
اٹھے۔ انہوں نے فوراً" مجھے ٹی وی پر گانے کی دعوت دی.......... بلکہ اسی وقت اٹھا کر
لے گئے۔ یا پھر بہت سی معروف اداکاروں کی طرح میں بھی بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہیں

بتاؤں گا کہ میں تو یونہی ذرا ٹی وی سینٹر کی سیر کرنے گیا تھا کہ فلاں پروڈیوسر صاحب سے
ملاقات ہو گئی اور انہوں نے فوراً" میرے اندر چھپے ہوئے فنکار کو تلاش کر لیا"۔

پرسنل مینجر نے ایک اور ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہا۔ "خیر.......... تم کوشش جاری
رکھو۔ یہ تمہارے اپنے لئے بھی اچھا ہے اور ہوٹل کے لئے بھی۔ ہم اخباروں میں ہوٹل
کے اشتہاروں میں لکھ سکیں گے ٹی وی کے مشہور سنگر اختر حسین صاحب روزانہ ہمارے
یہاں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن ذرا سی شہرت پاتے ہی تم ہوٹل کی نوکری چھوڑ کر
مت چلے جانا۔ اس کے اپنے بڑے فائدے ہیں"۔

"فائدے نہ بھی ہوتے سر! تب بھی میرا جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میرا اب یہاں
دل لگ گیا ہے"۔ اختر نے دیانتداری سے کہا۔

"ویری گڈ"۔ پرسنل مینجر کے لہجے میں طمانیت جھلک آئی۔ "اس ماہ سے شاید ہم
تمہاری تنخواہ میں پانچ سو روپے کا اضافہ بھی کر دیں.......... بلکہ شاید کیا.......... تم اس
بات کو یقینی ہی سمجھو"۔

"بہت شکریہ سر!" اختر نے کہا اور اجازت پا کر بال روم میں لوٹ آیا۔ تنخواہ میں
اضافے کی خوشخبری بھی اسے کچھ زیادہ خوش نہیں کر سکی تھی کیونکہ اسے جس کا انتظار تھا وہ
کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

اسے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی انجانے دیس سے آنے والی اس مہربان پری کا کام
بس اتنا ہی تھا کہ اس نے اختر کو ٹی وی پر پہنچا دیا تھا اس کے بعد گویا اس کا کام ختم ہو گیا تھا
اور واپس دور دیس سدھار گئی تھی.......... وہ بس باد بہاری کا ایک سبک سا جھونکا تھا' اس
کی زندگی میں ایک غنچہ امید کھلا کر چلا گیا تھا۔ ایک حسین.......... لیکن نہایت مختصر خواب
تھا۔ پل بھر میں ٹوٹ گیا تھا۔ وہ اسے تلاش کرنا چاہتا تھا مگر اس کی بھی ہمت نہیں پڑتی تھی۔
کہیں وہ برا نہ مان جائے' خفا نہ ہو جائے' برہم نہ ہونے لگے۔ وہ کسی سے اس کے
بارے میں پوچھنے کا ارادہ کرتا مگر پھر رک جاتا۔

لیکن دوسرے روز اسے اس اذیت سے نجات مل گئی۔

اس رات اختر کچھ بے دلی کے سے عالم میں بال روم میں اسٹیج پر بیٹھا تھا کہ بالکل غیر
متوقع طور پر رمنا رئیس ہال میں داخل ہوئی۔ اختر مبہوت سا رہ گیا۔

رمنا کی صراحی دار گردن اسی نخوت سے اٹھی ہوئی تھی۔ وہ فیروزی رنگ کے کسی
عجیب سے کپڑے کا مغلیہ تراش کا قمیض اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے تھی۔ پیروں میں
جگمگاتے سلیم شاہی جوتے تھے۔ ان دنوں اونچے طبقوں کی بیگمات میں چاندی کے زیورات کا
فیشن چلا ہوا تھا۔ وہ بھی چاندی کی پازیب اور چمپا کلی پہنے ہوئے تھی۔ موتیوں کی لڑیوں کی
مدد سے بالوں کا جوڑا شاہی تاج کے سے انداز میں بنا ہوا تھا۔ وہ ہر بار پہلے سے زیادہ

خوبصورت نظر آتی تھی لیکن آج تو اس کے روپ میں ایک انوکھا پن بھی تھا۔ گویا سچ مچ کوئی مغلیہ شہزادی انگڑائی لے کر' ایک نئی زندگی پا کر تاریخ کے جھروکوں سے نکل آئی تھی۔

وہ دیوار کے ساتھ لگی میزوں میں سے ایک پر جا بیٹھی۔ ابھی بال روم میں لوگوں کی آمدورفت شروع نہیں ہوئی تھی آرکسٹرا دھیمی دھیمی موسیقی بکھیر رہا تھا۔ اختر چونک کر گویا کسی اور ہی دنیا سے واپس آیا اور ساتھیوں کی پروا کئے بغیر گٹار رکھ کر رمنا کی میز پر جا پہنچا۔

وفور اشتیاق سے اس کے ہاتھ پیروں میں ارتعاش سا تھا۔ رمنا ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور وہ جیسے آسمان اور زمین کے درمیان کہیں ہلکورے لے رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے گویا دونوں ہی کو کوئی لفظ نہ سوجھا۔

بالآخر اختر دھیمے لہجے میں بولا۔ "کہاں تھیں آپ؟ اتنے دن سے نظر کیوں نہیں آئیں؟"

"کیا تم نے میری کمی محسوس کی؟" رمنا نے اسی طرح ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

اختر ایک لمحے کے لئے خاموش رہا جیسے اپنے دل کو ٹٹول رہا ہو پھر پہلے سے بھی دھیمے لہجے میں بولا۔ "بہت زیادہ"۔

رمنا کے چہرے پر جیسے طمانیت سی پھیل گئی۔ اس کی نم آلود سی آنکھوں میں اختر نے پہلی بار مسرت کی ہلکی سی جھلملاہٹ محسوس کی۔ اس نے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگا لی۔ اس کی صراحی دار گردن کچھ اور حسین لگنے لگی۔ اس نے اختر کو سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اختر بیٹھ چکا تو وہ نہایت نیچی آواز میں بولی۔ "دراصل میں نے سوچا کہ میں اس وقت ہی تمہارے سامنے جاؤں گی جب تم سے کیا ہوا وعدہ پورا ہو جائے گا۔ میں نے کہا تھا کہ ایک ہفتے بعد ٹی وی سے تمہارا نغمہ نشر ہو گا۔ اگر میں اپنا وعدہ پورا نہ کر سکتی تو شاید تم مجھے کبھی یہاں نہ دیکھتے"۔

"یہ تو بہت برا ہوتا"۔ اختر بے اختیار بولا۔ "میرا ٹی وی پر آنا اتنا اہم نہیں تھا کہ اس کی خاطر آپ یہاں آنا ہی چھوڑ دیتیں۔ مجھے ایسی شہرت نہیں چاہئے کہ جس کے چکر میں میں آپ سے ملاقات سے بھی محروم ہو جاتا"۔

"اوہ........" اس نے گہری نظر سے اختر کی طرف دیکھا۔ اس کے یاقوتی ہونٹوں پر نہایت مدھم سی مسکراہٹ تھی........ کوئی چاہتا تو اس مسکراہٹ سے ہزار معانی و مطالب اخذ کر لیتا اور کوئی چاہتا تو اسے محض خوش خلقی کا ایک مبہم سا نشان قرار دے سکتا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔ "کل میں نے خاص طور پر بیٹھ کر ٹی وی پر

پروگرام دیکھا۔ ورنہ میں شاذ و نادر ہی ٹی وی دیکھتی ہوں۔ ٹی وی پر تمہیں دیکھ کر بہت افسوس ہوا"۔

"کیوں........؟" اختر کا دل ڈوب گیا۔ "کیا بہت برا گایا میں نے؟" اس کے جاننے والوں میں سے جس نے بھی اسے ٹی وی پر دیکھا تھا' اسے مبارک باد ہی دی تھی' تعریف کی تھی' اس کا حوصلہ بڑھایا تھا۔

رمنا گویا اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے بولی۔

"نہیں........ افسوس مجھے اس بات کا تھا کہ تم اتنی تاخیر سے ٹی وی پر کیوں آئے۔ تمہیں تو کافی پہلے آ جانا چاہئے تھا۔ ایسے ایسے بے سرے لڑکے ایسی ایسی بے سروپا چیزیں گا رہے ہیں ٹی وی پر........ کہ میں نے تو ٹی وی دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ آخر تم نے کیا قصور کیا تھا جو تمہیں اب تک موقع ہی نہیں ملا تھا۔ میں یہی سوچتی رہی"۔

"اس کا ذمہ دار میں خود ہی ہوں۔ میں نے ٹی وی والوں کو کبھی اپروچ ہی نہیں کیا تھا"۔ اختر طمانیت کی گہری سانس لے کر بولا۔ "آپ نے تو یہ افسوس والی بات کر کے مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ میں تو ہواؤں میں اڑتے اڑتے یکدم گویا نیچے آن گرا تھا"۔

"تمہیں ٹی وی والوں کو اپروچ کرنا بھی نہیں چاہئے تھا۔ تمہارے پاس فن ہے۔ تمہارے فن کی خوشبو تو خودبخود ان لوگوں تک پہنچ جانی چاہئے تھی........ یا پھر کسی اور کو ان سے تمہارا ذکر کرنا چاہئے تھا۔ جیسے میں نے کیا"۔ رمنا بولی۔

"آج کل کے زمانے میں ذرا کم ہی ایسا ہوتا ہے بہت کم لوگ آپ کی طرح کسی سے کسی کا ذکر کرتے ہیں........ اور فن کی خوشبو خودبخود تو کسی تک شاذ و نادر ہی پہنچتی ہے۔ ٹی وی والوں کی قوت شامہ تو بہت ہی کمزور ہوتی ہے۔ خوشبو خود ان کی ناک تک لے جا کر بصد اصرار سنگھانی پڑتی ہے"۔ اختر مسکراتے ہوئے بولا۔

"ہاں........" رمنا گہری سانس لے کر بولی۔ "جس طرح کاروبار میں پہلا ملین کمانا مشکل ہوتا ہے اور اس کے بعد گویا گاڑی خودبخود ہی لڑھکنے لگتی ہے۔ اسی طرح شو بزنس کی دنیا میں بھی پہلا قدم رکھنا ہی دشوار ہوتا ہے۔ اس کے بعد اگر انسان کے پاس فن ہو........ یا اس کی پہلی تیر ہی ہٹ ہو جائے اس کے بعد تو تمام راستے خودبخود کھلتے چلے جاتے ہیں........"

اختر کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کی نظریں گویا کہیں اور ہی جا پہنچیں اس کی آواز اور بھی دھیمی ہو گئی خوابناک سے انداز میں وہ بولی "میں دیکھ رہی ہوں........ تمہارا مستقبل بہت روشن ہے جلد ہی تم اسٹار سنگر بن جاؤ گے۔ تمہارے کیسٹ دھڑا دھڑ بکیں گے ورائٹی پروگرامز تمہارے بغیر مکمل نہیں ہوں گے اور اونچے طبقے کی تقریبات میں تمہیں بلانا باعث فخر سمجھا جائے گا"۔

"یہ میرے لئے بہت اونچے خواب ہیں لیکن آپ کے منہ سے سن رہا ہوں تو سچ سچ سے لگ رہے ہیں مجھے یقین آگیا ہے کہ آپ جو کہتی ہیں وہ ہو جاتا ہے"۔

"تم خوش ہو نا؟" رمنا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"بہت زیادہ"۔ اختر نے جواب دیا۔

"لیکن میں بہت اداس ہوں"۔ رمنا نے نظر جھکا لی۔

"آپ اتنی اداس کیوں رہتی ہیں؟"

"اتنے مشکل سوال مت پوچھو جن کے جواب میرے پاس نہ ہوں یا جن کے جواب میں چاہتے ہوئے بھی نہ دے سکوں۔ رمنا گہری سانس لے کر بولی "بس............ میں اداس رہتی ہوں میں شاید ہزاروں سال سے اداسی کے برف زاروں میں دفن ہوں۔ میری روح بھی اداسی کی گہری کہر میں لپٹی رہتی ہے.......... اور اب تو اداس رہنا ہی مجھے اچھا لگتا ہے شاید اداسی بھی نشے کی طرح انسان کو لگ جاتی ہے.......... یا پھر شاید اداس رہنا بھی خود اذیتی کی کوئی قسم ہے میں چاہتی ہوں تم مجھے اور بھی اداس کر دو آج بھی تم مجھے کوئی مغموم سی غزل سناؤ خوشیاں تو ایک دوسرے سے سب ہی مانگتے ہیں میں تم سے تھوڑی سی اداسی مانگتی ہوں۔

وہ نیم وا آنکھوں سے اختر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اختر اپنی جگہ دم بخود بیٹھا تھا بالاخر وہ اٹھا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اسٹیج کی طرف چل دیا اسٹیج پر پہنچ کر اس نے گٹار کے بجائے ہارمونیم سنبھالا اور پریم وار برٹنی کی ایک غزل شروع کی۔

رات کی بھیگی پلکوں پر جب اشک ہمارے ہنستے ہیں
سناٹوں کے سانپ دلوں کی تنہائی کو ڈستے ہیں

آج اس کی آواز میں ایک عجیب درد تھا رمنا نے اس سے تھوڑی سی اداسی مانگ کر اسے بھی اداس کر دیا تھا۔ ظاہر ہے وہ اسے تھوڑی سی اداسی کی بھیک تب ہی دے سکتا تھا جب وہ خود اداس ہوتا۔ ہال میں دو چار افراد ہی موجود تھے لیکن جو بھی تھے اختر کی آواز نے ان سب کو سحر زدہ کر دیا تھا وہ جب غزل کے تیسرے شعر پر پہنچا تو ہال میں واقعی اداسی کی یخ بستگی اتر آئی تھی۔

اشکوں کی قیمت کیا جانیں پیار کے جھوٹے سوداگر
ان سیال نگینوں سے تو ہیرے موتی سستے ہیں

رمنا سامنے بیٹھی بت بنی مردوں کی طرف دیکھ رہی تھی وہ گویا پلکیں جھپکانا بھی بھول گئی تھی بالاخر اختر مقطع پر پہنچا

کون آئے گا ننگے پیروں شمع جلا کر شام ڈھلے
پریم محبت کی منزل کے بڑے بھیانک رستے میں

اس نے محسوس کیا کہ رمنا کے گلاب سے رخسار پر ایک آنسو شبنم کے قطرے کی طرح پھسلا تھا صرف ایک لمحے کے لئے جھلملایا تھا اور کہیں غائب ہو گیا تھا اس نے غزل ختم کی اور ساز خاموش ہوئے تو اس کے اپنے دل میں گہرا سناٹا چھا چکا تھا جتنے لوگ موجود تھے ان میں تالیاں بجانے کی بھی سکت نہیں تھی وہ مبہوت تھے۔

اسی اثناء میں لوگوں کا ایک ریلا ہال میں آگیا وہ لوگ رقص کے لئے آئے تھے اس وقت عموماً" ہال میں رقص شروع ہو جاتا تھا چند لمحے بعد ہال میں مغربی موسیقی گونجنے لگی اور جوڑے پالش شدہ فرش پر تھرکنے لگے اختر اس بھیڑ بھاڑ اور ہنگامے میں ایک بار پھر چپکے سے اٹھ کر رمنا کی میز پر آ بیٹھا۔

فضا یکسر تبدیل ہو چکی تھی چند منٹ پہلے جہاں دھیمے سروں کے دوش پر اداس لفظ ہلکورے لے رہے تھے وہاں اب تیز موسیقی کی دھادھم سے در و دیوار لرز رہے تھے' مترنم قہقہے گونج رہے تھے' گداز جسم لہرا رہے تھے۔ وہ بال روم بھی باقی دنیا ہی کی طرح تھا پل میں اداسی.......... پل میں مسرت۔

اختر نے میز پر ذرا آگے کو جھکتے ہوئے پوچھا۔ "آپ ایسی ہی کوئی اداس چیز سننا چاہتی تھیں نا؟"

"ہاں........." رمنا کی آواز جیسے کہیں دور سے آئی.......... "تمہاری سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جب تم کوئی مغموم غزل گاتے ہو تو اداسی صرف تمہارے لفظوں میں ہی نہیں تمہاری آواز میں بھی ہوتی ہے۔ تم میری پیش گوئی لکھ لو تم ضرور بہت بڑے سنگر بنو گے خصوصاً" المیہ گائیکی میں بڑا نام پیدا کرو گے۔ تمہاری آواز سن کر دل سے درد کے چشمے پھوٹتے ہیں.........."

رمنا رئیس کی پیش گوئی کچھ زیادہ ہی درست ثابت ہوئی اور اس میں کچھ زیادہ عرصہ بھی نہیں لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ملک بھر میں جانا پہچانا گلوکار بن گیا اس کے پوسٹر دکانوں میں چسپاں نظر آنے لگے اس کے نام پر میوزک کنسرٹ ہونے لگے ٹی وی کی اسکرین پر وہ نمودار ہوتا تو لوگ کام چھوڑ کر متوجہ ہو جاتے۔

رمنا نے تو کہا تھا کہ اس کی آواز میں درد تھا اس لئے وہ المیہ گائیکی کی وجہ سے زیادہ نام کمائے گا لیکن ایسا نہیں تھا قدرت نے اسے عجیب ہی صلاحیت سے نوازا تھا وہ طربیہ گاتا تھا تو ایک سماں باندھ دیتا تھا محفل لوٹ لیتا تھا اسے گاتے سن کر اچھی بھلی پکی عمر کے لوگوں کے دلوں میں بھی جوانی کی ترنگ عود کر آتی تھی۔

لیکن وہ المیہ شاعری کو سروں میں قید کرتا تھا تو ایک بالکل ہی مختلف سماں باندھ دیتا تھا۔ تب اندازہ ہوتا تھا کہ اس میں لوگوں کو مبہوت کر دینے کی کتنی صلاحیت تھی نئی نسل کو اگر اس نے ڈسکو ڈانس اور پاپ نغموں سے پاگل کر دیا تھا تو انہیں سنجیدہ شاعری اور لوک

گیتوں سے محظوظ ہونے کا سلیقہ بھی دیا تھا پرانی نسل الگ اس کی صلاحیتوں اور فن کی گرویدہ تھی وہ اس قدر مصروف ہو گیا تھا کہ ٹی وی کے لئے بھی بہت کم وقت نکال پاتا تھا جس کی بدولت اسے اتنی شہرت حاصل ہوئی تھی۔

اب کلفٹن کے علاقے میں ایک چھ... مر خوبصورت اور آراستہ اپارٹمنٹ میں رہنے لگا تھا جس کے بیڈ روم میں سمندر کی خنک ہوائیں بلا رکاوٹ کھڑکی کے راستے آتی تھیں اور اس کے بالوں یا رخساروں سے اٹھکیلیاں کر کے اسے جگاتی تھیں۔

اس نے چھوٹی سی ایک سیکنڈ ہینڈ کنور ٹیبل گاڑی بھی لے لی تھی جس کا ٹاپ وہ عموماً" ڈاؤن ہی رکھتا تھا یوں راہ چلتے لوگ اسے پہچان لیتے تھے اور بلاوجہ ہی پراشتیاق انداز میں ایک دوسرے کو کہنیاں مار مار کر بتاتے تھے وہ دیکھو.......... اختر جا رہا ہے..........

اسے پہچان لینے والوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے تھے کچھ تو نہایت بے ہودہ اور غیر مہذبانہ طریقوں سے بھی اس کی توجہ حاصل کر لینے کی کوشش کرتے تھے اور چھچھورے پن پر اتر آتے تھے اور بعض لوگ اسے کہیں دیکھ کر یا راستے میں رک کر نہایت شائستگی سے آٹوگراف کی درخواست کرتے تھے۔ بچے اور لڑکیاں تو خصوصاً" اس کی دیوانی تھیں۔

اتنی محبت.......... اتنی شہرت.......... اتنی عزت.......... اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی اس کے شکستہ دامن میں اتنا کچھ ہو گا قدرت اس کی جھولی اس فیاضی سے بھرے گی۔

رات کو وہ اپنے آرام دہ بستر پر سوتے سوتے کبھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا اور پہلا خیال اسے یہی آتا کہ اس کی خوبصورت اور ہنگامہ خیز زندگی ایک سپنا تھی.......... اور اب یہ سپنا ٹوٹ گیا تھا۔

لیکن پھر اسے اپنا سجا سجایا کمرہ نظر آتا ایک گوشے میں رکھا ہوا نیا ہائی فائی سیٹ' کیسٹوں کی لائبریری' وی سی آر رنگین ٹی وی دنیا بھر کے مشہور گلوکاروں کے پوسٹر اور دیگر بہت سی چیزیں دیکھ کر وہ مطمئن ہو جاتا کہ اس کی کائنات ابھی برقرار تھی اور جو زندگی وہ گزار رہا تھا۔ وہ محض خواب نہیں تھی -وہ سچ مچ ایک مشہور اور مقبول سنگر بن چکا تھا۔

اختر اپنی کامیابیوں کے بارے میں سوچتا تھا تو کبھی کبھی اسے شبہ ہونے لگتا تھا کہ ان کے پیچھے رمنا کا ہاتھ ہے۔ رمنا نے صرف اتنا نہیں کیا تھا کہ پہلی بار اسے ٹی وی پر گانے کا موقع دلوایا تھا بلکہ شاید اس کے بعد بھی ایک عرصے تک وہ پس منظر میں رہ کر ڈوریاں ہلاتی رہی تھی۔

اختر کو یہ شبہ اس لئے ہوتا تھا کہ کبھی کبھی نہایت غیر متوقع طور پر کسی دور دراز مقام سے کوئی شخص اچانک ہی اس سے رابطہ قائم کرتا اور اس کے لئے فائدے کا سبب بن جاتا۔

اب تو خیر وہ بہت مشہور ہو چکا تھا۔ گاڑی گویا پوری رفتار سے چل پڑی تھی لیکن

جن دنوں اس کی شہرت اور کامیابی کی گاڑی پہلے گیئر میں تھی اس کا نام لوگوں کے لئے بہت زیادہ جانا پہچانا نہیں تھا' ان دنوں بھی کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ بیٹھے بٹھائے ہی لاس اینجلس' شکاگو' لندن یا دبئی سے کوئی فون آ جاتا۔

کوئی اپنا نام بتاتے ہوئے کہتا۔ "اختر صاحب! میں یہاں میوزیکل پروگراموں' ڈراموں اور ورائٹی شوز وغیرہ کا بڑا پرانا پروموٹر ہوں۔ فیئر کام کرتا ہوں.......... اللہ کا فضل ہے.......... بڑی ساکھ ہے میری.......... میں آپ کو میوزک کے ایک بہت بڑے پروگرام میں بک کرنا چاہتا ہوں۔ ایک ہفتے بعد میں پاکستان آ رہا ہوں۔ آپ اپنی مصروفیات کا شیڈول ابھی سے اس طرح بنائیں کے اگلے ماہ میں بیس دن آپ کو ہمارے لئے خالی مل جائیں.........."

اختر حیران رہ جاتا کہ ابھی تو اس کی شہرت کی خوشبو ملک میں بھی صحیح طور پر نہیں پہنچی تھی۔ یہ اسے غیر ممالک سے کس طرح بلاوے آنے لگے؟

پھر رفتہ رفتہ وہ دور آیا کہ اس نے حیران ہونا چھوڑ دیا اور صرف شکر ادا کرنے لگا۔ اس کے بعد تیزی سے وہ دور بھی آ گیا کہ باہر جانے کے بعض پروگراموں کے لئے اسے انکار کرنا پڑتا۔ کبھی اسٹیج کی مصروفیات کبھی کوئی ذاتی شو اس کے راستے کی رکاوٹ بن جاتا۔ فلموں میں گانے کا سلسلہ بھی چل پڑا تھا۔

وہ خوش شکل اور ہینڈسم تھا۔ دو تین فلموں میں تو اسے اداکاری کی بھی آفر ہوئی لیکن اس نے انکار کر دیا ابھی وہ ذہنی طور پر اس کے لئے تیار نہیں تھا سب کچھ اتنی تیزی سے' اتنے غیر متوقع انداز میں اسے ملا تھا کہ ابھی اس کے پاؤں زمین پر جم نہیں رہے تھے۔ وہ کچھ بوکھلایا بوکھلایا سا رہتا۔ لیکن ظاہری طور پر نہیں۔ بوکھلاہٹ صرف اس کے اندر تھی۔

ہوٹل کی ملازمت البتہ اس نے اب تک نہیں چھوڑی تھی۔ اس معاملے میں اس نے بڑی مستقل مزاجی دکھائی تھی۔ درحقیقت اب ملازمت رہی بھی نہیں تھی وہ تو ایک تعلق خاطر تھا جسے اختر نبھا رہا تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک قدامت پرست اور روایت پسند سا آدمی تھا' اسے اس جگہ سے انسیت ہو گئی تھی جو اس کے لئے ترقی کا پہلا زینہ ثابت ہوئی تھی۔

ہوٹل والوں نے بھی اسے جواب نہیں دیا تھا حالانکہ وہ اب مہینے میں بمشکل چار چھ مرتبہ وہاں جاتا تھا۔ لیکن الٹا ہوٹل والوں کی نوازشات میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہاں اب اس سے بل قطعاً" وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ خواہ وہ تنہا وہاں کچھ بھی کھاتا پیتا یا اپنے کتنے ہی ملاقاتیوں کے لئے کھانے پینے کو منگواتا' اس کے حساب سے پیسے بالکل نہیں کٹتے تھے اور ہر ماہ تنخواہ کی صورت میں گویا اسے ایک اعزازیہ الگ مل جاتا۔

ہوٹل والوں کو یہی خوشی تھی کہ اس نے ہوٹل سے ترک تعلق نہیں کیا تھا وہ اب

بھی باقاعدگی سے تو نہیں لیکن کبھی کبھی اپنے اشتہاروں میں لکھ سکتے تھے کہ ملک کے مشہور و معروف گلوکار اختر حسین بلا ٹکٹ ان کے ہاں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں.......... اور اختر ان کی فرمائش پر واقعی کبھی کبھی ہوٹل میں گا دیتا تھا۔

ہوٹل کو نہ چھوڑنے کی ایک اور بھی وجہ تھی۔ رمنا رئیس جو یہاں آتی تھی! کوئی اور ایسی قابل ذکر جگہ نہیں تھی جہاں وہ اس سے مل سکتا۔

رمنا سے اس کا تعلق بھی ابھی تک ایک عجیب' بے عنوان سا ہی تعلق تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پاتا تھا کہ اسے محبت کا نام دے یا نہیں؟ ایک خلش تھی' ایک کسک سی تھی' ایک درد تھا جسے وہ دل میں لئے' سب سے چھپائے پھرتا تھا۔ کسی سے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ حتیٰ کہ رمنا سے بھی نہیں۔ وہ اس عورت کو دیکھتا تھا اور دیکھتے ہی کہنا چاہتا تھا مگر اس سے کچھ کہنے کی جرات اپنے دل میں نہیں پاتا تھا۔

اس نے بارہا سوچا.......... اگر یہ محبت بھی ہے تو اس سے کیا حاصل؟ وہ رمنا کو پانے کا شاید خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا وہ تو محض ایک پتھر تھا جسے رمنا کے نادیدہ ہاتھوں نے تھوڑا بہت تراش خراش دیا تھا لیکن اب بھی وہ کوئی ہیرا موتی تو نہیں تھا کہ اس کے تاج میں ٹانکا جاتا۔

رمنا ایک فلک بوس چوٹی تھی وہ اس کے دامن میں بہتا ہوا ایک چھوٹا سا برساتی نالہ ان کا کوئی میل نہیں تھا' کوئی مناسبت نہیں تھی' وہ مرتبے میں ہی نہیں' عمر میں بھی اس سے بڑی تھی۔ اختر کی نظر میں اس فرق کی کوئی اہمیت نہیں تھی لیکن رمنا کا رویہ بتاتا تھا کہ اسے نہ صرف اس فرق کا احساس تھا بلکہ وہ چاہتی تھی کہ اختر بھی اس فرق کو یاد رکھے۔

شاید یہی وجہ تھی کہ جب بھی اختر نے دل کی بات کہنا چاہی تھی' جذبہ دل کے اظہار کا کوئی بہانہ تلاش کرنا چاہا تھا تو ایک عجیب سی جھجک آڑے آ گئی تھی' کوئی لطیف سا اشارہ.......... کوئی خفیف سا کنایہ بھی اسے اک کوہ گراں محسوس ہوتا۔ وہ خاموشی سے اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ طلب کی تپش اس کی روح کو دھیرے دھیرے جھلسا رہی تھی۔

وہ حقیقت کی سفاک دنیا کے باسی تھے۔ فلمی یا افسانوی کردار نہیں تھے۔ رمنا کسی بڑے سیٹھ کی اٹھارہ بیس سال کی کنواری بیٹی نہیں تھی جو عشق میں دیوانی ہو کر بغاوت کر کے گھر سے نکل آتی اور اپنے غریب محبوب سے شادی کر کے زندگی کے دن بتانے لگتی۔ اپنے نازک ہاتھوں سے روٹیاں پکا پکا کر شوہر کو کھلاتی اور والہانہ لہجے میں کہتی۔ "جان جلی تمہارے سوا مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ تمہارے گھر کی ہر تکلیف میرے لئے عین راحت ہے"۔

رمنا پر عمر کا وہ دور یقیناً کئی برس پہلے گزر چکا تھا جب جذباتیت ہی لڑکی کا سب سے بڑا سرمایہ ہوتی ہے اور وہ جذباتیت اس سے نہ جانے کیسے کیسے پہاڑ سر کروا دیتی ہے۔

سب سے زیادہ مایوس کن بات یہ تھی کہ اب اس سے ملنا بھی کیا ملنا رہ گیا تھا۔ جوں جوں اختر کی شہرت بڑھتی گئی تھی' ان کے درمیان فاصلہ بھی کم ہونے کے بجائے بڑھتا گیا تھا۔ اختر جس دیوانگی' جس والہانہ پن سے اس کی طرف بڑھنا چاہتا تھا' اتنی ہی رکھائی سے وہ پیچھے ہٹ جاتی تھی۔

بعض اوقات تو کئی کئی دن گزر جاتے اور وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی اور نہ ہی ایسا موقع پیدا ہونے دیتی کہ اختر خود ہی جا کر اس سے مل لیتا۔ ہوٹل میں اگر سامنا بھی ہوتا تو عمر رسیدہ یا نک چڑھی قسم کی بیگمات کے جھرمٹ میں جا کھڑی ہوتی جو ایک دوسرے کو حسب توفیق پیرس' ہانگ' کانگ یا دبئی میں اپنی اپنی شاپنگ کے قصے سنا رہی ہوتی تھیں۔ وہ انگریزی زدہ اردو میں گفتگو کرتی تھیں۔ شوہر کا نام اگر دانش ہوتا تھا تو اسے ڈینش یا ڈینی کہتی تھیں۔

وہ اپنی ہانگ کانگ کی ایمی ٹیشن جیولری کی نمائش کرتے ہوئے بڑے فخر سے بتاتی تھیں کہ ان کے بالکل ویسے ہی اصل ہیروں والے زیورات لاکروں رکھے ہیں۔ اختر قریب سے گزرتے ہوتے یا ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے ان کی باتیں سنتا اور حیران ہوتا کہ آخر ان زیورات کے انبار جمع کرنے کا کیا فائدہ تھا جنہیں عورت پہن نہیں سکتی تھی؟

رمنا اگر کبھی کبھار اختر سے اچھی طرح ملتی تھی تو صرف اس وقت جب ان کے آس پاس یا تو کوئی موجود ہی نہیں ہوتا تھا اگر کوئی اکا دکا شخص بھی ہوتا تھا تو وہ بالکل غیر متعلق' ناآشنا یا اپنے آپ میں ہی مگن ہوتا تھا۔

ایک بار ایسے ہی ایک موقع پر اختر یاسیت زدہ لہجے میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔ "رمنا بیگم! اس سے تو ہم اجنبی ہی اچھے تھے کہ کبھی آپ اپنی فرمائش کی چٹ بھجوا دیا کرتی تھیں اور کبھی ہمارا دل چاہتا تھا تو بلا کھٹکے آپ کی میز پر آ بیٹھتے تھے۔ اب تو جیسے کوئی غیبی ہاتھ ہمارے درمیان اجنبیت اور تکلف کی دیوار کھری کر گیا ہے"۔

"بات یہ ہے اختر..........!" وہ گہری سانس لے کر اپنے کھلے سیاہ بالوں میں مرمریں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ "کہ شہرت جہاں اپنے ساتھ بہت سی خوشیاں لاتی ہے' انسان کو بہت کچھ دیتی ہے وہاں انسان سے بہت کچھ چھین بھی لیتی ہے۔ تم اب شوبزنس کی دنیا کی ایک نمایاں شخصیت بن چکے ہو اور میں بدقسمتی سے ایک بہت دولت مند انسان کی بیوی ہوں۔ اونچے سماجی حلقوں میں میرا بھی ایک خاص مقام ہے۔ میں تمہاری طرح مشہور نہ سہی لیکن پھر بھی ایک اہم شخصیت ہوں"۔

"میں سمجھا نہیں۔ کیا میرے اور آپ کے مقام نے ہمیں ایک دوسرے سے دور کر دیا؟" اختر الجھن سے بولا۔

"تمہیں تو اس سیدھی سی بات کو نہایت آسانی سے سمجھ جانا چاہئے۔ تم شوبزنس کے

سادمی ہو۔ تمہیں تو ان معاملات کا مجھ سے زیادہ تجربہ ہو گا۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ اخباروں کے رپورٹر.......... خصوصاً" سماجی تقریبات کی رپورٹنگ کرنے والے کس کثرت سے اونچے ہوٹلوں میں چکراتے رہتے ہیں؟ تم تو اب انہیں اچھی طرح پہچانتے ہو۔ ان ہوٹلوں میں نشست و برخاست رکھنے پر ان کا خرچ بھی نہیں ہوتا۔ آج اس تقریب میں.......... کل اس تقریب میں۔ آج اس ہال میں نظر آئیں گے کل اس ہال میں۔ تم انہیں دیکھتے ہو یا نہیں؟"

"دیکھتا ہوں۔ میری تو ان سے ہر قدم پر سلام دعا ہوتی رہتی ہے"۔ اختر نے سادگی سے جواب دیا۔

"تمہیں ان سے خوف نہیں آتا؟" رمنا نے پوچھا۔

"نہیں"۔ اختر نے سرہلایا۔

رمنا نے ٹھنڈی سانس لی۔ "دراصل شوبزنس نے ابھی تمہیں خرانٹ نہیں بنایا اور تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تم اخبار والوں کے شکنجے میں نہیں آئے ورنہ تمہاری ہڈیاں بھی چورا ہو جاتیں۔ کچھ تمہاری خوش قسمتی ہے اور کچھ تمہاری شرافت.......... کہ ابھی تک تم کسی اسکینڈل کی زد مین نہیں آئے۔ جس مقام پر اس وقت تم ہو' اس مقام پر پہنچ کر بھی اسکینڈل سے محفوظ رہنا بڑی خوش قسمتی ہے"۔

"میں بڑی محتاط زندگی گزار رہا ہوں۔ میں نے کسی چیز کو اپنی کمزوری نہیں بنایا۔ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہیں۔ وقت کا پابند ہوں۔ کہیں فرعونیت کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ لڑکیوں کے پیچھے نہیں بھاگتا۔ جو لڑکیاں اپنی نوازشات کے ساتھ میری طرف لپکتی ہیں میں ان سے بھی کنی کترا جاتا ہوں۔ میں بہت صبر و قناعت کی زندگی گزار رہا ہوں۔ شاید اس لئے میرا کوئی اسکینڈل نہیں بنا"۔

"کیا تم نے واقعی ابھی تک کسی لڑکی میں دلچسپی نہیں لی؟" رمنا نے یکدم موضوع سے ہٹتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"نہیں"۔ اختر نے دیانتداری سے جواب دیا۔ "لڑکیاں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ بہت سی لڑکیوں کے فون آتے ہیں بعض تو کہتی ہیں کہ وہ میری تصویر کتابوں میں رکھتی ہیں' ایک آدھ نے تو یہ دھمکی بھی دی کہ اگر وہ مجھے نہ پا سکی تو خودکشی کر لے گی.......... لیکن مجھے یہ باتیں متاثر نہیں کر سکیں"۔

"کیوں؟"

"شاید اس لئے کہ یہ سب سطحی باتیں ہیں.......... وقتی باتیں ہیں ان میں خلوص یا عزم کی پختگی نہیں ہے۔ یہ افسانوں محبتوں کا دور نہیں ہے مسز رئیس! ایسی باتیں کرنا بس یونہی اچھا لگتا ہے۔ ان کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ کل کو ان لڑکیوں کی شادیاں ہو جائیں

گی.......... دو دو چار چار بچے ہو جائیں گے۔ یہ باتیں انہیں یاد بھی نہیں رہیں گی۔ یاد آیا بھی کریں گی تو انہیں ہنسی آیا کرے گی۔ یہ سوچ کر میں ان کی ہمت افزائی نہیں کرتا۔ بات آگے نہیں بڑھاتا۔ مجھے ان سے خوف بھی آتا ہے شاید ان میں سے کسی کے جذبات میں شدت ہو میں کسی کی زندگی خراب نہیں کرنا چاہتا"۔

"بہت خوب"۔ رمنا بولی۔ "تمہارا ذہن' تمہاری عمر سے کہیں زیادہ پختہ ہے"۔

اختر کہتے کہتے رہ گیا۔ "شاید یہی وجہ ہے کہ میرا ذہن ایک پختہ عورت میں پھنسا ہوا ہے"۔

اس کے بجائے اس نے کہا۔ "شاید میرے محتاط رہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ میرا ذہن کہیں اور اٹکا ہوا ہے۔ میرے آئیڈیلز کچھ اور ہوں"۔

"لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہاں کوئی تمہارے دل میں جھانکنے کی کوشش نہیں کرے گا"۔ رمنا گویا جان بوجھ کر اس کی بات میں چھپے ہوئے نکتے کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ "تم خواہ کتنے ہی محتاط ہو.......... کتنے ہی اچھے آدمی ہو.......... تمہارے دل میں خواہ کتنی ہی خوبصورت دنیا آباد ہو۔ اس کے باوجود تم اسکینڈل کی زد میں آ سکتے ہو کیونکہ ہمارے ہاں اسکینڈل بنانے کا شوق صرف اخبار نویسوں ہی کو نہیں ہر طبقے کو ہوتا ہے۔ اخبار نویسوں کی تو خیر یہ ضرورت بھی ہے اور وہ بیچارے تو پھر بھی اس وقت خبر دیتے ہیں جب کوئی نہ کوئی بات ہوتی ہے۔ آگ لگی ہوتی ہے تو وہ صرف دھواں اٹھنے کی خبر دیتے ہیں لیکن دوسرے طبقے تو بعض اوقات ان سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ رائی ہو تو پہاڑ بنا دیتے ہیں تم نے شاید کبھی غور نہیں کیا کہ لوگوں کی نظریں کس طرح ہمارے تعاقب میں رہتی ہیں؟"

"نہیں.......... میں نے اس نظر سے کبھی لوگوں کی طرف نہیں دیکھا"۔ اختر نے اعتراف کیا۔ "دراصل مجھے بہت تیزی سے سب کچھ مل گیا ہے۔ بہت سی باتوں کی طرف دھیان دینے کا مجھے وقت ہی نہیں مل رہا۔ میرے پاؤں ابھی مضبوطی سے زمین پر نہیں جمے"۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ بہت سی باتوں کا ابھی تمہیں تجربہ نہیں ہے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ ہمارے تمہارے جاننے والے.......... ہمارے اپنے طبقوں کے لوگ خود دوڑے دوڑے اخبار نویسوں کے پاس جاتے ہیں۔ انہیں کوئی ذرا سا نکتہ ہاتھ آ جائے تو اسے خوب نمک مرچ لگا کر' افسانے تراش کر اپنے شناسا اخباری لوگوں کے پاس دوڑ جاتے ہیں"۔ رمنا بولی۔

اختر قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "مجھ جیسی عورت.......... جس کے وجود سے جوانی بھی ایک الزام کی طرح چمٹی ہوئی ہے اور جس کا کروڑ پتی لیکن بوڑھا اور اپاہج شوہر گھر پر پڑا رہتا ہے.......... اور تم جیسا معروف

اور وجیہہ نوجوان جس کی نس نس میں امنگیں تڑپ رہی ہیں.......... جو ابھی آسمان کو چھو لینا چاہتا ہے.......... جسے ملک کا بچہ بچہ جانتا ہے.......... ہم دونوں کا اسکینڈل بننا تو بہت آسان ہے۔ اختر! لوگوں کے لئے اس میں چٹخاروں کا بہت سامان ہو گا"۔

اختر نے پہلی بار ان پہلوؤں کے بارے میں سوچا تھا۔ اس کی نظر تو ابھی تک اپنی طلب کی شدت.......... اپنے محسوسات سے آگے گئی ہی نہیں تھی' شوبزنس نے ابھی اسے کچھ زیادہ تلخ تجربات نہیں دئے تھے۔

رمنا ایک افسردہ سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لئے نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی' ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ نہایت مدہم لہجے میں بولی۔ "تم ابھی کم عمر ہو' نادان ہو' جینے کے بہت کم گر جانتے ہو' زمانے کے پل صراط سے صحیح سلامت گزرنے کا فن ابھی تمہیں مکمل طور پر نہیں آیا۔ یہ صرف تمہاری خوش قسمتی ہے کہ ابھی تک ہموار راستوں پر تمہارا سفر جاری ہے۔ ورنہ بہت سے لوگ تو تمہارے مقام پر پہنچنے سے پہلے ہی اوندھے منہ گر پڑتے ہیں اور کوئی انہیں سہارا دے کر اٹھانے والا نہیں ہوتا پھر بھی اگر تمہارے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو تم اس کے متحمل ہو سکتے ہو' لیکن میری پوزیشن تم سے کہیں زیادہ نازک ہے۔ میں ایک شیش محل میں بیٹھی ہوں اور میں اسے توڑنا نہیں چاہتی۔ اس لئے جو کچھ کرتی ہوں۔ ٹھیک کرتی ہوں.........."

اس نے ایک بوجھل سی سانس لی اور میز پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے ذرا آگے کو جھک کر پہلے سے بھی دھیمی آواز میں بولی۔ "......... اور پھر جب بات بھی کچھ نہ ہو.......... ہمارے تمہارے درمیان وفا کا کوئی رشتہ نہ ہو.......... عہد و پیماں کی کوئی بات نہ ہو.......... تو پھر رسوائیاں کمانے سے کیا فائدہ؟"

ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی وہ' اختر نے سوچا' کہ جب بات کچھ بھی نہ ہو تو رسوائیاں کمانے سے کیا فائدہ؟

لیکن یہ صرف رمنا کا خیال تھا کہ بات کچھ بھی نہیں تھی۔ اختر سے تو اس نے پوچھا ہی نہیں تھا کہ اس کی دھڑکنوں میں کس کے نام کی گونج تھی؟ اس کی آنکھوں میں' رمنا کو دیکھ کر ستارے کیوں جھلملا اٹھتے تھے؟ ان لڑکیوں میں سے کوئی آج تک کیوں اس کی آنکھوں میں نہیں سما سکی تھی جو بڑے اشتیاق سے اس کی طرف بڑھتی تھیں؟

اختر.......... سدا کا بزدل.......... وہ رمنا کو یہ سب باتیں بتا بھی تو نہیں سکا تھا' بات اس کے ہونٹوں تک آتی تھی اور رک جاتی تھی۔ اس کے ہمعصر' اس کے ساتھی' اس کے ہم پیشہ بہت بے باک' بڑے کھلاڑی' بڑے زمانہ ساز تھے۔ نہ جانے پہلی پہلی ملاقاتوں میں ہی' کس کس سے' کیا کیا کچھ کہہ جاتے تھے۔ ایک وہ تھا کہ ابھی تک دل کے بھید کو' اسکول کی نو عمر لڑکی کی طرح دل ہی میں چھپائے پھر رہا تھا۔

پھر کبھی کبھی وہ سوچتا' کیا رمنا اس کے محسوسات سے باخبر نہیں تھی؟ شاید ہیں.......... مگر وہ اتنی بے خبر بھی معلوم نہیں ہوتی تھی۔

ایک روز انہیں ہوٹل کے ریستوران میں ایک گوشے میں تخلیہ میسر آیا۔ وہ کھانے کا وقت نہیں تھا اس لئے ریستوران میں ایک آدھ ویٹر کے سوا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کافی دیر تک وہ چپ چاپ سے ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے رہے۔

بالآخر اختر ہمت کر کے بولا۔ "رمنا! کیا آپ کو معلوم ہے محبت کسے کہتے ہیں؟"

"ہاں" خلاف توقع وہ خوابناک سے انداز میں بولی۔ "محبت ایک خوش رنگ پرندہ ہے جس کے تعاقب میں ہم عمر گنوا دیتے ہیں' مگر وہ کبھی ہمارے ہاتھ نہیں آتا"۔

"یاسیت زدہ فلسفوں کو چھوڑیئے رمنا" اختر نے ملامت سے کہا پھر اپنے دل کی دھڑکنوں کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "یہ بتایئے آپ نے کبھی کسی سے محبت کی؟"

رمنا کی آنکھوں میں نہ جانے کتنے بھولے بسرے خوابوں کی پرچھائیاں رینگ آئیں۔ کئی لمحے تک وہ کچھ نہ بول سکی۔ شاید اس کے ذہن میں لفظوں کا سیلاب امنڈ آیا تھا جس نے اسے بولنے کا قرینہ بھلا دیا تھا۔ ایک طویل سانس لے کر اس نے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگا لی۔ اس کے ریشمی بال آج بھی کھلے تھے اور وہ دھیرے دھیرے ان میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اس کی نظریں چھت میں آویزاں ایک بڑے سے فانوس پر تھیں۔

"ہاں.......... میں نے بہت سی چیزوں سے محبت کی ہے"۔ وہ بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی۔ "مجھے یاد ہے جب میں چھوٹی تھی تو تو ہمارا گھر ایک خوبصورت' سرسبز پہاڑی کے دامن میں تھا' وہ ایک کشادہ پر آسائش کوٹھی تھی مجھے ان رنگ برنگے پھولوں سے محبت تھی جو ہمارے لان میں پودوں کی شاخوں پر جھومتے تھے۔ مجھے اپنے ابو سے بھی محبت تھی جو ایک سرکاری افسر تھے انہوں نے ہی میرا نام رمنا رکھا تھا۔ انہیں یہ نام بہت پسند تھا۔ روزانہ آفس جاتے وقت وہ مجھے گود میں اٹھا کر گاڑی تک پہنچتے تھے اور میری پیشانی چوم کر مجھ سے اجازت طلب کرتے"۔ "اچھا.......... رمنا بیٹے! ہم جائیں؟"

میں سر ہلا کر انہیں اجازت دیتی اور اپنا ننھا سا ہاتھ لہراتے ہوئے انہیں اس وقت تک ٹاٹا کہتی رہتی جب تک ان کی گاڑی نظر سے اوجھل نہ ہو جاتی۔ یوں بچپن ایک سہانے خواب کی طرح گزرتا چلا جا رہا تھا..........

"جب میں نے ہوش سنبھالا تو محسوس کیا کہ میری امی نہایت حریص اور سطحی قسم کی عورت ہیں وہ ان عورتوں میں سے تھیں جنہیں خوشیاں صرف دولت اور خود نمائی میں نظر آتی ہیں۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا اونچے طبقے کی عورتوں میں تھا۔ گویا کہ انہیں ہر قسم کی آسائش میسر تھی لیکن وہ جن سرمایہ داروں کی بیگمات میں بیٹھتی تھیں۔ ان سے بھی ممتاز ہو کر رہنا

چاہتی تھیں۔ ان کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ کسی محفل میں جائیں اور وہاں کسی خاتون کے گلے میں ایک لاکھ کا لاکٹ ہو تو ان کے گلے میں سوا لاکھ کا لاکٹ ہونا چاہئے.........

"ابو کتنے ہی اونچے عہدے پر سہی' لیکن بہرحال سرکاری ملازم تھے۔ اس کے باوجود ہمارا رہنا سہنا شاہانہ تھا۔ لیکن اب یہ تو ممکن نہیں تھا کہ امی کی لامحدود خواہشات کی تکمیل بھی ہوتی رہتی۔ اکثر ان کے درمیان تلخ کلامی ہوا کرتی اور امی کہتیں۔ "فلاں صاحب عہدے میں آپ سے کم ہیں ان کی بیوی کے ٹھاٹ دیکھے ہیں آپ نے؟ چھٹیاں منانے مری کا کہہ کر جاتے ہیں لیکن جاتے سوئٹزر لینڈ ہیں' معلوم ہے آپ کو؟.........

"یا پھر وہ طعنہ دیتیں "فلاں صاحب کا گھر کبھی غور سے دیکھا ہے آپ نے؟ ہر چیز امپورٹیڈ ہے ان کے گھر میں۔ سب بچوں کے نام سے ایک ایک بنگلہ بنا کر چھوڑا ہوا ہے' کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہے"۔

ابو بے چارگی سے کہتے۔ "بیگم! تم اچھی طرح جانتی ہو' میں ان لوگوں والے راستے اختیار نہیں کر سکتا"۔ پھر ان میں زور و شور سے بحث شروع ہو جاتی۔

آخر ایک دن ابو نے شکست تسلیم کر لی۔

امی کے پسندیدہ ملبوسات' زیورات اور نت نئے آرائشی سامان کے انبار لگنے شروع ہو گئے ان انباروں تلے امی کی روز روز کی چخ چخ دب کر رہ گئی گھر میں امپورٹیڈ چیزیں نظر آنے لگیں۔ سرکاری گاڑی کے علاوہ بھی گھر میں دو دو گاڑیاں نظر آنے لگیں کنبہ نہایت مختصر تھا لیکن آسائشوں کا کوئی شمار نہیں تھا۔

اس وقت میں بی اے میں تھی اور جاگتی آنکھوں سے سپنے دیکھا کرتی تھی جب ایک عجیب حادثہ ہوا......... جانتے ہو کیا ہوا؟ رمنا نے مخمور سی آنکھوں سے اختر کی طرف دیکھا۔ اختر دم بخود سا بیٹھا تھا۔ اس نے ذرا چونکتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

تب رمنا گویا اپنے آپ پر ہنستے ہوئے بولی۔ "مجھے محبت ہو گئی۔ ایک اور محبت......... ویسی ہی محبت جیسی دراصل تم پوچھنا چاہ رہے ہو......... یہ محبت مجھے اپنی خالہ کے لڑکے سے نہیں ہوئی تھی جو اپنی لمبی سی کار میں اتوار کے اتوار ہمارے ہاں آتا تھا۔ یہ محبت اپنی پھوپھی کے لڑکے سے بھی نہیں ہوئی جو اپنی امپورٹ ایکسپورٹ فرم چلا رہا تھا اور جس نے میری سالگرہ پر مجھے ہیروں کے دو جڑاؤ کنگن تحفے میں دیئے تھے۔ اپنے آس پاس کی لمبی چوڑی کوٹھیوں میں بسنے والا کوئی شہزادہ بھی میرے تصورات کی دنیا میں روشنی بن کر نہیں آیا۔ مجھے محبت ہوئی بھی تو ابو کے محکمے میں کام کرنے والے ایک کلرک کے بیٹے سے"۔

"وہ میری کلاس میں پڑھتا تھا دبلا پتلا' خوبصورت اور شرمیلا سا وہ لڑکا شاعر تھا۔ اس نے مجھ پر بڑی خوبصورت نظمیں لکھیں۔ صرف مجھے ہی اس سے محبت نہیں تھی' اس کا بھی

دعویٰ تھا کہ وہ مجھ سے بہت پیار کرتا تھا۔ میرے گمان سے بھی زیادہ......... وہ اتنی پیاری باتیں کرتا تھا کہ انہیں سنتے دل نہیں بھرتا تھا۔

وہ لفظوں کا بادشاہ تھا۔ الفاظ گویا اس کے ایک اشارے پر دست بستہ' قطار در قطار چلے آتے تھے اور وہ ان سے اپنے محسوسات کو سجاتا رہتا تھا۔

اس کے الفاظ کیا تھے......... بس ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی میں کسی ساکت جھیل میں کھل اٹھنے والے کنول تھے یا پھر نکھری نکھری صبح کی آمد پر سورج کی کندنی کرنوں سے جھلملا اٹھنے والی شبنم کی بوندیں۔

دو سال تو میں اس کا ہاتھ تھامے' مدھر خوابوں کی فضاؤں میں پرواز کرتی رہی۔ ایک دن میں نے اس سے کہا "شکیل! گھر میں شادی کی بات چیت چل رہی ہے تم اپنی والدہ کو ہمارے ہاں بھیجو"۔

"لیکن کیوں؟" اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"تاکہ میں تم سے شادی کے لئے ہاں بھر سکوں"۔ میں نے کہا۔

"شادی.........؟" اس نے حیرت سے دہرایا۔

"مگر میں تو تمہارے ساتھ شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتا رمنا! تم میرے ساتھ زندگی نہیں گزرا سکتیں۔ تم نے میرا گھر نہیں دیکھا۔ وہاں طویل و عریض' آراستہ و پیراستہ کمرے نہیں' تنگ و تاریک کوٹھریاں ہیں جن میں ہم دس افراد رہتے ہیں۔ وہاں امپورٹیڈ میٹریس والے بیڈ اور صوفے نہیں' جھلنگا سی چارپائیاں ہیں جن پر بعض اوقات بستر بھی نہیں ہوتا۔ اگر تم ان پر سونے کی کوشش کرو تو تمہاری ملائم جلد پر خراشیں پڑ جائیں گی"۔

پھر وہ مجھ سے نظر چراتے ہوئے بولا۔ "وہاں میرے پانچ چھوٹے بہن بھائی ہیں جو اتنے گندے سندے رہتے ہیں کہ اگر تمہاری خوبصورت قمیض کا دامن پکڑ لیں تو مرغی کے پنجوں جیسے نشان ڈال دیں۔ وہاں میری ماں جو میلے کپڑوں کا بڑا سا انبار اپنے ہاتھوں سے دھوتی ہے' ڈھیر کا ڈھیر برتنوں کا مانجھتی ہے۔ تم ایک دن بھی وہاں نہیں رہ سکتیں۔ رمنا ایک دن بھی........."

"ضروری تو نہیں ہے کہ ہم وہاں رہیں"۔ میں نے اس کے دل میں امید کا دیا جلانا چاہا۔

"میں ایک کلرک کا بیٹا ہوں رمنا"۔ وہ بدستور افسردگی سے بولا۔ "کلرک بھی ایسا بھی جس نے زندگی میں کبھی دس روپے کی رشوت بھی نہیں لی......... اوپر سے میں آرٹس پڑھ رہا ہوں۔ ایک غریب کلرک کا آرٹس پڑھنے والا بیٹا اپنے مستقبل کے بارے میں کیا امیدیں رکھ سکتا ہے؟ اس کا مستقبل وہی گھر ہے......... یا پھر اس جیسا ہی کوئی دوسرا گھر"۔

میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ "شکیل! تمہاری بانہوں کے پیار بھرے حلقے میں سمٹ کر پتھروں کے فرش پر بھی سو سکتی ہوں۔ تمہیں میری نزاکتوں کا تو اندازہ ہے' میری سخت جانی کا نہیں......... میں سب کچھ سہہ لوں گی' ہر امتحان سے گزر جاؤں گی۔ ہم دونوں مل کر اپنی کائنات تعمیر کریں گے"۔

"یہ سب افسانوی باتیں ہیں رمنا"۔ اس نے میرا رخسار تھپک کر کہا تھا۔ "میں اپنی ماں کو اس رشتے کے لئے بھیج کر ذلیل نہیں کرانا چاہتا۔ تمہارے ابو کبھی یہ رشتہ قبول نہیں کریں گے ان کی مرضی اور خوشنودی کے بغیر اگر میں نے تم سے شادی کی تو یہ درحقیقت تم سے دشمنی کے مترادف ہو گا۔ اس صورت میں ایک قابل رحم زندگی ہماری منتظر ہو گی۔ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ رمنا! چند دن کی اذیت' زندگی بھر کے عذاب سے بہتر ہے"۔

"وہ حقیقت پسند ضرور تھا مگر بے وقوف اور بزدل بھی تھا۔ اس نے میرے حوصلوں کو آزمائے بغیر ہی یکطرفہ فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ یکدم ہی میرے دل سے اتر گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے کسی سراب کے تعاقب میں عمر گنوا دی تھی۔ اس دن کے بعد میں اس سے کبھی نہیں ملی......... ابھی میں جذبہ دل کی اس شکست وریخت سے ہی نہیں سنبھلی تھی کہ اس سے بھی بڑا ایک اور حادثہ رونما ہو گیا"۔

ابو گرفتار کر لئے گئے' اینٹی کرپشن اور ایف آئی اے والوں نے انہیں رشوت لیتے ہوئے گرفتار کیا تھا ان پر مقدمہ چلنے لگا۔ مقدمہ صرف رشوت کا ہی نہیں تھا' ان پر لاکھوں کی ہیرا پھیری کا بھی الزام تھا۔ ان کی زندگی پر بندھا ہوا قناعت پسندی کا بند ٹوٹا تھا تو پھر شاید ہوس کا سیلاب کچھ زیادہ ہی تیزی سے آیا تھا۔

جب ہماری پیشانیوں پر رسوائی کی سیاہی بکھر گئی تو عزیزوں' رشتے داروں نے ہمیں پہچاننا چھوڑ دیا۔ خالہ کا لڑکا جو اتوار کے اتوار ہمارے ہاں آنا اپنا فرض سمجھتا تھا' اب اس کی صورت بھی نہیں نظر آتی تھی' پھوپھی کا لڑکا ویسے ہی جرمنی چلا گیا تھا۔ ان کے والدین کے بارے میں ہمیں پتہ چلا کہ وہ لوگوں کو بتاتے پھر رہے تھے' ہم سے ان کی رشتے داری نہیں' یونہی رسمی سی صاحب سلامت تھی۔

صرف ابو کے جیل جانے سے گویا ہماری کائنات الٹ پلٹ ہو گئی' امی اب چھپ چھپ کر رویا کرتیں' مجھے ان سے نفرت ہو چکی تھی ان کے آنسو بھی اب میری نفرت کو محبت میں نہیں بدل سکتے تھے۔ ہماری خوبصورت دنیا کی بربادی میں سب سے زیادہ انہی کا ہاتھ تھا۔ کبھی کبھی مجھے شبہ ہوتا کہ شاید وہ میری سگی ماں نہیں تھیں۔

مقدمہ چلتا رہا' ہمارے پاس زیادہ نقد روپیہ نہیں تھا' زیادہ تر تو وضع داریوں اور نمود و نمائش پر ہی اٹھ جاتا تھا اور ابو کی گرفتاری کے بعد ہمارے کچھ اثاثے جو ظاہر ہو گئے وہ ضبط بھی ہو گئے تھے لہٰذا وہ سب قیمتی چیزیں جو بڑے چاؤ سے خریدی گئی تھیں چھپ چھپ

کراونے پونے داموں بیچی جانے لگیں۔ کاروں اور ہیروں کے زیورات وغیرہ کے بعد گھریلو استعمال کی چیزوں تک کا نمبر آ گیا۔ تمام بھاری بھاری چیزیں ایک ایک کر چلی گئیں۔ گھر اجاڑ سا ہو گیا۔ بھائیں بھائیں کرنے لگا۔

شام ڈھلے' سوگوار اور ویران سی کوٹھی کے کسی گوشے میں بیٹھے بیٹھے میری آنکھیں نم ہو جاتیں اور میں ڈوبتے دل کو سنبھالے دھندلائی نظروں سے یوں منتظر سے انداز میں گیٹ کی طرف دیکھا کرتی جیسے ابو ابھی کار سے اتریں گے اور مجھے بیٹھے دیکھ کر دور سے ہی ہاتھ ہلا کر کہیں گے۔ "دیکھو رمنا بیٹے میں تمہارے لئے کیا لایا ہوں"۔

میں ان کی اکلوتی اولاد تھی اور وہ مجھے بیٹا کہا کرتے تھے لیکن میں کتنی مجبور تھی۔ ان کے لئے کچھ بھی تو نہیں کر سکتی تھی۔ امی پانی کی طرح روپیہ بہا رہی تھیں۔ ابو شاید جلد ضمانت پر جیل سے آ جاتے لیکن ان پر سرکاری رازوں کی فروخت کا الزام بھی لگ گیا تھا۔ محکمے میں اندر ہی اندر کچھ لوگ ان کے مخالف تھے اور انہوں نے موقع غنیمت دیکھ کر سارے حساب بے باق کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اسی دوران ہم سے سرکاری کوٹھی بھی خالی کرا لی گئی۔ ہم کرائے کے ایک معمولی سے مکان میں آ گئے۔

پورے دو سال بعد ابو کی مشروط ضمانت ہو سکی۔ وہ گھر آئے تو ان کے سفید بالوں میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہو چکے تھے۔ کمر جھک گئی تھی اور وہ بات کرتے کرتے بار بار کھانستے۔ ایک عجیب طرح کی کھانسی انہیں لگ گئی تھی جو کسی دوا سے ٹھیک نہیں ہوتی تھی میں ان سے لپٹ کر بہت روئی۔

مقدمہ ابھی چل رہا تھا۔ ابو کی شخصیت مسخ ہو کر رہ گئی تھی وہ کسی سے بات نہ کرتے' چڑچڑے بہت ہو گئے تھے۔ اکثر خاموش بیٹھے گھنٹوں خلاء میں نہ جانے کیا تکتے رہتے' کیا تلاش کرتے رہتے۔ شاید کھویا ہوا وقار اور عزت۔ بہر حال زندگی کا لاشہ کسی نہ کسی طرح گھسیٹا جا رہا تھا۔

ایک دن ابو باہر سے واپس آئے تو ان کے ساتھ بڑی عمر کا ایک خوش لباس شخص تھا جو حلیے سے ہی ذی حیثیت معلوم ہوتا تھا۔ ابو اسی کی شاندار کار میں آئے تھے۔ پتہ چلا کہ ابو نے اپنی افسری کے زمانے میں کوئی اہم انڈسٹریل لائسنس دلوانے میں ان صاحب کی بڑی مدد کی تھی۔ اس وقت سے معمولی شناسائی تھی۔ آج ایک عرصے بعد ملاقات ہوئی تو انہیں ہمارے حالات کا پتا چلا۔

وہ سیٹھ رئیس تھے!

میں ان کے لئے چائے لے کر گئی تو انہوں نے گہری نظر سے میرا سراپا جائزہ لیا اور ابو سے بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "فکر نہ کیجئے......... سب ٹھیک ہو جائے گا"۔

آخر کار ایک روز ابو کے مقدمے کا فیصلہ ہو گیا۔ دو سال قید اور دس لاکھ روپے

جرمانہ' جس کی عدم ادائیگی پر ابو کی قید میں تین سال کا اضافہ ہو جاتا۔ ادائیگی کے لئے صرف دو ماہ کی مہلت دی گئی تھی۔

پانچ سال قید کا تصور کر کے ابو زار و قطار رونے لگے۔ میں کانپتے ہاتھوں سے انہیں سہارا دینے کے لئے کٹہرے کی طرف بڑھی۔ امی کرسی پر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے رو رہی تھیں۔ دفعتہ" سیٹھ رئیس آگے آئے۔ انہوں نے ایک ہاتھ میرے اور ایک ابو کے کندھے پر رکھتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہا۔ "گھبرائیے نہیں' سب ٹھیک ہو جائے گا"۔

........اور پھر واقعی سب ٹھیک ہو گیا۔

سیٹھ رئیس نے جرمانہ بھر دیا۔ ابو کے جیل جانے کے بعد بھی وہ ہمارے ہاں آتا رہا۔ ہم سے ملنے کے لئے اسے خاص طور پر بائی ائیر آنا پڑتا تھا لیکن وہ ہر تیسرے چوتھے دن اس طرح آتا رہتا تھا جیسے برابر کے محلے سے اٹھ کر آ گیا ہو۔

اس نے ہر طرح سے ہماری خبر گیری کی۔ ہمیں کوئی تکلیف نہ ہونے دی۔ کاروبار کے سلسلے میں وہ اکثر باہر جاتا رہتا تھا۔ جب بھی باہر سے واپس آتا میرے لئے کوئی نہ کوئی قیمتی تحفہ لے کر آتا ابو سے ملنے سے وہ کئی مرتبہ ہمارے ساتھ جیل گیا۔ ہم پر اس کی نوازشات کے بارے میں سن کر یقیناً تمہیں حیرت نہیں ہوئی ہو گی۔

ظاہر ہے میرے والدین سے اس کا ایک خاموش معاہدہ ہو چکا تھا۔ ایک ایسا معاہدہ جس کے لئے کوئی میٹنگ نہیں بلائی گئی تھی' کاغذات تیار نہیں کئے گئے تھے' کسی قسم کی گفتگو نہیں کی گئی تھی۔ یہ معاہدہ صرف ذہنوں کے اوراق پر لکھا گیا اور اس پر نگاہوں کی رضامندی نے دستخط کئے۔

جیسے ہی ابو جیل سے رہا ہو کر آئے اس معاہدے پر عمل در آمد ہو گیا۔

تم سمجھ رہے ہو نا؟ سیٹھ رئیس سے میری شادی ہو گئی۔ میں نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ مجھے کوئی خاص دکھ بھی نہیں ہوا۔ میں شاید کچھ بے حس سی ہو گئی تھی۔ میں ایسے دور میں سے گزر رہی تھی جس میں میرے احساسات سو گئے تھے یا پھر شاید یہ میرے حالات کا منطقی نتیجہ تھا جسے نہایت ٹھنڈے اور منطقی ذہن کے ساتھ ہی میں نے قبول کر لیا تھا۔

میں لاکھ پڑھی لکھی سہی' ذہین سہی' میرے اپنے کچھ تصورات سہی' لیکن کوئی بھی باضمیر لڑکی جیتے جی اپنے والدین کو مصائب کے جہنم میں دھکیلنا پسند نہیں کرتی۔ ہمارے گھرانے کے جو حالات تھے ان میں صرف میں ہی قربانی دینے کے قابل تھی۔ صرف میرے ایثار سے سب مسئلے حل ہو سکتے تھے ورنہ ہمارے ارد گرد مایوسی اور اندھیرے کی ایک لامتناہی دلدل کے سوا کچھ نہیں تھا۔ تمہیں شاید معلوم ہو کہ لڑکیاں ویسے بھی اپنے والدین کے سلسلے میں زیادہ ایثار پسند ہوتی ہیں۔

مجھے ابو سے بے پناہ ہمدردی بھی تھی اور محبت بھی۔ وہ اس حد تک حوصلہ کھو چکے

ئے کہ اب ان میں زندگی کی کوئی بھی سختی سہنے کی ہمت نہیں تھی۔ انہوں نے میرا ہاتھ سیٹھ رئیس کے ہاتھ دے کر اپنی دانست میں میرا مستقبل محفوظ کر دیا تھا۔ ناگواری ضرور تھی لیکن انہیں امید تھی کہ میں اس ناگواری سے سمجھوتہ کر لوں گی۔

میں احتجاج کرتی بھی کس کے لئے؟ میرا تھا ہی کون؟ کس کی خاطر میں ابو کے فیصلے سے اختلاف کرتی؟ کوئی بھی تو نہیں تھا جس کی خاطر میں لڑتی یا جسے میں اپنی منزل سمجھ کر ابو کے فیصلے کو ٹھکراتی۔

بڑی دھوم دھام سے میں سیٹھ رئیس کی بیوی بن کر رئیس پیلس میں آ گئی۔ جدید ترین فرنیچر' بیش قیمت قالینوں' دنیا بھر کی آسائشوں سے بھری تصوراتی خوابگاہوں والی وہ زلی کوٹھی دھیرے دھیرے میرے دل کو بھی پتھر کر گئی۔ اس میں سب کچھ تھا' سکون اور بت کے سوا.........!

نا آسودگی کا ایک طویل صحرا تھا جس میں میرا سفر شروع ہو چکا تھا۔ تم نے سیٹھ رئیس و نہیں دیکھا ہو گا۔ حادثے میں اپاہج ہونے کے بعد تو وہ بالکل ہی کھنڈر ہو گیا ہے لیکن ب میری اس سے شادی ہوئی اس وقت بھی وہ میرے ابو کے برابر ہی لگتا تھا۔ اس کے ڑوں کا گوشت لٹکا ہوا تھا۔ اس کا وزن دو سو تیس پونڈ تھا اور اس کے بال جو فرانس کے رہ ترین ہیئر کلر سے رنگے رہتے تھے' درحقیقت سارے کے سارے سفید تھے۔ کثرت مے ثی اور ہر طرح کی بے اعتدالیوں نے اسے کھنڈر کر دیا تھا مگر اس کے گرد عورتوں ہی کا یں' نوخیز لڑکیوں کا بھی ہجوم رہتا تھا۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں شاید دولت دنیا کا سب سے بڑا ناطیس ہے۔ ہر چیز کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ شروع شروع میں مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ نی دلبر صورتوں کا قرب حاصل ہوتے ہوئے بھلا سیٹھ رئیس کو میری کیا ضرورت تھی؟ لیکن پھر رفتہ رفتہ میری سمجھ میں آیا کہ بعض دولت مند بوڑھوں میں ایک عجیب قسم کا کمپلکس وجود ہوتا ہے.........

وہ بات کرتے کرتے گویا تھک کر ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئی۔ اختر گم صم بیٹھا لف لیلوی حسن کی مالک اس عورت کی طرف دیکھ رہا تھا جس نے کسی فرمائش کے بغیر چانک ہی اپنی کتاب زندگی اس کے سامنے کھول کر رکھ دی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔ "تم نے بہت سے ولت مند بوڑھوں کو نوجوان لڑکیوں سے شادیاں کرتے دیکھا ہو گا۔ یہ کامپلکس آج تک یری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں سیٹھ رئیس کے ساتھ ازدواجی زندگی کے کئی برس گزارنے کے بعد بھی اس کامپلکس کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکی اس طرح کے دولت مند بوڑھے اپنی سین اور نوجوان بجی سنوری بیوی کو اپنے ساتھ محفل میں لے جاتے ہیں اور وہاں سب کی ستائشی نظروں کا اندازہ کر کے ایک عجیب اور ناقابل بیان مسرت محسوس کرتے

ہیں............"

رمنا عجیب سے انداز مسکرائی۔ اس کی آواز کچھ اور دھیمی ہو گئی .... "ان کی
دراصل احساسات، جذبات اور خواہشات کا مجموعہ یا ایک جیون ساتھی نہیں، صرف
ڈیکوریشن پیس ہوتی ہے۔ مہنگے داموں خریدا ہوا ایک جیتا جاگتا، ڈریکوریشن پیس.......
کبھی وہ گھر میں سجائے رکھتے ہیں اور کبھی تقریبات میں لے جا کر صوفے یا کرسی پر سجا
ہیں............"

اس کی نیم وا آنکھوں میں کرب کے سائے لہرائے اور وہ پہلو بدلتے ہوئے بولی
کی زندگی......... ان کا رویہ عجیب تضادات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ
اگر بیوی کو محض ڈیکوریشن سمجھتے ہیں تو انہیں بیوی کے اعمال، افعال اور کردار
خاص غرض نہیں ہونی چاہئے۔ بیوی کے بارے میں جذباتی نہیں ہونا چاہئے.........
ہوتا یہ ہے کہ بیوی نے اگر ایک نگاہ غلط انداز سے بھی کسی کی طرف دیکھ لیا تو غ
پاگل ہونے لگتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ خود سجا سنوار کر بیوی کو تقریبات میں ساتھ
ہیں اور سب کی ستائشی نظریں محسوس کر کے خوش ہوتے ہیں۔ دوسری طرف یہ
ہے اگر کسی کی نظروں میں کچھ زیادہ ہی ستائش سمٹ آئے یا ستائش سے بڑھ کر کو
جھانکنے لگے تب بھی ان دولت مند بوڑھوں کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ ان کی بیویا
صرف حسین اور "مراعات یافتہ" قیدی ہوتی ہیں............"

پھر وہ خود ہی گویا اس کامپلکس کی وضاحت کرتے ہوئے بولی......... "میرا ذ
ان کی خوشی بس یہیں تک ہوتی ہے کہ لوگ ان کے قبضے میں ایک حسین چیز کو
انہیں فاتح اور صاحب کمال محسوس کریں۔ اس سے آگے بس تفکرات شروع ہو جا
بے چارے ہر وقت حسد و رقابت اور شکوک کی سولی پر مصلوب رہتے ہیں۔ کہیں
نظریں کسی پر مہربان تو نہیں.........؟ کہیں کسی کی نظریں کچھ زیادہ ہی دور تک
تعاقب نہیں کر رہیں.........؟ بس اسی قسم کے اندیشوں واہموں اور اذیت ناک
میں ان کی بچی کھچی زندگی گزر جاتی ہے............"

رمنا نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا لیں اور گہری سانس
بولی......... "سیٹھ رئیس نے بھی مجھے تقریبات کے سوا کچھ نہیں دیا۔ جب میرا
کہ وہ میرے پاس بیٹھے اور ملن رت کی باتیں کرے اس وقت وہ اسٹڈی میں
سویڈن، جرمن، یا انگلینڈ کے دوروں کے اخراجات کا تخمینہ لگا رہا ہوتا تھا۔ جب می
کہ وہ میری لوح جاں پر محبت کی داستانیں رقم کرے اس وقت وہ کسی چیک پر د
ہوتا تھا۔ جس وقت میرا جی چاہتا کہ وہ مجھ سے کبھی ختم نہ ہونے والی بے معنی
سی باتیں کرے اس وقت وہ ٹیلیفون پر کاروبار کی باتیں کر رہا ہوتا تھا۔ اس نے

لکس اور فلیکس لگوا رکھے ہیں۔ تین چار آدمیوں کا اسٹاف گھر پر بھی آتا .... یعنی رئیس
نز سے آنے کے بعد بھی درحقیقت دفتر میں ہی رہتا تھا"

پھر رمنا خود استہزائی کے سے انداز میں ہنس کر بولی......... "لیکن یہ ضرور تھا کہ
ئیس مجھ سے شادی کر کے بہت خوش تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں اس کے لئے بہت خوش
ت ثابت ہوئی تھی کیونکہ مجھ سے شادی کے بعد اس کا کاروبار اور بھی تیزی سے پھیلتا جا
ہا تھا۔ شاید میں اس کے لئے واقعی خوش بخت تھی لیکن خود اپنے لئے بدبخت تھی۔ میں تو
ی دست کی تہی دست تھی............"

اس نے اپنی مرمریں انگلیاں بالوں میں پھیریں۔ ایک لمحے خاموش رہی پھر
ولی......... "میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ رئیس کتنی دولت کمانا چاہتا تھا جب کہ اس
کے پاس پہلے ہی کچھ کم دولت نہیں تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ جتنی تیزی سے اس کے پاس
دولت آ رہی تھی اتنی ہی تیزی سے اس کے سینے میں بچی کھچی محبت کے بے ثمر پودے بھی
سوکھتے جا رہے تھے۔ بہر حال......... ازدواجی زندگی کی ناآسودگیوں سے قطع نظر وہ بہت اچھا
آدمی ہے۔ اس نے ہمیشہ مجھے خوش رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مجھ پر کبھی ناروا پابندیاں نہیں
لگائیں۔ میں خود ہی کچھ حدود میں رہتی ہوں۔ میری بھی یہی کوشش رہی ہے کہ اس کے
دل کے آئینے کو کبھی میری وجہ سے ٹھیس نہ لگنے پائے۔ آج تک میں اس کوشش میں
کامیاب ہوں۔ آگے دیکھو کیا ہوتا ہے............"

بیگم رمنا رئیس خاموش ہو گئی۔ گو کہ وہ بہت ہی نیچی آواز میں بات کر رہی تھی
لیکن وہ خاموش ہوئی تو گویا کائنات خاموش ہو گئی۔ اختر جیسے کسی خواب سے چونکا۔ اس کی
سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے، کیا تبصرہ کرے۔ آج تک وہ رمنا کا صرف ظاہر دیکھتا آیا
تھا۔ آج اس کے باطن کی پراسرار محل سراؤں میں جھانک کر تو وہ جیسے بت ہی بن گیا تھا۔

"یہ ہے میری کل داستان حیات!" رمنا رئیس دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولی۔ پھر وہ
کھوکھلے سے انداز میں ہنس دی۔

اختر اس ہنسی میں اس کا ساتھ نہیں دے سکا۔ وہ عورت جو اسے اجنتا اور ایلورا کے
غاروں سے زیادہ پراسرار لگتی تھی، آج اس کے سامنے ایک شفاف جھیل، ایک کھلی کتاب
بن گئی تھی۔ وہ اس کی تہہ میں جھانک سکتا تھا، اس کا ہر صفحہ پڑھ سکتا تھا۔ اب وہ پہلے سے
بھی زیادہ اس کے دل کو بھانے لگی تھی۔ حواس پر چھانے لگی تھی۔ وہ سحر زدہ اس کے
سامنے بیٹھا، ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔

دفعتہً وہ چونک کر بولی......... "ارے......... آج میں تم سے جو خاص بات
کرنا چاہتی تھی وہ تو بھول ہی گئی۔ سب باتیں ہو گئیں، ضروری بات رہ گئی"۔

"ضروری بات.........؟ کیسی ضروری بات؟" اختر جیسے خواب و خیال کی دنیا سے

واپس آیا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اپنی داستان حیات سے زیادہ ضروری بات اس کی نظر میں
سی تھی؟

رمنا بولی.......... ”اگلے اتوار کو ہماری شادی کی سالگرہ ہے جو ہم گھر کے لان
سوئمنگ پول کے کنارے مناتے ہیں۔ کیونکہ رئیس کو وہیل چیئر پر بیٹھ کر ہوٹل میں
اچھا نہیں لگتا..........“

”بہت خوب میری طرف سے پیشگی مبارکباد..........“ اختر گویا سنبھل کر بولا۔
کے خیال میں تو یہ کوئی ایسی ضروری بات بھی نہیں تھی۔

رمنا استہزائیہ سے انداز میں ہنس کر بولی.......... ”ہاں.......... اچھا کیا تم
مبارک باد دے دی۔ دنیا داری اسی کا نام ہے.......... اور ہمیں بہرحال اسی دنیا میں
رہنا ہے۔ شاید یہ اس بات کی مبارک باد ہے کہ اہرام مصر میں رکھی ہوئی حنوط شدہ
کو.......... ممی کو نئی زندگی کے انتظار میں ایک برس اور گزر گیا؟؟“

”نہیں.......... نہیں.......... میرا مطلب ہے..........“ اختر گڑ بڑا کر بولا۔

رمنا ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی.......... ”خیر.......... چھوڑو
باتوں کو.......... میں دراصل میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ تمہیں نہ صرف اس تقریب
شرکت کرنی ہے.......... بلکہ بہت کچھ سنانا بھی ہے۔ شاید اسی طرح اس تقریب
آزاری میں ہلکی سی خوشی کا کوئی رنگ ابھر سکے۔ کچھ ایسی چیزیں سنانا کہ تقریب یادگار
جائے“۔

”میں اس قابل تو نہیں ہوں کہ آپ کی کسی تقریب کو یادگار بنا سکوں“۔ اختر
لہجے میں بولا.......... ”لیکن جس قابل بھی ہوں.......... اپنی سی کوشش کر
گا..........“۔

============ * ============

تقریب کا اہتمام دیکھ کر اختر کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ وہ جب
رئیس کے محل نما بنگلے پر پہنچا تو باہر گاڑیوں کی قطاریں دیکھ کر ہی دنگ رہ گیا تھا۔ اتنی
سی بیش قیمت گاڑیاں اس نے پہلی مرتبہ دیکھی تھیں۔ آس پاس کی کئی گلیاں ان گاڑیوں
سے بھری ہوئی تھیں۔

اختر نے اپنی چھوٹی سے معمولی سی سیکنڈ ہینڈ گاڑی ان شاندار گاڑیوں کے درمیان
کھڑی کی تو باوردی ڈرائیوروں کی ایک ٹولی نے ذرا حقارت سے اس کی طرف دیکھا۔ ڈرائیور
بھی تو اپنے سیٹھوں کی گاڑیوں پر کچھ اس طرح فخر کرتے تھے جیسے وہ ان کی اپنی ہوں۔
کو خود بھی وہاں اپنی گاڑی کھڑی کرنا اچھا نہ لگا۔ وہ اسے ایک بغلی گلی میں کچھ دور لے
گاڑی ایک کونے پر کھڑی کر کے اسے خاصی دور پیدل چلنا پڑا۔

سیٹھ رئیس کا منفرد اور پرشکوہ ڈیزائن کا بنگلہ دو تین چھوٹی چھوٹی اونچی نیچی پہاڑیوں پر
پھیلا ہوا تھا۔ کہیں دیواریں سرخ اور براؤن پتھروں کی تھیں اور کہیں کنکریٹ کی۔ ایک نیچے
ٹیلے سے دوسرے اونچے ٹیلے تک ایک خوبصورت پل جا رہا تھا جو بنگلے کے دو حصوں کو ملا رہا
تھا۔ کہیں حفاظتی جنگلے تھے اور کہیں سنگ مرمر کی سیڑھیاں۔

اختر باہر سے ہی بنگلے کو دیکھ کر مبہوت ہو کر رہ گیا۔ بنگلہ کیا' ایک عجیب و غریب
اسرار سی محل سرا تھی جسے جدید رنگ دے دیا گیا تھا۔ یوں تو وہ آئے دن نت نئی تقریبات
میں جاتا تھا' ان میں شرکت کرتا تھا اور اس کا بیشتر وقت ایسے ہی ماحول میں گزرتا تھا جہاں دولت
کی چمک دمک سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ پھر بھی کبھی کبھار ایسے عالیشان مکانات اس
کی نظر سے گزرتے تھے جنہیں دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لئے مبہوت سا ہو جاتا تھا۔ اسے
یقین نہیں آتا تھا کہ وہ مکانات اسی شہر میں.......... اسی ملک میں واقع تھے جہاں لوگوں کی
ایک بہت بڑی تعداد نالوں کے کنارے جھونپڑوں میں رہتی تھی۔ ان شاندار محلات کو ان
کے مالک ازراہ انکساری ”مکان“ یا ”غریب خانہ“ کہتے تھے۔

ایک ملازم کی رہنمائی میں اختر اندرونی گیٹ تک پہنچا جہاں دو خوش شکل لڑکیوں نے
دیگر مہمانوں کے ساتھ ساتھ اس پر بھی پھولوں کی پتیوں کی بارش کی اور خوبصورت بوتلوں
سے اس پر غیر ملکی کلون کے فوارے مارے۔ خوشبو میں نہایا وہ بٹلر کی رہنمائی میں سوئمنگ
پول تک پہنچا۔

کہنے کو وہ محض شادی کی سالگرہ تھی اور گھر میں منعقد ہو رہی تھی مگر تقریب کیا تھی'
گویا پورے شہر کی انا کا سوال آن پڑا تھا۔ تقریب منعقد کرنے والا گویا اپنی دولت مندی سے
پورے شہر کے دولت مندوں کو مرعوب کرنے پر تلا ہوا تھا اور شرکاء نے گویا اسے متاثر
کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائی ہوئی تھی۔ نہ جانے کیا کیا تحائف اٹھائے چلے آ رہے
تھے۔ دولت گویا دولت پرواری ہونے کے بہانے ڈھونڈتی تھی۔

بنگلے کو اندر سے دیکھ کر اختر کی آنکھیں کچھ اور کھل گئیں۔ وہ واقعی دور جدید کے
کسی شہنشاہ کا قلعہ تھا.......... اور وہ شہنشاہ جو اس کا مالک تھا.......... وہ محاورتاً ” نہیں'
حقیقتاً اس تقریب کا دولہا تھا' وہ چلنے پھرنے سے معذور تھا۔ وہ موٹر والی وہیل چیئر پر' مخملیں
لان کے قریب مہمانوں کے استقبال کے لئے موجود تھا۔

لان کی گھاس ایسی ہموار' خوبصورت اور سرسبز تھی جیسے ریشم کا قالین بچھا ہو لیکن
ذرا ہی اختر کی نظر لان کے کنارے لگے ہوئے ایک بورڈ پر گئی۔ اس پر انگریزی میں جلی
حروف میں لکھا تھا.......... ”براہ کرم لان پر سگریٹ نہ جھاڑیئے۔ گھاس سنیتھیٹک کی
ہے۔ اسے آگ لگ سکتی ہے..........“

لان پر خوبصورت رنگا رنگ شامیانے لگے تھے۔ امپورٹیڈ ٹائلوں والے سوئمنگ پول

کا پانی رنگا رنگ روشنیوں میں جھلملا رہا تھا اور اس کے آس پاس رنگا رنگ ملبوسات لہرا رہے
تھے۔ مترنم قہقہے ہوا کے دھیمے جھونکوں سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ رنگوں اور روشنیوں کا
ایک سیلاب تھا جو حواس پر دھند کی طرح چھا رہا تھا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے اختر کو اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں سوئمنگ پول کے کنارے
بھی بورڈ نہ لگا ہو.......... "خواتین و حضرات! دھوکا نہ کھایئے۔ سوئمنگ پول میں جو چیز
جھلملاتی نظر آ رہی ہے وہ پانی نہیں محض نظر کا دھوکا ہے۔ پول میں چھلانگ لگانے کی کوشش
مت کیجئے گا۔ کھوپڑی ٹوٹ جائے گی.........."

اس کے علاوہ شاید مہمانوں کے آس پاس بھی کوئی بورڈ لگا ہو.......... "یہ رنگ
برنگے لہراتے پیرہن.......... یہ خوشبوؤں میں نہائے ہوئے وجود محض آپ کی خواہشوں کا
عکس ہیں۔ آپ کے خواب ہیں.......... انہیں چھونے کی کوشش نہ کیجئے۔ خواب ٹوٹ
جائیں گے.........."

رمنا اپنے شوہر کی وہیل چیئر کے پاس کھڑی تھی۔ اس کا ملکوتی حسن عام دنوں میں
بھی دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیتا تھا مگر آج تو جیسے دنیا بھر کا جادو اس کے نین نقش میں
سمٹ آیا تھا۔ حالانکہ اس نے کوئی خاص اہتمام بھی نہیں کیا تھا۔ وہ بڑی انفرادیت پسند تھی۔
جب سارے مہمان نہ جانے کیا کیا اہتمام کر کے آئے تھے تو اس نے سادگی کے دامن میں
پناہ لے لی تھی۔ اب سادگی ہی اس کا حسن بن گئی تھی۔ اس سادگی میں غضب کی پرکاری
تھی۔ میک اپ نہایت ہلکا تھا۔ لباس بھی غیر معمولی نہیں تھا لیکن وہ سب سے الگ تھلگ
نظر آ رہی تھی۔

سیٹھ رئیس بھاری جثے کا مالک تھا لیکن اس کی ٹانگیں پتلون میں چھپی ہونے کے
باوجود کچھ سوکھی سی دکھائی دے رہی تھیں۔ چہرے پر شکنیں تھیں۔ جبڑوں کا گوشت ا
پوٹے لٹکے ہوئے تھے۔ اس کے ہونٹ سیاہی مائل تھے اور ان کے درمیان ایک موٹا سا
دبا ہوا تھا جس کی مہک دور تک پہنچ رہی تھی۔ صرف سگار سے ہی نہیں اس کے پور
وجود سے خوشبوئیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس کے باوجود زیادہ دیر اس کے قریب کھڑے ہو
کو جی نہیں چاہتا تھا.......... اور وہ اس عورت کا شوہر تھا جو اختر کو دنیا کی حسین تر
عورت معلوم ہوتی تھی۔

رمنا نے مسکرا کر خوش خلقی سے اختر کا استقبال کیا۔ مگر اس میں کوئی انوکھی بات نہ
تھی۔ وہ سبھی مہمانوں کا اسی طرح استقبال کر رہی تھی۔ اس کی یہ خوش خلق رسمی
اس کی مسکراہٹ نپی تلی تھی۔

اسی رسمی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اختر کا تعارف سیٹھ رئیس سے کرایا
بولی.......... "رئیس! میں آپ کو اختر کے بارے میں بتا ہی چکی ہوں۔ آج ہماری محفل

اپنی آواز سے کچھ اور خوبصورت بنانے کی کوشش کریں گے.........."
"اور مجھے امید ہے کہ یہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہیں گے"۔ سیٹھ رئیس
مسکراتے ہوئے بھاری آواز میں انگریزی میں بولا۔

"یقیناً.......... یقیناً.........." رمنا کے ہونٹوں پر نپی تلی مسکراہٹ برقرار تھی۔

اختر کو صحیح طور پر احساس نہیں تھا کہ وہ اس قسم کے رسمی جملے بول بھی پایا تھا یا
نہیں.......... جو ایسے موقعوں پر عموماً بولے جاتے ہیں۔ وہ تو کھوئی کھوئی نظروں سے اس
انوکھے جوڑے کو دیکھے جا رہا تھا۔

پھر نہ جانے کس طرح وہ چونکا اور اس نے محسوس کیا کہ سیٹھ رئیس گہری نظروں
سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ مسکرایا اور دیگر مہمانوں کی طرح نارمل نظر آنے کی کوشش
کرنے لگے۔ اسے احساس ہوا کہ اس موقع پر کوئی رسمی سی بات بھی کرنی چاہیے تھی۔ اس
کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ غیر ارادی سے انداز میں وہ اوھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا.......... "
آپ کا گھر بہت خوبصورت ہے.........."

"ہوں.........." سیٹھ رئیس نے ہنکارا بھرا.......... "کم از کم دو خوبصورت
چیزیں اس وقت میرے پاس ہیں۔ ایک خوبصورت مکان اور ایک خوبصورت
بیوی.........."

اس نے ہلکا مگر گونجیلا سا قہقہہ لگا کر رمنا کی طرف دیکھا۔ رمنا کے چہرے پر ذرا
بھی تغیر نہ آیا۔ وہ سنگ مرمر سے تراشے گئے مجسمے سے مشابہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے
چہرے پر مسکراہٹ بھی گویا مجسمہ ساز نے ہی تخلیق کی تھی۔ اس لئے وہ نہ گھٹ رہی تھی
اور نہ بڑھ رہی تھی۔

سیٹھ رئیس بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میری تمنا تھی کہ میری زندگی کے
آخری ایام ایک نہایت خوبصورت مکان میں گزریں اور جب مجھے موت آئے تو میرا سر
میری خوبصورت بیوی کے زانو پر ہو.........."

اس نے ایک بار پھر مسکراتے ہوئے رمنا کی طرف دیکھا۔ رمنا نہایت ٹھہرے ٹھہرے
لہجے میں بولی۔ "رئیس! اس وقت ہم زندگی کی رنگینیوں اور خوبصورتیوں میں گھرے ہوئے
ہیں۔ اس وقت تمہیں موت کا تذکرہ کرنے کی کیا سوجھی ہے؟"

"زندگی کی خوبصورتیوں ہی کے درمیان کہیں موت چھپی بیٹھی ہوتی ہے جو اس طرح
اچانک ہمیں ان دبوچتی ہے کہ پتہ بھی نہیں چلتا.........." سیٹھ رئیس اپنے سگار کی راکھ
اپنی وہیل چیئر پر ہی لگی ہوئی ایک بلوری ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے بولا۔

پھر اس نے کندھے اچکائے اور اختر کی طرف دیکھا۔ اس کا لہجہ یکدم بدل
گیا.......... "رمنا ٹھیک کہہ رہی ہے مسٹر اختر! یہ موقع نہیں ہے ایسی بات کرنے

کا.......... بہرحال.......... مکان آپ کو پسند آیا۔ آپ کا بہت شکریہ.......... لیکن آپ کو اس کی خوبصورتی کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا کیونکہ آپ درحقیقت مکان کے کھڑے ہیں۔ اصل مکان تو ابھی کچھ اور آگے سے شروع ہوتا ہے..........”

اس نے سگار کا ایک گہرا کش لیا اور سلسلہ کلام جوڑا.......... ”یہ مکان میں نے عرصہ پہلے ہی بنوایا ہے۔ اس سے پہلے ہم جس مکان میں رہتے تھے وہ اتنا شاندار نہیں اسے میرے لئے فرانس کے ایک مشہور آرکیٹیکٹ نے ڈیزائن کیا تھا..........”

”بہت خوب.......... بہت خوب..........“ اختر نے سر ہلایا.......... ”اہل ز معاوضہ لے کر ایسی چیزیں بنا ہی دیتے ہیں لیکن بنوانے کے لئے بہرحال ذوق چاہیے۔ میں شک نہیں کہ دولت کے ساتھ ساتھ آپ کے پاس سلیقہ اور ذوق بھی ہے“۔

”شکریہ.......... آپ یقیناً اچھے گلوکار ہونے کے ساتھ ایک مہربان‘ وضعدار خوش کلام نوجوان ہیں..........”

رمنا نے مہمانوں کی طرف اشارہ کیا.......... ”آپ جا کر مہمانوں میں گھل جایئے۔ ایسی محفلوں میں اپنا راستہ خود بنانا پڑتا ہے۔ آپ جسے چاہیں پکڑ کر خود اپنا تعار کروا دیں.......... لیکن خیر.......... یہ تو میں غلط کہہ گئی۔ آپ کو تو اس کی ضرور نہیں.......... آپ جہاں بھی کھڑے ہوں گے لوگ خود ہی آپ کو پہچان کر کھنچے چلے آ گے..........”

ان میاں بیوی نے اس کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور دوسرے مہمانوں کا استق کرنے کے لئے آگے بڑھ گئے۔ اختر لان پر آگیا اور مہمانوں کے ہجوم میں گویا کھو سا گ لمبائی چوڑائی میں لان کسی چھوٹے موٹے اسٹیڈیم سے کم نہیں تھا۔ مکان نہایت مہنگے علا میں واقع تھا۔ وہاں کے بعض حصوں میں تو زمین گزوں کے بجائے فٹوں کے حساب سے تھی اور اختر سوچا کرتا تھا کہ اگر اس علاقے کی قدر و قیمت یونہی بڑھتی رہی تو کوئی دن آ گا جب وہاں انچوں کے حساب سے زمین فروخت ہونے لگے گی۔

لیکن اسی علاقے میں ایسے مکان بھی واقع تھے جن کا صرف لان اور سوئمنگ پو دیکھ کر اختر جیسے لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ سکتی تھیں۔ اختر سوئمنگ پول کے قر ایک رنگین چھتری تلے خوبصورت ٹائلوں سے مزین روش پر جا کھڑا ہوا۔ چاندنی اور رنگ برنگی روشنیوں میں کسی ہفت رنگی سیال دھات کی طرح جھلملاتے پانی کا نظارہ بہت بھلا لگ رہا تھا۔

اس سوئمنگ پول کے گرد بھی رنگوں‘ خوشبوؤں اور حسن و وجاہت کی لہریں محو تھیں۔ کہیں مہ رخوں کا ہجوم تھا تو کہیں ان پر بھونروں کی طرح منڈلاتے مردوں کی ٹولیاں کہیں ہیرے جگمگا رہے تھے تو کہیں سونا جھلملا رہا تھا۔ کہیں چہرے چھب دکھلا رہے تھے

ہیں لباس لشکارے مار رہے تھے۔

باوردی ویٹر مہمانوں کے درمیان چکرا رہے تھے اور ہر اشارے ہر حکم کی تعمیل کر رہے تھے۔ کھانوں‘ مشروبات اور دیگر لوازمات سے لدی پھندی ٹرالیاں ادھر سے ادھر گردش کر رہی تھیں۔

اتنے ہجوم اور اتنی ہلچل کے باوجود شور نہیں تھا۔ افراتفری نہیں تھی۔ صرف نیچی آوازوں اور سرگوشیوں میں باتوں کی بھنبھناہٹ تھی۔ دبے دبے قہقہوں کا ترنم تھا۔ کہی ان کہی باتوں سے گویا فضا مرتعش تھی۔

سارا ماحول اختر کو خواب خواب سا لگ رہا تھا جس میں وہ یوں اجنبی اور غیر متعلق سا ادھر ادھر پھر رہا تھا جیسے اس کا وجود غیر مرئی ہو اور کوئی بھی اسے نہ دیکھ رہا ہو۔ اس کا کوئی شناسا وہاں نظر نہیں آ رہا تھا اور اس کا خود کسی سے متعارف ہونے کا حوصلہ نہیں پڑ رہا تھا۔ رمنا نے کہا تھا کہ لوگ اسے پہچان کر خود ہی کھنچے چلے آئیں گے لیکن وہاں تو گویا کسی کو اس کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔

ویسے بھی لان کے بیشتر حصوں پر روشنی کم تھی اور مہمانوں کی ٹولیاں وہیں کھڑے ہونا زیادہ پسند کر رہی تھی۔ رمنا کئی بار اس کے قریب سے گزری اور ہر بار دو انگلیاں ہلا کر ہی تلی مسکراہٹ کے ساتھ ”ہائے“ کہہ کر مہمانوں کی کسی اور ٹولی کی طرف بڑھ گئی۔

اختر بھی اس وقت ملگجی روشنی میں ہی کھڑا تھا جب قریب سے گزرتی ایک لڑکی نے اسے پہچان لیا۔ وہ یکدم رک کر قدرے جوشیلے مگر دبے دبے سے لہجے میں بولی۔ ”ارے.......... آپ وہی تو نہیں ہیں جو ٹی وی پر گاتے ہیں اختر حسین نام ہے شاید آپ کا..........؟“

اختر نے متانت سے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تب وہ سوکھا سا ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھاتے ہوئے بولی.......... ”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر.......... مجھے ٹینا کہتے ہیں..........”

اختر نے مشروب کا گلاس دوسرے ہاتھ میں تھام کر اس سے ہاتھ ملایا۔ ٹینا کا ہاتھ استخوانی تھا مگر اس میں جذبوں کا گداز اور لہو کی حرارت موجود تھی۔ اختر کے اعصاب میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا جو ہاتھ کے جدا ہوتے ہی معدوم ہو گیا۔

وہ کچھ دیر کھڑی اس سے باتیں کرتی رہی پھر آگے بڑھ گئی۔ شاید اسی کی زبانی وہاں اختر کی موجودگی کی خبر نوجوان مہمانوں میں پھیل گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد لڑکے لڑکیوں نے اختر کو گھیرنا شروع کر دیا۔ ہر قبیل کے لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے اختر پر طرح طرح کے سوالات کی بارش کر دی تھی۔

”مسٹر اختر! آپ کو ٹی وی سے معاوضہ تو بہت ملتا ہو گا؟“ ایک لڑکی نے پوچھا۔

"جی ہاں......... کپڑوں کی سلائی کا خرچ پورا ہو جاتا ہے"۔ اختر نے جواب
سب نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا گویا انہیں یقین نہ آ رہا ہو کہ اختر سچ
رہا ہے۔

ایک لڑکا جس کی جینز پر چمڑے کے پیوند لگے ہوئے تھے اور جس کے بال اپنی
لڑکی سے بھی لمبے تھے' انگریزی میں بولا......... "مسٹر اختر! ہم تین لڑکوں نے مل کر
تھری ڈیز" کے نام سے ایک میوزک کلب بنایا ہے اور ہم امریکہ' انگلینڈ وغیرہ جا کر
دھوم مچا دینا چاہتے ہیں۔ آپ ہماری رہنمائی کے لئے کچھ وقت نکال سکتے ہیں؟"

"یہ تھری ڈیز سے کیا مراد ہے؟" اختر نے کچھ اور کہنے سے پہلے یہ جان لینا
سمجھا۔

"اس سے مراد ہے <تھری ڈیولز........." ہم تینوں دوست تھری ڈیولز ہیں۔
فرسٹ ڈیول ہوں۔ میں گٹار پر ہوتا ہوں"۔ لڑکے نے فخر سے بتایا۔

"مسٹر ڈیول!" اختر مسکراتے ہوئے بولا......... "آپ انگلینڈ اور امریکہ جا کر دھوم
مچانے سے پہلے یہیں کہیں دھوم نہیں مچاتے؟"

"یہاں ٹی وی پر تو ہمیں کوئی چانس نہیں دیتا........." لڑکے نے بڑی سادگی
اعتراف کیا......... "ویسے پرائیویٹ فنکشنز میں ہم بہت دھوم مچا چکے ہیں۔ پچھلے
سال میں ہم تین ہوٹلوں میں پروگرام پیش کر چکے ہیں........." اس کی گردن فخر سے ا
گئی۔ "ہر پروگرام میں سامعین کی تعداد پچاس سے کم نہیں تھی"۔

پھر اس کی آواز میں ذرا مایوسی جھلک آئی......... "ہمارا باہر جانا اس لئے
ضروری ہے کہ ہمیں اردو میں گانا تو آتا ہی نہیں........."

"پھر تو باہر جا کر آپ کے پروگراموں میں سامعین کی تعداد آٹھ دس ہی نہ
جائے........." اختر کہے بغیر نہ رہ سکا......... "باہر انگریزی میں گانے والے گروپس
تو مقابلہ بہت سخت ہے۔ کیونکہ گروپس کا کوئی شمار ہی نہیں ہے۔ اینٹ اٹھاؤ تو دو
گروپ نکل آتے ہیں........."

اس گفتگو کے آگے بڑھنے سے پہلے ایک لڑکی نے اختر کو اپنی طرف متوجہ کر لیا
اس کا بازو ہلاتے ہوئے بولی......... "مسٹر اختر! آپ آج یہاں بھی کچھ سنا رہے ہیں
نہیں؟"

"جی ہاں......... میزبان نے مجھے بلایا تو اسی مقصد سے ہے........." اختر
جواب دیا۔

"اوہ......... ہاؤ فینسی فل!" لڑکی وفورِ اشتیاق سے تالی بجاتے ہوئے اور آنکھ
پھیلاتے ہوئے بولی۔ "آج ہم آپ کا لائیو شو دیکھیں گے۔ اس سے پہلے میں نے کبھی

ر کی......... میرا مطلب ہے پاکستانی سنگر کو اپنے سامنے گاتے نہیں دیکھا"۔

"کیوں......... کیا آپ تقریبات وغیرہ میں نہیں جاتیں؟" اختر نے ملائمت سے
پوچھا۔

"نہیں......... دراصل میں یہاں تھی ہی نہیں......... پچھلے ماہ ہی اسٹیٹس سے
ئی ہوں۔ میں بہت چھوٹی تھی جب چلی گئی تھی۔ سولہویں سالگرہ کے بعد پاپا نے فوراً مجھے
اں بھیج دیا........."

"کیوں......... خیریت.........؟" اختر پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"سولہویں سال کے بعد دوسرے لڑکے زبردستی ڈیٹس لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔
کار کرو تو اسکول میں لڑکی کے بارے میں عجیب عجیب باتیں پھیلا دیتے ہیں......... اینڈ
نز آل وی آر پاکستانی........." وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"اوہ........." اختر محض اتنا ہی کہہ سکا۔

سترہ اٹھارہ سال کے ایک لڑکے نے اچانک ہی پراشتیاق لہجے میں اختر سے
پوچھا......... "آپ کی گرل فرینڈز کتنی ہیں مسٹر اختر؟"

"ایک بھی نہیں"۔ اختر نے صداقت سے جواب دیا۔

"ایک تو آپ شو بزنس کے لوگ جھوٹ بہت بولتے ہیں........." ایک موٹی سی
ڑکی نے بلاوجہ اٹھلا کر کہا۔

"اگر میری ایک بھی گرل فرینڈ ہوتی تو اس وقت میرے ساتھ نظر نہ آتی؟" اختر
نے اپنا دفاع کیا۔

اس طرح کی اوٹ پٹانگ گفتگو کچھ دیر چلتی رہی۔ اس دوران دو لڑکیوں نے پانچ پانچ
سو کے نوٹ پر اختر کے آٹوگراف بھی لئے۔ آخر کار وہ سب اختر کو تنہا چھوڑ کر اِدھر اُدھر بکھر
گئے۔

مشروبات' کھانوں اور گپ شپ کے بعد "پوسٹ ڈنر آئٹم" یعنی بعد از طعام چیز کی
باری آئی......... اور وہ تھا اختر حسین۔

جب مہمان سست پڑنے لگے تو رمنا اس خوبصورت اسٹیج نما حصے کی طرف بڑھی جو
لان کے ایک سرے پر بنایا گیا تھا اور جس پر خوب تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس پر مائیک
بھی نظر آ رہا تھا۔ اختر کے سازندے بھی مقررہ وقت پر پہنچ چکے تھے۔

اس چھوٹے سے اسٹیج پر پہنچ کر رمنا نے اعلان کیا......... "خواتین و حضرات!
گلوکار اختر حسین کا نام کون نہیں جانتا......... ٹی وی پر کامیابی کے جھنڈے گاڑنے کے بعد
اب انہوں نے فلم کے لئے بھی گانا شروع کر دیا ہے......... لیکن آج وہ صرف اور
صرف ہمارے لئے گائیں گے........."

جن مہمانوں کو تالیاں بجانے کا ہوش تھا انہوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ اختر جم
نے گانا شروع کیا اور اپنی روایت کے مطابق خوب رنگ جمایا۔ اس نے فلمی نغمے، گر
غزلیں، لوک گیت سبھی کچھ سنایا۔ اس کے پاس سندھی، بلوچی، پنجابی اور انگریزی نغموں ک
فرمائشیں بھی آئیں۔ مہمانوں میں ہر قومیت کے لوگ موجود تھے۔ سب نے کم از کم ایک
نغمہ تو اپنی مادری زبان میں سنا۔ اختر سب کی فرمائشیں پوری کرکے داد سمیٹتا رہا۔

محفل جب شباب پر تھی تو اختر نے سیٹھ رئیس کی وہیل چیئر بنگلے کی اصل عمارت ک
طرف جاتے دیکھی۔ ایک نرس اس کے ہمراہ تھی اس میں شاید محفل کا مزید ساتھ دینے ک
ہمت نہیں تھی اور وہ آرام کرنے چل دیا تھا۔

اس کے بعد دیر بعد جب سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تو مہمان رخصت ہونا شروع
ہوئے۔ کچھ دیر بعد وہی جگہ جہاں زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ فگن تھی، اجڑا
دیار نظر آنے لگی۔

گاتے گاتے اختر کا سر چکرانے لگا تھا۔ وہ سوئمنگ پول کے مرمریں کنارے پر بیٹھ کر
یخ مشروب پینے لگا۔ بہت سے ملازمین اس وقت ساز و سامان سمیٹنے کے آخری مراحل مکمل کر
رہے تھے۔

مہمانوں کا آخری جوڑا بھی رخصت ہوچکا، ملازمین اور بیرے وغیرہ بھی سامان سمیٹ
کر نہ جانے کہاں غائب ہوچکے تب رمنا، دبے قدموں اختر کے پاس آئی اور سرگوشی کے سے
لہجے میں بولی......... "میرے ساتھ آؤ........."

اختر مشروب کا گلاس اور جگ وہیں سوئمنگ پول کے کنارے رکھ کر اس کے ساتھ
چل دیا۔ وہ بنگلے کی اصل عمارت کے گرد گھوم کر پچھلی طرف جا رہی تھی۔ اختر کا خیال تھا کہ
اس طرف سرونٹ کوارٹرز ہوں گے مگر سرونٹ کوارٹرز اسے راستے میں کہیں نظر نہیں
آئے۔ شاید وہ کسی اور کی طرف تھے۔

رمنا کوٹھی کے عقب میں ایک ایسی جگہ رکی جہاں سے بل کھاتا تاریک سا زینہ غالباً
ہنگامی حالات میں استعمال کے لئے بنایا گیا تھا، اوپر جا رہا تھا۔ رمنا نے اسے پیچھے آنے کا
اشارہ کیا اور زینے پر چڑھنے لگی۔ اختر شاخ گل کی طرح لچکتی اس کی کمر پر نظر جمائے اوپر
چڑھنے لگا۔

دوسری منزل کی ایک چھوٹی سی ٹیرس پر پہنچ کر رمنا نے ایک کمرے کا خوبصورت
محرابی دروازہ کھولا اور اندر پہنچ کر ایک مدھم سی لائٹ آن کر دی۔

اختر بھی کمرے میں داخل ہوچکا تو رمنا نے دروازہ بند کرکے مقفل کر دیا۔ اختر نے
دیکھا وہ خوشبوؤں میں بسی ہوئی ایک نہایت آراستہ و پیراستہ خواب گاہ تھی......... ایسی ہی
خواب گاہ جیسی زیادہ تر لوگ خوابوں میں دیکھتے ہیں۔ وہاں کا ماحول مسحور کن تھا اور جس

تے سے وہ وہاں پہنچے تھے وہ شاید اس خواب گاہ کا چور دروازہ تھا۔ اس کا اصل اور شاندار
وازہ خوبصورت پردوں کی اوٹ میں، دوسری طرف موجود تھا۔

"اگر ہم صحیح راستے سے آتے تو شاید کوئی ملازم ہمیں دیکھ لیتا"۔ رمنا نے خود ہی
ضاحت کی اور بالوں کا جوڑا کھول لیا۔ کمرے میں ایک نئی مہک پھیل گئی۔ اختر خاموش کھڑا
ا۔

"یہ ہے میرا گوشہ عافیت........." رمنا نے اس کی طرف مڑ کر دونوں ہاتھ پھیلاتے
وئے بولی......... "اس طویل و عریض بنگلے کے کمرے زیادہ ہیں اور رہنے والے افراد
م......... جب میرا یہاں کے کسی کمرے، کسی گوشے میں دل نہیں لگتا تو میں اپنے اس
اص بیڈ روم میں آجاتی ہوں۔ جب سیٹھ رئیس کا وجود میرے لئے ناقابل برداشت ہو جاتا
ہے تو میں آنکھ بچا کر اپنی اس پناہ گاہ میں آجاتی ہوں......... یہاں اچھی اچھی کتابیں
ں......... معروف شاعروں کے دیوان ہیں......... المیہ نغموں اور آرٹ فلموں کے
یسٹ ہیں......... اور اس بستر میں رچی ہوئی میرے آنسوؤں کی نمی ہے........." اس
نے خوبصورت ڈبل بیڈ کی طرف اشارہ کیا جسے محض دیکھنے سے ہی آنکھوں کو آرام کا
حساس ہوتا تھا۔

اختر نے محسوس کیا کہ وہ بظاہر پتھر کی عورت نظر آتی تھی مگر اس کے سینے میں
پنکھڑی سے بھی زیادہ نازک اور حساس دل دھڑک رہا تھا۔ اس کی یہی خوبی اختر کو اس کا
یوانہ بنائے جا رہی تھی۔ اس کی ذات ان گنت تہوں میں چھپی ہوئی تھی لیکن جو بھی تہہ
ٹتی تھی، اندر سے اس کا زیادہ خوبصورت روپ ہی نکلتا تھا۔ اس لمحے اختر کو پہلی بار احساس
ہوا کہ وہ اس عورت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

اس احساس کے ساتھ ہی ایک عجیب سا خوف بھی تھا جو اس کی رگوں میں خون کو
منجمد کئے دے رہا تھا۔ اس کا گلا ایک بار پھر خشک ہوا جا رہا تھا جیسے اس نے نہ جانے کب
سے کچھ نہ پیا ہو۔ اس کے ہونٹ گویا پتھرائے جا رہے تھے۔

"ارے......... تم اب تک کھڑے کیوں ہو؟" رمنا گویا چونکتے ہوئے بولی۔ "ادھر
آؤ......... یہاں بیٹھو........." اس نے اختر کا ہاتھ تھام لیا اور ایک بار پھر چونکتے ہوئے
بولی......... "تمہارا ہاتھ تو برف کی طرح سرد ہو رہا ہے"۔

"میں کچھ عجیب سا خوف محسوس کر رہا ہوں"۔ اختر نے اعتراف کیا۔ "چوروں جیسا
خوف......... مجھے کچھ ایسا لگ رہا ہے جیسے......... جیسے میں پہلی بار واردات پر نکلا ہوا
چور ہوں اور اس گھر میں کچھ چرانے آیا ہوں"۔

"میں تمہارے خوف کو سمجھتی ہوں"۔ وہ ہمت افزا انداز میں اس کا ہاتھ تھپتھپاتے
ہوئے بولی......... "ایک تو تم میرے طبقے کے فرد نہیں ہو اور پھر پہلی مرتبہ میرے گھر

آئے ہو.......... خصوصاً اس کمرے میں.......... اور وہ بھی چوری چھپے"۔
وہ گویا اس کا نفسیاتی تجزیہ جاری رکھتے ہوئے بولی.......... "ایک احساس تمہیں
بھی ہے کہ اسی گھر میں کہیں میرا شوہر بھی موجود ہے۔ معذور ہی سہی..........
بہرحال شوہر تو ہے.......... لیکن تمہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے مطا
ہے کہ اپنے "خوف" سے خوفزدہ مت ہو۔ یہ خوف فطری ہے اور دھیرے دھیرے خود
ہی تحلیل ہو جائے گا.......... بیٹھو.........."

اس نے اختر کو ایک ایسے صوفے پر لا بٹھایا جو ذرا فاصلے سے محض دھنکی ہوئی رو
ڈھیر نظر آتا تھا۔ اختر اس پر بیٹھا تو گویا قالین تک دھنستا ہی چلا گیا۔

وہ بڑا سا کمرہ درحقیقت تین حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصہ تو خالصتاً" خواب گاہ
دوسرا حصہ ایک چھوٹی سی نشست گاہ کا کام دیتا تھا۔ تیسرا حصہ ایک طرح کی اسٹڈی تھ
اس میں دیوار گیر الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ لکھنے پڑھنے کے لئے خوبصورت
کرسی بھی تھی۔ نشست گاہ میں ٹی وی، وی سی آر اور کیسٹوں کی لائبریری وغیرہ مو
تھی۔ تینوں حصوں کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں تھی۔ ساخت کے اعتبار سے وہ ایک
بڑا سا مستطیل کمرہ تھا۔ صرف آرائش اور سازوسامان کے ذریعے اسے تین حصوں میں تق
کر لیا گیا تھا۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک باسانی نظر ڈالی جاسکتی تھی۔

رمنا اسے بٹھا کر ایک وارڈروب تک گئی اور اس کا سلائیڈنگ ڈور ایک طرف ہٹایا
دیوار ہی کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ دروازہ بے آواز طریقے سے ایک طرف ہٹتا چلا گیا۔ الما
میں لٹکے ہوئے زیادہ تر ملبوسات شب خوابی ہی کے معلوم ہوتے تھے۔

رمنا نے الماری کے کسی خفیہ خانے سے بوتل اور دو گلاس نکالے اور اختر کے سا
شیشے کی تپائی پر لا رکھے۔ پھر اس نے بیڈ روم فریج سے آئس کیوبس کی ٹرے وغیرہ نکا
لوازمات مکمل ہونے کے بعد وہ اختر کے قریب بیٹھ کر جام تیار کرنے لگی۔

اختر باقاعدہ پینے والوں میں سے نہیں تھا لیکن جن ہاتھوں سے جام مل رہا تھا ان
لمس سے گویا اس کے تمام خوف دور ہو گئے تھے۔ اس نے بلاجھجک جام لے لیا۔ رمنا اس
کے گلاس سے گلاس ٹکراتے ہوئے بولی.......... "ان بے عنوان محبتوں کے نام جن
انجام بھی اندھیرے میں ہے"۔

تیسرے جام پر جب اختر کے رگ و پے میں جمتی ہوئی برف تحلیل ہو گئی اور اس
کے کانوں کی لویں تپنے لگیں جیسے ابھی جل اٹھیں گی تو وہ لڑکھڑاتی سی آواز میں بولا..........
"رمنا! مجھے تم سے محبت ہے"۔

یہ وہ چند الفاظ تھے جو وہ اس وقت سے رمنا سے کہنے کے لئے ترس رہا تھا جب اس
نے پہلی بار رمنا کو دیکھا تھا لیکن ان الفاظ کو زبان پر لانے کا موقع بہت عرصے میں آیا تھا۔

"مجھے معلوم ہے.........." رمنا اطمینان سے بولی.......... "بتانے کی ضرورت
نہیں۔ مجھے معلوم ہے تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ اسی روز سے معلوم جس روز پہلی بار
ہماری نظریں ملی تھیں۔ نظروں کی زبان عورت سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے؟"

"کیا تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے؟" اختر نے تصدیق چاہی۔

"کیا میرے خفیہ گوشہ خلوت میں میرے برابر بیٹھ کر بھی یہ سوال کرنے کی ضرورت
باقی رہ جاتی ہے؟" اس نے اختر کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ آنکھیں گویا اختر کو ہپناٹائز کر دیتی
تھیں۔

اختر نے گھبرا کر نظریں جھکالیں اور ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر گیا.......... اس
احساس سے، کہ رمنا کو بھی اس سے محبت تھی، اس کا دل اس شدت سے دھڑکنے لگا تھا کہ
کنپٹیوں میں دھمک سی محسوس ہو رہی تھی۔ آج گویا سورج، چاند، ستارے اس کی مٹھی میں
آ گئے تھے۔ اسے سب کچھ مل گیا تھا۔ اب اسے اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔

چوتھے جام کے بعد رمنا نے اٹھ کر الماری سے شب خوابی کا ایک نہایت خوبصورت
لباس نکالا اور واش روم میں چلی گئی۔ جب وہ واش روم سے شب خوابی کے لباس میں باہر
آئی تو کمرے میں روشنی مدھم ہونے کے باوجود اختر کی آنکھیں چکا چوند سی ہو گئیں۔

اختر کے حواس پر دھند بڑھتی جا رہی تھی اور کنپٹیوں میں گویا لہو نہیں، ایک آتش
سیال ٹھوکریں مار رہی تھی۔

رمنا نے اس کے قریب بیٹھ کر ایک اور جام تیار کیا.......... اختر اسے ختم نہ کر سکا۔
دو گھونٹ بھرنے کے بعد اس نے بے اختیار رمنا کی طرف ہاتھ بڑھایا حالانکہ اسے خود بھی
صحیح طور پر احساس نہیں تھا کہ اس حرکت سے اس کا مقصد کیا تھا؟ وہ یہ بھی یقین سے نہیں
کہہ سکتا تھا کہ خواہشات نے اسے مغلوب کر لیا تھا۔ اس وقت اس کا ذہن خود اپنا تجزیہ
کرنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ بس ایک دیوانگی سی تھی جو اس کے ذہن میں قدم جما رہی
تھی۔

رمنا فوراً" کھسک کر اس کے ہاتھ کی رسائی سے دور چلی گئی۔ اختر کے ذہن کو عجیب
سا جھٹکا لگا۔ وہ اس سے محبت بھی کرتی تھی۔ شوہر اور ملازموں کی نظر سے چھپا کر اسے گوشہ
خلوت میں بھی لائی تھی۔ اس کے ساتھ پینے پلانے کا دور بھی چلایا تھا۔ خمار سے بوجھل لہجے
میں اپنے دل کی، اپنے محسوسات کی ان گنت باتیں بھی کی تھیں۔

لیکن پھر یہ کیسا گریز..........؟ یہ کیسی کنارہ کشی؟ وہ اس کے کون سے جذبے کو
آزما رہی تھی؟

"یہ تم کیا کر رہی ہو رمنا..........؟" وہ بہ مشکل بولا۔ اسے آنکھیں کھلی رکھنے اور
بولنے میں بڑی دقت پیش آ رہی تھی۔ اسے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ وہ غیر ارادی طور پر

رمنا کو "آپ" سے "تم" کہنے لگا تھا۔

رمنا تحکمانہ سے لہجے میں بولی۔ "یہ نہیں ہوگا اختر! میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی ناآسودہ ازدواجی زندگی سے پریشان ہو کر خلوتوں کے سہارے ڈھونڈ لیتی ہیں اور چوری چھپے ان سہاروں سے ہی زندگی کو بہلاتی رہتی ہیں۔ اس طرح میسر آنے والی کیف و انبساط کی گھڑیاں بھیک سے بھی بدتر ہوتی ہیں۔ چوری کا مال ہوتی ہیں۔ مجھے چوری کا مال نہیں چاہیے.........."

اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے اور یاقوتی لب دہک رہے تھے مگر اسے اپنے لہجے پر قابو تھا۔ وہ اسی ہموار انداز میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "میں تشنہ کام ضرور ہوں.......... تمہیں خلوت میں لے آئی ہوں اور تمہاری محبت سے میرا دل مسخر بھی ہے لیکن بس.......... اس سے آگے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ میری قوت ارادی کا امتحان بھی ہے اور اس بات کا ثبوت بھی.......... کہ میں امانت میں خیانت کی مرتکب نہیں ہو رہی"۔

"یہ فلسفہ.......... میری کچھ.......... سمجھ میں نہیں آیا.........." اختر نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا اور مزید کچھ کہے سنے بغیر اٹھ کر رمنا پر جھپٹا۔ رمنا تو چکنی مچھلی کی طرح تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی لیکن اختر جانے کس چیز میں الجھ کر گر پڑا اور اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

آنکھیں دوبارہ کچھ دیکھنے اور ذہن کچھ سمجھنے کے قابل ہوا تو اس نے اپنے آپ کو صوفے پر لیٹے ہوئے پایا۔ رمنا صوفے کے ہتھے پر بیٹھی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ شاید وہ زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہا تھا۔

رمنا اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی خمار کے ڈورے تھے اور جب وہ بولی تو آواز بھی بوجھل تھی لیکن اختر کے مقابلے میں وہ اب بھی ہوش و حواس میں تھی۔

"میں یہ کہنا چاہتی تھی.........." اس نے یوں بات شروع کر دی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا اور ان کی گفتگو میں ذرا بھی وقفہ نہیں آیا تھا۔ "کہ میں جسمانی طور پر صرف اس شخص کی ہو سکتی ہوں جس سے میری باقاعدہ شادی ہوئی ہو"۔

"میں تو ابھی اور اسی وقت تم سے شادی کے لئے تیار ہوں۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے"۔ اختر بولا۔ وہ اپنی ذہنی حالت بہتر محسوس کر رہا تھا۔ بے ہوشی کا وقفہ خواہ طویل تھا یا مختصر لیکن اس کے حق میں اچھا ثابت ہوا تھا۔ اس کے ذہن کو آرام مل گیا تھا۔ شاید اسی لئے ذہن پر سے آتشیں سا گرد و غبار ہٹ گیا تھا۔

"لیکن یہ ناممکن ہے"۔ رمنا افسردہ سے لہجے میں بولی۔

"کیوں؟ اس میں ناممکن والی کیا بات ہے؟ تم سیٹھ رئیس سے خلع یا طلاق لے لو۔ ت کی مدت پوری ہوتے ہی ہم شادی کرلیں گے"۔

"یہی تو مسئلہ ہے۔ وہ مجھے کبھی طلاق نہیں دے گا۔ میں اس کی انا کا مسئلہ ہوں"۔ نا گہری سانس لے کر بولی۔ "اور پھر میں حقیقت پسند بن کر سوچتی ہوں تو طلاق لینا مجھے اسر گھاٹے کا سودا نظر آتا ہے"۔

"وہ کیوں؟" اختر نے الجھن سے پوچھا۔

"محبت اپنی جگہ ہے اور زندگی کی تلخ حقیقت اپنی جگہ۔ میں اس شاہانہ رگی.......... آرام و آسائش اور سماجی برتری کی عادی ہوگئی ہوں۔ اس کے بغیر میرا گزارہ ہیں ہو سکے گا۔ میں اس سماج میں گردن اٹھا کر چلتی ہوں اور بڑی بڑی نخریلی گردنیں میرے امنے جھکتی ہیں۔ یہ صرف اس دولت کی وجہ سے ہے اس کے بغیر میں کچھ بھی نہیں رہ ں گی۔ میرے مرحوم باپ نے بھی مجھے انہی آسائشوں کی پناہ میں دینے کے لئے دل پر پتھر کھا تھا اور میں نے بھی اپنی جوانی کی انمول گھڑیاں انہی سب چیزوں کی بھینٹ چڑھائی ہیں۔ ت بھاری قیمت ادا کی ہے میں نے.........."

اختر دم بخود سا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ تھوک نگل کر مجروح سے لہجے میں ا۔ "اتنی محبت ہے تمہیں دولت سے؟"

"بات محبت کی نہیں اختر.......... میری جان!" وہ ملائمت سے بولی۔ "جذباتی اور سانوی ذہن کے ساتھ مت سوچو۔ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں یہ سب کچھ اس ے نہیں کہہ رہی ہوں کہ میں لالچی ہوں یا مجھے دولت سے بہت محبت ہے لیکن یہ ایک یقت ہے کہ انسان اگر ایک طویل عرصہ انتہائی دولت مندانہ اور پرآسائش ماحول میں گزار لے تو پھر وہ سب چیزیں اس کی ضرورت بن جاتی ہیں۔ وہ اس لائف اسٹائل کا عادی ہو جاتا ہے۔ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر رہنے کی کوشش کرے گا تو وہ بالکل ایک بدلا ہوا انسان گا۔ وہ بہت چڑچڑا ہو جائے گا۔ جذبات کا سیلاب جلد ہی اتر جائے گا اور وہ اپنے ساتھی کو نے کو دوڑے گا۔ افسانوی محبت اس وقت اس کا ساتھ نہیں دے گی"۔

اختر خاموش تھا اور اس کی دلیلوں کو حلق سے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "میں سولہ سترہ سال کی لڑکی نہیں ہوں جسے محبت کے پاگل پن میں کچھ سوچنے کی مہلت نہیں ملتی۔ سولہ سترہ سال کی لڑکی طغیانی پر آیا ہوا دریا ہوتا ہے۔ میں ٹھہری ہوئی جھیل ہوں۔ میں کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اس کا نتیجہ وچے بغیر نہیں رہ سکتی۔ رئیس سے طلاق لینے کی صورت میں مجھے کچھ بھی نہیں ملے گا۔ ں بالکل خالی ہاتھ اس کے گھر سے نکلوں گی۔ حتیٰ کہ یہ سماجی مرتبہ بھی مجھ سے چھن جائے گا۔ میں بالکل ایک عام سی عورت ہو کر رہ جاؤں گی۔ ایک تہی دست مطلقہ..........! مجھے

تہی دست اور عام سی عورت بننا بالکل پسند نہیں۔ جبکہ رئیس کی موت کی صورت میں اس کی ہر چیز کی مالک بن جاؤں گی"۔ اس نے سینے پر انگلی رکھ کر اپنی طرف اشارہ کیا۔

پھر ایک گہری سانس لے کر وہ بولی۔ "یہ سب کچھ نکاح نامے کی شرائط میں شامل اور اسی کے مطابق رئیس نے اپنا وصیت نامہ تیار کر رکھا ہے"۔

اختر صوفے پر لیٹا ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ چند لمحے رمنا اس کی طر دیکھے بغیر مضطربانہ انداز میں بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔ پھر خود کلامی کے سے انداز بولی۔ "آج تم نے رئیس کو تو دیکھ ہی لیا ہے.......... وہ ایک گرتی ہوئی دیو ہے.......... اسے صرف ایک ہلکے سے دھکے کی ضرورت ہے.......... ورنہ شاید یہ دی اسی حالت میں برسوں ہمارا راستہ روکے کھڑی رہے"۔

پھر اس نے گویا چونک کر اختر کی طرف دیکھا۔ "کیا تم اتنی ہمت نہیں کر سکتے؟"

"کس بات کی ہمت؟" اختر نے سادگی سے پوچھا۔

"گرتی ہوئی دیوار کو دھکا دینے کی ہمت.........." رمنا نے جواب دیا۔ "اگر تم ذ سی جرات کرو اور رئیس کو قتل کر دو تو ہمیں ایک نئی زندگی مل جائے گی.......... لی اسے میری فرمائش یا اصرار مت سمجھنا۔ دوسرا راستہ تو ہمارے سامنے موجود ہی ہے۔ یعنی اسی طرح ایک دوسرے کو نہ پاسکنے کا عذاب سہتے ہوئے یونہی اس انجانی آگ میں جلتے زندگی گزار دیں گے"۔

"میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا"۔ اختر نے بے اختیار کہا اور تب اسے احسا ہوا کہ اس کے تپتے ہوئے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔

"تو پھر تمہیں وہی راستہ اختیار کرنا پڑے گا جو میں نے بتایا ہے"۔ وہ بولی اور دونو ہاتھ پشت پر رکھے کمرے میں ٹہلنے لگی۔

"لیکن اس صورت میں مجھے تم کہاں ملو گی؟ مجھے تو سزائے موت ملے گی"۔ اخ کراہا۔ "قتل.......... اور وہ بھی سیٹھ رئیس کا..........؟ میں بھلا کہاں بچ سکوں گا؟"

"تم صاف بچ جاؤ گے"۔ رمنا وثوق سے بولی۔ "سزا تو تمہیں تب ملے گی نا جب پر قتل کا الزام آئے گا"۔

وہ دوبارہ صوفے کے ہتھے پر آ بیٹھی۔ "اور قتل کا الزام تم پر ہرگز نہیں آئے گا۔ میرا ذمہ ہے"۔

"وہ کس طرح؟" اختر کو گویا امید کی کرن نظر آئی۔

"تمام تر حفاظتی انتظامات کے باوجود آج کل دولت مندوں کے ہاں کس طرح ڈا پڑ رہے ہیں۔ کس طرح چوری اور نقب زنی کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ چور رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے.......... یا ڈاکے کی کسی واردات میں گڑ بڑ

جاتی ہے اور چور یا ڈاکو اہل خانہ کو قتل کر کے فرار ہو جاتے ہیں۔ ان کا کبھی کوئی سراغ نہیں ملتا۔ ایسا ہوتا ہے یا نہیں؟"

"ہاں.......... ہوتا تو ہے"۔ اختر نے کمزور سے لہجے میں کہا۔

"ایسا کوئی حادثہ سیٹھ رئیس کے ساتھ بھی تو پیش آ سکتا ہے"۔ رمنا ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔

اختر کا ذہن اب سوچ بچار کرنے اور باریکیوں کو سمجھنے کے قابل ہوتا جا رہا تھا تاہم وہ صرف ہنکارا بھر کر رہ گیا۔

رمنا گویا اس کی خاموشی سے حوصلہ پا کر بات آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ "میں اس کام میں تمہاری بہت مدد کر سکتی ہوں اور میری مدد کی وجہ سے یہ کام تمہارے لئے انتہائی آسان ہو جائے گا۔ میں تمہیں اندر آنے اور رئیس کے کمرے تک پہنچنے کا موقع فراہم کر سکتی ہوں۔ میں تمہیں بتا سکتی ہوں کہ کس وقت وہ چند گھنٹوں کے لئے بالکل تنہا ہوتا ہے.......... اور.......... اور.......... میں یہ گواہی بھی دے سکتی ہوں.......... پولیس کے سامنے یہ بیان بھی دے سکتی ہوں کہ یہ ڈاکو کی کارروائی تھی جو فرار ہو گیا.........."

اختر اب بھی خاموش تھا لیکن وہ سب کچھ غور سے سن رہا تھا۔ اس کا ذہن ان الفاظ کو دھیرے دھیرے جذب کر رہا تھا۔

رمنا نیچی آواز میں بولی۔ "میرا ساتھ میسر ہونے کی صورت میں تمہیں کسی خطرے کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی"۔

اختر نے چند لمحے سوچا۔ رمنا اگر اس طرح اس کا ساتھ دیتی تو کام واقعی مشکل نہیں تھا.......... اور اس کے بعد آنکھیں خیرہ کر دینے والا مستقبل اس کا منتظر تھا۔

لیکن اس عالم میں بھی ذہن کے نہ جانے کس گوشے میں ایک خیال سر اٹھائے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ کام خود رمنا کے لئے بھی تو مشکل نہیں تھا۔ اگر طلب کی آگ اس کے دل میں بھی اتنی ہی شدید تھی تو وہ خود بھی راستے کی اس رکاوٹ کو نہایت خاموشی سے.......... نہایت رازدارانہ انداز میں ہٹا سکتی تھی۔

رمنا سے اس کی محبت کی شدت بے وجہ اور بے بنیاد نہیں تھی ان کے ذہنوں میں کوئی مضبوط رابطہ تھا۔ شاید ٹیلی پیتھی کی سی کوئی صورت تھی۔ شاید اسی تعلق کے سہارے رمنا گویا اس کے خیالات پڑھتے ہوئے بولی۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم نے بچگانہ انداز میں سوچنا شروع کر دیا ہو گا۔ تم ایک سادہ ذہن انسان ہو۔ شاید تم سوچ رہے ہو کہ میں خود رئیس کو زہر کیوں نہیں دے دیتی.........."

اختر نے اس سے نظر چرا لی۔ اسے کچھ ندامت سی محسوس ہوئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ رمنا اتنی آسانی سے اس کے ذہن میں جھانک لے گی۔

رمنا بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "اگر یہ کام اتنا ہی آسان ہوتا تو شاید میں کبھی کا
کر گزری ہوتی۔ دو ڈاکٹر ہر مہینے رئیس کا مکمل چیک اپ کرتے ہیں۔ اس کا نچلا دھڑ مفلوج
ضرور ہے لیکن اس کے باقی اعضا بالکل ٹھیک ہیں۔ اس کی موت گندے نالے کے کنارے
جھونپڑی میں رہنے والے کسی مفلس و قلاش کی موت نہیں ہوگی کہ خواہ جوانی میں ہی مر
ہو مگر پڑوسی چند ٹھنڈی آہیں بھرنے کے بعد اسے اللہ کی رضا قرار دے کر تکفین و تدفین کر
دیں اور دوسرے روز بھول جائیں.........."

اس نے خوبصورت بالوں کی لٹیں پیشانی سے ہٹائیں اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد
بولی۔ "میں خود اسے سلو پوائزن بھی دے دوں تب بھی اس کا پوسٹ مارٹم ہوگا۔ ڈاکٹر اور
سرجن اس کی موت کے بارے میں ہر طرح سے اطمینان کریں گے۔ اس کے پاس جتنی قسم
کی انشورنس پالیسیاں ہیں' ان کے کلیموں کی رقم ہی کروڑوں میں ہوگی۔ اتنی بڑی رقموں کی
ادائیگی انشورنس کمپنیاں بھی آسانی سے نہیں کرتیں۔ وہ بھی اپنے طور پر تحقیقات کرائیں گی
اور اطمینان کریں گی۔ زہر خواہ کیسا بھی ہو اس کا سراغ لگا لیا جائے گا اور وصیت کی وجہ
سے شبہ فوراً مجھ پر جائے گا"۔

پھر ایک گہری سانس لے کر وہ دوسرے امکان کی طرف آتے ہوئے بولی۔ "اور اسے
خود گولی مار کر چور ڈاکو والی کہانی گھڑنا میرے بس کی بات نہیں۔ میرا مطلب ہے..........
میں پستول وغیرہ چلا ہی نہیں سکتی.......... خصوصاً" رئیس پر اپنے ہاتھوں سے گولی چلانے کا
تو تصور بھی میرے لئے محال ہے۔ مجھے اس سے نفرت سہی.......... لیکن
بہرحال.......... زندگی کے خاصے برس اس کے ساتھ گزرے ہیں۔ بے شک وہ خود غرض
ہے.......... اس نے میری جوانی کو مصلوب کیا.......... لیکن اس نے زندگی میں چند
چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی مجھے ضرور دی ہیں.........."

وہ ایک نظر اختر کی طرف دیکھ کر اداسی سے مسکرائی۔ <ویسے بھی.......... اتنا عرصہ
تو کوئی جانور بھی انسان کے ساتھ گزار لے تو اسے بھی سامنے جا کر اپنے ہاتھوں سے مارنے کا
حوصلہ نہیں پڑتا۔ میرے پاس تھوڑا بہت روپیہ ہے۔ میں چاہوں تو کرائے کا کوئی قاتل تلاش
کرنے کی کوشش کر سکتی ہوں لیکن کرائے کے کسی قاتل سے اس قسم کا کام لے کر میں عمر
بھر اس کے ہاتھوں بلیک میل ہونا نہیں چاہتی"۔

پھر وہ سر ہلاتے ہوئے فیصلہ کن سے لہجے میں بولی۔ "میں نے بہت سوچا ہے۔ اس
مسئلے کا اس کے سوا کوئی حل نہیں جو میں نے سوچا ہے۔ ہم دو محبت کرنے والے اذیت کے
جس جال میں پھنسے ہیں اس سے ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر ہی نکل سکتے ہیں۔
ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے راز کو راز رکھ سکتے ہیں۔ ہم دونوں ہی بعد میں ایک
دوسرے کے ذہن سے پچھتاوے کا بوجھ اتار سکتے ہیں.......... اور اس تھوڑی سی سفاکی

ے بدلے جو کچھ ہمیں حاصل ہوگا اس سے لطف اندوز ہونے کے بھی صحیح معنوں میں ہم ہی
ستحق ہیں کیونکہ ہم نے ہی انتظار کا عذاب بھی سہا ہے"۔

اختر خاموش رہا۔ چند لمحے کمرے میں بوجھل سکوت طاری رہا۔ پھر رمنا کی آنسوؤں
ں بھیگی ہوئی سی آواز ابھری۔ "یہ محض ایک تجویز تھی.......... اگر تم مجھے اس قید سے
ہائی دلانے کے لئے کوئی فیصلہ کن قدم نہیں اٹھا سکتے تو ہم اس بات کو یہیں بھول جاتے
ں"۔

اختر خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ "میرا خیال ہے.......... مجھے ایسا کرنا ہی
ڑے گا.......... یہ میری مجبوری ہے.......... میں نے بہت صبر کیا ہے.......... میں
ہارے بغیر نہیں رہ سکتا.......... نہیں رہ سکتا.........."

"ٹھیک ہے.........." رمنا کے لہجے میں طمانیت سی آ گئی۔ "تفصیلات ہم پھر کبھی
طے کریں گے۔ دن چڑھ چکا ہے۔ اب تم جاؤ۔ چلو میں تمہیں اس راستے سے پچھلے گیٹ
تک چھوڑنے چلتی ہوں جدھر تمہیں کوئی نہیں دیکھے گا"۔

☆ ============ ☆ ============ ☆

راہداری میں بھی دبیز قالین موجود تھا اور اختر کے قدموں کی آہٹ پیدا نہیں ہو رہ
تھی۔ مدھم روشنی میں دیواروں پر آرائشی لکڑی کی پالش سطح آب کی طرح جھلملا رہی تھی۔

سیٹھ رئیس کے بیڈ روم سے چند قدم پہلے اختر رک گیا اور دیوار سے ٹیک لگا
گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ اس نے کچھ زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا لیکن اس کی سانس
پھول رہی تھی۔

سیٹھ رئیس کے کمرے کے دروازے پر مخملیں گدے والی دو خوبصورت کرسیاں پڑ
تھیں۔ ایک کرسی پر کبھی کبھار نرس بیٹھتی تھی۔ ویسے دن یا رات میں ڈیوٹی پر رہنے وا
نرس کے لئے سیٹھ رئیس کے کمرے سے ملحق ایک چھوٹا سا کمرہ مخصوص تھا جہاں وہ آرا
کر سکتی تھی اور سیٹھ رئیس ضرورت پڑنے پر کسی بھی وقت اسے بلا سکتا تھا۔

لیکن رات کی ڈیوٹی دینے والی نرس ہفتے میں صرف ایک دن کے لئے اپنی ماں۔
ہاں چلی جاتی تھی۔ اس رات وہ ڈیوٹی پر نہیں آ سکتی تھی۔ اگلی رات وہ ڈیوٹی پر آتی تھی
ایک آدھ رات یا ایک آدھ دن سیٹھ رئیس کے لئے نرس کے بغیر گزارنا کوئی مسئلہ نہ
تھا۔ دن میں ڈیوٹی دینے والی نرس بھی ہفتے میں چوبیس گھنٹے کے لئے چھٹی کرتی تھی۔

آج رات والی نرس کی چھٹی کی رات تھی۔

اختر پچھلی دیوار پھاند کر کوٹھی میں داخل ہوا تھا اور ہر چیز اسے مطلوبہ حالت میں
تھی۔ سب کچھ اس پروگرام کے عین مطابق تھا جو اس کے اور رمنا کے درمیان نہایہ
تفصیل سے طے ہو چکا تھا۔ دیوار پر لگے ہوئے خاردار حفاظتی تار اسے پہلے ہی ایک جگہ
کٹے ہوئے ملے۔ اس کے دیوار پر چڑھنے سے کوئی برگلر الارم بھی نہیں بجا۔ سب کچھ آ
تھا۔ گارڈ ویسے بھی صرف سامنے والے گیٹ پر رہتا تھا۔

وہ آگے آیا تو برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر ایک عظیم الشان کچن کا عقبی دروازہ ا

اس حالت میں کھلا ہوا ملا تھا کہ بعد میں معائنہ کرنے والے یہی سمجھتے کہ چور ادھر کا تالا توڑ
کر اصل عمارت میں داخل ہوا تھا۔ راستے میں دو اور دروازوں کے تالے بھی اسے اسی
طرح کھلے ہوئے ملے جیسے انہیں کسی اوزار سے کھولا گیا ہو۔ اس راستے کا نقشہ رمنا نے اختر
کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا جس سے گزر کر اسے سیٹھ رئیس کے کمرے تک پہنچنا تھا۔

........اور اب وہ اس کمرے سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

اس نے پورے ایک ماہ اس معاملے پر غور و خوض کیا تھا۔ اس دوران اس کی رمنا
سے کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں جن میں سے کچھ اسی خفیہ گوشہ عافیت میں ہوئی تھیں جہاں پہنچ
کر اختر کی روح گویا خوابوں کے کسی انوکھے ہی جزیرے کے سفر پر نکل جاتی تھی لیکن اس کی
حالت اس تشنہ لب جیسی ہی رہی جس کے ہونٹوں سے گلاس لگا کر ہر بار ہٹا لیا جاتا تھا۔

رمنا کی طلب اور اسے پا لینے کی خواہش نے اسے دیوانہ کر دیا تھا بالآخر وہ اس نتیجہ پر
پہنچا تھا کہ اس نے پہلی بار جو بات کہی تھی وہ بالکل درست تھی۔ "مجھے ایسا کرنا پڑے
گا........ یہ میری مجبوری ہے۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا........"

وہ بہرحال ایک انسان ہی تھا۔ اسی لالچی دنیا کا ایک انسان۔ رمنا سے اس ایک مہینے کی
ملاقاتوں میں وہ آخر کار محبت سے ہٹ کر بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اسے اندازہ
ہونے لگا تھا کہ رمنا کے دامن میں اس کے لئے محبت کے علاوہ بھی کیا کچھ تھا۔ وہ اس ساری
دولت، محل نما بنگلوں، شاندار اور قیمتی کاروں، بزنس اور کارخانوں کے بارے میں سوچتا تو
اس کی رگوں میں لہو کی گروش تیز ہو جاتی۔

شہرت تو وہ کما ہی چکا تھا۔ اس نوجوانی میں ہی اگر ایک نہایت حسین بیوی سمیت دنیا
کی باقی تمام نعمتیں اور آسائشیں بھی اگر اس کی جھولی میں آ گرتیں تو کیا مضائقہ تھا؟

باپ نے شاید اسے ذرا سی زمین سے عاق کر کے یہ سمجھا تھا کہ وہ زندہ ہی نہیں رہ
سکے گا۔ اب اختر چشم تصور سے دیکھ رہا تھا کہ وہ چم چم کرتی لمبی سی گاڑی میں بیٹھ کر گاؤں
جائے گا تو صرف باپ ہی نہیں، سارے گاؤں والے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھیں
گے۔

پھر وہ باپ کو گاڑی میں بٹھا کر شہر لائے گا۔ اسے اپنے دفاتر، اپنا محل نما خاص بنگلہ،
دیگر آلتو فالتو قسم کے بنگلے اور جائیداد، اپنے کارخانے دکھائے گا تو باپ اپنے جسم پر چٹکیاں
بھرے گا کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا؟ کیا اس کے ناخلف بیٹے کے ہاتھ میں چراغ الہ
دین آ گیا تھا؟

پھر اسے معلوم ہو گا کہ یہ چراغ الہ دین کے بدصورت جن کا کام نہیں، کوہ قاف کی
ایک حسین پری کی نوازشات تھیں جس نے جادو کی چھڑی ہلائی تھی اور سب کچھ اختر کے
قدموں میں ڈھیر کر دیا تھا۔ بالآخر باپ کو یقین آ جائے گا کہ باپ اولاد کو عاق تو کر سکتے ہیں

لیکن ان کا مقدر ان سے نہیں چھین سکتے۔

اس نے اپنی شہرت کے بارے میں سوچا تو اسے خیال آیا کہ اس کے گاؤں کے لو بھی تو اسے ٹی وی پر دیکھتے ہوں گے اور ان میں سے بیشتر اسے پہچانتے بھی ہوں گے۔ شا وہ پرجوش لہجے میں ایک دوسرے کو بتاتے ہوں گے۔ "ارے.......... یہ وہی چوہدری اک حسین کا لڑکا ہے.......... وہی دبلا پتلا سا چھوکرا جو یہاں کھیتوں میں مارا مارا پھ تھا.......... اور اگر کسی کو چمٹا بجاتے دیکھ لیتا تو وہیں بت بن کر کھڑا ہو جاتا تھا.......... بخت اس چھوٹی سی عمر میں بھی ہیر بڑے غضب کی گاتا تھا"۔

کبھی کبھی اختر حیرت سے سوچا کرتا تھا کہ کیا اس کا باپ بھی اسے ٹی وی پر دیکھتا ہو اگر دیکھتا ہوگا تو کیا سوچتا ہوگا؟ کیا اس کے دل میں کوئی نرم گوشہ پیدا ہوا ہوگا نہیں.......... نہیں.......... اگر ایسا ہوا ہوتا تو اس نے کبھی اختر سے رابطہ کیا ہوتا۔

گاؤں کی یاد آئی تو اسے آسیہ بھی یاد آگئی۔ گاؤں میں ان کے برابر کے گھر میں ر والی بیوہ کی وہ لڑکی جس سے اختر کی آخری ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب وہ سولہ سترہ بر کی تھی۔ چنبیلی کی کلی کی طرح سفید اور نرم و نازک سی وہ عجیب لڑکی جو اپنی عمر سے بڑ بڑی باتیں کرتی تھی۔

کہنے کو وہ دیہاتن تھی۔ گھر کا سارا کام کاج کرتی تھی مگر اس کی نزاکت پھولوں شرماتی تھی۔ حسن تھا کہ معمولی سوتی اور بے ڈھب کپڑوں میں بھی آنکھوں کو جھپکنا بھلا د تھا۔

اختر کو معلوم تھا کہ آسیہ اسے چاہتی تھی مگر اس وقت وہ بہت ہی لاابالی تھا اور پھر ا کا ذہن ویسے بھی شہر میں اٹکا رہتا تھا۔ وہ گاؤں جاتا بھی بہت کم تھا۔

آسیہ اس وقت چودہ پندرہ سال کی تھی جب اس نے بہت سیدھے سادے' نہایت معصوم.......... اور شاید دیہاتی سے انداز میں اپنی چاہت کا اظہار کر دیا تھا۔ اختر اس وقت اپنے گاؤں والے مکان میں اوپر کے کمرے میں بیٹھا اپنے کالج کے کسی دوست کو خط لکھ تھا۔ وہ گرمیوں کی دوپہر تھی ہر طرف سکوت پھیلا ہوا تھا۔ چلچلاتی دھوپ پڑ رہی تھی۔

اختر کو اچانک ہی احساس ہوا تھا کہ کوئی کمرے میں جھانک رہا تھا۔ اس نے چونک سر اٹھایا۔ وہ آسیہ تھی۔ ننگے پیروں اوپر آئی تھی۔ اس کے گورے 'گداز' خوبصورت پاؤ دھول میں اٹے ہوئے تھے اور بالکونی کے تپتے فرش پر کھڑی تھی۔ پسینے کی بوندیں اس تمتماتے ہوئے چہرے پر شبنمی قطروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ یقیناً نیچے والوں سے بچا کر اوپر آئی تھی۔

"تم یہاں کیا لینے آئی ہو؟" اختر نے اکھڑے سے لہجے میں پوچھا۔

"میں تم سے کچھ لینے نہیں.......... تمہیں کچھ دینے آئی ہوں.........." اس۔

دوپٹے کے نیچے سے نکالا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا ایک تہہ شدہ گلابی رومال تھا۔

"یہ میں تمہارے لئے لائی ہوں۔ اس پر میں نے تمہارا نام کاڑھا ہے۔ یہ میری نشانی تم رکھ لو.........." وہ دھوپ سے تپتے فرش پر کبھی ایک پاؤں اٹھا رہی تھی' کبھی اختر کو یقین تھا کہ اگر وہ اتنی دیر اس فرش پر کھڑا ہوتا تو اس کے پیروں میں چھالے تے۔

"تم یہاں اندر چھاؤں میں تو آجاؤ"۔ اختر گہری سانس لے کر بولا۔

وہ اندر آگئی۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اس کے سینے میں دل دھڑک نہیں رہا تھا' رہا تھا۔

اختر نے رومال کھول کر دیکھا۔ وہ گلابی رنگ کا ایک نہایت چھوٹا سا' نہایت معمولی سا تھا۔ اس پر رنگین ریشمی دھاگوں سے اس کا نام کڑھا ہوا تھا۔ نیچے ایک دل بنا ہوا تھا میں ایک تیر ترازو تھا۔ اختر کو کچھ ہنسی بھی آئی' کچھ جھنجھلاہٹ بھی محسوس ہوئی۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ غالب کا وہ شعر نہیں پڑھ سکا۔

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے آتی جو جگر کے پار ہوتا

وہ خود بھی اس وقت نوعمر' نوجوان ہی تھا اس عمر میں محبت کہیں سے بھی ملے' اچھی لگتی ہے۔ بلکہ محبت تو ہر عمر میں اچھی ہی لگتی ہے۔ لیکن اختر کے ذہن میں نہ جانے کیا آسیہ جتنا اس کی طرف بڑھتی تھی' وہ اتنا ہی پیچھے ہٹتا تھا۔ شاید یہ بھی انسانی فطرت کا خاص پہلو تھا۔ جو چیز رسائی میں ہوتی ہے وہ دل کو نہیں بھاتی۔ جو رسائی سے جتنا دور ہے' اتنا ہی تڑپاتی ہے۔ آسمان پر جھلملاتے چاند ستارے شاید اسی لئے سب کو اچھے لگتے کہ وہ رسائی سے دور ہوتے ہیں۔

وہ قدرے خفگی سے بولا۔ "تمہاری یہ دیہاتیوں والی حرکتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں"۔

"میں دیہاتن ہوں تو دیہاتیوں والی حرکتیں ہی کروں گی۔ شہری ہوتی تو شہریوں والی تیں کرتی۔ تم شاید شہر جاکر شہری ہوگئے ہو"۔ وہ سادگی سے بولی۔

اختر اس سے دو تین سال ہی بڑا تھا لیکن بزرگانہ لہجے میں بولا۔ "تم ابھی چھوٹی ہو۔ یں اس طرح کی حرکتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ میں تو شریف آدمی ہوں۔ اگر میری جگہ کوئی ہوتا تو نہ جانے تمہیں ورغلا کر کیا کچھ کر گزرتا"۔

"تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو ہی کیوں؟" وہ بدستور سادگی سے بولی۔ "میرے دل.......... میرے دماغ میں تو آج تک تمہارے سوا کوئی آیا ہی نہیں ہے.......... اور.......... یہ جو تم مجھے چھوٹی چھوٹی کہہ رہے ہو نا.......... تو گاؤں میں پندرہ سال کی عمر میں تو بعض لڑکیوں کی شادی ہو جاتی ہے"۔

"تمہیں بھی بہت جلدی ہے کیا شادی کی؟" اختر نے بدستور خفگی سے پوچھا۔
"شادیاں تو قسمت والیوں کی ہوتی ہیں۔ مجھے کوئی جلدی نہیں شادی کی۔ میں تو
تمہارے منہ سے یہ سننا چاہتی ہوں کہ تم بھی مجھ سے پیار کرتے ہو"۔
"دیکھو آسیہ! میں ابھی پڑھ رہا ہوں اس کے علاوہ میرا دوسرا شوق موسیقی ہے
میں کسی تیسری کی طرف دماغ لگانا نہیں چاہتا۔ زیادہ سمتوں میں منہ مارنے والا کسی طرف
بھی نہیں رہتا' ویسے بھی مجھے شادی گاؤں میں تو کرنی نہیں ہے"۔
"شادی بے شک نہ کرنا' میری یہ نشانی تو رکھ لو۔ وہ رومال دوبارہ اس کی طرف
بڑھاتے ہوئے بولی۔
"تمہیں یہی ملا تھا مجھے دینے کے لئے؟" اختر مسکرا دیا۔
"میں ایک غریب بیوہ کی بیٹی ہوں ہم ماں بیٹی گھروں میں کام کرکے پیٹ پالتی ہیں
والی ہوتی تو تمہارے لئے کوئی اچھا سا مہنگا سا تحفہ لاتی۔ میرے پاس تو اس رومال کو کا
کے لئے ریشمی دھاگہ بھی نہیں تھا یہ بھی میں نے کسی سے مانگا ہے"۔ وہ افسردگی سے بو
اختر کو صحیح طور پر یاد نہیں تھا کہ اس نے وہ رومال آسیہ سے لینے کے بعد کہاں
تھا۔ وہ شہر آتا تھا تو آسیہ کو بالکل بھول جاتا تھا۔
پھر یونیورسٹی کے زمانے میں آسیہ سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ اسے یاد تھا
ملاقات میں آسیہ نے بہت ہی افسردہ لہجے میں کہا تھا۔ "اختر اب بھی اپنے اور میرے بار
میں سوچ لو کوئی وقت آئے گا کہ مجھے یاد کرکے رویا کرو گے"۔
مگر اختر قطعی نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ اپنے اور اس کے بارے میں کیا سوچ لے۔
اس کا اشارہ شادی کی طرف تھا تو اختر گاؤں کی ایک ان پڑھ لڑکی سے شادی تو کسی بھی
پر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس پر کوئی ایسا وقت بھی نہیں آیا جب وہ آسیہ کو یاد کرکے رویا
شروع شروع میں بس ایک میٹھی کسک تھی بعد میں اس کی اپنی زندگی کے مدوجزر میں
دھندلی یاد بھی اس کے ذہن سے محو ہوگئی تھی اور دل میں میٹھی سی کسک کا احساس بھی نہ
رہا تھا۔
اچانک اس نے اپنے جسم میں ایک سرد سی لہر محسوس کرتے ہوئے جھرجھری لی
نے خیالات سے چونک کر دل ہی دل میں اپنے آپ کو سمجھایا۔ کہ یہ بھی کوئی موقع ہے
یادوں میں الجھنے کا۔ تم اس وقت سیٹھ رئیس کے گھر میں کھڑے ہو اور اسے قتل کرنے
ارادے سے آئے ہو۔
اس نے سر جھٹک کر یادوں کی بھول بھلیوں سے باہر آتے ہوئے دیوار سے
کر اس طرح ایک طویل سانس لی کہ ذرا بھی آواز پیدا نہ ہو پھر اس نے چمڑے کی سیاہ
کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ریوالور کے ٹھوس اور سرد دستے کا لمس محسوس کرکے اس

جھرجھری لی لیکن ریوالور کی موجودگی سے اسے ذرا خود اعتمادی کا احساس سا ہوا۔
بار پھر اس نے ایک بار پھر سیٹھ رئیس کے کمرے کی طرف دیکھا۔ اس کے ایک طرف
ے کمرے کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ سیٹھ رئیس اور رمنا الگ الگ خواب گاہ میں سوتے
لیکن یہ "محض رسما" ہی رمنا کی خواب گاہ تھی وہ محض دکھاوے کے لئے کبھی کبھار ہی
میں سوتی تھی - وہ اپنی اصلی خواب گاہ اسی کو سمجھتی تھی جسے اس نے اپنے خفیہ گوشہ
یا گوشہ عافیت کا نام دیا ہوا تھا۔
سیٹھ رئیس خواب آور گولیاں کھا کر سوتا تھا۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں
کہ رمنا کہاں سوئی ہوئی ہے یا کہاں موجود ہے۔ رات کے کسی بھی حصے میں رمنا کا دل
تنہائی سے گھبراتا تھا تو وہ چپکے سے اٹھ کر اوپر اپنے گوشہ عافیت میں چلی جاتی تھی حالانکہ
اس کے اپنے وہاں بھی تنہائی ہی اس کی رفیق ہوتی تھی لیکن نہ جانے کیوں وہاں اس کا
دل لگتا تھا اختر کو معلوم تھا کہ پروگرام کے مطابق وہ اس وقت بھی اپنی رسمی خواب گاہ
نہیں بلکہ اپنے گوشہ عافیت میں ہی ہوگی۔
اختر نے اپنی منتشر سوچوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے گھڑی دیکھی۔
احساس ہوا کہ وقت بہت تیزی سے گزرتا جا رہا ہے۔ وہ اپنے منتخب کیئے ہوئے راستے پر
بہت آگے آ چکا تھا اب واپسی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا اس لئے اسے جو کچھ کرنا
اس میں تاخیر کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔
کام کچھ ایسا مشکل بھی نہیں تھا۔ ساؤنڈ پروف کمرے میں ریوالور سے ایک نیم مردہ
ن پر ایک گولی ہی تو چلانی تھی گولی چلانا اس کا شوق نہ سہی لیکن اس کے لئے کوئی ایسا
کام بھی نہیں تھا۔ کالج کے زمانے میں وہ گاؤں جاتا تھا جہاں اسے سوروں سے بھی
پڑتا تھا جو کبھی کبھار کھیتوں تک آ نکلتے تھے اور فصلیں اجاڑتے تھے۔
ان سوروں کو مارنا آسان کام نہیں تھا۔ حکومت کے کسی ڈپارٹمنٹ کی طرف سے
سور کو مارنے پر پچاس روپے کا انعام مقرر تھا اختر اور اس کے دوست بیسیوں سوروں کا
کرتے تھے لیکن وہ کبھی انعام لینے نہیں گئے تھے۔ بائیس بور کی رائفل سے سوروں کا
کرنے کا تجربہ رکھنے کے بعد ریوالور سے ایک نیم مردہ شخص کو گولی مارنا کوئی مشکل کام
تھا۔ مشکل کام تو اپنے آپ کو اس حرکت کے لئے آمادہ کرنا تھا اس مرحلے سے اختر گزر
کا تھا۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا بے آواز طریقے سے سیٹھ رئیس کے کمرے کی طرف
ہ نہایت آہستگی سے ناب گھما کر اس نے دروازہ کھولا اس تالے کی ایک چابی رمنا کے
بھی رہتی تھی وہی اختر کے لئے اس تالے کو کھلا چھوڑ کر گئی تھی۔ جاتے وقت اختر کو
پر کچھ ایسے نشانات پیدا کرکے جانا تھا جیسے چور نے اسے کسی اوزار سے کھولا ہو۔

دروازہ اس نے پہلے صرف اتنا کھولا کہ اندر جھانک سکے۔ پرتعیش اور طویل و خواب گاہ میں نائٹ لیمپ کی مدہم روشنی پھیلی ہوئی تھی اور بیضوی ساخت کے بیڈ میں سیٹھ رئیس سر سے پاؤں تک کمبل میں لپٹا محو خواب تھا۔ وہ کمبل اتنی کم لاگت اچھے خاصے فاصلے سے بھی نہایت خوبصورت محسوس ہو رہا تھا۔

بیڈ کی ایک سائیڈ ٹیبل دواؤں کی شیشیوں سے بھری پڑی تھی اور دوسری طرف میز پر فائلیں اور رجسٹر اوپر تلے سجے ہوئے تھے یعنی سوتے وقت دفتر رئیس کے ساتھ رہتا تھا۔ کاروبار بھی ایک جنون کی طرح لوگوں کو چمٹ جاتا ہے یہ سوچتے ہوئے ایک لمحے کے لئے سیٹھ رئیس پر ترس بھی آیا۔ دولت سمیٹنے کے علاوہ اس شخص کی میں کوئی لذت نہیں تھی۔

پھر اس نے باقی کمرے کا جائزہ لیا بیڈ کے سرہانے دو لیمپ نصب تھے جو اس بجھے ہوئے تھے۔ اتنا بڑا کمرہ محض ایک خوابیدہ فرد کی موجودگی میں ویران ویران سا لگ تھا۔

ایک طرف دیوار پر بہت کم بلندی پر وہ خوبصورت پینٹنگ بھی نظر آ رہی تھی کے بارے میں رمنا نے اسے بتا دیا تھا کہ اس کے پیچھے ایک تجوری پوشیدہ تھی جو نقدی اہم کاغذات سے بھری رہتی تھی۔ بہت سے معاملات میں سیٹھ رئیس کو بلیک منی سے ادائیگی کرنی ہوتی تھی اس لئے تجوری میں ہمیشہ بھاری رقم موجود رہتی تھی۔

چونکہ وہ وہیل چیئر پر ہی چل کر تجوری کھولتا تھا اس لئے وہ دیوار میں کم بلندی نصب کی گئی تھی۔ سیٹھ رئیس کو قتل کرنے کے بعد اختر کو ایک اوزار کی مدد سے تجوری پر بھی ایسے نشانات ڈالنے تھے جیسے وہ اسے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا اور شاید دوران سیٹھ رئیس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

کمرے کا سکوت دیکھ کر اختر کو حوصلہ ہوا اور وہ دبے قدموں اندر پہنچا۔ دروازہ عقب میں بند کرکے اس نے ایک بار پھر غیر محسوس طور پر طویل سانس لی اور ریوالور کی جیب سے نکال کر اس کے دستے پر گرفت مضبوط کرکے بیڈ کی طرف بڑھا۔ اس کا تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک شریف انسان تھا طلب و خواہش کی جانے کون سی شدتیں تھیں جنھوں نے اسے اس کام پر آمادہ کر لیا تھا اور یہاں تک تھا۔

بیڈ کے قریب پہنچ کر اس نے آہستہ سے کمبل اٹھایا۔ ٹریگر پر اس کی انگلی کا دباؤ کن حد تک بڑھنے ہی والا تھا مگر اس نے بروقت بڑی مشکل سے اپنے آپ کو گولی چلا سے باز رکھا کیونکہ جہاں اس کے خیال میں سیٹھ رئیس کی کھوپڑی ہونی چاہیے تھی اسے ایک تولیہ گولے کی سی شکل میں لپٹا ہوا نظر آیا تھا۔

اضطراری طور پر اس نے ایک جھٹکے سے پورا کمبل کھینچ لیا۔ تب اسے پتہ چلا کہ کمبل کے نیچے دو گاؤ تکیے ایک سیدھ میں رکھے ہوئے تھے جنہیں کمبل میں ڈھکا ہونے کی وجہ سے اختر انسانی جسم سمجھا تھا۔

شاید وہ تیزی سے مڑتا اور بے اختیار چیختا ہوا کمرے سے نکل بھاگتا لیکن سیٹھ رئیس کی پرسکون اور میٹھی میٹھی سی آواز نے اسے گویا وہیں پتھر کر دیا۔

"پیچھے مڑ کر مت دیکھنا برخوردار..........." وہ کہہ رہا تھا۔ "تم اس وقت بے حد خطرناک ریوالور کی زد پر ہو۔ اگر تم نے میرے حکم کے خلاف ذرا سی حرکت کی تو کھوپڑی کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ اپنا ریوالور پیچھے پھینک دو مڑ کر دیکھے بغیر..........."

ایک لمحے کے لئے تو اختر بت بن کر رہ گیا۔ اس کے جسم میں اتنی بھی جان نہیں رہی تھی کہ وہ سیٹھ رئیس کے حکم پر عمل ہی کرسکتا۔ یعنی مڑ کر دیکھے بغیر اپنا ریوالور پیچھے پھینک دیتا۔ وہ بالکل خالی الذہن سا ہوگیا تھا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ کہاں کھڑا تھا اور وہاں کس لئے آیا تھا۔

اس کی خوش قسمتی تھی کہ خالی الذہنی کی یہ کیفیت صرف ایک لمحے کے لئے رہی۔ دوسرے ہی لمحے اس پر بڑی شدت سے خوف حملہ آور ہوا۔ اسے احساس ہوا کہ اگر اس نے ریوالور پھینکنے میں مزید تاخیر تو عقب سے گولی اس کے جسم میں پیوست ہوسکتی ہے۔

اس نے مشینی انداز میں ریوالور پیچھے پھینک دیا۔ ایک ثانئے کے لئے تو اسے یوں سکون سا آگیا جیسے اس نے اب تک ہاتھ میں کوئی دہکتا ہوا انگارہ پکڑا ہوا تھا جو اب اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ گٹار تھامنے والے ہاتھ تھے۔ اس کی انگلیاں مضراب کی تاروں کو چھو کر موسیقی کی مدھر تانیں بکھیرنے والی انگلیاں تھیں۔ بندوق' پستول یا دوسرے آتشیں ہتھیار تھامنا اس کا مزاج نہیں تھا۔ اسے خود اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی کہ اب تک وہ اس حماقت میں کیونکر مبتلا تھا؟

اسے اپنے عقب میں کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ غالباً" سیٹھ رئیس نے جھک کر قالین سے ریوالور اٹھایا تھا لیکن اختر مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہ کرسکا۔

عقب سے سیٹھ رئیس کی پرسکون آواز ابھری۔ "اب تم میری طرف گھوم جاؤ اور آرام سے بیڈ پر بیٹھ جاؤ جب تک تم کوئی غلط حرکت نہیں کرو گے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا"۔

اختر ڈرتے ڈرتے نہایت آہستگی سے گھوما اور بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ بیٹھنا اس وقت اسے ویسے بھی ضروری محسوس ہو رہا تھا کیونکہ اس کی ٹانگوں میں گویا جان ہی نہیں تھی۔

بیڈ پر بیٹھنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ کمرے کا ایک گوشہ ایسا تھا جہاں تک روشنی

بالکل ہی نہیں پہنچ رہی تھی۔ ادھر لٹکے ہوئے بھاری پردے بھی دیوار سے کافی آگے تھے ان
ان پردوں کے درمیان سے سیٹھ رئیس کی وہیل چیئر آگے کو نکلی نظر آرہی تھی جس پر وہ
نہایت مطمئن انداز میں نیم دراز تھا۔

اس کے ہاتھ میں واقعی ریوالور موجود تھا اور اختر کا ریوالور قالین پر کہیں نظر نہیں آ
رہا تھا۔ سیٹھ رئیس یقیناً" اسے اٹھا کر قبضے میں لے چکا تھا۔ سیٹھ رئیس نے اپنی وہیل چیئر
میں لگا ہوا ایک بٹن دبایا اور وہیل چیئر نہایت معمولی سی گھرگھراہٹ کے ساتھ آگے آگئی۔

سیٹھ رئیس بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اختر کو اس کی خود اعتمادی پر حیرت تھی۔
اسے معذور ہمیشہ قابل رحم سے دکھائی دیتے تھے۔ معذور خواہ دولت مند ہوتا تب بھی اس
کے چہرے پر تھوڑی بہت بے چارگی کی پرچھائیں ضرور ہوتی تھی لیکن سیٹھ رئیس کے
چہرے کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک معذور کا چہرہ تھا۔

"مجھے تمہاری معصومیت اور جوانی دیکھ کر ترس آ رہا ہے"۔ بالآخر سیٹھ رئیس گہری
سانس لے کر بولا۔ "اس مکار عورت نے کتنی آسانی سے تمہیں شیشے میں اتار لیا"۔

اختر کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ کیا وہ رمنا کو مکار عورت کہہ رہا تھا؟ وہ سوچ بھی
نہیں سکتا تھا کہ دنیا میں کوئی شخص رمنا پر مکاری کا الزام بھی لگا سکتا تھا۔ وہ تو خود ایک
مظلوم عورت تھی۔ اس کا چہرہ معصومیت کا شاہکار تھا۔ وہ چہرہ بھلا کسی مکار عورت کا ہوسکتا
تھا؟

سیٹھ رئیس ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔ "ٹھیک ہے.......... تم پر عشق کا
بھوت سوار تھا۔ اس کی باتوں میں آکر تم مجھے قتل کرنے چلے آئے۔ اس نے تمہیں جاگتی
آنکھوں سے اتنے خواب دکھائے کہ حقائق تمہاری نظر سے اوجھل ہوگئے۔ لیکن تمہیں کم از
کم اتنا تو سوچنا چاہیے تھا کہ اگر میں اتنا ہی غافل، اتنا ہی احمق اور اتنا ہی آسان شکار ہوتا تو
بہت پہلے مارا جاچکا ہوتا۔ آج اس مقام پر نہ ہوتا اور نہ ہی اتنا بڑا کاروبار چلا رہا ہوتا"۔

پھر وہ ذرا آہستگی سے بولا۔ "تمہیں شاید معلوم نہ ہو.......... تمہاری اطلاع کے
لئے بتاتا چلوں کہ میں بمبئی کی ایک جھونپڑی میں پیدا ہوا تھا۔ سات سال کی عمر میں اپنی بیمار
ماں کو فاقوں سے بچانے اور اپنے پیٹ کا ننھا سا دوزخ بھرنے کے لئے ماہی گیروں کی ایک
لانچ پر ملازم ہونا پڑا تھا۔ اس کم عمری اور ناتوانی میں.......... جب بچوں کو اپنی گلیوں کے
محفوظ فٹ پاتھوں پر چلنے کا سلیقہ نہیں ہوتا.......... میں اس وقت سمندر کے بے رحم
تھپیڑوں سے بری طرح ڈگمگاتی ہوئی لانچ کے کنارے پر کھڑا ہو کر بہت بڑے جال میں اپنے
ننھے ننھے ہاتھ پھنسائے زندہ رہنے کا سلیقہ سیکھ رہا تھا۔ ان سمندروں میں روز و شب گزار رہا
تھا جن کا کنارہ نظر نہیں آتا تھا.........."

وہ گویا اپنے دل میں امنڈتے ہوئے کسی طوفان پر قابو پانے کے لئے ایک لمحے کو

وش ہوا پھر کچھ اور دھیمے لہجے میں بولا۔ "میں بہت سخت جان ہوں مسٹر اختر! اگر مجھے مارنا
آسان ہوتا تو بے رحم زمانہ یا فاقوں کا عفریت مجھے بچپن میں ہی مار چکا ہوتا۔ تم یہی
کو کہ میں چند سال قبل کار کے اس حادثے میں بھی نہیں مرا جس میں کار چکنا چور
ئی۔ ڈرائیور کی تو لاش بھی پہچانے جانے کے قابل نہ رہی اور میرے دو کاروباری ساتھی
موقع پر ہی مر گئے۔ صرف میں زندہ رہا۔ اس کا مطلب سمجھتے ہو مسٹر اختر؟"

اختر خاموش رہا۔

سیٹھ رئیس خود ہی اپنے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا۔ "اس کا مطلب ہے ابھی
ت قدرت نے میری موت کا حکم نامہ جاری نہیں کیا.......... اور جب تک اوپر سے
انہ آئے۔ میں بھلا اس دنیا سے کیسے جا سکتا ہوں؟ میں زندہ رہوں گا۔ وہیل چیئر پر ہی
ں.......... میں اس وہیل چیئر سے ہی اتنا بڑا کاروبار اور اتنی ہنگامہ خیز زندگی کے تمام
لات کنٹرول کرتا ہوں۔ میرا دل کہتا ہے کہ ابھی میری موت کافی دور ہے۔ لیکن یہ بات
مکار عورت کی سمجھ میں نہیں آتی"۔

سیٹھ رئیس کے لہجے میں برہمی، تکبر یا اشتعال کے بجائے ملائمت اور بزرگی تھی۔
ز کو قدرے حوصلہ ہوا۔ اس نے تھوک نگلا اور بیٹھی بیٹھی سی آواز میں کہا۔ "تم مجھے بے
ف کہہ لو.......... احمق کہہ لو.......... لالچی کہہ لو.......... کچھ بھی کہہ لو مگر رمنا کو
ارمت کہو۔ وہ بہت دکھی عورت ہے۔ اس کے سینے میں زخموں کا الاؤ دہک رہا ہے"۔

سیٹھ رئیس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی۔ شاید اس نے قہقہہ لگایا تھا اور فوراً
اسے دبانے کی کوشش بھی کی تھی۔ یا پھر شاید وہ ایک ایسا قہقہہ تھا جس میں ان گنت
راہیں شامل ہوگئی تھیں۔ اس کے چہرے کے عضلات گویا تڑپ کر رہ گئے۔

وہ استہزائیہ سے لہجے میں بولا۔ "دکھی عورت جس کے سینے میں زخموں کا الاؤ دہک رہا
ہے.......... اس کی آواز میں تمہیں ابھی سنواتا ہوں۔ تم تو اس کے لئے ایک کھلونا ہو
نے وہ ایک خاص مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتی تھی۔ تمہیں قربانی کا بکرا بنا کر سب کچھ
اصل کرنا چاہتی تھی۔ اس کا اصلی عاشق تو کوئی اور ہے جو اس وقت بھی اس کے ساتھ اس
کرے میں موجود ہے جسے وہ اپنا خفیہ گوشہ عافیت کہتی ہے اور جو درحقیقت اس کا عشرت
کدہ ہے.........."

سیٹھ رئیس نے ایک بٹن دبا کر اور پھر ہینڈل گھما کر کرسی پیچھے کھسکائی اور اسے
پردوں کے قریب لے گیا کمرے میں چاروں پھیلے ہوئے وہ پردے اپنے پیچھے نہ جانے کیا کیا
بھید چھپائے ہوئے تھے۔ سیٹھ رئیس نے ایک پردے کے پیچھے ہاتھ لے جاکر شاید کوئی سوئچ
دبایا اور کمرے میں گویا کوئی ریڈیو آن ہوگیا۔ آواز دھیمی تھی لیکن ذرا توجہ سے سنا جاتا تو
صاف پہچانی جاسکتی تھی۔

وہ رمنا ہی کی آواز تھی۔ وہ اسی گھٹے گھٹے لہجے میں، مخمور سے انداز میں بات کر تھی جس میں اختر سے باتیں کیا کرتی تھی۔ مگر اس وقت وہ نہ جانے کس سے مخاطب تھ کہہ رہی تھی۔ "اختر کو رئیس کے کمرے میں جاتے ہوئے تو میں نے خود دیکھا ہے۔ م اندازے کے مطابق تو اسے اب تک کام ختم کر کے سگنل دے دینا چاہیے تھا"۔ رمنا لہجے میں ہلکی سی تشویش تھی۔

"سگنل کیا مقرر کیا تھا تم نے؟" بھاری سی آواز والے کسی مرد نے ذرا بے پر سے پوچھا۔

"میں نے اختر سے کہا تھا کہ کام ختم کرنے کے بعد رئیس کے کمرے کی پچھلی کھ کا پردہ ہٹا کر تین مرتبہ لائٹ جلانا اور بجھانا"۔ رمنا کی آواز سنائی دی۔ "میں یہاں اپنے کمرے کی کھڑکی سے رئیس کے کمرے کی پچھلی کھڑکی اس حد تک تو دیکھ ہی سکتی ہوں کمرے میں روشنی ہو رہی ہے یا نہیں ابھی تک تاریکی ہی نظر آ رہی ہے۔ اختر نے ا تک سگنل نہیں دیا"۔

اختر کو یقین نہ آیا کہ وہ رمنا کی آواز میں یہ بات سن رہا تھا لیکن یہ حقیقت تھ اس کے اور رمنا کے درمیان یہی سگنل طے ہوا تھا۔

بھاری آواز والے مرد نے بے پروائی سے کہا۔ "خیر.......... تم اس لونڈے اتنی جلدی کام ختم کرنے کی توقع مت رکھو اور یہاں آجاؤ.......... جیسا تم نے اس لونڈ کا نقشہ کھینچا ہے اس سے تو یہ معلوم ہوتا کہ ابھی وہ رئیس کے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہوگا اور اپنی ٹانگوں کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہوگا۔ تم ابھی کچھ دیر لئے اسے اس کے حال پر چھوڑ دو اور یہاں آجاؤ"۔

"نہیں۔ میں کھڑکی سے نہیں ہٹ سکتی"۔ رمنا فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "اگر سگنل نہ دیکھ سکی تو سارے کام میں نقص پڑ سکتا ہے۔ ہمیں اس کو عین وقت پر ر ہاتھوں پکڑوانا ہے.......... جب ریوالور اس کے ہاتھ میں ہو اور رئیس کی کھوپڑی سے ہوا خون خشک نہ ہوا ہو.......... پھر مجھے زار و قطار روتے ہوئے پولیس کو ساری کہانی سنانی ہے کہ کس طرح میں نے اس نوجوان کو سفارش کے ذریعے اس مقام تک پہنچایا.......... اپنے گھر کے ایک فرد کی طرح قریب ہونے کا موقع دیا اور اس نے نہ جا کیا سوچ کر ہمیں ہی لوٹنے پر اور ہمارا گھر اجاڑنے کا فیصلہ کرلیا"۔

پھر وہ طویل سانس لے کر بولی۔ "اگر میں تمہارے قریب آ بیٹھی تو شاید بعد میری اداکاری میں وہ تاثیر پیدا نہ ہوسکے جو پولیس کے سامنے میری کہانی میں حقیقت کا ر بھرنے کے لئے ضروری ہے.........."

سیٹھ رئیس نے پردے کے پیچھے ہاتھ لے جا کر وہ پراسرار سوئچ آف کر دیا اور آ

منقطع ہوگئی۔ اس نے اچھا ہی کیا تھا کیونکہ اختر میں مزید کچھ سننے کی تاب نہ رہی تھی۔ اس کا جسم اندر ہی اندر یوں کانپ رہا تھا جیسے اسے لرزے کا بخار چڑھنے والا ہو۔ اس کا دھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہ رہا تھا لیکن سیٹھ رئیس بالکل پرسکون تھا۔

"سنا تم نے؟" سیٹھ رئیس نے قطعی ہموار لہجے میں کہا۔ "سنا تم نے قربانی کے بکرے؟ انہوں نے تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑوانے کے لئے کوئی کہانی بھی تیار کر رکھی ہے اور وہ یقیناً بڑی بے عیب اور ناقابل تردید کہانی ہوگی۔ قدرت نے اس کم بخت رمنا کو جیسا بے عیب حسن عطا کیا ہے ایسی ہی بے عیب کہانیاں وہ تخلیق کرتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ کہانیاں کاغذوں پر نہیں لکھی جاتیں اور کہیں نہیں چھپتیں۔ تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے میں نے تمہیں پھانسی کے تختے پر جانے سے بچا لیا ہے.........."

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ "تم جب رنگے ہاتھوں پکڑے جاتے اور رمنا آنسوؤں کی روانی کے ساتھ پولیس کو اپنی کہانی سناتی تو شاید تم شکست محبت کے صدمے سے گنگ ہو کر رہ جاتے۔ میرے اندازے کے مطابق تم کچھ ایسے ہی جذباتی نوجوان ہو۔ اگر تم اس صدمے سے سنبھل بھی جاتے اور اصلی بات بتانے کا حوصلہ بھی کرلیتے تب بھی رمنا یہ ثابت کر دیتی کہ تم نے یہ کہانی اپنے بچاؤ کے لئے گھڑی ہے۔ تم چیختے رہ جاتے۔ تمہاری کوئی نہ سنتا۔ اس کے اثر و رسوخ کے سیلاب کے سامنے تمہاری حیثیت ایک تنکے کی سی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تم پولیس کی تحویل میں مرجاتے اور اگلے روز اخبارات کے کونے کھدروں میں چند سطر کی خبر آجاتی کہ حوالات میں ملزم نے خودکشی کرلی.........."

پھر وہ ایک متاسفانہ سی سانس لے کر بولا۔ "اگر رمنا کا مقصد صرف مجھے مروانا ہوتا تو یہ کام اس کا وہ عاشق بھی کرسکتا تھا جس کی آواز ابھی تم سن رہے تھے۔ لیکن مسئلہ صرف مجھے مروانے کا نہیں تھا انہیں رنگے ہاتھوں پکڑوانے کے لئے قربانی کا ایک بکرا بھی چاہیے تھا.......... اور تم بہت عمدہ بکرے تھے.........."

پھر وہ گویا خود ہی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "یہ تھوڑا سا تردد انہیں صرف انشورنس کمپنیوں کے لئے کرنا تھا۔ ورنہ اور کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ میری انشورنس پالیسیاں کروڑوں کی بنتی ہیں اور ان کے کلیم مشکوک قسم کے حالات میں زیادہ آسانی سے نہیں ملتے۔ اگر کہانی محض یہ رہتی کہ رات گھر میں کوئی نامعلوم چور گھسا' عین وقت پر سیٹھ رئیس کی آنکھ کھل گئی اور چور پکڑے جانے کے ڈر سے اسے قتل کر کے چلا گیا تو شاید کمپنیاں اپنے طور پر خفیہ تحقیقات شروع کرا دیتیں۔ بڑی رقموں کے معاملے میں ایسا ہوتا ہے لیکن رنگے ہاتھوں پکڑا جانے والا ایک قاتل سامنے موجود ہوتا تو کام بہت آسان ہو جاتا.......... خواہ قاتل کی کہانی کچھ بھی ہوتی"۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا.......... کہیں میرے دماغ کی نسیں نہ پھٹ

جائیں"۔ اختر نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"دنیا کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لئے ابھی تمہارا ذہن بہت چھوٹا ہے"۔ سیٹھ رئیم نے اطمینان سے کہا اور ریوالور گود میں رکھ لیا۔ اب شاید اختر کی طرف سے کوئی خط محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اپنے گاؤن کی جیب سے ایک سگار نکال کر سلگانے کے بعد اس ـ کمرے میں خوشبودار دھواں بکھیرا اور ملگجی روشنی میں ایک لمحے کے لئے بغور اختر کے چہر کا جائزہ لیا۔

پھر اس کی آواز گویا کہیں دور سے آئی۔ "اس دور میں زیادہ تر انسان دہری زندگیا گزار رہے ہیں۔ ایک وہ جو سطحی طور پر دیکھنے والوں کو نظر آتی ہے اور ایک وہ جو صرف چار لوگوں کے علم میں ہوتی ہے۔ اگر دنیا میں کچھ دن اور کامیابی سے زندہ رہنا چاہتے ہو محض چہرہ دیکھ کر کسی پر بھروسہ مت کرنا.......... خصوصاً" بعض غیر معمولی طور پر حسیر عورتیں تو کسی ناگن سے کم نہیں ہوتیں۔ نایاب ہیرے کی طرح ان کی شخصیت کے جانے کتنے پہلو ہوتے ہیں۔ ہر پہلو تمہاری آنکھیں خیرہ کر دے گا۔ تمہیں بدحواس کر د گا۔ تم شاید برسوں ابھی ان معاملات سے نمٹنے کے قابل نہ ہوسکو۔ تم اپنی محدود اور سادہ دنیا میں رہو۔ جس حد تک بھی ممکن ہو سیدھی سادی زندگی گزار دو ورنہ زندگی کی ڈور الجھ چلی جائے گی۔ اسے سلجھانا تمہارے بس میں نہیں رہے گا"۔

اس نے سگار کا ایک اور گہرا کش لیا اور کھوئے کھوئے سے انداز میں مسکراتے ہو بولا۔ "رمنا نے جب اپنی دانست میں چوری چھپے اور آہستہ آہستہ یہ اوپر والا کمرہ سجانا شرو کیا تو اس کا خیال تھا مجھے پتہ ہی نہیں چلے گا۔ خوش فہمی تھی اس بے چاری کو.......... اسے اندازہ نہیں ہے کہ مجھے تو اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ کس سرونٹ کوارٹر میں کر نئی چارپائی آئی ہے۔ میں وہیل چیئر پر بیٹھ کر بھی ان لوگوں سے زیادہ باخبر ہوں جو اپنی ٹانگو پر چلتے پھرتے ہیں۔ باخبر رہنے میں ہی میری عافیت ہے کیونکہ جوں جوں انسان کی دول بڑھتی جاتی ہے' اس کے گرد خطرات کا جنگل بھی وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے.........."

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔ "رمنا! نے بڑی حماقت ا اگر وہ کہیں اور کوئی بنگلہ وغیرہ لے کر اپنا عشرت کدہ بنالیتی تو شاید مجھے ذرا دیر سے علم ہو لیکن عورت کی فطرت ہے وہ اپنے گھر میں اپنے آپ کو ہر معاملے میں زیادہ محفوظ و ماموا تصور کرتی ہے اور رمنا نے تو ویسے ہی مجھے گھر کے ایک گوشے میں پڑا ہوا عضو معطل تصو کر رکھا ہے۔ بہرحال مجھے رمنا کے اس گوشہ عافیت کا پہلے دن سے پتہ ہے"۔

اس نے سگار کا ایک کش لیا اور پرخیالی کے انداز میں دھویں کے مرغولے کو تک ہوئے بولا۔ "کافی عرصہ پہلے رمنا اپنی کسی نامعلوم بیماری کا علاج کرانے کے بہانے اپنے ایک عاشق کے ساتھ گرمیاں گزارنے سوئٹزرلینڈ گئی ہوئی تھی تو میں نے ایک نہایت اچ

الیکٹرانک انجینئر سے اس کمرے میں یہ خفیہ سسٹم نصب کرایا جس کے ذریعے تم یہ ساری گفتگو سن رہے تھے۔ اس سے پہلے میں تمہاری اور رمنا کی گفتگو بھی سنتا رہا ہوں"۔

اختر کو اپنے کانوں کی لویں تپتی ہوئی محسوس ہوئیں لیکن سیٹھ رئیس گویا اس کی کیفیت سے بے خبر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "شاید تمہیں یہ جان کر حیرت نہ ہو کہ ابھی تم جس شخص کی آواز سن رہے تھے یہ کوئی رمنا کا پہلا عاشق نہیں ہے۔ شادی کے بعد سے یہ اس کا تیسرا عاشق ہے۔ ایک نہایت پراسرار حالات میں چل بسا تھا۔ اس نے رمنا کو اس کی تمام تر مہربانیوں کے باوجود بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی۔ دوسرا نہ جانے کیوں اور کیسے اسے چھوڑ گیا۔ یہ تیسرا عاشق سوا چھ فٹ لمبا' ایک قوی ہیکل اور وجیہہ نوجوان ہے اور پالتو کتے کی طرح رمنا کے قدموں میں لوٹتا ہے لیکن مجھے معلوم ہے رمنا کے لئے اس کی حیثیت بھی ایک کھلونے سے زیادہ نہیں۔ مجھے یقین ہے اگر وہ مجھے تمہارے ہاتھوں قتل کروانے اور پھانسی کے تختے تک پہنچانے میں کامیاب ہو جاتی تو اس کے بعد زیادہ عرصے اس عاشق کو بھی اپنے سر پر مسلط نہ رکھتی۔ جلد ہی اس سے بھی جان چھڑا لیتی.......... اور اب بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا"۔

وہ ایک بار پھر سگار کا کش لینے لگا اور اس بار کش لینے کے بعد بھی کچھ نہ بولا۔ اختر کی جرات کسی حد تک لوٹ آئی تھی۔ اس مسافر کی طرح جس کا سب کچھ لٹ چکا تھا اور اب وہ جیسے ہر خوف سے بے نیاز ہوتا جا رہا تھا۔ وہ خفگی آمیز سے لہجے میں بولا۔ "تم یہ سب کچھ کیسے برداشت کرتے ہو؟ کیسے سنتے ہو؟ کیا یہ بے غیرتی نہیں؟"

اتنی دیر کی گفتگو میں سیٹھ رئیس پہلی بار نہایت واضح طور پر مسکرایا لیکن وہ ایک عجیب پراسرار سی مسکراہٹ تھی۔

"بے غیرتی تو مجھ سے اسی دن سرزد ہوگئی تھی جس دن میں نے اپنے سے تیس سال چھوٹی لڑکی سے شادی کی تھی"۔ وہ قدرے افسردہ سے لہجے مین بولا لیکن پھر فوراً" ہی خوشدلی سے مسکرا دیا۔ "غیرت تو ویسے بھی رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو کی گرمی کا نام ہے اور میرا خون اب کچھ ایسا زیادہ گرم نہیں رہا۔ میرے لئے اب یہ سب کچھ دراصل شطرنج کی بازی بن کر رہ گیا ہے۔ رمنا میری حریف کھلاڑی ہے۔ ہمارے درمیان ایک غیر مرئی بساط پر زندگی اور موت کی بازی چل رہی ہے۔ میں اس سے لطف اندوز ہو رہا ہوں لیکن میری ایک بات لکھ لو.......... میں اس دنیا میں رہوں یا نہ رہوں.......... شہہ مات بہرحال رمنا کو ہی ہوگی۔ بس یہی سوچ سوچ کر میرے دل میں گدگدی سی ہوتی رہتی ہے"۔

"عجیب آدمی ہیں آپ بھی"۔ اختر بولا۔

"اگر تمہیں کچھ خاص قسم کے حالات میں لوگوں کے قریب جانے کا موقع ملے تو تمہیں دنیا کے بیشتر انسان ہی عجیب دکھائی دیں گے"۔ سیٹھ رئیس نے جواب دیا۔

اختر کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اسے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ دفعتاً" سیٹھ رئیس جھرجھری سی لیتے ہوئے بولا۔ "بس اب تم بھاگ جاؤ۔ ورنہ شاید کسی برے انجام سے تمہیں میں بھی نہ بچا سکوں۔ رمنا سے آئندہ تم جتنا بھی دور رہو تمہارے حق میں اتنا ہی بہتر ہو گا۔ کوشش کرنا کہ اس سے تمہارا سامنا نہ ہونے پائے اور اگر سامنا ہو بھی جائے تو ایسے بن جانا جیسے تم اسے جانتے ہی نہیں۔ جیسے اس کے اور تمہارے درمیان کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے فون کا جواب مت دینا......... اور اس کے رازوں کو راز ہی رکھنا۔ اس کے بارے میں کسی سے باتیں کرنا بھی تمہارے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اس سے اسی طرح بچو جس طرح تمہیں کسی حسین ناگن سے بچنا چاہیے۔ میں تمہیں صرف اتنا ہی مشورہ دے سکتا ہوں"۔

اختر نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک لمحے کے لئے وہ سیٹھ رئیس کی طرف دیکھتا رہا پھر وحشت کے سے عالم میں اٹھا اور کمرے سے نکل بھاگا۔ وہ جلد از جلد اس گھر سے بہت دور کسی ایسی جگہ چلے جانا چاہتا تھا جہاں رمنا سے کبھی اس کا سامنا نہ ہو سکے وہ اس سے خوفزدہ نہیں، شرمندہ اور نادم سا تھا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔

شرمندہ اور نادم تو رمنا کو ہونا چاہیے تھا مگر اس کے برعکس وہ خود کو خجل سا محسوس کر رہا تھا۔ شاید وہ اپنی محبت کے سامنے شرمندہ تھا جو بڑی حد تک بے لوث اور معصوم تھی مگر وہ اسے ایک ایسی عورت کے قدموں میں نثار کئے ہوئے تھا جس کی عیاری، مکاری، بے حسی اور سنگدلی کے پہلے ہی ریلے میں اس کے جذبات خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے تھے۔

اس وقت اس کا ذہن صحیح طور پر کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ فیصلہ تک نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے کہاں جانا چاہیے۔ ہوٹل کی ملازمت بھی وہ رمنا ہی کی فرمائش پر چند دن پہلے چھوڑ چکا تھا حالانکہ اپنی مرضی سے شاید وہ ایک طویل عرصے تک ایسا نہ کرتا۔

پرسنل منیجر اور نگہت افروز جس نے وہ ملازمت اسے اس وقت دلائی تھی جب عوامی سطح پر کوئی اسے جانتا تک نہیں تھا۔ اس کا استعفیٰ دیکھ کر چپ سے ہو گئے تھے۔

پھر نگہت افروز نے افسردہ سے لہجے میں کہا تھا۔ "شہرت کی ابتدائی منزلوں پر ہی تم نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا اختر! ہمارا خیال تھا کہ بہت بڑے آدمی بن جانے کے بعد بھی تم ہم سے ترک تعلق نہیں کرو گے۔ بہت دور تک اور بہت دور تک ہمارا ساتھ دو گے"۔

"میں ترک تعلق نہیں کر رہا"۔ اختر نے نظریں جھکائے ہوئے کہا تھا۔ "چند مصروفیات کے لئے وقت نکال رہا ہوں"۔

یوں وہ اس ٹھکانے کو چھوڑ آیا تھا جہاں اس کی صلاحیتوں کا بیج پھوٹا تھا۔

سیٹھ رئیس کی کوٹھی سے وہ یوں نکل کر بھاگا جیسے کسی اندھیرے کمرے میں چھت سے چپکی ہوئی چمگادڑ اچانک روشنی ہو جانے پر ہڑبڑا کر وہاں سے نکلی ہو۔

بہت دور جا کر اسے ٹیکسی ملی۔ آج کی "مہم" پر وہ اپنی گاڑی میں نہیں آیا تھا۔ اپنے پہنچ کر وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح بستر پر گر پڑا۔ وہ جاگ رہا تھا مگر اس کے ب میں ں سوچ چکے تھے یا شاید سن ہو گئے تھے۔

پھر شاید رات کے پچھلے پہر اس کی آنکھ لگ گئی تھی اسے کچھ پتہ نہیں چلا کہ سورج طلوع ہوا، کب صبح ہوئی اور کب نیچے سڑک پر ٹریفک کے شور میں وہی روز مرہ کی روانی آ گئی۔ کھڑکی کے شیشوں کو پار کر کے آنے والی دھوپ جب اس کی آنکھوں میں ہ چبھنے لگی تو برسوں کے مریضوں کی طرح اٹھا اور اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا بالکونی میں کرسی آ بیٹھا۔

اس کا خیال تھا کہ اس پر جو صدمہ گزرا تھا وہ اس قدر جانکاہ اور ہمہ گیر تھا کہ اس بعد سورج طلوع نہیں ہو سکے گا۔ دنیا کی گردش تھم جائے گی اور کاروبار حیات معطل ہو ئے گا۔

لیکن کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔

سورج سر پر آ چکا تھا گاڑیوں کا سیلاب روز کی طرح رواں تھا۔ لوگ کاروبار حیات ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑ دینے کے لئے عجیب افراتفری کے عالم میں دوڑے جا رہے اور کسی کو گمان نہیں تھا کہ اوپر بالکونی میں مضمحل چہرہ لئے جو نوجوان ہاتھ پاؤں ڈھیلے وڑے بیٹھا تھا اس پر کیا قیامت بیت چکی تھی، اس کے اعصاب کیسے شل تھے اور اس کے تبار کا اثاثہ کس بیدردی سے لوٹا گیا تھا۔

دھیرے دھیرے اس کے ہاتھ پیروں میں جان سی آنے لگی مگر اب بھی وہ اتنی ہمت سوس نہیں کر رہا تھا کہ نیچے ریستوران میں جا کر ناشتہ کر لیتا۔

دفعتاً" کال بیل بجی اور بجتی ہی چلی گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی بٹن پر انگلی رکھ کر بھول گیا تھا۔ اختر سہم سا گیا کئی لمحے تک وہ ساکت ہی بیٹھا رہا لیکن جب گھنٹی کی آواز بند نہ ہوئی تو مجبوراً" اسے جا کر دروازہ کھولنا ہی پڑا۔ وہ ڈرتے ڈرتے باہر جھانکنے ہی لگا تھا کہ کوئی دروازے کو دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔

اختر ایک لمحے کے لئے تو بالکل ہی خوفزدہ ہو گیا مگر پھر یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کی سانس لی کہ اندر آنے والا امتیاز احمد تھا۔ امتیاز احمد درمیانے قد کا ایک سانولا سا نوجوان تھا جو ہر ایک سے بہت جلد بے تکلف ہو جاتا تھا۔

کچھ عرصہ تک وہ ٹی وی پر اسسٹنٹ پروڈیوسر تھا اور جب اختر نے نیا نیا گانا شروع کیا تھا تبھی ان میں کافی بے تکلفی ہو گئی تھی حالانکہ امتیاز جس پروڈیوسر کا اسسٹنٹ تھا اس کے پروگراموں میں اس وقت تک اختر کبھی شریک ہی نہیں ہوا تھا۔

پھر کسی ہڑتال وغیرہ کے چکر میں امتیاز کو کچی ملازمت کے دوران ہی نکال دیا گیا تھا

اور وہ کچھ عرصہ ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد لاہور چلا گیا تھا۔ اختر نے سنا تھا کہ وہاں اس مشہور فلمی ہیروئن نورین کے فلمساز ادارے میں بطور پروڈکشن منیجر ملازمت کر لی تھی۔

بطور ہیروئن تو نورین کی شہرت کے آفتاب کو گرہن لگنے لگا تھا لیکن بطور فلمساز ہدایت کار اس نے شہرت اور کامیابی کی دنیا میں گویا نیا جنم لیا تھا۔ اس کی بنائی ہوئی فلمیں یکے بعد دیگرے باکس آفس پر ہٹ ہوئی تھیں اور اب اس کا شمار بڑے فلمسازوں اور معروف ہدایتکاروں میں ہوتا تھا۔ فلموں میں اداکاری اس نے خود ہی بہت کم کر دی تھی۔

امتیاز اسے دھکیل کر اندر آتے ہوئے بولا۔.......... "میں تو سمجھا تھا صرف گھڑی میں بارہ بجے ہیں لیکن یہاں تو تمہاری شکل پر بھی بارہ بجے ہوئے ہیں۔ بھائی! اگر اللہ نے اچھی دی ہے تو اس کا تھوڑا بہت خیال رکھا کرو۔ اور کچھ نہیں تو صبح اٹھ کر منہ پر دو چھپکے ہی مار لیا کرو"۔

اختر کچھ نہ بولا۔ ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ امتیاز اس کی خاموشی کی پرواہ کیے بغیر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ "کچھ کھانے کو ہے؟ بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ زندگی تو اتنی مصروف گزر رہی ہے کہ کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ بڑی ذلت کی نوکری ہے۔ لنچ بریک میں بھی عموماً" ڈانٹ ہی کھانے کو ملتی ہے.......... اور ڈانٹ بھی اک عورت کی.......... اور عورت بھی.........." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا پھر کچن میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "مگر تمہارے ہاں تو کھانے پکانے کا بندوبست نہیں ہے۔ اس لئے بھوک وغیرہ کے چکر کو فی الحال بھولنے کی کوشش کرتے ہیں اور بیٹھ کر کام کی بات کرتے ہیں"۔

وہ خود ہی ڈرائنگ روم میں گھس کر آرام سے صوفے پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ اختر بالکل خاموش تھا لیکن امتیاز کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ اس قسم کا آدمی تھا کہ اپنی دھن میں' اپنے جوش و خروش میں اپنی ہی ہانکے جاتا تھا۔ دوسرے کے بولنے کا انتظار نہیں کرتا تھا۔

"میں اپنے یونٹ کے ساتھ پرسوں ہی کراچی آیا ہوں"۔ وہ گویا اب اصل بات شروع کرتے ہوئے بولا۔ "تمہیں شاید معلوم ہو کہ ہماری نئی فلم "دیوانے" کی کافی شوٹنگ کراچی میں ہوگی۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ ہم لوگ یہاں رہیں گے اور مختلف مقامات پر شوٹنگ کریں گے۔ میڈم نورین بھی آئی ہوئی ہیں"۔

اختر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ امتیاز یہ سب کچھ اسے کیوں بتا رہا تھا۔ امتیاز اس کے اس خیال کو پڑھتے ہوئے بولا۔ "میں تمہارے لئے یہ خوشخبری لے کر آیا ہوں۔ میڈم نورین کو تمہاری آواز بے پناہ پسند ہے اور انہوں نے کب سے ارادہ کیا ہوا تھا کہ ان کی نئی فلم میں کم از کم دو گانے تم گاؤ گے۔ یہ بھی اچھی بات ہے کہ تمہیں اس کام کے لئے

لاہور بلوانا نہیں پڑا۔ گانے لکھے ہوئے ہیں۔ دھنیں یہیں کے اسٹوڈیو میں تیار ہو چکی ہیں۔ بس آج چل کر تم سچویشنز سمجھ لو۔ ریہرسل کر لو۔ کل کسی وقت ریکارڈ کر لیں گے"۔ پھر وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "کرنے کو تو آج بھی ریکارڈنگ کر سکتے ہیں ریکارڈنگ میں ہماری شفٹ بک ہے لیکن میڈم تمہیں ریہرسل کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت دینا چاہتی ہیں۔ دونوں گانے المیہ ہیں اور میڈم چاہتی ہیں تم واقعی المیہ گانے کا حق ادا کر دو۔ سب کو رلا دو۔ گانوں کے بول غضب کے ہیں اور دھنیں بھی زبردست بنی ہیں"۔

اس نے گویا اس خوشخبری پر کوئی ردعمل تلاش کرنے کے لئے اختر کے چہرے کی طرف دیکھا لیکن اختر اسی طرح بت بنا بیٹھا تھا۔ "چلو اٹھو۔ کپڑے بدل لو۔ اپنا ایک سلیپنگ سوٹ اور ٹوتھ برش وغیرہ بھی بریف کیس میں ڈال لو۔ شاید آج کی رات تمہیں ہمارے ساتھ ہی گزارنی پڑ جائے"۔

اختر اب بھی خاموش بیٹھا ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے اپنی جگہ سے ہلنے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ آخر امتیاز اٹھ کر اس کے قریب آیا اور اس کے دونوں بازو پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا۔ "اب اٹھ بھی چکو۔ کیا دیوداس جیسی شکل بنا رکھی ہے۔ میں نے تمہیں المیہ گانوں کی تیاری کرنے کے لئے کہا ہے۔ المیہ سین پکچرائز کرانے کے لئے نہیں کہا"۔

اختر اٹھ تو گیا لیکن وہ بدستور خاموش تھا۔ امتیاز کو گویا پہلی بار احساس ہوا کہ اختر غیر معمولی طور پر خاموش تھا۔ وہ بغور اختر کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔ "خیریت تو ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"طبیعت ہی تو ٹھیک نہیں ہے"۔ اختر دھیمے لہجے میں بولا۔

"اس منحوس فلیٹ میں اکیلے پڑے رہو گے تو طبیعت کیسے ٹھیک رہے گی؟" امتیاز بولا۔ "چلو میں تمہیں وہاں لے چلتا ہوں جہاں پہنچ کر بڑے بڑے بیمار اپنی بیماریاں بھول جاتے ہیں۔ جہاں رونق ہے.......... رنگینی ہے.......... زندگی ہے.........."

"تم کہاں لے جانا چاہتے ہو مجھے؟" اختر نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"میڈم نورین کے پاس"۔ امتیاز نے جواب دیا۔ "اور میں کوئی عذر نہیں سنوں گا"۔

☆ ============ ☆ ============ ☆

نورین ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے ڈی لکس سوئٹ میں ٹھہری ہوئی تھی۔ یہ وہ ہوٹل نہیں تھا جہاں اختر چند دن پہلے تک ملازم تھا۔ اس روز شوٹنگ نہ ہونے کی وجہ سے نورین اپنے سوئٹ میں موجود تھی۔

اس کے دائیں بائیں اس کا سیکرٹری' پرائیویٹ میک اپ مین' سامان ٹھانے والا ایک ملازم' ایک پروڈیوسر اور دو تین دوسرے افراد موجود تھے جو صورت اور انداز و اطوار سے

صرف چمچے معلوم ہوتے تھے۔ سوکھی ہوئی سی ایک سانولی عورت بھی وہاں موجود تھی
کے بارے میں کسی کو صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ وہ نورین کی کیا لگتی تھی۔ اس عور
کوئی نورین کی ماں کہتا تھا اور کوئی نانی۔

سننے میں آیا تھا کہ خود نورین اس کے بارے میں صحیح طور پر کسی کو کچھ نہیں
تھی۔ ٹال جاتی تھی۔ تاہم وہ عورت گھر' بازار' اسٹوڈیو' غرض یہ کہ ہر جگہ سائے کی ا
نورین کے ساتھ رہتی تھی۔ ابتدا میں تو نورین کے تمام معاملات بھی وہی طے کرتی تھی ا
پیسہ بھی اسی کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ وہی ہر قسم کی وصولی اور ادائیگی کرتی تھی۔ نورین
پروڈیوسر اور ڈائریکٹر بن جانے کے بعد معاملات خود طے کرنے شروع کئے تھے۔

کمرے میں جسے جہاں بیٹھنے کو جگہ میسر تھی وہ وہاں بیٹھا تھا۔ ایک دو افراد تو کھ
بھی تھے۔ سوئٹ کا وہ حصہ چھوٹا سا ڈرائنگ روم تھا۔ سب کے سامنے نورین بنی سنور
بھڑکیلا نارنجی لباس زیب تن کئے' ٹانگ پر ٹانگ رکھے اس طرح صوفے پر بیٹھی تھی جیسے
ملکہ اپنے دربار میں ہو۔ وہ خاموش ہوتی تھی تو سب بیک وقت زور و شور سے بولنا شر
کر دیتے تھے اور چھوٹا موٹا ایک ہنگامہ سا برپا ہو جاتا تھا لیکن وہ بولنے لگتی تھی تو سب
اپنی بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو جاتے تھے۔

پروڈکشن منیجر امتیاز نے آگے بڑھ کر نورین کو بتایا کہ وہ گلوکار اختر حسین کو لے
ہے۔ اختر کو دیکھ کر خوشگوار سی حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ نورین اس کے استقبال
لئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی ورنہ اس نے یہی دیکھا تھا کہ جو عورتیں شوبزنس کی دنیا میں نور
جیسا مقام حاصل کرلیتی تھیں تو وہ یہ توقع ضرور رکھتی تھی کہ سب لوگ ان کا احترام کر
لیکن وہ خود شاذ و نادر ہی کسی کا احترام کرتی تھیں۔ وہ شوبزنس کی صرف ان نہایت عمر ر
شخصیتوں کے لئے اٹھ کر کھڑی ہوتی تھیں جو اپنے اپنے زمانے میں بڑی اونچی چیز رہی ہ
تھیں۔ اختر تو ابھی نوجوان تھا اور شوبزنس کی دنیا میں اس کا کوئی بہت اونچا مقام بھی نہ
تھا۔

"آیئے.......... آیئے اختر صاحب! آپ سے ملنے کا تو بڑا اشتیاق تھا"۔ نور
نہایت شیریں اور شائستہ لہجے میں بولی۔

اس نے اچانک ہی جیسے کمرے میں موجود تمام افراد کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اس
اشارہ پا کر ایک شخص نے کرسی چھوڑ دی اور نورین نے اختر کو اس پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اختر کے بیٹھتے ہی نورین نے سب لوگوں کو اجتماعی طور پر مخاطب کیا۔ "بھئی آپ
لوگوں کو مجھ سے جو جو کام تھے ان کے سلسلے میں مجھے جو بھی جواب دینا تھا وہ میں دے
ہوں۔ اب براہ مہربانی مجھے کچھ اپنا کام بھی کرنے کا موقع عنایت فرمائیں۔ میرا بڑا وقت
ہو رہا ہے۔ فلم کا بجٹ بڑھتا جا رہا ہے میری شوٹنگ آج بھی کینسل ہو گئی ہے"۔

سب لوگ ذرا بھی برا منائے بغیر اٹھے اور خاکسارانہ انداز میں سلام کرتے ہوئے
رخصت ہوئے۔ نورین کے اپنے آدمی بھی کمرے سے باہر چلے گئے۔ حتیٰ کہ سانولی سی بڑھیا
نے بھی اپنا پاندان اٹھایا اور سوئٹ کے اس حصے میں چلی گئی جو خواب گاہ پر مشتمل تھا۔

تب نورین نے گویا سکھ کی سانس لی اور صوفے کے پشتے سے سر ٹکا کر آنکھیں بند
کرلیں۔ چند لمحے وہ انگلیوں سے کنپٹیاں مسلتی رہی اس دوران اختر بیٹھا خاموشی سے اس کا
جائزہ لیتا رہا۔

نورین کا قد درمیانہ' رنگت گندمی' جسم گدرایا ہوا اور نین نقش دلکش تھے۔ اس کی
ناک چینی لڑکیوں کی طرح کچھ بیٹھی بیٹھی سی تھی اور اسے شروع شروع میں فلمی دنیا میں
اس کے چہرے کا ایک نقص سمجھا گیا تھا مگر پھر فلمساز نے نہ جانے کس طرح اسے ایک فلم
میں ہیروئن کاسٹ کیا۔ ڈرتے ڈرتے فلم مکمل کی.......... اور فلم ہٹ ہو گئی۔

تب فلمسازوں کو پتا چلا کہ دنیا اس کی ناک پر ہی تو مرمٹی تھی جس شرارت بھرے
انداز میں وہ مختلف فلمی مناظر میں یہ ناک سکیڑتی تھی اس سے سینما ہال میں..........
خصوصاً" تھرڈ کلاس میں بڑھکیں گونجنے لگتی تھیں اور اب یہی ناک تھی جس پر وہ مکھی نہیں
بیٹھنے دیتی تھی۔

اختر کئی اداکاراؤں کو دیکھ چکا تھا۔ کئی سے مل چکا تھا لیکن یہ پہلی اداکارہ تھی جو اسے
اسکرین سے زیادہ حقیقی زندگی میں دلکش لگی تھی۔ گو کہ اس وقت بھی اس نے فلمی انداز کا
ہی' خاصا گہرا میک اپ کیا ہوا تھا۔ اختر کا خیال تھا کہ اگر وہ ہلکا میک اپ کرتی تو زیادہ دلکش
نظر آتی۔

ہوٹل پہنچنے سے پہلے اختر نے امتیاز کے ساتھ خاصا وقت گزارا تھا۔ راستے میں کچھ
دوسرے لوگوں سے ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ امتیاز نے بہ صد اصرار اسے ایک ریستوران میں
اپنے ساتھ ناشتہ بھی کرا دیا تھا اس لئے اب اختر کی پژمردگی کافی حد تک کم ہو چکی تھی۔ وہ
اب پہلے جیسا دل شکستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

کاروان محبت لٹ جانے کا صدمہ کم از کم وقتی طور پر ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ وہ اس
ہرجائی اور جلاد صفت عورت رمنا کا تصور ذہن سے جھٹک کر دنیا کی دلکشی اور ہنگامہ خیزی کو
نئے سرے سے محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ امتیاز کا اس کے گھر اچانک آ پہنچنا اس
کے لئے گویا نئی زندگی کا پیغام ثابت ہوا تھا۔ ورنہ شاید وہ وہیں بیٹھا بیٹھا غم کے بوجھ سے پتھر
ہو جاتا.......... یا پھر شاید کوئی بیماری اسے اس طرح آن گھیرتی کہ وہ بستر سے ہی لگ جاتا۔
وہ اس وقت گویا دھیرے دھیرے کسی دلدل میں اتر رہا تھا جب امتیاز نے اچانک اسے کھینچ کر
نکل لیا تھا اور وہ دل ہی دل میں امتیاز کا شکر گزار تھا۔

چند لمحے بعد نورین نے آنکھیں کھولیں اور اختر کی طرف دیکھ کر تھکن زدہ سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ "کیسے کیسے بور لوگوں سے دن بھر سر کھپانا پڑتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اداکاروں کی زندگی گلیمر اور آسائشوں سے بھرپور ہوتی ہے۔ دن رات یہ لوگ مزے عیش کرتے ہیں۔ لوگوں کو کیا معلوم کہ یہ گلیمر اور یہ آسائشیں ہمیں کتنی مہنگی پڑتی ہیں۔ ان کے لئے ہمیں کس طرح خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے"۔

پھر جیسے اسے کچھ احساس ہوا اور وہ ذرا چونکتے ہوئے بولی۔ "آپ اتنے خاموش کیوں ہیں اختر صاحب؟ کچھ بولئے نا!"

"آپ بولتی رہیے۔ مجھے سننا ہی بھلا محسوس ہو رہا ہے"۔ اختر مدہم لہجے میں بولا۔

"اس ان ڈائریکٹ تعریف کا شکریہ"۔ نورین کی مترنم سی ہنسی کمرے میں بکھری۔ "میرا اندازہ درست ہی تھا کہ آپ بڑے شائستہ اور مدھم لہجے میں گفتگو کرتے ہوں گے۔ اگر آپ اسے جوابی تعریف نہ سمجھیں تو میں کہوں گی کہ آپ کو تو گلوکار کے بجائے ہیرو ہونا چاہیے تھا۔ آپ تو ہمارے فلمی ہیروز سے کہیں زیادہ ہینڈسم اور خوش شکل ہیں۔ ٹی وی کی اسکرین پر تو آپ کی شخصیت کا سارا تاثر ہی سکڑ سمٹ سا جاتا ہے۔ امپریشن آدھا رہ جاتا ہے۔ اگر آپ سینما کی اسکرین پر آئیں تو امپریشن دگنا ہو جائے گا"۔

دفعتاً" اسے گویا کوئی خیال آیا۔ وہ ایک بار پھر مترنم سے انداز میں ہنسی اور بولی۔ "لیکن آپ یہ مت سمجھئے گا کہ آپ کی تعریف کرکے میں گانوں کا معاوضہ کم کرانے کی کوشش کروں گی۔ شوبزنس کی دنیا میں عموماً" تعریف کرنے والے کو یا تو کوئی کام ہے یا وہ کسی کام کا معاوضہ کم کرانے کی بات کرے گا۔ ادھر دو جملے تعریف میں بولے ادھر ہزار دو ہزار کی ڈنڈی مارلی"۔

"معاوضوں وغیرہ کے سلسلے میں میں کبھی بھی بہت زیادہ حسابی کتابی قسم کا آدمی نہیں رہا۔ میں تو سب سے پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ جس کام کے لئے مجھے بلایا گیا ہے اس میں میرے لئے دلچسپی کا سامان کس حد تک ہے۔ پھر اس شخصیت یا ادارے کو دیکھتا ہوں جو مجھے بلاتا ہے"۔ اختر دھیمے لہجے میں بولا۔

"ہماری فلم کے لئے گانے میں آپ کو یقیناً دلچسپی تو محسوس ہوئی ہوگی تبھی آپ تشریف لائے ہیں۔ شخصیت اور ادارہ آپ کے سامنے ہے۔ میں ہی شخصیت ہوں اور میں ہی ادارہ۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ ون مین شو......... بلکہ ون وومین شو ہے لیکن ہم لوگ لین دین کے بہت کھرے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے آدمی کے ساتھ نہایت سیدھے صاف اور فیئر طریقے سے چلتے ہیں۔ شاید اسی لئے اللہ نے کم وقت میں بڑی عزت دے دی ہے۔ ہمارے لئے کام کرکے آپ کبھی نقصان میں نہیں رہیں گے"۔ وہ بڑے من موہنے سے انداز میں مسکرائی۔

"نفع نقصان تو نصیبوں کی باتیں ہی جی!" اختر درویشانہ سے لہجے میں بولا۔ "میں ان چکروں میں زیادہ نہیں پڑتا۔ اگر میں کاروباری ذہنیت کا مالک ہوتا تو کب سے تھوڑے بہت ہاتھ پاؤں مار کر فلمی دنیا میں آچکا ہوتا۔ آپ نے عزت سے بلالیا تو آگیا ورنہ ابھی نہ جانے کتنا عرصہ فلمی دنیا سے لاتعلق رہ کر ہی گزر جاتا........."

پھر اس کے افسردہ سے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ کی رمق ابھری اور وہ ذرا ہچکچاہٹ کے ساتھ بولا۔ "آپ کے لئے کام کرکے اس لئے بھی زیادہ خوشی ہوگی کہ آپ میری پسندیدہ ہیروئن ہیں اور میں اردو فلموں میں کم از کم آپ کی فلم ضرور دیکھ لیتا ہوں اس لئے نہیں کہ فلم بہت اچھی ہوتی ہے یا میں آپ کی اداکاری اور ہدایتکاری سے بہت متاثر ہوں۔ صاف گوئی معاف' ایسی کوئی بات نہیں۔ ظاہر ہے فلم آپ کمرشل نقطۂ نظر سے بناتی ہیں اس میں آرٹ تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرتا لیکن میں ان لوگوں میں سے بھی نہیں ہوں جو صرف ٹھمکے اور مصنوعی ادائیں دیکھ کر مرمٹتے ہیں"۔

"تو پھر وہ کون سی چیز ہے جو آپ کو میری فلم دیکھنے پر مجبور کرتی ہے اختر صاحب؟" نورین ہاتھ پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے قدرے آگے کو جھکتے ہوئے دلچسپی سے بولی۔

"اس کے پیچھے چھوٹی سی ایک کہانی ہے اگر آپ بور نہ ہوں......... آپ کے پاس تھوڑا سا وقت ہو تو میں آپ کو سنا سکتا ہوں"۔ اختر کھوئی کھوئی سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"وقت ہو یا نہ ہو......... آپ وہ چھوٹی سی کہانی ضرور سنایئے اختر صاحب! مجھے کہانیوں سے بہت دلچسپی ہے خصوصاً" جب سے میں خود پروڈکشن اور ڈائریکشن کی لائن میں آئی ہوں کہانیوں میں میری دلچسپی بہت بڑھ گئی ہے"۔ وہ بڑے ٹھہراؤ سے بولی۔

"اس کا تعلق میری اپنی زندگی کے ایک معصوم دور سے ہے"۔ اختر بولا۔

"پھر تو میں اسے اور زیادہ دلچسپی سے سنوں گی"۔ نورین فوراً بولی۔

"بات یہ ہے........." اختر نے نظریں جھکا کر انگلیاں ایک دوسری میں پھنسائے ہوئے نہایت دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "جب میں چھوٹا تھا تو ہمارے گاؤں میں ہر سال میلہ لگتا تھا ایک بار میں بھی میلہ دیکھنے چلا گیا اس وقت میری یہی کوئی دس گیارہ برس کی عمر ہوگی........."

اس کی آنکھیں جیسے بچپن کے خوابوں میں بھٹکنے لگیں اور اس کی آواز گویا کہیں دور سے آنے لگی۔ "میلے میں ایک تھیٹر کمپنی بھی آئی ہوئی تھی۔ وہ ماضی کے کسی مشہور اداکار کی تھیٹر کمپنی تھی جو بہت بوڑھا ہوچکا تھا اور غالباً" بدحالی سے بچنے کے لئے اس نے یہ راستہ ڈھونڈا تھا۔ گشتی تھیٹر کمپنی بنا کر شہر شہر گاؤں گاؤں میلوں ٹھیلوں میں لے جانے لگا تھا۔ وہ لوگ ایک بہت بڑے ٹینٹ میں کوئی ورائٹی پروگرام قسم کی چیز پیش کرتے تھے۔ ٹینٹ کے

باہر اونچے تختے پر مسخرے اور ہیجڑے وغیرہ ناچتے تھے۔ ساتھ ساتھ لاؤڈ اسپیکر پر اعلان
ہوتے رہتے تھے اور ٹکٹیں بھی فروخت ہوتی رہتی تھیں..........“
اختر نے ایک لمحے توقف کیا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ”اسی تختے پر ذرا بھر
بھرے سے جسم کی ایک نوخیز سانولی سی لڑکی بھی سنجیدگی سے بیٹھی رہتی تھی۔ اس کی
سولہ سترہ برس ہوگی۔ کبھی کبھی جب ہیجڑے اور مسخرے اچھلتے کودتے تھک جاتے تو اس ل
کو ناچنے پر لگا دیا جاتا اور تھیٹر پر ہجوم بڑھنے لگتا۔ غضب کا ناچتی تھی وہ لیکن مجھے وہ نا
ہوئی نہیں بلکہ اس وقت زیادہ اچھی لگتی تھی جب وہ ہاتھوں کے حلقے میں چہرہ ٹکائے نہا
سنجیدگی سے بیٹھی ہوئی تھی۔۔۔“
وہ گویا ماضی کا کوئی بھولا بسرا دھندلا دھندلا سا منظر چشم تصور سے دیکھتے ہوئے کھو
کھوئے سے انداز میں مسکرایا۔ ”اس کی ناک چینی لڑکیوں کی طرح بیٹھی ہوئی تھی اور ج
وہ مسکراتی تھی تو اس کی ناک پر شکنیں سی پڑ جاتی تھیں۔ اس عالم میں تو وہ مجھے بہت
پیاری لگتی تھی میں کم عمر تھا اپنے جذبے کو کوئی نام نہیں دے سکتا تھا لیکن اب میرا خ
ہے کہ وہ میرے معصوم لڑکپن کی اولین محبت تھی۔ اس کی صورت میری آنکھوں میں ا
وقت بھی پھرتی رہتی تھی جب وہ میرے سامنے نہیں ہوتی تھی میں اسے دیکھنے روز جاتا
اور جب ہجوم زیادہ ہوتا تھا تو اسے قریب سے دیکھنے کے لئے نہ جانے کیا کیا جتن کرتا۔ ا
بار تو اس کوشش میں میری قمیض بھی پھٹ گئی..........“
اس نے بے اختیار اپنی قمیض کی طرف دیکھا جیسے وہ آج بھی وہی چاک گریباں
بیٹھا ہو اس کی مسکراہٹ کچھ گہری ہوگئی اور وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”حیرت تو
ہے کہ اس کم عمری میں بھی وہ مجھے سپنوں میں دکھائی دیتی تھی۔ اگلے سال میلہ لگا تو میں
آ چکا تھا اور ہوسٹل میں تھا مگر میلے کی خبر سن کر گاؤں دوڑا دوڑا گیا۔ وہاں کوئی اور تھیٹر
آئی ہوئی تھی۔ اس میں دوسری لڑکیاں تھیں میں مایوس ہو کر واپس آ گیا۔ آپ کو ش
یقین نہ آئے اس رات پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا۔ میرے لئے وہ ہجر کی پہلی شب تھی ج
کے بعد وصل کی کوئی امید نہ رہی تھی..........“
اس نے سر اٹھا کر نورین کی طرف دیکھا اور خود استہزائی کے سے انداز میں دھیر
سے ہنس دیا۔ ”میں بتانا یہ چاہ رہا تھا کہ اس لڑکی میں آپ کی بڑی مشابہت تھی وہ آپ
لڑکپن نظر آتی تھی۔ مرجھایا ہوا سا لڑکپن.......... گو کہ وہ اس کی چڑھتی عمر تھی مگر ا
میں وہ تازگی اور شگفتگی نہیں تھی جو آپ کی شخصیت کا سب سے اہم حصہ ہے“۔
اس بات پر اختر کو حقیقتاً حیرت تھی کہ نورین اپنے عروج کا دور تقریباً گزار چکنے
بعد بھی شگفتہ اور تازہ دم نظر آتی تھی وہ کئی سال فلمی دنیا کے اعصاب شکن ماحول میں گز
چکی تھی اور کچھ زیادہ کم عمری میں فلم انڈسٹری میں نہیں آئی تھی۔ دو شادیاں کر کے طلاق

لے چکی تھی اور اب بھی بے پناہ مصروف زندگی گزار رہی تھی مگر حقیقی زندگی میں وہ
مرین سے زیادہ شگفتہ دکھائی دیتی تھی۔
نورین بالکل خاموش تھی اور ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اختر بات جاری
رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے جب پہلی مرتبہ آپ کی ایک فلم دیکھی تو لڑکپن کا وہ بھولا بسرا
اور دھندلا دھندلا سا خواب ذہن میں تازہ ہوگیا اس کے بعد میں آپ کی ہر فلم دیکھنے لگا بس
اتنی سی بات ہے..........“
وہ دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے قدرے شرمیلے سے انداز میں مسکرایا اور پھر یہ دیکھ کر
اس کی مسکراہٹ معدوم ہوگئی کہ نورین پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
میک اپ کی گہری تہوں کے باوجود محسوس کیا جاسکتا تھا کہ اس کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔
چند لمحے بعد وہ جیسے تنویمی سی کیفیت سے چونکی اور پھیکی سی مسکراہٹ اس کے
زاشیدہ سے ہونٹوں پر رینگ آئی وہ مدھم آواز میں بولی۔ ”اختر صاحب! آپ چونکہ صحافی
نہیں ہیں.......... اور مجھے امید ہے آپ پیٹ کے بھی ہلکے نہیں ہوں گے اس لئے میں
آپ کو بتا دوں کہ میں وہی لڑکی ہوں لیکن پلیز.......... یہ بات کسی کو معلوم نہ ہونے پائے
میں کسی نہ کسی طرح اب تک اس راز کو راز ہی رکھنے میں کامیاب رہی ہوں“۔
”نہیں.......... نہیں.......... ایسا نہیں ہوسکتا“۔ اختر ہڑبڑا کر بے یقینی سے بولا۔
”کیوں نہیں ہوسکتا؟“ نورین حیرت سے بولی۔ ”اس میں انہونی بات کیا ہے؟“
”میرا مطلب ہے.......... کہاں وہ لڑکی.......... کہاں آپ۔۔۔!“ اختر کی سمجھ
میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔
نورین ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”یہ زمانے کے انقلابات ہیں اختر صاحب! آپ نے
مجھے سولہ سترہ سال کی عمر میں دیکھا تھا تو پھر میری پہلی فلم دیکھ کر بھی پہچان لینا چاہیے تھا“۔
”مجھے احساس تو ہوا تھا کہ کچھ کچھ وہی جانی پہچانی سی شکل ہے“۔ اختر بولا۔ ”لیکن
بہرحال تھیٹر کے تختے پر ناچنے والی اور اسکرین پر نظر آنے والی اس لڑکی میں فرق بہت نمایاں
تھا میں نے سوچا شکلوں میں تھوڑی بہت شباہت تو دیکھنے میں آتی ہے کوئی ایسا ہی اتفاق
ہوگا“۔
”حالانکہ جب آپ وہ ساری باتیں کر رہے تھے تو میں یہی سمجھی تھی کہ آپ مجھے وہ
سب کچھ یاد دلانے کی کوشش کر رہے ہیں اور آپ نے مجھے پہچان لیا ہے“۔ نورین بولی۔
”کہیں اسی لئے تو آپ نے اتنی جلدی اقرار نہیں کرلیا؟“ اختر مسکرایا۔
”نہیں ایسی بات نہیں ہے اداکارائیں تو جھوٹ بولنے پر آئیں تو ان سے کوئی سچ اگلوا
ہی نہیں سکتا۔ اس قسم کی باتوں کو چھپانے کے لئے تو وہ زندگی بھر نہایت ڈھٹائی سے جھوٹ
بولتی رہتی ہیں میں بھی بول سکتی تھی۔ میرے بارے میں تو یہ بات کسی کو معلوم ہی نہیں

ہے۔ آج تک کبھی پریس میں بھی اس سلسلے میں کوئی اشارہ تک نہیں آیا میں بھی چاہ آپ کے منہ پر بھی جھوٹ بول سکتی تھی لیکن میں آپ سے پہلی ہی ملاقات میں سچ رہی ہوں.......... اور آپ چاہیں تو میں اس کی وجہ بھی سچ سچ بتا سکتی ہوں"۔

"ضرور.......... ضرور.........." اختر اشتیاق سے بولا۔

"اختر صاحب..........!" اس نے ایک اور ٹھنڈی سانس لی۔ اس کی آنکھیں میں نہ جانے کیا تلاش کرنے لگیں۔ وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔ "میں ابھی بڑھا کی حدود میں داخل تو نہیں ہوئی لیکن کچھ ایسی نوجوان بھی نہیں.......... اور پھر فلم عورتیں تو بہت کم وقت میں ہی دنیا کا ہر رنگ ڈھنگ دیکھ لیتی ہیں مجھے بھی کبھی کبھی لگتا ہے جیسے میں نے دنیا میں سب کچھ دیکھ لیا ہے اب کچھ دیکھنے کی حسرت نہیں رہی کے باوجود جب آپ نے لڑکپن.......... بلکہ بچپن کی اس معصوم محبت کی بات کی میرے دل کو جیسے کچھ ہونے لگا.........." نورین نے اپنے پہلو پر ہاتھ رکھ لیا اور ایک کے لئے خاموش ہوگئی جیسے واقعی اس کے دل کو کچھ ہونے لگا ہو اس کے چہرے پر ا عجیب سا رنگ آ کر گزر گیا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ کچھ اور دھیمے لہجے میں بولی۔ "آپ کی باتیں مجھے اور ہی دنیا میں لے گئیں۔ وہ زمانہ میری نظر میں گھوم گیا میں اب اس دور کی یادوں بہت نظر چراتی ہوں لیکن ظاہر ہے میں اس زمانے کو بھول نہیں سکتی۔ آپ نے بات چھ تو جیسے سب کچھ میری نظر میں تاز ہوگیا لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس وقت د بارہ برس کا کوئی معصوم بچہ.......... جو کبھی مجھ سے نہیں ملا.......... جس نے کبھی سے بات نہیں کی.......... جو کبھی میرے قریب نہیں آیا وہ اپنے دل میں میرے معصوم اور بے غرض محبت چھپائے پھرتا ہوگا۔۔۔"

اس کے چہرے پر ہلکا سا کرب نمودار ہوا وہ اختر کی طرف دیکھے بغیر بات جاری ر ہوئے بولی۔ "اس وقت میں تو یہی محسوس کرتی تھی کہ میں درندوں میں گھرا ہوا کوئی کمز سا شکار ہوں۔ میرے گرد بھوکی آنکھوں کا ہجوم ہوتا تھا میں بلندی سے ان عجیب و غریب چہروں کو دیکھتی تھی اور اندر ہی اندر نہ جانے کیوں کانپتی رہتی تھی حالانکہ میرے لئے تماشے نئے نہیں تھے۔ بس مجھے یوں لگتا تھا کہ اگر میں اس تختے سے نیچے گر پڑی تو درند مجھے چیر پھاڑ کر کھا جائیں گے میں گویا کسی غیر مرئی پنجرے میں بند تھی جس کی وجہ سے رہتی تھی.......... اور وہ غیر مرئی پنجرا قانون کا خوف تھا اس زمانے میں لوگوں کے دلوں میں قانون کا تھوڑا بہت خوف ہوا کرتا تھا.........."

پھر اسے گویا کچھ یاد آیا۔ جھرجھری سی لے کر بولی۔ "اس کے باوجود تمہارے علا کے دو تین بدمعاشوں نے ایک بار مجھے اٹھا کر لے جانے کی کوشش کی تھی"۔

"اچھا..........؟" اختر چونکا۔ "کیا خدانخواستہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوگئے تھے؟"

"اگر وہ کامیاب ہوگئے ہوتے تو شاید آج میں تمہارے سامنے نہ بیٹھی ہوتی شاید میری زندگی میں کوئی اور موڑ آجاتا جو مجھے کسی اور سمت لے جاتا میں ایکٹریس نہ بنتی' کچھ اور بن جاتی"۔ نورین بولی۔ "شاید تمہیں معلوم ہو ہمارے تھیٹر کے مالک اسماعیل صاحب.......... جن کا کئی سال پہلے انتقال ہوچکا ہے خود بھی ماضی کے ایک خاصے جانے پہچانے اداکار تھے ان دنوں فلم انڈسٹری چھوڑ چکے تھے.......... یا یوں کہو کہ فلم انڈسٹری نے انہیں چھوڑ دیا تھا۔ وہ بوڑھے ہونے کے باوجود بڑے دلیر آدمی تھے ایک تو مجھے بچانے کے لئے وہ پستول لے کر باہر آ گئے تھے اور انہوں نے فائرنگ شروع کر دی تھی دوسرے قریب ہی پولیس موجود تھی وہ ہماری مدد کو پہنچ گئی تھی یوں میں اغواء ہونے سے بچ گئی تھی"۔

پھر نورین گویا حقیقت کی دنیا میں واپس آتے ہوئے اختر کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "کیا اچھا زمانہ تھا..........! بدمعاش محض پستول سے بھی ڈر جایا کرتے تھے.......... اور پولیس بھی بوقت ضرورت ہم جیسے غیر معزز لوگوں کی مدد کو بھی پہنچ جایا کرتی تھی"۔

"آپ کب تک اس تھیٹر کے ساتھ رہیں؟" اختر نے پوچھا۔

"میں تیرہ سال کی عمر سے لے کر اٹھارہ سال کی عمر تک اس تھیٹر کے ساتھ رہی میں نے گاؤں گاؤں قصبے قصبے مداری کی بندریا کی طرح ناچ دکھایا.........." نورین بلا تامل بتانے لگی۔ "اٹھارہ برس کی عمر سے دھیرے دھیرے شہرت اور دولت کی دیوی نے مجھے اپنے سائے میں لینا شروع کیا ورنہ اس سے پہلے میں نے بڑی ٹھوکریں کھائیں نہ جانے کیوں؟ حالانکہ میں لڑکی تھی زیادہ خوبصورت نہیں تھی تو کچھ ایسی بدشکل بھی نہیں تھی سب سے بڑی بات یہ کہ جوان ہونے کے بعد سے میں چھوٹے چھوٹے مفادات کے لئے بھی بکنے کو تیار رہتی تھی۔ ایک گھاگ اور گرگ باراں دید قسم کی عورت میری نگران اور سرپرست بھی تھی اس کے باوجود شہرت اور دولت کی دیوی مجھ پر مہربان نہیں ہوئی تھی میں کچھ بھی حاصل نہ کرسکی تھی گنواتی ہی رہی لیکن جب میں نے نوجوانی میں ہی مایوس ہو کر جدوجہد ترک کر دی تو سب کچھ دھیرے دھیرے میری جھولی میں آنے لگا۔ تیس برس کی عمر میں آ کر میں سپر اسٹار بن گئی لیکن میرا عروج کا زمانہ زیادہ طویل نہیں رہا جونہی مجھے زوال کے آثار نظر آنا شروع ہوئے میں نے فیصلہ کرلیا کہ گھسٹ گھسٹ کر فلم انڈسٹری میں وقت نہیں گزاروں گی۔ زبردستی ہیروئن بنی رہنے کی کوشش نہیں کروں گی۔ انڈسٹری میں اور بھی شعبے ہیں چنانچہ میں پروڈیوسر اور ڈائریکٹر بن گئی"۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ متجسس سے لہجے میں بولی۔ "اختر صاحب! کیا واقعی تھیٹر کے دروازے پر ناچنے والی وہ لڑکی آپ کو بہت اچھی لگتی تھی؟"

"وہ اب بھی میرے دل کے کسی گوشے میں رہتی ہے ایک میٹھی کسک کی طرح"۔ اختر نے جواب دیا۔

نورین نے ایک گہری سانس لے کر صوفے کے پشتے سے ٹیک لگا لی اور آنکھیں بند کرلیں۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔ "اختر صاحب! اب.......... جبکہ زندگی میں سب کچھ دیکھ لیا ہے.......... تو اس معصوم دور کی یہ معصوم سی باتیں سننا بہت بھلا لگتا ہے۔ آپ کی بات سننے کے بعد ان دنوں کا تصور کچھ خوبصورت محسوس ہونے لگا ہے ورنہ میں نے ہمیشہ اسے بھول جانے کی کوشش کی ہے۔ بچپن اور لڑکپن میں دل چاہتا ہے جلدی سے بڑے ہو جائیں دنیا میں جو کچھ بھی دیکھنے کا ہے اسے جلدی جلدی دیکھ لیں۔ ہمارے نصیب کی جو بھی خوشیاں اور کامیابیاں ہیں انہیں جلدی سے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیں لیکن جب یہ سب کچھ ہو جاتا ہے.......... ہم بڑے.......... بلکہ بہت بڑے ہو جاتے ہیں.......... دنیا میں سب کچھ دیکھ لیتے ہیں.......... اپنے نصیب کی خوشیاں اور کامیابیاں حاصل کرلیتے ہیں.......... تو پھر بڑی شدت سے دل چاہتا ہے کہ نوعمری کا وہ دور لوٹ آئے.......... وہ کچی عمر پھر سے واپس مل جائے جو انسان کسی حال میں خوش نہیں اسے کسی حال میں قرار نہیں"۔

نورین نے جھرجھری سی لی پھر یک لخت گویا گھبرا کر موضوع بدلتے ہوئے ذرا بلند آواز میں بولی۔ "میرا خیال ہے ہم اب اس کام کی بات بھی کرلیں جس کے لئے میں نے آپ کو بلوایا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ باقی سب باتیں ہو جائیں صرف کام کی بات رہ جائے"۔

اس نے ٹیلی فون اٹھا کر آپریٹر کے ذریعے کوئی نمبر ملوایا پھر فون پر نہایت ٹھہرے ٹھہرے اور قدرے تحکمانہ سے لہجے میں کہا۔ "اقبال صاحب سے کہو ایک کنٹریکٹ فارم لے کر آجائیں اور اختر صاحب سے سائن کروالیں"۔

اختر خاموش بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا اسے اب بھی اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہو رہی تھی کہ وہ کس کام سے وہاں آیا تھا۔ اس کے ذہن میں تو نورین کی آواز کی بازگشت گونج رہی تھی۔ آج تک دو تین ہی قابل ذکر فلمی اداکاراؤں سے اختر کی ملاقات ہوئی تھی اور ان میں سے کسی کو بھی اختر نے نورین کی طرح شائستگی' ملائمت اور دھیمے پن سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ کسی کا لہجہ بھی اختر کو ویسا دل نشیں محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک بھولا بسرا خواب زندگی کے کسی موڑ پر یکدم ہی حقیقت کا روپ دھار کر اس کے سامنے آجائے گا۔

☆ ============ ☆ ============ ☆

اختر ویسے تو نورین کی فلم کے لئے صرف دو گانے گانے آیا تھا جو زیادہ سے زیادہ ایک ن کا کام تھا مگر ہوا یہ کہ نورین نے اسے روز بلانا شروع کر دیا۔ کبھی نورین اگلی فلم کے وں کے بارے میں اس سے تبادلہ خیال کرنے لگتی اور کبھی سچوئیشنز اور لوکیشنز کے بارے مشورے طلب کرنے لگتی اس کے ساتھ ساتھ وہ اسے فلموں میں اداکاری کے لئے بھی ل کرنے لگی تھی مگر وہ آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔

اس موضوع پر بات شروع ہوئی تو اختر نے کہا۔ "بات یہ ہے نورین احبہ.........!"

نورین فوراً" اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ "اختر! خدا کے لئے اب تو یہ صاحبہ والا چھلا ہٹا دو۔ ہمیں ملتے جلتے ہوئے کافی دن گزر گئے ہیں۔ ہمارے درمیان ایک خاص تعلق اطر دریافت ہوچکا ہے۔ کیا اب صرف نورین کہنے سے کام نہیں چلتا؟"

"بہت بہتر نورین!" اختر بے چارگی سے بولا۔ "میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں سچا اور کھرا دی ہوں۔ اداکاری میرے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ ٹی وی پر گانوں کے دوران جو تھوڑی ت اداکاری کرلیتا ہوں وہی کافی ہے اس سے زیادہ دیر اداکاری میں نہیں کرسکتا"۔

"کیا مطلب.........؟" نورین مصنوعی خفگی سے بولی۔ "تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ جو دنیا میں اتنے بہت سے اداکار بھرے پڑے ہیں وہ سچے اور کھرے لوگ نہیں ہیں؟ ایک تم ں دنیا میں سچے اور کھرے رہ گئے ہو؟ جو لوگ اداکاری نہیں کرتے وہ سب کے سب سچے ور کھرے ہیں؟"

"نہیں.......... نہیں میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا"۔ اختر جلدی سے بولا۔ "میں تو یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ انسان خواہ کیسا بھی ہو اداکار بننے کے لئے اسے اپنی ذات' اپنی فطرت کی فی کرنا پڑتی ہے۔ جب وہ کیمرے کے سامنے جاتا ہے تو اسے بھولنا پڑتا ہے کہ وہ خود کیا ہے۔ اسے اپنے کردار میں ڈوب جانا پڑتا ہے۔ مثلاً" وہ خود کتنا بھی شریف آدمی سہی لیکن اگر اسے ولن کا رول دے دیا جائے تو اسے کیمرے کے سامنے جا کر بھلا دینا پڑتا ہے کہ وہ ایک شریف آدمی ہے۔ تبھی وہ اچھے طریقے سے اپنا کردار ادا کرسکتا ہے اگر کیمرے کے سامنے بھی اس کی شرافت ہی اس پر حاوی رہی تو وہ اچھا ولن ثابت نہیں ہوسکتا۔ آپ خود ایک اداکارہ اور ہدایتکارہ ہیں آپ ہی بتائیں کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں یہاں تک تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو"۔ نورین نے تسلیم کیا۔

"لیکن میں یہ کام نہیں کرسکتا۔ میں اپنے آپ کو اپنی شخصیت سے الگ کرکے زیادہ دیر کے لئے ایک طرف نہیں رکھ سکتا"۔ اختر بولا۔

"میں کب تم سے ایسا کرنے کے لئے کہہ رہی ہوں بے وقوف کہیں کے!" نورین محبت آمیز سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں کب تمہیں طرح طرح کے رول کرنے

کے لئے کہہ رہی ہوں۔ میں تو تمہیں ہیرو کے طور پر فلمی دنیا میں قدم رکھنے کے لئے
رہی ہوں۔ ہیرو کا رول ہر فلم میں بظاہر کتنا ہی مختلف ہو درحقیقت بنیادی طور پر وہ ایک
قسم کا ہوتا ہے۔ اسے بس اپنی وجاہت کو کیش کرنا ہوتا ہے اور وجیہہ تم ہو اس کے علاوہ
ہیرو کو بس وہی کچھ کرنا ہوتا ہے جو ہر شخص اپنی زندگی میں کرتا ہے کبھی پیار جتانا......
کبھی خوش ہونا......... کبھی خفا ہونا......... کبھی کسی پر گرجنا برسنا......... کبھی
رونا......... کبھی ہنستا اور کیا کرتا ہے ہیرو؟"

اختر خاموش رہا تو نورین مزید بولی۔ "اور اگر تمہیں کوئی دقت پیش بھی آئی تو وہ
خود دیکھ لیں گے۔ آخر ہدایت کار کس لئے ہوتا ہے؟ تمہیں کیا معلوم کہ آج کے یہ بڑے
بڑے ہیرو جب نئے نئے فلموں میں آئے تھے تو انہیں اور ان کے ہدایت کاروں کو کیا
مشکلات پیش آئی تھیں۔ اگر انسان بنیادی طور پر اداکار نہیں ہوتا تب بھی انڈسٹری میں آ
کے بعد سیکھ لیتا ہے"۔

"یہ سب کچھ میں بھی سوچتا ہوں اس کے باوجود میری ہمت نہیں پڑتی۔ میں ایک
ناکام ہیرو قرار پاکر خوار ہو کر انڈسٹری سے نکلنا نہیں چاہتا"۔ اختر بولا۔

"ہاں......... یہ اصل بات ہے"۔ نورین کرسی کے ہتھے پر ہاتھ مار کر بولی۔
تمہارے لاشعور میں اصل میں ناکامی کا خوف بیٹھا ہوا ہے جو تمہیں پہلا قدم اٹھانے سے
رکھتا ہے لیکن میں تم سے اداکاری کرا کے چھوڑوں گی۔ میں نے چھوٹے موٹے کردار
کے لئے تو ہمیشہ نئے چہرے متعارف کرانے کا رسک لیا ہے۔ اب میں انڈسٹری کو ایک نیا
دینا چاہتی ہوں اور میں تم پر رسک لے لوں گی۔ خواہ مجھے تمہاری شخصیت کو سامنے رکھ
خاص طور پر ہی کہانی کیوں نہ لکھوانی پڑے۔ تم دیکھنا کہ تمہاری پہلی فلم ریلیز ہوتے
لوگ تمہارے پیچھے ہوں گے"۔

"جوتے ہاتھوں میں لئے؟" اختر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں محبتوں کے پھول لئے"۔ نورین نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اب تو مجھے واقعی اندیشہ ہو چلا ہے کہ آپ مجھ اداکار بنا کر ہی چھوڑیں گی"۔ اختر
بولا۔

"بھئی واقعی اس دنیا کا عجب حال ہے!" نورین ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "ایک
طرف وہ بھی لوگ ہیں جو دو دو لائنوں کا رول لینے کے لئے مارے مارے پھرتے ہیں
جانے کس کس کی منت خوشامد کرتے ہیں ایک آپ ہیں جنہیں ہیرو کا کردار پلیٹ میں رکھ
پیش کیا جارہا ہے مگر آپ کے نخروں کا ہی کوئی شمار نہیں"۔

"یہ نخرے نہیں ہیں......... یہ خوف ہے ڈاکٹر صاحبہ!" اختر مسکراتے ہوئے بولا
"آپ نے صحیح تشخیص کی ہے یہ ناکامی کا خوف ہے۔ آپ کی یہ بات میرے دل کو لگ

"میں تمہارا یہ خوف ایک سین کی شوٹنگ میں ہی نکال دوں گی"۔ نورین وثوق سے
"جس طرح کچھ عرصہ پہلے تک لوگوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ تمہارے اندر اتنا بڑا
چھپا بیٹھا ہے اسی طرح ابھی لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ تمہارے اندر ایک بہت بڑا
بھی چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے اسے دیکھ لیا ہے۔ اب صرف اسے خوف کی اندھیری
ڑی سے باہر لانا ہے"۔

صرف یہی نہیں' نورین نے تو اسے اگلی فلموں کے لئے زیر غور آئیڈیے بھی سنانے
ع کر دیئے تھے اور ان کے بارے میں تبادلہ خیال کرنے لگی تھی حالانکہ فلم کا آئیڈیا
راز رکھا جاتا تھا اور شروع میں صرف خاص الخاص افراد سے ہی اس پر تبادلہ خیال کیا
تھا۔ اختر کو اب ہر لحاظ سے نورین فلمز کے خاص آدمی کا ہی درجہ دیا جانے لگا تھا۔

فلم کے آئیڈیا یا کہانی کے بارے میں اختر کوئی خاص مشورہ نہیں دے سکتا تھا کیونکہ
لکھانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا دوسرے اسے کہانی کی فلمی قدر و قیمت کا اندازہ
کا بھی کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن نورین ہر معاملے میں اس کی رائے لینے کی کوشش ضرور
تھی۔

ادھر نورین کا یہ اصرار بھی جاری تھا کہ اختر کو شوٹنگ کے اختتام پر ان کے ساتھ
ر چلنا ہوگا۔ زیر تکمیل فلم کے لئے بھی اس نے دو کے بجائے تین گانے اختر سے گوائے
اور تینوں کا معاوضہ اختر کو تمام بڑے گلوکاروں کے برابر ادا کیا گیا تھا۔

نورین کا کہنا تھا کہ اختر نے اس فلم کے لئے جو پہلا گانا گایا تھا اسے راتوں کو ڈیک پر
ن کر وہ روتی تھی نہ جانے کیوں؟ حالانکہ خود اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ فلمی لوگوں کو
لوں پر شاذ و نادر ہی رونا آتا تھا۔ گانے تیار کرانا تو ان کے دن رات کے کام کا ایک
تھا اور وہ اپنے ہر کام کے مصنوعی پن سے اچھی طرح آگاہ تھے۔

ایک روز باتوں باتوں میں اختر نے یونہی سرسری سے انداز میں ذکر کر دیا کہ اگلا دن
کی سالگرہ کا دن ہوگا مگر سالگرہ بچپن سے لے کر اب تک اس نے کبھی نہیں منائی تھی
نے اس سلسلے میں کبھی سوچا ہی نہیں تھا اور اس کا باپ تو ویسے ہی ان رسوم کے خلاف

دوسرے روز وہ حسب پروگرام نورین کے سوئٹ میں پہنچا تو نورین نے سرخ کاغذ
لپٹا ہوا ایک چھوٹا سا لمبوترا پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا اس پر "ہیپی برتھ ڈے" کا
لگا ہوا تھا۔

اختر کو زندگی میں پہلی بار کسی نے سالگرہ کا تحفہ دیا تھا۔ پیکٹ سے دھیمی دھیمی خوشبو
ہی تھی وہ یہی سمجھا کہ کوئی کلون وغیرہ ہوگا وہ وہیں پیکٹ کھولنے لگا تو نورین نے

اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے روک دیا۔ "یہ نہیں ہوگا بھئی"۔ وہ بولی۔ "یہ آداب
کے خلاف ہے سالگرہ کا تحفہ اس کے سامنے نہیں کھولا کرتے جس نے تحفہ دیا ہو ممکن ہے
تحفہ تمہاری نظر میں حقیر ہو اور تمہارے تاثرات دیکھ کر تحفہ دینے والا کا دل دکھ جائے"۔

"مجھ سے گھر واپس جانے تک یہ تجسس برداشت نہیں ہوگا میں ہر حال میں اس
پیکٹ کو یہیں کھولوں گا"۔ اختر بولا۔ "میرے تاثرات کی تم پروا نہ کرو اگر یہ پیکٹ خالی ہوا
تب بھی مجھے مایوسی نہیں ہوگی۔ میرے لئے تو یہی بہت ہے کہ کسی نے میری سالگرہ کو یاد تو
رکھا"۔

اس نے پیکٹ کھول ڈالا نورین اسے روکتی ہی رہ گئی۔ ان دنوں نوجوانوں
میں.......... خصوصاً" اونچے طبقے کے نوجوانوں میں اصلی یا نقلی سونے کے لاکٹ پہننے کا
بہت رواج نظر آ رہا تھا۔ اختر نے سرخ کاغذ ہٹایا تو ایک مخملیں ڈبا برآمد ہوا۔ اختر کے
اندازے کے مطابق اس کی قیمت دس بارہ ہزار رہی ہوگی۔ اس میں سونے کا بڑا سا حرف "
اے" جھول رہا تھا۔

"تم نے اتنا تکلف کیوں کیا نورین؟" وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔

"تم میرے خلوص کو تکلف کہہ کر اس کی توہین مت کرو"۔ نورین بولی۔

"خلوص کے اظہار کے لئے سونے چاندی کا سہارا لینا تو ضروری نہیں ہوتا"۔ اختر
بولا۔

"میں تو سونے چاندی سے بڑھ کر کسی چیز کا سہارا لینا چاہتی تھی لیکن جلدی میں کچھ
مل سکا"۔ نورین سرجھکا کر مدھم لہجے میں بولی۔

اختر کے لئے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ دونوں کے دلوں میں کون سی چنگاری تاؤ پکڑ
رہی تھی کون سے جذبے پروان چڑھ رہے تھے اور کوئی انجانا ہاتھ خیالوں کے ویران صنم
خانوں میں کون سی مورتیاں سجانے لگا تھا۔ نورین کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر کیوں ستارے
جھلملا اٹھتے تھے اور وہ خود اس سے ملنے آنے کے لئے خاص طور پر اہتمام سا کیوں کرتا تھا؟
ان سب سوالوں کا جواب پا کر اس کے دل میں گدگدی سی ہونے لگتی تھی مگر پھر رستے
دیئے ہوئے زخم میں ٹیس سی جاگ اٹھتی تھی۔ ابھی تو وہ زخم صحیح طور پر بھرا ہی نہیں تھا کہ
دل کے دروازے پر اس نئی ہستی نے دستک دینا شروع کر دی تھی کیا وہ واقعی اس سے محبت
کرنے لگی تھی؟ کہیں کوئی نیا زخم تو اس کا منتظر نہیں تھا؟

اس آخری سوال پر اختر کا دل ڈوبنے لگتا تھا لیکن اس احساس کی اپنی ایک کشش
ہوتی ہے کہ کوئی آپ سے محبت کرتا ہے انسان خود بہ خود ہی کھنچا چلا جاتا ہے۔ وہ بھی کھنچا
چلا جا رہا تھا۔

لیکن دل میں برپا تلاطم پر قابو پاتے ہوئے اس نے کہا۔ "پھر بھی تمہیں اتنا مہنگا تحفہ

لینے کی کیا ضرورت تھی؟ کوئی چھوٹا موٹا تحفہ بھی کافی ہوتا۔ ویسے بھی میں کون سا سالگرہ منا
رہا ہوں"۔

"یہ نورین کی طرف سے نہیں ہے"۔ وہ مدھم سی آواز میں بولی اور اختر کو اس کی
آنکھوں میں نمی کی جھلک سی محسوس ہوئی۔

"تو پھر یہ کس کی طرف سے ہے؟" وہ ذرا حیران ہو کر بولا۔

"یہ اس غریب اور نادار لڑکی کی طرف سے ہے جو پندرہ سولہ برس کی عمر میں تھیٹر
کے تختے پر ناچا کرتی تھی پھر بھی اسے دو وقت پیٹ بھر کر روٹی نہیں تھپڑ اور لاتیں نصیب
ہوا کرتی تھیں۔ وہی لڑکی جسے تم دور کھڑے دیکھا کرتے تھے مگر اسے علم نہیں تھا' اس لڑکی
نے آج اور تو سب کچھ پالیا ہے لیکن محبت کی تلاش میں اس کی روح اب تک بھٹک رہی
ہے"۔

اختر کا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپنے لگا۔ بے اختیار اس کا جی چاہا کہ نورین کو
سینے سے لگا لے اور اسے ان آنسوؤں کا غبار نکال لینے کا موقع دے جو پلکوں کی دہلیز پار
نہیں کر پا رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ خود بھی جی بھر کے روئے۔ نورین کو بتائے کہ
وہ خود بھی انسانوں کے ہجوم میں رہتے ہوئے کس قدر تنہا تھا۔

مگر ان سب باتوں کی نوبت نہیں آ سکی۔ نورین تیزی سے مڑی اور بیڈ روم میں چلی
گئی جہاں وہ پراسرار سی سانولی عمر رسیدہ عورت موجود تھی۔ بیڈ روم میں اس کے سروتا
چلانے کی کٹ کٹ سنائی دے رہی تھی۔

اس روز وہ بعد میں نورین اور دیگر لوگوں کے ساتھ شوٹنگ پر کلفٹن گیا مگر کھویا کھویا
سا رہا۔ نورین بھی ہدایتکاری کی ذمہ داریاں انجام دیتی رہی مگر اس کا ذہن جیسے بار بار کہیں
اور پہنچ جاتا تھا اس کی حرکات و سکنات سے اس کی غیر حاضر دماغی ظاہر تھی۔ زیادہ تر کام اس
کے اسسٹنٹ نے سنبھالا۔

☆ ============ ☆ ============ ☆

اندازاً" صرف چند دن کی شوٹنگ باقی رہ گئی تھی جو شیڈول سے آگے چلی گئی تھی۔
اس کے بعد یونٹ کو لاہور واپس جانا تھا۔

ایک روز اختر شوٹنگ کے بعد نورین کو اس کے کمرے تک پہنچا کر رخصت ہونے لگا
تو نورین نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے مہکتی سی سرگوشی کی۔ "کل شوٹنگ کا ناغہ ہے تم دوپہر
کے بعد دو بجے آنا جب بے جی سوئی ہوں گی۔ مجھے تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں"۔

نورین ہر وقت سائے کی طرح اپنے ساتھ رہنے والی سانولی سی عورت کو بے جی کہتی
تھی۔ اختر نے اثبات میں سر ہلایا اور واپس ہولیا۔

اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسے کافی حد تک اندازہ تھا کہ باتیں کیا ہوں گی

اور وہ فیصلہ کرچکا تھا کہ نورین کو مایوس نہیں کرے گا۔ جس کی اک نگاہ کرم کے لئے نہ جانے کتنے دل دھڑکتے تھے وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ محبت تو صرف ایک نظر کے بدلے خاک راہ کی طرح اس کے قدموں میں بچھ جانے کے لئے تیار تھی۔ یہی تو وہ کم بخت جنس گراں مایہ تھی جس کی پیاس سے اسے سب ہی دیوانے نظر آتے تھے اور اختر خود کو خوش نصیب محسوس کر رہا تھا کہ اسے یہ محبت نصیب ہو رہی تھی۔

دوسرے روز وہ ہوٹل پہنچا تو راہداری میں رک کر اس نے غیر ارادی طور پر گھڑی دیکھی وہ وقت کا بہت پابند تھا لیکن اس روز وفور اشتیاق اور اپنے جذبہ دل کے سیلاب میں بہتا ہوا وہ وقت سے بہت پہلے آگیا تھا اس نے سوچا تھا کھانا نورین کے ساتھ ہی کھائے گا لیکن اب اسے یاد آیا کہ نورین نے تو اسے دو بجے بلایا تھا۔ ویسے ان کی ملاقات کا کبھی کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا تھا لیکن اس روز یقیناً" نورین نے خاص طور پر اس لئے وقت دیا تھا کہ جب اختر آئے تو بے جی سوئی ہوئی ہوں وہ یقیناً بے جی کے علم میں لائے بغیر کچھ باتیں کرنا چاہتی تھی۔

ابھی بے جی کے سونے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ وہ الجھن میں پڑ گیا کہ دستک دے یا واپس چلا جائے اور کچھ دیر نیچے لابی میں بیٹھ کر انتظار کرلے؟ آج کی آمد کو بے جی سے مخفی رکھنا ہی بہتر تھا۔

وہ مڑنے ہی لگا تھا کہ اسے احساس ہوا اندر خاصی تیز تیز آوازوں میں باتیں ہو رہی تھیں۔ اس کے کانوں تک تو آوازیں بہت مدھم پہنچ رہی تھیں اور جب تک دروازے سے کان لگا کر نہ سنا جائے الفاظ سمجھ میں نہیں آسکتے تھے لیکن اگر ساؤنڈ پروف اور کافی حد تک کشادہ سوئٹ سے آوازیں اس حد تک بھی سنی جاسکتی تھیں تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اندر خاصی گرما گرمی سے گفتگو ہو رہی تھی۔

اس نے قطعی غیر ارادی طور پر دروازے سے کان لگا دیا۔

اختر کو نورین کی آواز سنائی دی۔ آواز گویا کہیں دور سے سنائی دے رہی تھی لیکن الفاظ آسانی سے سمجھ میں آرہے تھے۔ نورین کہہ رہی تھی........ "بے جی! تمہاری تو ساری عمر کوٹھے پر گاہکوں کو پان کھلاتے گزر گئی۔ تمہیں اندازہ نہیں ہوسکتا کہ عورت کو ہر حال میں ایک اچھے شوہر کی ضرورت ہوتی ہے۔ عورت خواہ کسی مقام پر پہنچ جائے حالات خواہ اسے کچھ بھی بنا دیں........ وہ انتہائی بلندی پر پہنچ چکی ہو خواہ انتہائی پستی میں پڑی ہو اور خواہ کتنے ہی مرد اس کی زندگی میں آتے اور جاتے رہیں لیکن شوہر کی طلب اس کی مٹی میں رچی ہے اس کی زندگی میں جو مقام شوہر کا ہوتا ہے وہ کسی بھی اور مرد کا نہیں ہوسکتا اور جو خوشی اسے شادی کرکے، گھر بسا کے ملتی ہے وہ اسے کسی طرح بھی نہیں مل سکتی........"

بے جی نے شاید کچھ کہنا چاہا تھا لیکن نورین ان کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ "بڑی مشکل سے تو میں

بھولے بھالے سیدھے سادھے نوجوان کو پھانس سکی ہوں اب تم اسے بھگا دوگی........"

"بھئی نورین بیگم........ ہم نے تم جیسے ناتراشیدہ ہیرے کو تراش خراش........ پالش کرکے کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا لیکن تم وہی دقیانوسی رہیں........ جو بات میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں وہ تمہاری سمجھ آہی نہیں رہی"۔

"میں تو تمہاری سب باتیں خوب سمجھتی ہوں بے جی! وہ باتیں بھی جو تم منہ سے کہتی........ وہ بھی جو تم منہ سے نہیں کہتی........ وہ بھی جو تم آنکھوں سے کہتی........ اور وہ بھی جو تمہارے دل میں ہوتی ہیں........ لیکن میں تمہیں جو سمجھانے کوشش کر رہی ہوں وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ بے جی! ہر عورت تمہاری طرح حس اور بنجر نہیں ہوتی۔ تمہارے دل میں شاید کبھی جوانی میں بھی محبت کی طلب یا گھر بسانے کی آرزو نہیں ابھری........ تم نے روپے پیسے کے علاوہ زندگی میں کسی چیز سے نہیں کیا........ لیکن صرف روپے کے سہارے ساری زندگی نہیں کٹتی بے جی! اتنا ہم قبر میں ساتھ نہیں لے جائیں گے"۔

"مجھے تمہاری شادی........ بیاہ یا گھر بسانے پر اعتراض نہیں ہے نورین بیگم! بے کی آواز میں ذرا کرختگی آگئی........ "میں تو صرف اتنا کہہ رہی ہوں کہ تمہیں کسی کو انسے کا تردد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جبکہ ایک سے ایک بڑھ کر باحیثیت آدمی خود مارے ایک اشارے پر قدموں میں ڈھیر ہونے کو تیار ہے۔ پھانسنا ہی ہے تو کسی جاگیردار کو انسو' اس کنگلے سنگر کی بیوی بن کر تمہیں کیا ملے گا؟ فائدہ تمہیں نہیں اسی کو ہوگا؟"

"اسی لئے تو وہ جھک کر ساری عمر میرے ساتھ گزارے گا"۔ نورین بولی........ "مارے مشورے میرے لئے کوئی نئے نہیں ہیں ان پر عمل کرکے دیکھ چکی ہوں کیا تم بھول ئی ہو کہ میرا پہلا شوہر ایک بڑا صنعتکار تھا اور دوسرا ایک جاگیردار........ دونوں شادیاں کرکے میں نے کیا پھل پایا؟ جس کے پاس جتنی زیادہ دولت ہوتی ہے وہ اتنا ہی چالاک ہوتا ہے جس کے پاس ہم سے زیادہ دولت ہوگی وہ ہم سے زیادہ چالاک ہوگا........ لہٰذا ہم سے نہیں وہ ہمیں پھانس رہا ہوتا ہے۔ جب وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا شوق پورا ہوگیا ہے تو ہماری تمامتر چالاکی کے باوجود وہ ہمیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکتا ہے........"

نورین کی آواز میں تیزی و تندی آتی جا رہی تھی۔ بے جی خاموش تھیں ایک لمحے کی خاموشی کے بعد نورین بولی۔ "دولتمند آدمی زیادہ جان پھنستی دیکھتا ہے تو ایک آدھ فیکٹری یا دو چار مربع زمین دے کر جان چھڑا لیتا ہے........ نتیجہ بہرحال وہی علیحدگی ہے........ اور مجھے اب علیحدگی نہیں کسی کا ساتھ چاہیے........ ساتھ........"

"تو کیا تمہارے خیال میں سال دو سال کی برائے نام سی رفاقت کے نتیجے میں ایک

آدھ کوٹھی.......... ایک آدھ فیکٹری.......... لاکھوں نقد.......... تحفے تحائف یا
مربع زمین مل جانا اچھا سودا نہیں ہے؟" بے جی نے گویا حیرت سے پوچھا۔
"بے جی! میں تمہیں یہی تو سمجھا رہی ہوں کہ اب میں سودے بازیوں سے تھک
ہوں.......... میں کب تک اس دنیا میں اپنی قیمت وصول کرتی رہوں گی؟ میں اپنی ا
ایک ادا.......... ایک جنبش ابرو تک کی قیمت وصول کرچکی ہوں۔ اب مجھے بن مول
کچھ کر لینے دو۔ ویسے بھی اب میں زوال کے دور سے گزر رہی ہوں میں اس کمپنی کی ط
ہوں جس کے شیئرز کی قیمت دنیا کی منڈی میں تیزی سے گر رہی ہے.......... مجھے ا
زندگی کے آخری دنوں تک کا سہارا چاہیے.........."

اس کی آواز ذرا دھیمی ہوگئی جیسے وہ کسی خوش کن خیال میں الجھنے لگی ہو۔
"اختر بہت سیدھا.......... بہت معصوم ہے.......... وہ شوبزنس میں ہے اور آج کے د
کا نوجوان ہے.......... اس کے باوجود اتنا سیدھا اتنا وفا پرست ہے کہ مجھے یقین نہیں
آتا.......... لیکن میں نے اسے ہر طرح سے پرکھ لیا ہے۔ وہ میری شہرت' میری دول
کے پیچھے نہیں ہے.......... وہ صرف محبت کا بھوکا ہے مجھے یقین ہے وہ عمر بھر انگلی پکڑ
پکڑے میرے ساتھ چلے گا۔ تم اس بیل کو منڈھے چڑھنے دینا بے جی! اگر تم نے اس
معاملے میں کوئی مکاری.......... کوئی بدمعاشی دکھانے کی کوشش کی تو میں تم سے نپٹ لوں گ
بے جی..........!"

اختر نے مزید کچھ نہیں سنا اور دروازے سے ہٹ کر لفٹ کی طرف چل دیا اس کے
قدم لڑکھڑا رہے تھے اور دل زخمی چڑیا کی طرح ہانپ رہا تھا۔

"یہ عورتیں.......... جن سے محبت کی جاتی ہے.......... جن کی پرستش کی جاتی
ہے.......... یہ پیٹھ پیچھے ایسی عجیب عجیب باتیں کیوں کرتی ہیں؟" وہ اپنے آپ سے پوچھ
رہا تھا۔

وہ ایک بار پھر اس صدمے سے دوچار تھا جس سے اسے رمنا نے روشناس کرایا تھا
وہی اندر کی توڑ پھوڑ.......... وہی انا کی پامالی.......... وہی معصوم محبت پر کچوکے
بازی..........

"تو گویا نورین بھی مجھ سے محبت نہیں کر رہی تھی.......... مجھے پھانس رہی
تھی.........." اور یہ لفظ "پھانس" گویا پھانس کی طرح اس کے دل میں اتر گیا تھا۔ نکلے
نہیں نکل رہا تھا۔ اس زمانہ ساز عورت کو تو صرف ایک سعادت مند شوہر کی تلاش تھی جو
اس کی انگلی تھام کر زندگی بھر اس کے ساتھ چل سکے.......... اس سے زیادہ کچھ نہیں۔
کس غیر جذباتی انداز میں وہ اختر کا ذکر کر رہی تھی جیسے وہ کوئی محبت کرنے والا انسان
نہیں' بازار میں رکھا ہوا مال ہو جس کی خوبیوں اور خامیوں پر تکرار کی جا رہی تھی۔ اس کی

ی اس سے زیادہ توہین کیا ہوسکتی تھی۔
گزرے دنوں کا ایک لمحہ اس کی آنکھوں میں ناچ رہا تھا اور اسے اندر ہی اندر رلا رہا
.... وہ کونے کھدروں میں مختصر سی سرگوشیاں.......... وہ گرم و گداز ہاتھ کا معنی
دباؤ.......... وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ہونے والی باتیں.......... وہ کبھی کبھی سب
ہوتے ہوئے بھی سب کی توجہ سے بچ کر کچھ کہہ جانا.......... کبھی کبھی ماضی کا کوئی
زدہ تذکرہ.......... وہ بے پناہ سنجیدہ موقعوں پر بھی ہونٹوں کے گوشوں سے پھوٹ
والا تبسم.......... اور وہ بے پناہ خوشی کے موقعوں پر بھی آنکھوں میں چھلک آنے
نمی.......... کیا یہ سب کچھ جھوٹ تھا؟ طے شدہ تھا؟ کسی اسکرین پلے کی طرح؟ کسی
نی کی طرح؟ یہ سب اس ڈرامے کی جزئیات تھیں جو اسے پھانسنے کے لئے لکھا جا رہا تھا؟
اسے پھانسے جانے پر بھی کوئی اتنا زیادہ دکھ نہیں تھا۔ اسے نورین کے ماضی کی بھی
زیادہ پروا نہیں تھی اور اس بات سے بھی کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ دو مرتبہ طلاق یافتہ
ی۔ اس کے لئے تو یہ صدمہ جانکاہ تھا کہ نورین کا اس کی طرف جھکاؤ جذبات سے خالی
.... اس کا التفات اس کا اظہار محبت کسی فطری پکار کی پیداوار نہیں بلکہ محض ایک
ورت تھا.......... صابن کی طرح.......... پانی کی طرح.......... تولئے کی
ح.......... مکان کی طرح.......... دکان کی طرح! وہ بس دنیا کے بازار میں پائی جانے
ضرورت کی ایک چیز تھا۔

نیچے آکر وہ ریستوران میں بیٹھ گیا اور اس نے اپنے لئے بلیک کافی کا آرڈر دیا۔ اس
آنکھوں کے سامنے کبھی اندھیرا اور کبھی آنسوؤں کی دھندلاہٹ پھیل رہی تھی اور وہ
نے آپ کو فوری طور پر گاڑی ڈرائیو کرنے کے قابل محسوس نہیں کر رہا تھا۔
بہت دیر بعد وہ اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی اسے اندازہ تھا کہ
نورین کا فون ہوگا۔ وہ پوچھنا چاہ رہی ہوگی کہ وہ اب تک اس کے پاس کیوں نہیں پہنچا تھا
نے ریسیور نہیں اٹھایا اور جوتوں سمیت بستر پر ڈھیر ہوگیا۔
اس روز رات تک بارہا اس کے فون کی گھنٹی بجی مگر اس نے ایک بار بھی ریسیور
یں اٹھایا اسے یہ احساس بھی تھا کہ کوئی فون کسی پروگرام آرگنائزر کا بھی ہوسکتا تھا۔ ٹی وی
ے بھی ہوسکتا تھا۔ اس کے مالک مکان کا بھی ہوسکتا تھا جو کئی دن سے اس سے ملنے کے
لئے آنا چاہ رہا تھا.......... مگر اختر اس وقت کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا کسی سے ملنا
یں چاہتا تھا.......... اس کی ذات کے کھنڈر میں اس کے محسوسات کے قتل عام کا ماتم برپا
تھا۔

رات گئے کچھ سوچتے اور کچھ جاگتے ہوئے یکدم اسے عرفان سا ہوا.......... اس کے
اندر سے اچانک ہی کوئی آواز ابھری.......... بے وقوف! تو یہاں شوبزنس کی دنیا میں

خلوص اور محبت تلاش کر رہا ہے.......... رمنا اور نورین جیسی عورتوں کے دلوں م
جذبات کا گداز تلاش کر رہا ہے.......... اس ہنگامہ پرور اور بے مہر شہر میں چاہت ڈھونڈ
ہے.......... غرض مندوں کے ہجوم میں بے غرضی ڈھونڈ رہا ہے؟

پھر اسی آواز نے اسے مشورہ دیا.......... چل.......... گاؤں کی طرف لو
جا.......... جہاں محبت بازو پھیلائے نہ جانے کب سے تیرا انتظار کر رہی ہوگی۔ جہاں تی
بوڑھا باپ تجھے عاق کرنے کے باوجود آج بھی تجھے سینے سے لگانے کو تیار ہوگا.......... جہا
آسیہ تیری تمام تر بے وفائی اور بے اعتنائی کے باوجود تیرا انتظار کر رہی ہوگی.......... کیو
کی یہ سیدھی سادی اور بھولی بھالی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں.......... کسی کے نام زندگی لکھ
دیتی ہیں تو پھر اس امانت میں خیانت نہیں کرتیں.......... آسیہ.......... آسیہ..........؟

یہ نام بازگشت کی طرح اس کے ذہن میں گونجا اور اس کے حواس پر چھا گیا..........

چنبیلی کی کلی کی طرح سفید اور نرم و نازک سی اس لڑکی کا سراپا ذہن پر یوں نقش تھا جیسے
لوح سنگ پر کسی نے شیشے سے کچھ کھود رکھا ہو مگر وہ ہمیشہ اس پر فراموشی کی مٹی ڈالتا آ
تھا۔

پے در پے حادثوں نے اس کی روح کو جھنجھوڑا تھا.......... محبتیں سراب ثابت ہوئی
تھیں.......... عورت کے فریب کا زہر اس کی رگ و پے میں اترا تھا تو فراموشی کی ساری
دھول گویا تیز آندھیوں سے اڑ گئی تھی۔ آسیہ کی یاد گہرے گھاؤ کی طرح جاگ اٹھی
تھی.......... کتنی معصوم اور سادہ تھی وہ.......... کتنی بے لوث تھی اس کی
محبت.......... کس طرح وہ اس کی ایک نگاہ التفات کی منتظر رہی تھی.......... کتنی بار اس
نے کہا تھا.......... "اب بھی وقت ہے.......... میرے بارے میں کچھ سوچ لو..........
کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے یاد کرکے رویا کرو.........."

اختر کو اپنے رخسار گیلے محسوس ہوئے۔ نیم غنودگی میں اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا
اس کے چہرے پر آنسوؤں کی نمی تھی اسے حیرت ہوئی وہ واقعی آسیہ کو یاد کرکے رو رہا تھا۔

صرف آسیہ ہی نہیں اسے باپ بھی یاد آ رہا تھا.......... بے تحاشا یاد آ رہا تھا باپ
کی نافرمانی کرکے اس نے کوئی سکھ نہیں پایا تھا.......... یہ تھوڑی سی شہرت.......... ذرا
ماڈرن علاقے میں کرائے کے اپارٹمنٹ میں رہائش.......... تھوڑی سی آسودہ حالی..........
تھوڑا سا جدید سامان.......... تھوڑا سا نام.......... اور بس!

یہ ایسی چیزیں تو نہیں تھیں کہ ان کے لئے ایک بے پناہ مہربان باپ ایک محبت کرنے
والی سادہ دل لڑکی کو کھو دیا جاتا.......... بہت تھوڑی قیمت کے عوض اس نے اپنے اصلی
محبت کرنے والوں کو چھوڑ دیا تھا بہت احمق تھا وہ.......... اس نے بہت گھاٹے کا سودا کیا
تھا.......... لیکن شاید اب بھی اتنی تاخیر نہیں ہوئی تھی۔ واپسی کے راستے شاید ابھی بند

ہوئے تھے۔

اس نے دل ہی دل میں پختہ ارادہ کرلیا کہ صبح وہ گاؤں ضرور جائے گا.......... باپ
قدموں میں گر کر معافی مانگ لے گا.......... آسیہ کے سامنے بھی ہاتھ جوڑ لے گا۔
یقین تھا وہ دونوں اسے معاف کر دیں گے وہ سچی محبت کرنے والے لوگ تھے۔
اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد اسے سکون کی نیند آ گئی۔

☆ ============ ☆ ============ ☆

وہ صبح جلدی گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ نورین کا کوئی آدمی اسے
نہ پہنچ جائے اس میں کسی کو دھتکارنے، سختی سے ترک تعلق کرنے کا اعلان کرنے یا
کو اس کے منہ پر اس کی خودغرضی اور بے وفائی کا طعنہ دینے کا حوصلہ نہیں تھا۔ ایک
سی بزدلی تھی اس میں۔ زخم کھا کر بھی خود ہی شرمندہ سا ہو جاتا تھا.......... شاید خود
نظروں میں خجل سا ہو جاتا تھا.......... ایسے معاملات میں وہ صاف صاف بات کرنے یا
نا کرنے کی بجائے۔ راہ فرار اختیار کرنے والا آدمی تھا۔

چار گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد وہ دوپہر کے قریب اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ ہائی وے سے
ں تک جانے والی سڑک پکی ہو چکی تھی۔ گلیاں بھی کافی حد تک ہموار نظر آ رہی تھیں
کار اپنے گھر کی طرف لے جانے میں زیادہ دقت نہیں ہو رہی تھی کچھ بچے اس کی کار
پیچھے دوڑے کچھ کتے بھونکتے ہوئے لپکے لیکن اختر کو جیسے کچھ پتہ نہیں تھا وہ بالکل گم صم
گاڑی چلا رہا تھا۔

وہی مانوس سی گلیاں.......... وہی جانے پہچانے درخت اور وہی شناسا سے در و دیوار
مگر چہرے گویا کچھ بدلے بدلے سے تھے۔ راہ چلتی اکا دکا عورتوں اور مردوں نے رک کر
نس سی نظروں سے اسے اور اس کی گاڑی کو دیکھا مگر کسی نے اسے آواز نہیں دی۔ کسی
نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی.......... حالانکہ ان میں سے چند ایک کو اختر پہچانتا تھا
ن شاید وہ اب اسے نہیں پہچانتے تھے۔

اپنے مکان کے ساتھ گاڑی روک کر وہ اترا اور تیزی سے اندر چلا گیا مگر پھر اسے
ٹھٹک کر رکنا پڑا۔

مکان کے طویل و عریض صحن میں درختوں کی چھاؤں میں بچے بیٹھے پڑھ رہے تھے۔
آمدے میں بھی بچے تھے کمروں میں سے بھی بچوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ صحن اور
آمدے میں بلیک بورڈ اسٹینڈ پر کھڑے تھے۔ ایک درخت میں پیتل کی تھال جیسی گھنٹی لٹکی
رہی تھی۔ ایک طرف پانی کا حوض بنا ہوا تھا جس پر کچھ لڑکے بیٹھے تختیاں دھو رہے تھے۔
درختوں کی چھاؤں میں کرسی پر بیٹھا بچوں کو پڑھانے والا نوجوان اشرف تھا اختر اسے
پہچانتا تھا وہ کچھ موٹا ہو گیا تھا اور ذرا بڑی عمر کا نظر آنے لگا تھا مگر زیادہ نہیں بدلا تھا جب اختر

نے دھوپ کا چشمہ اتارا تو اشرف نے بھی اسے پہچان لیا اور کتاب اور بید رکھ کر اٹھ
تیزی سے اختر کی طرف آیا مگر پھر نہ جانے کیوں جھجکتے ہوئے کچھ فاصلے پر ہی
گیا۔

"یہ ہمارے گھر میں اسکول کب سے کھل گیا ہے اشرف؟" اختر نے دھیمے لہجے
پوچھا۔

"تمہیں معلوم نہیں.........؟" اشرف نے الٹا سوال کیا۔ "تمہیں شاید اطلاع
ملی......... تمہارے والد اپنا مکان......... اور جو تھوڑی بہت زمین تھی سب محکمہ
کے نام کر گئے تھے"۔ اشرف نے اپنی گردن پر لپٹا ہوا مفلر قدرے ڈھیلا کرتے ہوئے بتایا

"تو کیا ان کا.........؟" اختر کی آواز گلے میں پھنس گئی۔

"ہاں......... شاید تمہیں یہ بھی علم نہیں کہ پچھلی سردیوں میں ان کا انتقال ہ
ہے"۔ اشرف آہستگی سے بولا۔ "انہوں نے وصیت کی تھی کہ......... کہ
تمہیں ان کے انتقال کی خبر نہ دی جائے......... لیکن میرا خیال تھا......... شاید
طرح تمہیں یہ خبریں مل ہی گئی ہوں........."

پھر وہ گویا ذہن پر زور دیتے ہوئے افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا......... "
تو ان کی وصیت کے الفاظ بھی یاد ہیں جو انہوں نے خود وکیل کو لکھوائی تھی......... انہ
نے لکھوایا تھا......... مجھے اب تعلیم سے کچھ زیادہ پیار تو نہیں رہا اس تعلیم نے میرا
مجھ سے چھین لیا میں نے اسے شہر پڑھنے بھیجا تھا مگر وہ جہل کی وادیوں میں کھو گیا.........
پھر بھی میں سوچتا ہوں شاید اس میں قصور اس آج کے دور کی تعلیم کا نہیں میرے اپنے
ہی کا تھا......... اس لئے میں اپنا مکان زمین اور نقد روپیہ سب کچھ محکمہ تعلیم کو عطیہ
رہا ہوں۔ میں وصیت کرتا ہوں کہ میرے مکان میں اسکول قائم کیا جائے۔ گاؤں کے اسکول
کی حالت بہت خراب ہے میں سوچتا ہوں میرے مکان کے صحن میں بیٹھ کر چند بچوں
تعلیم کی روشنی پالی تو شاید میری آخرت میں اندھیرا کچھ کم ہو جائے......... تقریباً" یہی
ان کے الفاظ........." اس نے کھوئے کھوئے سے انداز میں یہ سب کچھ دہرایا تھا۔

اختر چند لمحے گم صم کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دوبارہ دھوپ کا چشمہ
لیا تاکہ اشرف اس کی آنکھوں میں چھلک آنے والے آنسوؤں کو نہ دیکھ سکے کیونکہ یہ
سے زیادہ ندامت کے آنسو تھے۔

وہ تیزی سے مڑا اور باہر گاڑی میں آ بیٹھا چند لمحے بعد اس نے عینک اتار کر رو
سے آنکھیں پونچھیں اور گاڑی تھوڑی آگے بڑھا کر دوسرے گھر کے سامنے لے جا روکی
گھر کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا اور سامنے ہی چند بوڑھی سی عورتیں بیٹھی سوت کی اٹیاں بنا
رہی تھیں۔ ان میں آسیہ کی ماں نظر نہیں آ رہی تھی۔

اختر کو متوجہ پا کر ایک بڑھیا اٹھ کر قریب آئی اور گاڑی کی کھڑکی پر جھکتے ہوئے بولی۔
"کس سے ملنا ہے بیٹا؟ کسے ڈھونڈ رہے ہو؟"

"گلشن بی بی سے........." اختر نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ گلشن آسیہ
کی ماں کا نام تھا۔

"وہ تو کب کی اللہ کو پیاری ہو چکی ہے بیٹا!" بڑھیا نے آہ بھر کر کہا۔ "اسے سانپ
نے کاٹ لیا تھا........."

اختر کے دل پر ایک اور گھونسہ لگا کہ اس کا رابطہ گاؤں سے اتنے ہی طویل عرصے سے
ٹوٹا ہوا تھا کہ اس دوران یہاں اتنی قیامتیں گزر گئی تھیں؟ اختر کو تو اپنا گاؤں سے جانا کل ہی
کی بات محسوس ہو رہی تھی......... لیکن شاید وقت کی رفتار بہت ہی تیز تھی۔

وہ کیسا بدنصیب تھا کہ باپ کے جنازے کو کندھا بھی نہ دے سکا تھا......... دم آخر
اس کے پاؤں پکڑ کر اپنی غلطیاں بھی معاف نہ کرا سکا۔ ابھی وہ اس صدمے سے سنبھلنے نہ پایا
تھا کہ اس ضعیفہ نے اسے ایک اور افسوسناک خبر سنا دی۔

اختر نے بہ مشکل تمام دل کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اماں
جی......... گلشن بی بی کی ایک لڑکی تھی......... آسیہ نام تھا اس کا......... کیا وہ اس
گھر میں نہیں رہتی؟"

"بیٹا! یہ مکان تو گلشن کی زندگی میں ہی کھڈی والوں کے پاس گروی رکھا ہوا
تھا........." بڑھیا نے آنکھیں سکیڑ کر گویا اسے پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "
گلشن کے انتقال کے بعد کھڈی والوں نے مکان لے لیا آسیہ بڑے چوہدری صاحب کے ہاں
نوکری کرتی ہے اور وہیں رہتی ہے"۔

بڑی بی کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ ابھی آسیہ کی شادی نہیں ہوئی تھی ورنہ وہ اس
کا ذکر ضرور کرتیں۔ اختر کو اس سلسلے میں ان سے کچھ پوچھنے کی جرات نہ ہو سکی لیکن وہ
آسیہ سے ملنا ضرور چاہتا تھا۔

شاید اس سے مل کر کرب مسلسل کی اس دھوپ میں مسرت کے کسی خفیف سے
جھونکے کا لمس نصیب ہو......... اختر نے سوچا اس کی حالت اس تیراک جیسی تھی جو محض
تھک جانے کی وجہ سے ڈوبنے کے قریب تھا کوئی نادیدہ ہاتھ بڑھ کر اسے تھام لیتا تو اس کے
بچنے کی امید تھی۔

اس نے گاڑی موڑی اور واپس روانہ ہو گیا۔ بڑے چوہدری صاحب کا نام رحمت علی
تھا ان کی حویلی گاؤں میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے نظر آتی تھی۔ حویلی کے سامنے
ایک بڑا سا میدان بھی خالی پڑا تھا۔ ٹاؤن کمیٹی کے نقشے کے مطابق وہ کھیل کا میدان تھا۔ مگر
آج تک اس میں کسی جوان کو تو کیا ناسمجھ بچے کو بھی کھیلنے کی جرات نہیں ہوئی تھی بڑے

چوہدری صاحب کی حویلی کے سامنے بھلا کون کھیل سکتا تھا؟

چوہدری رحمت علی صاحب محض زمیندار ہی نہیں علاقے کی نمایاں سیاسی شخصیت بھی تھے۔ ہر دور حکومت میں ان کی سرکار دربار میں رسائی رہی تھی۔ بڑا دبدبہ تھا ان کا............ مگر اختر حسین چونکہ ایک مدت سے ان کی "رعایا" میں شامل نہیں تھا اور اس کا تعلق کسی ہاری یا مزارع خاندان سے نہیں تھا اس لئے اس نے ان سے کبھی مرعوبیت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ گاڑی سیدھی حویلی کے دروازے پر لے گیا۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت کپڑوں کی ایک گٹھڑی اٹھائے ناک سڑکتی ایک بچی کا ہاتھ پکڑے باہر آ رہی تھی۔

"سنو ماسی!" اختر نے اشارے سے اسے قریب بلایا۔

وہ قریب آئی تو اختر بولا............ "چوہدری صاحب کی نوکرانیوں میں ایک لڑکی ہوگی............ آسیہ نام ہے اس کا............ گلشن بی بی کی بیٹی آسیہ............ ذرا اسے بھیج دو۔ کہنا کہ شہر سے اس کی پھوپھی............ نہیں پھوپھی نہیں............ خالہ کا بیٹا اختر آیا ہے............"

"باؤ جی!" عورت سہمی سہمی سی نظروں سے پیچھے مڑ کر بند گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی............ "اگر آسیہ سے ملنا ہے تو پیچھے والے چھوٹے دروازے پر آجاؤ............ اصطبل کے قریب............ میں آسیہ کو بھیجتی ہوں"۔

وہ دوبارہ بغلی گیٹ کھول کر اندر چلی گئی اختر گاڑی گھما کر حویلی کے گرد چکر کاٹتا ہوا پیچھے آ گیا۔ پچھلی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ موجود تھا جو غالباً صرف اصطبل میں آمد و رفت کے لئے بنایا گیا۔ اصطبل وہاں سے قریب ہی تھا۔

چند لمحے بعد متوحش سی ایک عورت باہر آئی تیل میں چپڑے ہوئے اس کے بال سختی سے سر سے چمٹے ہوئے تھے اور ان میں کوئی کوئی سفید بھی ہو چلا تھا اس کی رنگت اس قدر زرد اور رخساروں کی ہڈیاں اتنی ابھری ہوئی تھیں کہ پہلی نظر میں وہ ٹی بی کی مریضہ لگتی تھی۔

اس کے تن پر میلے اور بد وضع کپڑے تھے جو شاید اس کے اپنے نہیں تھے جسم ڈھلکا ہوا اور آنکھیں ویران تھیں وہ مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتی ہوئی آ رہی تھی۔ ان ہاتھوں کی الٹی طرف نیلی نیلی نسیں ابھری ہوئی تھیں اور ہتھیلیوں پر قسمت کی لکیروں میں سیاہی سمٹ آئی تھی۔

کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی اجلی اجلی آسیہ تھی جس پر چنبیلی کی کلی کا گمان گزرتا تھا۔ کسی انجانے ہاتھ نے اس کلی کو بدنمائی و بربادی کی راکھ میں دفن کر دیا تھا اختر کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا۔

آسیہ کار کی کھڑکی کے قریب آ کھڑی ہوئی لیکن سہمی سہمی نظروں سے پیچھے بھی

بھتی جا رہی تھی۔ چند لمحے کے لئے تو اختر سے کچھ بولا ہی نہ گیا اس کا گلا پہلے ہی رندھا وا تھا۔ لڑکپن کی محبت کے کھنڈر کو دیکھ کر تو جیسے اس کی زبان بھی پتھر کی ہوگئی۔

"اب کیا لینے آئے ہو یہاں؟" بالآخر آسیہ نے اکھڑے اکھڑے سے لہجے میں کہا۔

"تمہیں لینے............" بے اختیار اختر نے سرگوشی کی یہ اس کی ذات کے صحرا میں م توڑتے ہوئے جذبے کی بازگشت تھی۔

"ہونہہ............" آسیہ کے نچڑے ہوئے سے ہونٹوں پر ایک تحقیر آمیز مسکراہٹ بکھر گئی............ "مردوں کی یہی خاصیت ہوتی ہے............ جب وہ ٹوٹ پھوٹ جاتے ں............ ٹھکرا دیئے جاتے ہیں تو وہ اپنے اصل کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ اب تو گو کہ ں بھی شکست خوردہ ہوں اپنی ہی نظروں میں گر چکی ہوں مگر یہ مت سمجھو کہ تمہیں دیکھتے ں میں بانہیں کھولے باچھیں پھیلائے تمہاری طرف دوڑی چلی آؤں گی............ میرے دل کے دروازے ہمیشہ کے لئے............ اور سب کے لئے بند ہو چکے ہیں............ مجھے اب لی سے ملنے............ کسی کی بننے............ اور کسی کو اپنا بنانے کی کوئی تمنا یں............" وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسک اٹھی۔

"لیکن کیوں............؟ آخر کیوں؟" اختر گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ اسٹیئرنگ وہیل پر ں کی گرفت اس قدر سخت ہوگئی کہ کھردری ربڑ کا کور اس کے ہاتھوں میں کانٹوں کی طرح بھنے لگا۔

"دو سال تک وہ خبیث چوہدری جس کا نام رحمت کے بجائے عفریت ہونا چاہیے تھا ھے درندوں کی طرح بھنبھوڑتا رہا مگر کوئی نہ تھا جسے میں پکارتی............ جو آ کر مجھے اس کے چنگل سے نجات دلاتا............" وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی............ "اس نے صرف د وقت کی روٹی کے عوض مجھے اپنی ملکیت میں لے لیا تھا اور گاؤں میں اس کی پگڑی کا طرہ چھ اور اونچا ہوگیا تھا کہ چوہدری صاحب کس طرح بیواؤں اور یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھتے ں............"

اس کے کملائے ہوئے رخسار آنسوؤں سے تر تھے مگر اب وہ آنسو پونچھ نہیں رہی تھی اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے کار کی کھڑکی پر ٹکے ہوئے تھے اور ان پر نیلی نیلی نسیں چھ اور نمایاں ہوگئی تھیں۔

پھر وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی............ "شاید تم سوچ رہے ہو گے کہ میں یہاں ے بھاگی کیوں نہیں؟ میں بھاگ کر کہاں جاتی؟ کس کے پاس جاتی؟ اس عفریت سے نجات اصل کرتی تو بھوک کے عفریت سے کیسے لڑتی؟ اندھا دھند نکل کر کھڑی ہوتی تو قدم قدم پہ نہ جانے کتنے چوہدری ملتے۔ ماحول کی دہشت اور میری تنہائی و بے کسی نے مجھے مغلوب کر لیا۔ میں بھینٹ کا جانور بن گئی............"

آنسو آسیہ کے رخساروں پر بہتے چلے آ رہے تھے وہ اسی گھٹی گھٹی لیکن ہذیانی سی آواز میں بولے جا رہی تھی لیکن پھر یکایک اس کے لہجے میں ٹھہراؤ مگر انتہا کا زہریلا پن اور کاٹ پیدا ہوگئی.......... "اور پھر میں ایک بچے کی ماں بھی بن گئی.......... مگر وہ بچہ پیدائش کے فوراً" بعد ہی میری گود سے نوچ کر ایک اور نوکرانی کے بچوں میں شامل کر دیا گیا۔ وہ نوکرانی شرعی طور پر شادی شدہ اور بال بچوں والی تھی۔ چوہدری صاحب کو یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ ان کی کوئی نوکرانی ایسے بچے کی ماں کے طور پر مشہور ہو جس کے باپ کا کچھ "پتہ" نہ ہو.......... وہ بچہ اسی حویلی میں پرورش پا رہا ہے میں اسے دور دور سے دیکھتی ہوں مگر مجھے اتنی اجازت نہیں ہے کہ میں اس سے مل سکوں یا اپنا بیٹا کہہ سکوں.......... اور اب مجھے ایک چچوڑی ہوئی ہڈی کی طرح ایک طرف پھینک دیا گیا ہے کیونکہ میں بیمار سی رہنے لگی ہوں۔ اب صرف فالتو قسم کے کام کرنا اور ڈانٹ پھٹکار سننا میرے فرائض میں شامل ہے.........."

اس نے ہچکچاتے سے انداز میں ایک گہری سانس لی اور اس کا چہرہ یک لخت ایسی اذیت سے کھنچ کر رہ گیا جیسے اس کے سینے میں برچھی اتر گئی ہو۔ وہ کھرکھراتی سی آواز میں بولی.......... "یہ سب کچھ بیت چکا ہے مجھ پر.......... اور ابھی بیت رہا ہے.......... اب تم آ گئے ہو مجھے لینے.......... ہونہہ.......... مجھے تم سے نفرت ہے.......... میں تمہاری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی.......... دفع ہو جاؤ یہاں سے.........."

اس پر ایک بار پھر ہذیانی سی کیفیت طاری ہو چکی تھی اور اسی کیفیت میں اس نے اختر کے منہ پر تھوک دیا پھر وہ اپنے میلے دوپٹے سے منہ پونچھتی ہوئی واپس حویلی کی طرف بھاگتی چلی گئی۔

اختر کی کار کے گلوو کمپارٹمنٹ میں بھرا ہوا ریوالور موجود تھا۔ ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ ریوالور لے کر حویلی میں گھس جائے اور چوہدری اور اس کا جو بھی حمایتی اور محافظ سامنے آئے اس کے سینے میں گولیاں اتار دے۔ اپنی جان بچانے کی اسے اتنی پروا نہیں تھی۔

لیکن یہ سوچ کر اس کا ہیجان ختم ہوگیا کہ اس طرح بھی وہ آسیہ کو وہ سب کچھ واپس نہیں دلا سکتا جو لٹ چکا تھا.......... اس کا کنوار پن.......... اس کی جوانی.......... اس کی پاکیزگی.......... اس کی شگفتگی.......... اس کے بچے کے جائز ہونے کی سند.......... اس کے احساسات.......... محبت پر اس کا یقین..........

وہ آسیہ کو کچھ بھی تو نہیں دلا سکتا تھا۔

اس نے گاڑی موڑی اور گاؤں سے واپس روانہ ہوگیا۔ اس کا ذہن بالکل ماؤف تھا اور وہ گاڑی بہت تیز چلا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار اندھیرا چھا رہا تھا۔

شہر اور گاؤں کے درمیان ایک اور چھوٹا سا شہر بھی پڑتا تھا۔ اس کی طرف جانے والی

اور ہائی وے کے ملاپ سے پہلے ایک پل آتا تھا جس کے نیچے ایک بہت چوڑی تیز و نہر بہتی تھی اس کی گہرائی بھی کم نہیں تھی اس نہر کے پل پر پہنچ کر اختر گاڑی پر قابو نہ سکا اور کار زنگ آلود سے جنگلے کو توڑتی ہوئی نہر میں جا گری۔

اس حادثے کی خبر کافی تاخیر سے اخبارات میں آئی تھی۔ اخبارات نے لکھا تھا کہ تے وقت چونکہ کار کا دروازہ کھل گیا تھا اور اس حادثے کا علم بھی کئی گھنٹے بعد ہوسکا تھا لئے اختر کی لاش تلاش نہیں کی جاسکی تھی۔

بعد میں نہر میں بہت آگے جا کر جال لگائے گئے اور دوسری طرح بھی کوششیں کی گئی لاش نہ مل سکی۔ شاید لاش کو مچھلیاں کھا گئی تھیں۔ اس نہر میں مچھلیاں کثرت سے پائی تی تھیں۔ بہت دور دراز علاقوں میں تو اس نہر کے کنارے واقع مچھیروں کی چند بستیوں کی زی کا دار و مدار انہیں مچھلیوں پر تھا۔

بہرحال اس حادثے کا خاصا تذکرہ رہا تھا۔ تقریباً" سبھی اخبارات میں اس کی خبر آئی ا۔ خصوصاً" فلمی صفحات پر تو اس کا نمایاں تذکرہ رہا تھا.......... لیکن جیسا کہ دنیا کی بت ہے.......... لوگ رفتہ رفتہ اس حادثے کو بھی بھول گئے.......... اور اختر حسین کو ا.......... اس تیز رفتار زمانے میں لوگ بڑی بڑی طوفانی اور انقلابی قسم کی شخصیتوں کو لانے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگاتے۔ اختر تو پھر بھی محض ایک ابھرتا ہوا گلوکار تھا اس نے تھوڑی بہت شہرت اور مقبولیت حاصل کی تھی اس کا دور بھی کچھ زیادہ طویل نہیں تھا۔ وہ بہت جلد ہی قصہ پارینہ ہوگیا ویسے بھی ان دنوں تیزی سے نئے نئے گلوکار سامنے آ رہے ے۔ ٹی وی ایک جدید دور میں داخل ہو رہا تھا.......... زمانہ گویا کروٹ لے رہا ا.......... نئی نئی شکلوں نئے نئے اسٹائلز اور نت نئے پروگراموں کے ہجوم میں لوگ تی بالکل بھول گئے کہ اختر حسین بھی کوئی گلوکار ہوا کرتا تھا۔ شوبزنس میں اس کی آمد اور یسی کچھ ایسی ہی تھی جیسے کوئی ستارہ آسمان سے ٹوٹا ہو اور صرف چند لمحے کے لئے تیز وشنی بکھیر کر تاریکیوں میں کھو گیا ہو.........."

جانوروں والے بابا نے اختر حسین کی کہانی ختم کرکے اپنی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی میں ہاتھ پھیرتے ہوئے ہماری طرف دیکھا۔ ہم تینوں ہی گم صم تھے۔ تینوں ہی ایک ٹک جانوروں الے بابا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بارش تھم چکی تھی اور اس وقت گویا پوری کائنات ہی خاموش تھی۔

بالآخر احمد نے کھنکار کر گلا صاف کیا اس گہرے سکوت میں اس کے کھنکارنے کی آواز بھی بہت بلند محسوس ہوئی وہ آہستگی سے بولا.......... "ہاں.......... آپ نے یاد دلایا تو یاد آیا.......... اختر حسین ایک بڑا خوش شکل.......... بڑا خوش گلو فنکار ہوا کرتا تھا لیکن ٹی وی پر وہ زیادہ نہیں آیا.........."

میں نے تائید کی.......... "مجھے بھی ابھی یاد آیا ہے میں نے اخباروں میں اس حادثے کے بارے میں پڑھا تھا لیکن یہ خاصی پرانی بات ہو چکی ہے۔۔ جبکہ زندگی کچھ ایسے سانچے میں ڈھل گئی ہے کہ دوسروں پر گزرا ہوا بڑے سے بڑا سانحہ ہم بہت جلد بھول جاتے ہیں.......... ہمیں اپنے مصائب یاد رہ جاتے ہیں.........."

"درست کہتے ہو"۔ جانوروں والے بابا نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے لمبے لمبے میل بھرے الجھے بالوں کی لٹیں اس کی پیشانی سے چہرے پر ڈھلک آئیں۔ اس نے انہیں چہرے سے ہٹایا نہیں یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنا چہرہ چھپانے کی ایک غیر محسوس سی کوشش کر رہا تھا شاید اس لئے کہ ہم اب بھی بغور اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

جمال جھرجھری سی لے کر بولا.......... "کچھ بھی ہو.......... بہرحال یہ ایک درد انگیز اور دل سوز کہانی ہے.......... بعض لوگ واقعی بڑے بدنصیب ہوتے ہیں۔ زندگی بھر تہی دست رہتے ہیں افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اختر حسین کو ٹی وی نے بھی بھلا دیا سب پرانے یا مرحوم گلوکاروں کا کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی بھولا بسرا نغمہ چلتا رہتا ہے لیکن اختر کا کبھی کوئی نغمہ نہیں چلایا گیا.........."

"نہیں.......... میں نے دیکھا ہے.......... دو ایک مرتبہ اس کے مرنے کے بعد بھی اس کا نغمہ ٹی وی پر چلا ہے.........." احمد بولا۔ "دراصل ٹی وی پر اس کے گائے ہوئے نغمات کی فہرست کچھ ایسی طویل نہیں تھی اب نشر مکرر کے طور پر اس قسم کی چیزیں چلتی ہیں تو کچھ پرانی پرانی سی لگتی ہیں صرف وہی لوگ انہیں تھوڑی بہت توجہ سے دیکھتے ہیں جنہیں گزرے ہوئے دن اچھے لگتے ہیں"۔

"میرا تو خیال ہے ہمیں ہر دور میں ہر عمر میں گزرا ہوا زمانہ ہی اچھا لگتا ہے جوانی میں ہم بچپن کو یاد کرتے ہیں اور بڑھاپے میں جوانی کو"۔ میں نے بابا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہر دور میں ہم ماضی کے ہی اسیر رہتے ہیں"۔

"لیکن صرف اپنے ماضی کے.........." جمال نے تصحیح کی.......... "اختر کو بہرحال ہم بھی بھولے ہوئے تھے.......... لیکن آج اس کی کہانی سنی ہے تو وہ یاد آ گیا ہے"۔

پھر جمال نے گہری سانس لے کر بابا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن ہمارا خیال ہے اختر حسین مرا نہیں تھا بابا! تم کیوں اس جنگل میں پڑے اپنے آپ کو ضائع کر رہے ہو' آؤ ہمارے ساتھ شہر چلو.......... ہم چل کر مرے ہوئے اختر حسین کو زندہ کرتے ہیں.........."

جانوروں والا بابا یک لخت بڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اب تک وہ جیسے کسی اور ہی روانی کسی اور ہی بہاؤ میں اپنی کہانی سناتا چلا گیا تھا۔ اب چونکا تو جیسے پچھتاوا سا ہونے لگا ایک لمحے کے لئے تو ہم سمجھے کہ شاید وہ جلال میں آ گیا تھا لیکن وہ پرسکون لہجے میں بولا.......... "شاید

کا اجالا نمودار ہو رہا ہے.......... آؤ.......... میں تمہیں صحیح راستے تک چھوڑ ں.........."

باہر پرندوں نے چہچہانا شروع کر دیا تھا وہ تیزی سے باہر چلا گیا ہم نے اپنا سامان نہیں لیکن ہم اس کے پیچھے باہر لپکے وہ جھونپڑی کے سامنے کھڑا تھا۔ تمام جانور اس کے گرد ہوگئے۔ پرندے اس کے کندھوں اور سر پر آن بیٹھے۔ وہ اب گویا ہم سے نظر چرا رہا

جمال نے اس کے قریب پہنچ کر کہا.......... "بابا! تم نے ہماری بات کا جواب نہیں .... چلو شہر چلتے ہیں ابھی کچھ ایسی عمر تو نہیں گزری' کیوں اختر حسین کو ضائع کر ے ہو؟"

تب بابا نے عجیب سی نظروں سے جمال کی طرف دیکھا۔ گویا وہ اس کی بات سے ظ ہوا ہو اس نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا اور کہا.......... "تمہارا خیال ہے .... کہ یہاں جو زندگی گزاری جا رہی ہے وہ ضائع ہو رہی ہے.......... میرا تو خیال زندگیاں وہ ضائع ہو رہی ہیں جو تم لوگ چیختے چنگھاڑتے شہروں میں گزار رہے .... میں تو یہاں اپنے آپ کو تلاش کر رہا ہوں۔ ایک نہ ایک دن میں اپنے آپ کو ں گا.......... لیکن تم لوگ کیسے بدنصیب ہو.......... نہ کبھی خود کو پاسکو گے اور نہ ہی کسی اور کو.........."

اس نے ملگجے اجالے میں چاروں طرف دیکھ کر گہری سانس لی جیسے صبح کی تازہ شفاف مہکی مہکی سی نم آلود ہوا کو ہر مسام جاں میں سمو لینا چاہتا ہو.......... پھر وہ ایک عجیب نیازی سے بولا.......... "میں سکھ' سکون اور محبت کا پجاری ہوں.......... اور سکھ یا لب نہ شہر میں رہ گئی ہے اور نہ ہی گاؤں میں.........."

پھر اس نے چاروں طرف پھیلے ہوئے جنگل کی طرف اشارہ کیا.......... "سکھ اور ن اب صرف یہاں رہ گیا ہے.........." اس نے اپنے کتوں کی پیٹھ تھپتھپائی پرندوں کو یا اور بولا۔ "محبت صرف ان بے زبانوں میں رہ گئی ہے۔ صرف یہی ہیں جو تمہیں محبت جواب میں محبت دیتے ہیں.......... کھوٹ سے پاک محبت"۔

چند لمحے ہم تینوں دم بخود سے کھڑے رہ گئے۔ پھر پرندوں کی چہچہاہٹ نے مجھے چونکا .... میں جھرجھری سی لے کر خیالوں کی دنیا سے باہر آیا۔ میں چھوٹا موٹا کہانی کار تھا۔ نے ان گنت کہانیاں سوچی تھیں۔ تھوڑی بہت لکھی بھی تھیں.......... لیکن جانوروں لے بابا کی کہانی نے مجھے اندر سے ہلا دیا تھا۔ اس کے محسوسات پر نہ جانے کیا قیامتیں بیتی ں گی جو وہ اس حال کو پہنچا تھا۔ یوں تو انسان کی شخصیت میں چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بڑے انقلاب لے آتی ہیں لیکن اختر حسین کے تو ایک دنیا سے دوسری دنیا میں چلے آنے

کے درمیان بلاشبہ درد کا ایک طویل سفر طے ہوا تھا۔ مختصر سی مدت میں اس نے بڑے زخموں کی اذیت سہی تھی۔ اگر ذات کے انقلاب نے اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا تو ہمیں اس میں کچھ ایسی حیرت بھی نہیں ہونی چاہیے تھی۔

لیکن نہ جانے کیوں مجھے احساس تھا کہ اس سرگزشت کی کوئی کڑی غائب تھی۔ میں نے جانوروں والے بابا کے کچھ اور قریب ہوتے ہوئے کہا.......... "آپ نے جو داستان سنائی وہ بظاہر ختم ہوگئی.......... پھر بھی.......... اس کا اختتام کچھ تشنہ سا لگتا ہے۔ ظاہر ہے اختر حسین کی موت تو صرف دنیا والوں کی نظر میں موت تھی۔ وہ حقیقت میں تو نہیں مرا تھا.......... لیکن اس کے نہر میں گرنے اور جانوروں والے بابا بننے کے درمیان بھی تو کچھ اہم باتیں ہوں گی۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس داستان کی کوئی اہم کڑی غائب ہے.........."

جانوروں والے بابا نے ایک بار پھر بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ پھر سر ہلاتے ہوئے بولا.......... "ایک نہیں.......... کڑیاں تو بہت سی غائب ہیں.......... یہ تو اس کی زندگی کا گویا ایک دور تھا جو ختم ہوگیا.......... دنیا کی نظر میں وہ مرگیا تھا لیکن اس کے بعد اس نے درحقیقت ایک اور جنم لیا تھا.......... ایک بالکل ہی مختلف جنم جس پر شاید تمہیں یقین نہ آئے.......... اس کی داستان تو بہت طویل ہے.......... الف لیلیٰ کی طرح.......... داستاں در داستان.......... اس کی زندگی کے رنگ خواہ کتنے ہی بدلے لیکن ایک خصوصیت ہمیشہ اس کے ساتھ رہی.......... کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ سفر.......... بہت ہی کم مدت میں اس نے زندگی میں نہ جانے کیا کچھ دیکھ ڈالا.........."

ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر اس نے گہری سانس لی۔ "لیکن بات تو صرف رات گزرنے کی تھی۔ تم صرف وقت گزاری کے لئے.......... رات کاٹنے کے لئے کچھ سننا چاہتے تھے۔ میں نے تمہیں اختر حسین کی زندگی کا ایک باب سنا دیا۔ رات کٹ چکی ہے تمہارا مقصد پورا ہوچکا ہے۔ صبح کا اجالا پھیل رہا ہے۔ اب تمہیں جانا ہوگا.........."

"ہمارا جانا کچھ زیادہ ضروری نہیں ہے.........." جمال جلدی سے بولا.......... "ہم تو یہاں دو تین دن بھی رک سکتے ہیں۔ ہم اپنے گھروں میں کہہ کر آئے تھے شاید ہم لوگ جنگل میں کیمپ لگالیں۔ اسی لئے تو ہمارے ساتھ اتنا سامان بھی ہے۔ ہم تو ایڈونچر پر نکلے تھے.......... لیکن آپ کی داستان سننا ہمیں کسی بھی ایڈونچر سے زیادہ دلچسپ محسوس ہو رہا ہے۔ اس میں عبرت کے بہت سے پہلو ہیں۔ اب بات شروع ہو ہی گئی ہے تو اسے پوری ہونا چاہیے.......... ہمیں محض ایک باب پر نہ ٹرخایئے۔ باقی سب کچھ بھی سنا ڈالئے.......... ہمیں آپ سے.......... میرا مطلب ہے ہمیں اختر حسین سے بہت ہمدردی ہے"۔

جانوروں والے بابا نے ذرا افسردہ سی نظروں سے باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھا

بیٹا" ہم تینوں ہی کے چہروں پر التجا مچل رہی تھی۔ وہ واپس جھونپڑی کی طرف مڑتے ہوئے بولا.......... "ٹھیک ہے.......... مجھے تو کوئی اعتراض نہیں.......... اگر تم لوگوں کا اصرار ہے تو میں اپنی زندگی کا ایک اور باب شروع کر دیتا ہوں.......... لیکن اس سے پہلے چائے کا ایک دور چلے گا۔ میں تھک گیا ہوں۔ مدفون یادوں کو کریدنا بھی بڑا تھکا دینے والا کام ہے۔ خواہ وہ یادیں کسی اور ہی کی ہوں.........."

وہ ابھی تک یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ وہی اختر حسین تھا۔ حالانکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ہم اسے پہچان چکے ہیں.......... لیکن ہم نے بھی اس پر اصرار نہیں کیا اور اس کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔ اس بار ہم نے اس کے برتنوں میں پکی ہوئی چائے پی لی.......... اور حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ ہمیں اچھی بھی لگی۔ شاید ایک رات میں ہم اس سے مانوس ہوچکے تھے.......... شاید اس کا مقام اب ہماری نظر میں بدل چکا تھا.......... یا پھر شاید یہ اس کی سفاک سرگزشت کا اثر تھا کہ ہماری نظر میں چھوٹی چھوٹی باتوں کی اہمیت نہیں رہی تھی۔

چائے پی کر اس نے اپنا میلا سا تکیہ ایک بلی کے سہارے کھڑا کیا اور اس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے کھوئے کھوئے سے لہجہ میں وہیں سے بات شروع کی جہاں چھوڑی تھی۔

☆ ============ ☆ ============ ☆

جب اختر کی آنکھ کھلی تو اسے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کے ٹکڑے ہوچکے تھے مگر وہ اس کے باوجود زندہ تھا اور ٹکڑوں میں تقسیم ہونے کی اذیت برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ اس کے جسم کے ہر حصے میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور اسے اپنے اردگرد کچھ دھندلی سی پرچھائیاں نظر آ رہی تھیں۔ پھر اسے احساس ہوا کہ کوئی اس پر جھکا ہوا تھا اور شاید اس سے کچھ پوچھ رہا تھا لیکن اسے آواز بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی اور الفاظ بھی سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔

اس کی سمجھ میں قطعاً" نہیں آ رہا تھا کہ اس کی یہ حالت کیوں تھی؟ اسے بالکل یاد نہیں تھا کہ اسے کوئی حادثہ پیش آیا تھا۔ جلد ہی اس کے ذہن پر دوبارہ غنودگی یا پھر شاید بیہوشی غالب آگئی۔

دوسری مرتبہ اس کی آنکھ کھلی تو اسے کچھ صاف نظر آ رہا تھا اور آس پاس باتیں کرتے ہوئے دو تین افراد کی آوازیں بھی ذرا صاف سنائی دے رہی تھیں۔ اس کے سر سے لے کر پاؤں تک تکلیف کا وہی عالم تھا۔ وہ بے اختیار کراہ کراہ گیا۔ شاید اس کی کراہ سن کر کوئی جلدی سے اس کے قریب آیا اور اس پر جھک گیا۔ وہ کھچڑی بالوں والا ایک بوڑھا اور سانولا سا شخص تھا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال گھنے گھنگریالے تھے۔ اس کی موٹی موٹی

آنکھیں سرخ اور متورم تھیں مگر ان میں نرمی اور شفقت کی جھلک تھی۔

"خدا کا شکر ہے بیٹا تم ہوش میں آ گئے۔ اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے........ میرے جسم میں بڑا درد ہو رہا ہے........ کیا میں بے ہوش تھا؟"

"ہاں بیٹا! تم بے ہوش تھے........" بوڑھے نے جواب دیا........ "بلکہ ہم تو تمہیں مرا ہوا سمجھے تھے"۔

اس دوران سانولا سا ایک نوجوان اور ایک بڑھیا بھی قریب آ کھڑے ہوئے۔ وہ تشویش آمیز سی نظروں سے اختر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نوجوان تقریباً اختر ہی کا ہم عمر تھا۔ اس کے جسم پر صرف ایک میلی سی بنیان اور اونچی سی دھوتی تھی۔ وہ دبلا پتلا تھا لیکن اس کی کاٹھی سے مضبوطی عیاں تھی۔ ویسی ہی مضبوطی جیسی عموماً سخت مشقت سے پیدا ہوتی ہے۔

"میں بے ہوش کیوں ہوا تھا؟" اختر نے جاننا چاہا۔

ان تینوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا گویا ان کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ اس کا کیا جواب دیں۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بوڑھا جو کچھ بولا اس کا مفہوم یہ تھا "یہ تو ہمیں معلوم نہیں بیٹا کہ تم بے ہوش کیسے ہوئے تھے۔ ہم نے تو تمہیں نہر میں بہتے دیکھا تھا۔ ہم دونوں باپ بیٹا نہر میں مچھلیاں پکڑ رہے تھے........" اس نے سانولے سے نوجوان کی طرف اشارہ کیا اور بات جاری رکھی........ "ہم نے تمہیں پانی میں بہتے ہوئے آتے دیکھا تھا۔ تمہارا پیٹ پھولا ہوا تھا اور بدن پر زخم تھے........ چوٹوں کے نشان تھے........ ایک نیکر کے سوا تمہارے جسم پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ ہم تو ڈر گئے تھے۔ ہم سمجھے کہ تمہیں کسی نے قتل کر کے نہر میں پھینک دیا ہے' تم ہمارے جال میں آ کر پھنس گئے تھے۔ ہم تمہیں جال سے نکال کر دوبارہ نہر میں چھوڑنے والے تھے لیکن پھر ہم نے محسوس کیا کہ شاید تم ابھی مرے نہیں ہو۔ ہمارا دل نہیں مانا کہ تمہیں نہر میں ہی بہنے دیں۔ ہم تمہیں نکال کر کنارے پر لے آئے۔ تمہارے پیٹ میں سے پانی نکالا۔ تمہیں منہ سے سانس دیا تو تمہیں تھوڑی تھوڑی سانس آنے لگی۔ ہم تمہیں اٹھا کر یہاں اپنی جھونپڑی میں لے آئے۔ آج دوسرا دن ہے۔ آج تمہیں ہوش آیا........"۔

شاید نہر میں گرنے کے بعد ایک بار پہلے بھی اختر کسی کے ہتھے چڑھا تھا لیکن اس نے اس کی جان بچانے کے بجائے اس کا سوٹ وغیرہ اتار کر اس کی قیمتی چیزیں اور پرس وغیرہ قبضے میں کرنے کے بعد اسے مرنے کے لئے دوبارہ نہر میں ہی چھوڑ دیا تھا........ لیکن دنیا میں جہاں ایسے شقی القلب لوگ موجود ہیں وہیں انتہائی رحم دل بھی ہیں جو اپنی تمام تر غربت

اور کم مائیگی کے باوجود کسی بھی مصیبت زدہ کے کام آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاید نیکی اور بدی کے اسی توازن کی وجہ سے ابھی دنیا کا نظام چل رہا ہے ورنہ یہ مکمل تباہی سے دوچار ہو چکی ہوتی۔

لیکن اس وقت تک خود اختر کو اپنے بارے میں یاد نہیں تھا کہ وہ کس حالت میں اور کس طرح نہر میں گرا تھا۔ اسی دوران اس نے بوڑھے کو کہتے سنا........ "بیٹا! اب تم ہمیں بتاؤ کہ تم کون ہو........ کہاں کے رہنے والے ہو........ اور نہر میں اس طرح زخمی حالت میں کیسے گرے تھے؟"

تب اختر کو عجیب اور خوفزدہ سا کر دینے والا ایک احساس ہوا۔ اس کا وجود گویا ایک خالی گنبد کی طرح تھا جس میں بوڑھے کی آواز گونج کر رہ گئی۔ بوڑھے کے سوالوں کا کہیں سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اختر چند لمحے کے لئے اپنی تکلیف بالکل بھول گیا۔ وہ یک لخت خوفزدہ سا ہو گیا۔ اسے تو واقعی یاد نہیں تھا کہ وہ کون تھا........ کہاں سے آیا تھا........ کیونکر نہر میں گرا تھا؟

اس کا سر بری طرح دکھ رہا تھا۔ اس نے ذہن پر زور دینے کی کوشش کی تو اس کے سر کی تکلیف میں اضافہ ہو گیا۔ اس کے باوجود اس نے کوشش جاری رکھی۔ بہت سوچا' بہت یاد کرنے کی کوشش کی لیکن کچھ یاد نہ آیا۔ ذہن میں کوئی کوئی یاد ابھرتی بھی تھی تو محض اس طرح جیسے رات کے اندھیرے میں بہت دور کہیں جگنو جھلملائے اور دوسرے ہی لمحے تاریکی میں معدوم ہو جائے یا پھر رات کے اندھیرے میں ساحلوں کی ریت پر ایک لمحے کے لئے کوئی روشنی لہرائے اور اس روشنی میں کہیں کہیں ریت میں چاندی جیسا کوئی ذرہ چمک اٹھے اور معدوم ہو جائے۔

ان یادوں کا کوئی ربط نہیں تھا۔ کوئی تسلسل نہیں تھا۔ سیاق و سباق نہیں تھا۔ سر پیر نہیں تھا۔ کسی چھوٹے سے کمرے کی جھلک تھی........ کسی چوڑی چکلی سڑک کی جھلک تھی........ کسی ساز کی جھلک تھی........ کسی حسین چہرے کی جھلک تھی........ ایک دوسرے میں گڈمڈ بہت سے چہروں کی جھلک تھی........

لیکن یہ سب تصویریں دھندلی دھندلی اور ناقابل شناخت تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کن تصویروں کی جھلکیاں تھیں........ ان سے اس کا کیا تعلق تھا۔ بہت کوشش کے باوجود اسے اپنا نام تک یاد نہ آ سکا البتہ اس کی کنپٹیوں میں ٹیسیں بڑھ گئیں۔

"چاچا........!" مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا۔ مجھے اپنا نام بھی یاد نہیں آ رہا........" وہ بے بسی سے بولا۔

اس کی چارپائی کے گرد کھڑے ہوئے تینوں افراد نے حیرت اور بے یقینی سے پہلے ایک

دوسرے کی طرف دیکھا پھر اختر کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک لمحے کے لئے گہرا سکوت رہا۔
بوڑھا گردن کو خفیف سا جھٹکا دے کر بولا.......... "ٹھیک ہے بیٹا! اگر تم نہیں بتانا چاہتے
تمہاری مرضی.........."

وہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ بوڑھے نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا تھا۔ وہ
تکلیف کو بھول کر الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا.......... "یقین کرو چاچا! مجھے واقعی کچھ
نہیں آ رہا.........."

اختر کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ اسے اتنا ضرور یاد تھا کہ اس نے ایسی
فلمیں دیکھی تھیں جن میں کسی حادثے میں ہیرو کی یادداشت کھو جاتی تھی۔ وہ اکثر سوچا
تھا کہ یادداشت کھو جانا شاید ایک خوشگوار عمل ہو.......... کتنا اچھا ہوتا ہوگا کہ انسان سب
کچھ بھول جاتا ہوگا۔ ہر اچھی بری یاد سے پیچھا چھوٹ جاتا ہوگا۔

یاد ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

کئی بار اس شعر میں مقید دعا اختر کو بہت اچھی لگی تھی۔ اس نے سوچا تھا حافظہ چھن
جانے سے انسان کتنا ہلکا پھلکا ہو جاتا ہوگا۔ جیسے اس نے ایک نیا جنم لیا ہو۔ کورے کاغذ جیسی
ایک نئی زندگی اس کی منتظر ہوتی ہوگی.......... پچھلی سب خطائیں، سب گناہ
معاف.......... سب زخم مندمل.......... اب نئے سرے سے جو جی چاہے لوح حیات
لکھئے۔ نئے سرے سے زمانے کے فریب کھایئے یا زمانے کو فریب دیجئے.......... حوصلے
آزمایئے، ارمان نکالئے۔

لیکن آج جب اس نے اپنے ذہن کو اپنے ہی بارے میں بالکل خالی پایا تو وہ یک لخت
دہشت زدہ سا ہو گیا۔ یہ تو بڑی عجیب اور بڑی خوفناک سی بات تھی کہ آپ کو اپنے بارے
میں کچھ معلوم ہی نہیں.......... اسے یوں لگا جیسے اسے یکدم کسی نے تاریکی کے بیکراں
سمندر میں دھکا دے دیا تھا۔ یہ احساس بہرحال اسے تھا کہ دنیا بہت بڑی تھی.......... اتنی
بڑی دنیا میں انسان بالکل بے شناخت ہو کر.......... اپنے بارے میں بالکل لاعلم ہو کر کیسے
گھوم سکتا تھا۔ یہاں تو قدم قدم پر اس سے بہت کچھ پوچھا جاتا تھا.......... قدم قدم پر
انسان کو تعارف کی ضرورت پڑتی تھی.......... ہر جگہ اسے اپنے بارے میں کچھ نہ کچھ بتانا
پڑتا تھا.......... وہ اپنے بارے میں کیا بتائے گا؟ شاید یہی بے بسی تھی جس کی وجہ سے اس
کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور شاید اس لئے ساتھ ساتھ تکلیف کا احساس بھی تھا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر گویا بوڑھے کو اس کی بات کا یقین آ گیا۔ وہ جھک کر
اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا.......... "بیٹا! تم پریشان مت ہو.......... شاید تم پر
کوئی بڑا حادثہ گزرا ہے جس کی وجہ سے فی الحال تمہارا ذہن کام نہیں کر رہا.......... لیکن

آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا.........."

اختر نے بہ مشکل گردن ذرا گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ ایک بڑی سی جھونپڑی میں تھا
جہاں ضروریات زندگی کا نہایت مختصر اور نہایت غریبانہ سا سامان موجود تھا۔ وہ ایک جھلنگا
سی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر ایک شکن آلود واسکٹ اور میلی سی دھوتی تھی۔
فلموں میں ہیرو کی یادداشت گم ہوتی ہے اور اسے کوئی بچاتا ہے تو عام طور پر جس گھر میں
اس کی آنکھ کھلتی ہے وہاں ایک ہیروئن ضرور موجود ہوتی ہے.......... لیکن جھونپڑی میں
اس کی آنکھ کھلی تھی وہاں کوئی ہیروئن نہیں تھی۔ بس وہ بوڑھا جوڑا اور ان کا بیٹا، کل تین
افراد تھے۔

اختر کو احساس ہوا کہ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ وہ اپنے جسم کے کسی حصے کو آسانی
سے حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے جسم پر بہت سی چوٹوں کے نشان اور زخم تھے مگر ان
پر پیلے پیلے رنگ کی نہ جانے کس کس چیز کا لیپ کر دیا گیا تھا۔ اس کی ایک کہنی اور دونوں
ٹانگوں پر نہ جانے کس درخت کے پتے بھی بندھے ہوئے تھے۔

"چاچا! میرے لئے کوئی ڈاکٹر تو بلا دو.........." اختر کراہ کر بولا۔

"ڈاکٹر..........؟" ان تینوں سانولے اور سادہ لوح سے افراد نے ایک دوسرے کی
طرف دیکھا۔ پھر بوڑھا ذرا ندامت آمیز لہجے میں بولا.......... "بیٹا! یہاں ڈاکٹر تو
کیا.......... کوئی حکیم بھی نہیں ہے۔ یہ کوئی باقاعدہ بستی یا گاؤں نہیں ہے صرف بیس
پچیس جھونپڑیاں ہیں جن میں ہم مچھیرے رہتے ہیں۔ صرف ایک دکان ہے جہاں سے
ضرورت کی تھوڑی بہت چیزیں مل جاتی ہیں۔ ہم بھی صرف اس نہر کی وجہ سے یہاں پڑے
ہوئے ہیں اس میں مچھلیاں پائی جاتی ہیں.......... اور کافی پائی جاتی ہیں.......... ہم سب
نے علاقہ بانٹ کر مچھلیاں پکڑتے ہیں.......... پانچ چھ میل دور ایک گاؤں ہے۔ روزانہ
وہاں سے سوزوکی آتی ہے اور مچھلیاں لے جاتی ہے۔ ہمیں دس بارہ روپے روز مل جاتے
ہیں۔ اس سے ہم گزارہ کرتے ہیں.......... اگر یہاں ڈاکٹر ہوتا بھی.......... تو ہم کیسے
بلاتے؟ ہم تو پیٹ ہی پتہ نہیں کیسے بھرتے ہیں اور تن پتہ نہیں کیسے ڈھانپتے ہیں..........

"ہاں.......... پانچ سات روپے روز میرے بیٹے کو بھی مل جاتے ہیں۔ بس کل یہی
کل آمدنی ہے۔ اسی میں ہم گزارہ کرتے ہیں.........." بوڑھے نے بتایا۔

پندرہ بیس روپے روز میں تین افراد کا ایک کنبہ گزارہ کرتا تھا۔ اختر کو یہ ناممکن
سا محسوس ہوا لیکن پھر وہ یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ اس دنیا میں نہ جانے کیا کچھ ہو رہا تھا جو
اس کی آنکھ سے اوجھل تھا۔ ہر شخص خود کو ہی بڑا مظلوم، کچلا ہوا، پسا ہوا.......... اور نہ
جانے کیا کچھ سمجھتا تھا لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ دنیا میں کہاں کہاں انسان، کس کس حال
میں زندگی بسر کر رہے تھے.......... لیکن اس وقت اختر کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس

نے بوڑھے کو ہاتھ جوڑ کر، چھت کی طرف دیکھ کر کہتے ہوئے سنا.......... "اللہ
ہے کہ گزر بسر ہو رہی ہے.........."

اس قناعت اور شکر گزاری پر اختر کوئی تبصرہ نہ کرسکا۔ صرف آہ بھر کر
بوڑھے نے اسے تسلی دی.......... "تم فکر مت کرو۔ تم ڈاکٹر یا حکیم کے بغیر ٹ
جاؤ گے۔ ہم نے تمہاری چوٹوں اور زخموں پر جو جڑی بوٹیاں لگائی ہیں ان سے تم با
ہو جاؤ گے.......... ہم بستی والے تو انہی چیزوں اور اللہ کی رحمت کے سہارے ب
کسی ڈاکٹر اور حکیم کے بغیر گزارہ کر رہے ہیں.........."

بوڑھے کا کہنا اپنی جگہ درست تھا لیکن اختر کو ان جڑی بوٹیوں کے لیپ و
زیادہ راس نہیں آئے۔ وہ کئی ماہ بستر پر پڑا رہا اور اس دوران سوکھ کر کانٹا ہوگیا۔ ا
دیکھ بھال اور صفائی ستھرائی کی ضرورت تھی وہ اسے میسر نہ آسکی۔ اس کی چوٹیں
ٹھیک ہوگئی تھیں لیکن اس کے دو تین زخموں میں انفیکشن ہوگیا۔ ان زخموں کو ٹھیک
میں بہت عرصہ لگا۔

اس دوران اختر بستر سے اٹھ کر چلنے پھرنے تو لگا تھا لیکن نقاہت بہت زیادہ تھ
کہیں آنے جانے یا کام کاج کرنے کے لائق نہیں تھا۔ کھانے میں وہاں اکثر جو کی روٹی
آلو وغیرہ ملتے تھے۔ بعض اوقات تو وہ بھی میسر نہیں ہوتے تھے۔ ان سب کو چٹنی
روٹی کھانا پڑتی تھی۔ مچھلی بھی میسر ہوتی تھی لیکن وہ روز نہیں کھائی جاسکتی تھی۔

اختر خود تو اپنے آپ کو اب بھی نہیں پہچانتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اگر اس
شناسا اسے دیکھتا تو شاید وہ بھی نہ پہچان سکتا تھا۔ اس میں بہت تبدیلیاں آگئی تھیں۔ ب
داڑھی، لمبے لمبے بال، آنکھوں کے گرد حلقے، رنگت سنولا گئی تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں
آئی تھیں۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آتا تھا اور اپنے آپ سے آگہی نہ ہونے کے
آنکھوں میں ایک عجیب خالی پن اور خفیف سی وحشت آگئی تھی۔

بوڑھا جس کا نام لکھو میر بحر تھا اور اس کا بیٹا آسو، اختر کا بساط بھر خیال رکھ
لیکن وہ دن بھر باہر رہتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد بڑھیا بھی کام کاج نمٹا کر ادھر
کہیں نہ کہیں پاس پڑوس میں چلی جاتی تھی یا فارغ وقت میں کھجور کے پتوں سے چٹائیاں
ٹوکریاں بناتی تھی۔

وہ اختر سے بہت کم بات کرتی تھی۔ اس نے کبھی کسی قسم کی ناراضگی یا برہمی کا
نہیں کیا تھا لیکن اختر اس کی آنکھوں میں ایک سرد مہری سی دیکھنے لگا تھا۔ یہ کوئی تعج
بات نہیں تھی۔ ظاہر تھا جہاں دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے رہتے تھے۔ وہاں ا
صاحب فراش فرد کا اضافہ ہو جانا کوئی خوشی کی بات نہیں تھی۔ اختر کو اس سے کوئی
نہیں تھا۔

بہرحال کسی نہ کسی طرح اس کے زخم بہت عرصے میں جا کر ٹھیک ہوگئے۔ وہ آسانی
نے پھرنے لگا مگر اب بھی وہ کام کاج کرنے کے لائق نہیں تھے۔ دن بھر وہ بستر پر پڑا
اس کا ذہن ایک عجیب ادھیڑ بن میں لگا رہتا۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسا پنچھی محسوس
ں کی قوت پرواز چھن گئی تھی۔ ویسے وہ بالکل صحیح الدماغ تھا۔ لکھ پڑھ سکتا تھا۔
بھی بول سکتا تھا۔ دنیا اور دنیا داری کے بارے میں اس کا علم بھی برقرار تھا۔ بس
نے ہی بارے میں کچھ یاد نہیں رہا تھا۔

لیکن اسے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ اب درحقیقت وہ ذہنی طور پر پہلے والا انسان رہا
یں تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح تھوڑا سادہ لوح، تھوڑا شرمیلا، تھوڑا قناعت پسند، وفا
اور محبت کا متلاشی وغیرہ نہیں رہا تھا۔ اندر ہی اندر اس میں اب ایک انقلاب آچکا تھا
اب چونکہ وہ اسی جھونپڑی تک محدود تھا اس لئے اسے خود بھی اپنی اس تبدیلی کا صحیح
ادراک نہیں تھا۔

ہم تو مختلف ساخت کے کمپیوٹر اور ان کے کمالات دیکھ کر ہی حیران ہوتے رہتے ہیں
نسانی ذہن قدرت کا شاہکار کمپیوٹر ہے جس کی ساخت اور پیچیدگیوں سے پوری طرح
م ابھی مزید کروڑوں سال تک آگاہ نہیں ہوسکیں۔ اختر کو جو حادثہ پیش آیا تھا اس میں
ماغ نامی اس سپر کمپیوٹر کا کوئی ایسا بٹن دب گیا تھا جس سے اختر کی نجی "میموری>
ہوگئی تھی مگر اس کی جگہ اس کے "ذہن" اس کی سوچ میں بہت سی تبدیلیاں آچکی
اب وہ اندر ہی اندر ایک چالاک، عیار، شاطر اور خودغرض نوجوان تھا۔ دنیا کی مثبت
ی قدروں پر اب اس کا کچھ زیادہ یقین نہیں رہا تھا۔

جس وقت اس کا حادثہ ہوا اس وقت شاید اس کے ذہن میں یہ کشمکش، یہ سوچ بہت
پر تھی کہ اسے سادگی، معصومیت اور وفا پرستی کے صلے میں کیا ملا؟ جن کی طرف اس
لوص سے ہاتھ بڑھایا انہوں نے اسے کیا دیا؟ شاید حادثے نے اس کے ذہن پر اس کا
منفی ردعمل مرتب کر دیا تھا۔ اب اس کے دل میں اچھی خصوصیات اور اعلیٰ انسانی
ار وغیرہ کا کوئی مقام نہیں رہا تھا۔

مثلاً اگر وہ پہلے والا اختر ہوتا تو اپنے بوڑھے محسن لکھو میر بحر کو دیکھ کر خوش ہوا
جو اپنی تمامتر غربت اور فاقہ کشی کے باوجود اذان کے ساتھ اٹھتا تھا، نماز پڑھتا اور خدا کا
کر شکر ادا کرتا تھا۔ وہ اس طرح قانع اور مسرور نظر آتا تھا جیسے اسے دنیا کی ہر آسائش
ہو۔

لیکن اب اختر اسے دیکھتا تھا تو اسے دل ہی دل میں غصہ آتا تھا۔ "پتہ نہیں یہ بڈھا ہر
ن آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر کس بات کا شکر ادا کرتا رہتا ہے۔ اس کے پاس کیا
.... جس کا یہ شکر ادا کرتا ہے؟"

یہ اور اس طرح کے بہت سے باغیانہ خیالات اس کے ذہن میں آتے رہتے۔ وہ اندر ہی اندر بہت بے چین تھا۔ اس کا بہت کچھ کر گزرنے کو جی چاہتا تھا لیکن کیا کرے؟ یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا.......... اور ابھی نقاہت کے باعث وہ کچھ کرنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ کبھی کبھی وہ ٹوٹے اور دھندلے سے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا تو ایک لمحے کے لئے عجیب سا اندیشہ بھی محسوس کرتا۔ کہیں وہ کوئی مفرور مجرم تو نہیں؟ کہیں باہر کی دنیا میں.......... کسی دور دراز شہر میں زور و شور سے اس کی تلاش تو جاری نہیں؟ یہ خیال آتا تو اس کا دل ذرا بیٹھ جاتا۔ اس عالم میں وہ جھونپڑی اسے ایک محفوظ پناہ گاہ محسوس ہونے لگتی اور جلد از جلد وہاں سے نکل بھاگنے کی خواہش کچھ کمزور پڑ جاتی۔

جب اس کے جسم میں ذرا جان آئی تو اس نے لکھو اور اس کے بیٹے آسو کے ساتھ نہر پر جانا شروع کیا۔ اس کی کوشش تھی کہ ان کا کچھ ہاتھ بٹائے کیونکہ ایک تو گھر پر بڑھیا کی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی سرد مہری اس کے لئے کچھ تکلیف دہ سی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ تو اب خاصا ڈھیٹ ہو چکا تھا جو اسے اب تک برداشت کئے جا رہا تھا۔ اگر وہ پہلے والا اختر ہوتا تو کب کا وہاں سے رخصت ہو چکا ہوتا خواہ راستے میں فاقوں سے مر جاتا۔

لیکن اب وہ اچھی طرح تندرست ہو کر، سوچ سمجھ کر اور پلے میں کچھ رقم لے کر ہی وہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ اب وہ یونہی محض انا اور خودداری کا تقاضا نبھانے کے لئے منہ اٹھا کر کہیں چل دینے یا کچھ کر گزرنے کا قائل نہیں رہا تھا۔ بڑے میاں اور اس کے بیٹے کے ساتھ نہر پر جانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ شاید اس طرح اس کے پاس الگ سے اپنی کچھ پس انداز ہو جائے۔

کچھ عرصہ اس نے کنارے ہی پر رہتے ہوئے لکھو اور آسو کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کی۔ جب اس کی جسمانی حالت کچھ بہتر ہو گئی تو وہ ان کے ساتھ چھوٹا سا جال پکڑ کر نہر میں اترنے لگا لیکن جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ یہ اس کے بس کا کام نہیں تھا۔ اس سے نہ نہر میں اترنے اور کئی کئی گھنٹے آڑا ترچھا ہو کر پانی میں پھرنے کی مشقت ہوتی تھی اور نہ اسے مچھلیوں کا لمس اور ان کی پھاند اچھی لگتی تھی۔ ہر وقت مچھلیاں دیکھ دیکھ کر اس کا جی مچھلیوں سے اوب گیا تھا۔ اس نے تو مچھلی کھانی بھی بہت کم کر دی تھی۔ کبھی کبھار اس خیال سے کھا لیتا تھا کہ اس گھر میں مچھلی کے علاوہ کوئی توانائی بخش خوراک میسر ہی نہ تھی۔ نہر پر جانے سے البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس کا رنگ کچھ اور سانولا ہو گیا۔

اس کے علاوہ یہ دیکھ کر بھی اس کا دل اکتا گیا کہ اتنی مشقت سے محض چند روپے ملتے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ گاؤں سے آنے والا سوزوکی والا جو کسی ٹھیکیدار کا کارندہ تھا ایک طرح سے سب کو ٹھگ کر لے جاتا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ اس بھاؤ تو شہر میں کوڑا بھی نہیں ملتا ہو گا جس بھاؤ وہ ان مچھیروں سے مچھلیاں خرید کر لے جاتا تھا۔

ایک روز اس نے لکھو سے کہا۔ "تم لوگ گاؤں جا کر خود اپنی مچھلی کیوں نہیں بیچتے۔ وہاں مچھلی اچھے بھاؤ بکتی ہو گی ٹھیکیدار تو بہت روپیہ کماتا ہو گا"۔

"ٹھیکیدار ہمیں مچھلی لے کر گاؤں میں گھسنے بھی نہیں دے گا"۔ لکھو نے بتایا۔ "اس کے علاوہ مچھلی گاؤں میں بھی کہاں بکتی ہے ٹھیکیدار برف میں پیک کر کے وہاں سے بھی کہیں آگے بھیجتا ہے"۔

اختر نے قدرے مایوسی سے پوچھا۔ "تم لوگ گاؤں میں ہی جھونپڑیاں ڈال کر کیوں نہیں رہتے؟ یہاں ویرانے میں کیوں پڑے ہو؟"

"گاؤں میں تو باقاعدہ ٹاؤن کمیٹی ہے۔ وہاں ہمیں کوئی یونہی مفت میں جھونپڑیاں تھوڑا ہی بنانے دے گا۔ فوراً" اٹھا دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ گاؤں کے قریب ہمیں کوئی نہر سے مچھلیاں بھی نہیں پکڑنے دے گا۔ لائسنس بنواؤ.......... یہ کرو وہ کرو یہاں تو ہم سب ایسے ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہاں بڑی عافیت ہے ہم لوگ زیادہ جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتے"۔

ان کی قناعت پسندی سے اختر بڑا تنگ تھا کیونکہ وہ وہاں گویا قید ہو کر رہ گیا تھا۔ کوئی ایسی سبیل نظر نہیں آتی تھی کہ اس کے ہاتھ کچھ رقم لگ سکے اور وہ وہاں سے روانہ ہو سکے۔ وہ ذرا تحمل سے انتظار کرتا رہا۔ لکھو اس کا محسن تھا۔ اختر کے دل میں اس کا تھوڑا بہت احترام ضرور تھا لیکن کوئی بعید نہیں تھا کہ اگر اس کے گھر میں رقم ہوتی تو اختر مناسب موقع دیکھ کر چرا کر بھاگ جاتا لیکن لکھو کے گھر میں اختر نے کبھی دس روپے بھی روزمرہ خرچ کے علاوہ رکھے نہیں دیکھے تھے۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ لکھو نے ایک روز باتوں باتوں میں اختر کو بتایا تھا کہ اس کے باپ نے یہ سوچ کر اس کا نام لکھو رکھا تھا کہ شاید ایک روز اس کا بیٹا لکھ پڑھ ہو گا۔ اس پر اختر بے اختیار ہنس دیا تھا لیکن اس کی ہنسی بھی ایک کراہ سے مشابہ تھی۔

اختر کو چونکہ اس دوران بھی کوشش کے باوجود اپنا نام یاد نہیں آ سکا تھا اس لئے اس نے خود ہی ایک روز کچھ دیر سوچنے کے بعد اپنا نام شاہد رکھ لیا تھا اب وہ اسی نام سے پکارے جانے پر متوجہ ہوتا تھا۔

لکھو اور اس کا بیٹا رات کو کبھی کبھار بیٹھ کر اس سے باتیں کرتے اور کوشش کرتے کہ اسے یاد آ جائے وہ کہاں رہتا تھا۔ اختر.......... جو اب شاہد ہو چکا تھا' ذہن پر زیادہ زور دیتا تو اس کی کنپٹیوں میں ٹیسیں اٹھنے لگتیں۔ وہ کنپٹیاں مسلتے ہوئے کہتا۔ "مجھے کچھ کچھ یاد تو پڑتا ہے کہ میں کسی بڑے شہر میں رہتا تھا.......... بہت ہجوم ہوتا تھا وہاں.......... بہت گاڑیاں.......... اونچی اونچی عمارتیں.......... ہر جگہ ہجوم.......... لیکن یاد نہیں آتا اس کا نام کیا تھا.......... میں اس شہر میں کس جگہ رہتا تھا.......... اور یہ کب کی بات ہے؟ کچھ یاد نہیں آتا.........."

لکھو اس کی یہ بات سن کر کچھ سوچتے ہوئے سر کھجا کر بولا۔ ”میں نے دیکھا نہیں.......... لیکن سنا ہے ایسا شہر تو کراچی ہے.......... لیکن وہ تو یہاں سے بہت دا ہے۔ تم اتنی دور سے یہاں کہاں پہنچ گئے؟“

”یہی تو مجھے معلوم نہیں“۔ شاہد ٹھنڈی سانس لے کر بولا اور کسی خیال میں کھو گیا نام کراچی کچھ اس کے دل کو لگا تھا کچھ مانوس سا محسوس ہوا تھا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ جب بھی یہاں سے نکلا سیدھا کراچی ہی جائے گا اس کے لئے اس نے معلومات بھی حاصل کر شروع کر دی تھیں اس کے لئے تو صرف کرائے اور سفر خرچ وغیرہ کا بندوبست کرنا ہی ایک مسئلہ بنا ہوا تھا جبکہ وہ تو اس کے علاوہ بھی دو چار ہزار روپے فالتو لے کر روانہ ہونا چاہتا تھا وہ برے حالوں کراچی پہنچنا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی اسے یہ گوارا تھا کہ وہاں پہنچ کر ا دھکے کھانے پڑیں۔

اس کے علاوہ فی الحال وہ اس لئے بھی کچھ زیادہ جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کر رہا تھا اس کے ذہن کے کسی تاریک گوشے سے یہ اندیشہ بار بار سر ابھارتا تھا کہ کہیں وہ کوئی مفرور مجرم تو نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ کراچی یا راستے کے کسی بھی اسٹیشن پر پلیٹ فارم پر اتر ہی اسے گرفتار کرلیا جائے؟

انہی تمام سوچوں کے تحت وہ نہایت صبر و تحمل سے انتظار کر رہا تھا۔ لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ کس معجزے کے تحت چند ہزار یا اس سے زیادہ رقم اس کے ہاتھ آئے گی۔ تا اس کا ذہن دن رات اسی ادھیڑ بن میں لگا رہتا تھا تقریباً“ آٹھ نو مہینے اسے مکمل صحت یاب ہونے میں لگے تھے اور اس کے بعد پانچ چھ مہینے اسے انتظار کرتے ہوئے گزر گئے تھے۔

اس عرصے میں اسے اس ماحول سے مانوس ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ گھر اسے اپنے گھر کی طرح لگنا چاہیے تھا لیکن معاملہ اس کے الٹ تھا جوں جوں زیادہ عرصہ گزرتا جا رہا تھا اس ماحول سے اس کی اکتاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ جھونپڑی کے در و دیوار اور بستی کا ماحول اسے کاٹنے کو دوڑتا تھا شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے ذہن میں بٹھا رکھا تھا اسے وہاں لے جانا تھا۔

لیکن انتظار کرتے کرتے بالآخر وہ مایوس ہوگیا۔ اسے کہیں سے رقم ملنے کی کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی چنانچہ اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ ٹھیکیدار کے کارندے کے ساتھ سوزوکی میں بیٹھ کر قریبی گاؤں چلا جائے گا اس ویرانے میں پڑے رہنے سے تو یہی بہتر تھا کہ وہ گاؤں جا کر کوئی کام کاج تلاش کرنے کی کوشش کرتا اس نے لکھو، اس کی بیوی اور بیٹے کو بھی اپنے اس فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔

لکھو نے افسردگی سے کہا تھا۔ ”بیٹا! تم یہ ہرگز مت سمجھنا کہ تم ہم پر بوجھ ہو میں نے تمہیں اپنا دوسرا بیٹا سمجھ کر رکھا ہوا ہے میں نے تمہیں ابھی تک بتایا نہیں تھا..........

بڑا آسو سے بڑا ایک بیٹا اور تھا.......... وہ نمونئے میں مبتلا ہو کر مر گیا تھا۔ چھوٹا ہی تھا وہ اس وقت۔ جب سے تم اس گھر میں آئے ہو میں تمہیں دیکھ دیکھ کر یہی سوچتا رہتا ہوں کہ آج اگر پریل زندہ ہوتا تو اتنا ہی بڑا ہوتا۔ میں نے تو اب تمہیں اپنا دوسرا بیٹا ہی محسوس کرنا شروع کر دیا ہے۔ میں تمہیں یہاں رہنے پر مجبور تو نہیں کرسکتا۔ اگر تمہارا یہاں دل نہیں لگتا تو ٹھیک ہے.......... چلے جاؤ لیکن یہ بالکل مت سمجھنا کہ تم ہم پر بوجھ ہو“۔

لکھو کی آواز رندھ گئی تھی اور وہ جلدی سے منہ پھیر کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا تھا۔ شاہد نے اس کی اس جذباتی تقریر کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس پر اب جذباتی باتوں کا اثر ذرا کم ہی ہوتا تھا۔ اس کا ذہن تو اپنے بارے میں ہی سوچوں میں الجھا رہتا تھا۔

اس رات دیر تک وہ سب چپ چپ سے رہے سونے کے لئے لیٹ گئے مگر نیند شاید کسی کو بھی نہیں آ رہی تھی۔ حالانکہ روزانہ وہ اس سے بہت پہلے سو جاتے تھے۔ بستی میں ویسے بھی سرشام ہی سناٹا چھا جاتا تھا۔

اس رات ایک عجیب ہی واقعہ ہوا۔ اگر شاہد اس روز دن میں ہی گاؤں جانے کے لئے نکل گیا ہوتا تو شاید اس کی زندگی کسی اور ہی ڈگر پر ہوتی۔

آدھی رات کا وقت تھا اور وہ چاروں ابھی تک چپکے چپکے.......... کروٹیں بدل رہے تھے دفعتاً“ دور کہیں قدموں کی دھپ دھپ سنائی دی اور پھر کسی نے زور سے جھونپڑی کا دروازہ دھڑ دھڑایا۔ چاروں بیک وقت ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

”کون ہے؟“ لکھو نے خوفزدہ سے لہجے میں پوچھا۔

”مسافر، جلدی سے دروازہ کھولو میں بڑی تکلیف میں ہوں“۔ کسی نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ چاروں ساکت بیٹھے رہے کوئی بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا کم از کم شاہد کو ہرگز یقین نہیں تھا کہ وہ کسی مسافر کی آواز تھی لکھو کو اگر یقین بھی تھا تو شاید وہ اس لئے بیٹھا رہا ہو کہ ابھی تو ایک مصیبت زدہ ہی گھر میں موجود تھا اس کے رخصت ہونے سے پہلے ہی دوسرا چلا آیا تھا۔

باہر مسافر یا جو کوئی بھی تھا اس نے صرف ایک لمحے انتظار کیا۔ دوسرے ہی لمحے دھڑ سے دروازہ ایک اور وار دھکے سے کھل گیا جھونپڑی کا دروازہ کیا تھا چند بوسیدہ سے تختوں کا ایک آڑا ترچھا سا مجموعہ تھا جو ایک شکستہ سی لکڑی کے سہارے بند رہتا تھا۔ اس شخص نے غالباً“ دروازے پر لات ماری تھی اور وہ لکڑی چرچرا کر ٹوٹ گئی تھی۔ اس لکڑی کے کھانچے سے نکلتے ہی دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا تھا۔ اس بستی کے ماحول میں اور لکھو کی غربت کو مدنظر رکھتے ہوئے تو اس جھونپڑی میں دروازے کے تکلف کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

دروازہ کھلتے ہی ایک سیاہ پوش اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں لمبا سا پستول تھا۔ وہ سیاہ شلوار قمیض میں تھا جو کئی جگہ سے مٹی میں لتھڑی ہوئی تھی۔ ایک آستین بھی پھٹی ہوئی نظر

آ رہی تھی۔ اس کے منہ پر سیاہ ڈھاٹا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں جن
وحشت عیاں تھی۔

"دھاڑیل..........." لکھو کی بیوی کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی۔

"چپ رہ بڑھیا!" ڈاکو نے پستول لہراتے ہوئے اسے ڈانٹا لکھو شاید اس ستم ظریفی
دم بخود بیٹھا تھا کہ اب ان جھونپڑوں میں بھی ڈاکو آنے لگے تھے جہاں دو وقت کی روٹی
لالے رہتے تھے۔

لیکن ڈاکو نے جلد ہی اس کی یہ غلط فہمی دور کر دی۔ پستول لہراتے ہوئے اس
ایک سیکنڈ میں ہی جھونپڑی کا جائزہ لے ڈالا اور ہاتھ عقب میں لے جاتے ہوئے جھونپڑی
دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔ چہرے پر ڈھاٹا ہونے کی وجہ سے اس کی آواز گھٹی گھٹی سی سنا
دے رہی تھی لیکن اب وہ بولا تو بہرحال اس کے لہجے میں قدرے نرمی تھی۔

"دیکھو........... میرے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے..........." وہ تیزی سے بولا۔
مجھے یہاں چھپنا ہے۔ اگر تم میں سے کسی نے بھی پولیس کو میرے بارے میں بتایا تو
چاروں ہی کی خیر نہیں جلدی سے چارپائیوں سے اترو۔"

ان چاروں نے اس کے حکم کی تعمیل میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی اور یوں
چارپائیوں سے لڑھک آئے جیسے کسی نے چاروں کو بیک وقت دھکا دے دیا ہو۔ ڈاکو نے
چاروں چارپائیوں کا ایک لمحے میں جائزہ لیا اور کچھ سوچ کر شاہد کی چارپائی کو ایک دیوار کے
قریب لے گیا۔ اس دوران اس کی نظر ایک لمحے کے لئے بھی ان پر سے نہیں ہٹی اور لا
لہراتے ہوئے پستول کی زد پر بھی رہے۔

اس نے چارپائی پر بچھی ہوئی رلی اس طرح ذرا آگے کو کھینچ لی کہ وہ تقریباً زمین
تک لٹک گئی۔ اب وہ چارپائی کے نیچے چھپنے والے کے لئے پردے کا کام دے سکتی تھی۔

"میں اس چارپائی کے نیچے چھپوں گا..........." ڈاکو نے اعلان کیا۔ "اور اس رلی کے
پیچھے سے میری تم چاروں پر نظر رہے گی۔ تم چاروں میرے ٹی ٹی کے نشانے پر ہوؤ گے۔ تم
بالکل معصوم بن جانا کہ تمہیں کسی ڈاکو کے بارے میں کچھ پتہ نہیں........... اور نہ ہی
یہاں کوئی آیا ہے........... اگر تم میں سے کسی نے بھی پولیس کو یہاں میری موجودگی کے
بارے میں اشارہ دینے کی کوشش کی تو یاد رکھنا تم چاروں میں سے کوئی زندہ نہیں بچے گا۔
پولیس تو بعد میں میرا جو حشر کرے گی سو کرے گی لیکن میں تم چاروں کا قصہ ختم کر دوں گا
سمجھ گئے نا؟"

چاروں نے سعادت مندی سے سر ہلایا تب ڈاکو ذرا نرمی سے بولا۔ "اگر میں پولیس
سے بچ گیا تو فوراً یہاں سے نکل جاؤں گا۔ تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ تمہارا اس میں کوئی
نقصان نہیں ہے۔ تمہیں بس ذرا زبان بند رکھنی ہے۔"

چاروں نے ایک بار پھر سر ہلایا۔ش اس دوران کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی
دینے لگی تھی ڈاکو جلدی سے چارپائی کے نیچے گھس گیا اور لٹکی ہوئی رلی کے پیچھے غائب
ہو گیا۔

انجن کی آواز لحہ بہ لحہ قریب آتی جا رہی تھی۔

آخر کار آواز سے اندازہ ہوا کہ کوئی گاڑی جھونپڑی کے قریب آ کر رکی تھی۔
پگڈنڈی سے آنے والوں کے لئے لکھو کی جھونپڑی ہی سب سے پہلے پڑتی تھی۔ شاید اسی
لئے ڈاکو اس کی جھونپڑی میں آن گھسا تھا اور گاڑی بھی وہیں آ کر رکی تھی۔

چند لمحے بعد ایک بار پھر لات مار کر لکھو کی جھونپڑی کا دروازہ کھولا گیا اور دھڑ دھڑ
کرتے دو تین پولیس والے اندر گھس گئے سب سے آگے والے کے ہاتھ میں ریوالور اور
باقی دونوں کے ہاتھوں میں تھری ناٹ تھری کی رائفلیں تھیں۔

ریوالور والا اے ایس آئی تھا۔ اس کا ریوالور لہرانے کا انداز ڈاکو سے کچھ زیادہ مختلف
نہیں تھا۔ اس نے سرسری نظر سے جھونپڑی کا جائزہ لیا۔ لکھو سب سے آگے کھڑا تھا۔ اے
ایس آئی نے اسی کو مخاطب کیا۔ "بابا! کوئی ڈاکو تو ادھر نہیں آیا تھا؟"

لکھو ہاتھ باندھتے ہوئے بولا۔ "سائیں! کسی نے دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا تو تھا
لیکن ہم نے ڈر کے مارے کھولا نہیں........... ہم سب جاگ گئے تھے اور ابھی سوچ رہے
تھے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے........... وہ جو کوئی تھا دو تین مرتبہ دروازہ پیٹنے کے بعد شاید
آگے کہیں چلا گیا..........."

"ٹھیک ہے........... ٹھیک ہے........... ہم آگے دیکھتے ہیں........... تم دروازے
کو ذرا اچھی طرح بند رکھو........... کسی کو گھسنے مت دینا"۔ اے ایس آئی نے زیادہ باریک
بینی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ شاید اسے احساس تھا کہ اسے ابھی بہت سی جھونپڑیوں میں پوچھ گچھ
کرنا تھی۔ اس لئے وہ جلد بازی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

وہ لوگ جس تیزی سے آئے تھے اسی تیزی سے رخصت ہو گئے۔ سب نے قدرے
اطمینان کی سانس لی۔ لکھو نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا لیکن ڈاکو فوری طور پر چارپائی
کے نیچے سے نہیں نکلا۔ وہ چاروں تذبذب کے سے عالم میں ادھر ادھر کھڑے رہے۔ باہر
مکمل سکوت چھا گیا تھا۔ انہیں احساس تھا کہ ڈاکو رلی اور چارپائی کے ایک پائے کے درمیان
باریک سی جھری بنائے انہیں دیکھ رہا تھا اور اس کے پستول کا رخ بھی ان کی طرف تھا اس
لئے وہ اس کے حکم کے بغیر اپنی اپنی جگہ پر واپس جانے کی بھی کوشش نہیں کر رہے تھے۔

کئی منٹ بعد آخر کار ڈاکو چارپائی کے نیچے سے نکل آیا۔ پستول اب بھی اس کے ہاتھ
میں تھا اور وہ اب بھی اتنا ہی وحشت زدہ تھا جتنا جھونپڑی میں گھستے وقت نظر آ رہا تھا۔

اس وقت وہ سب حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے جب ڈاکو ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔

"تم سب کی بڑی مہربانی.......... بہت شکریہ.......... تم لوگوں نے میری جان بچائی ہے.........."

انہیں کسی ڈاکو سے اس قسم کے الفاظ سننے کی امید نہیں تھی۔ شاید وہ خاصا "شریف" ڈاکو تھا یا پھر ابھی اس پیشے میں نیا اور اناڑی تھا۔ اس لئے خوفزدہ ہو کر بھاگا پھر رہا تھا ورنہ وہ لوگ تو آئے دن ڈاکوؤں کے کچھ اس قسم کے قصے سنتے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ پولیس والے ڈاکوؤں سے ڈر کر اس طرح بھاگے پھرتے تھے۔

ڈاکو نے دروازے کی ایک جھری سے آنکھ لگا کر باہر جھانکا اور ہڑبڑا کر ذرا پیچھے ہٹ آیا۔ وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔ "ابھی تو دو پولیس والے جیپ کے پاس ہی کھڑے ہیں.......... شاید وہ دوسری طرف کی جھونپڑیوں میں جانے کا ارادہ کر رہے ہیں"۔

وہ دروازے ہی سے ٹیک لگائے چند لمحے گہری گہری سانسیں لیتا رہا پستول اب ڈھیلے ڈھالے انداز میں اس کے ہاتھ میں جھول رہا تھا۔ شاید اسے اب یقین ہوگیا تھا کہ اس جھونپڑی کے مکین اسے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کریں گے۔ اس لئے وہ اب ان پر پستول تان کر رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ لکھو کی بیوی تھکے تھکے سے انداز میں اپنی چارپائی پر جا کر بیٹھ گئی۔ ڈاکو نے صرف محتاط انداز میں اس کی طرف دیکھنے پر اکتفا کیا۔ کوئی اعتراض نہیں کیا۔

چند لمحے بعد اس نے دوبارہ گھوم کر دروازے کی جھری سے آنکھ لگا کر دیکھا اور مطمئن سے انداز میں گہری سانس لے کر بولا۔ "چلے گئے.......... چلے گئے.........." اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ نہایت احتیاط سے اس نے دروازہ کھولا اور دوسرے ہی لمحے ملگجے اندھیرے میں غائب ہوگیا۔

لکھو نے لپک کر دروازہ ایک بار پھر بند کر دیا اور خود کو گویا بہت محفوظ محسوس کیا۔ حالانکہ وہ دیکھ چکا تھا کہ وہ دروازہ کسی کو اندر آنے سے روکنے کے سلسلے میں کتنا بے وقعت تھا۔ وہ تھکی تھکی سی سانس لے کر اپنی چارپائی پر جا بیٹھا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اللہ سائیں نے بڑا کرم کیا.......... مصیبت ہمارے سر سے ٹل گئی.......... ہمیں کوئی پریشانی نہیں اٹھانی پڑی.........."

لکھو کے بیٹے اور شاہد نے بھی اس کی تقلید کی اور اپنی اپنی چارپائیوں پر آ بیٹھے۔ کچھ دیر وہ ڈاکو کے بارے میں باتیں کرتے رہے بالآخر سونے کے لئے دوبارہ لیٹ گئے۔ ان میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ باہر جا کر دیکھتے کہ پولیس والے کس کس جھونپڑی کی تلاشی لے رہے تھے اور بستی والوں کا کیا حال تھا۔ شاید انہیں اس لئے بھی تجسس نے مغلوب نہیں کیا تھا کہ انہیں معلوم تھا کہ ڈاکو تو نکل ہی چکا تھا۔ کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد بالآخر انہیں نیند آ ہی گئی۔

علی الصبح وہ اٹھ کر ناشتے سے پہلے باہر نکلے تو بستی کے بہت سے مرد جھونپڑیوں کے درمیان موجود چھوٹے سے ایک میدان میں جمع تھے۔ یہ میدان بستی والوں کے لئے ایک طرح کی چوپال کا کام دیتا تھا۔ کسی بھی گھر میں وقوع پذیر ہونے والے اہم یا غیر اہم معاملات پر یہیں بیٹھ کر تبادلہ خیال کیا جاتا تھا اور جنہیں فارغ وقت میسر ہوتا تھا وہ اسی میدان میں ٹوٹے ہوئے درختوں کے تنوں یا پتھروں پر بیٹھ کر گپ شپ کیا کرتے تھے۔

اس روز علی الصبح ہی وہاں کافی لوگ موجود تھے اور گزشتہ شب پولیس کی آمد کے بارے میں ہی باتیں ہو رہی تھیں۔ ان لوگوں کے لئے یہ ایک نہایت اہم واقعہ تھا کہ پولیس ایک ڈاکو کی تلاش میں ان کی بستی میں آئی تھی۔ ہر ایک نہایت تفصیل.......... بلکہ مبالغے کے ساتھ بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ پولیس کس طرح اس کی جھونپڑی میں داخل ہوئی اور کس طرح ان کے درمیان سوال و جواب ہوئے۔ صرف لکھو، اس کا بیٹا آسو اور شاہد خاموش تھے۔

سب سے آخر میں پولیس جمال دین کی جھونپڑی میں گئی تھی اور جب وہ لوگ وہاں بھی ڈاکو کو تلاش کرنے میں ناکام رہے تو جھنجلا گئے تھے۔ جمال دین نے بتایا کہ ایک پولیس والے نے اسے دو چانٹے رسید کئے جس پر وہ سخت رنجیدہ تھا۔ لکھو، آسو اور شاہد خاموشی سے اپنی جھونپڑی میں واپس آ گئے۔ وہ اپنے آپ کو چور چور سا محسوس کر رہے تھے۔ جیسے جمال دین کو چانٹے لگنے کے ذمہ دار وہی تھے۔

لکھو کی بیوی نے ناشتہ تیار کرلیا تھا۔ ان لوگوں کا معمول تھا کہ ناشتے سے پہلے اپنے اپنے بستر سمیٹ کر چارپائیاں اٹھا کر دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑی کر دیا کرتے تھے۔ اس روز وہ تینوں حسب معمول اپنی چارپائیاں اٹھا کر کھڑی کرنے لگے تو شاہد کو اپنی چارپائی کے نیچے چھوٹی سی ایک پوٹلی پڑی نظر آئی۔

چارپائی کھڑی کرنے کے بعد اس نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ وہ گہرے رنگوں کا ایک میلا سا ریشمی رومال تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں کچھ مڑے تڑے کاغذ بندھے ہوئے تھے لیکن شاہد نے اسے کھولا تو پوٹلی اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ ویسے تو اس میں کاغذ بندھے ہوئے تھے لیکن وہ بہت قیمتی کاغذات تھے۔ ایسے کاغذ جنہیں دیکھنے کے لئے اس کی آنکھیں کب سے ترس رہی تھیں۔

وہ ہزار، پانچ سو اور سو کے کچھ نوٹ تھے جو مڑی تڑی سی حالت میں اس طرح رومال میں موجود تھے جیسے انہیں عجلت کے عالم میں باندھا گیا ہو۔ اگر شاہد کو ذرا سا شبہ بھی ہوتا کہ اس میلے رومال سے نوٹ برآمد ہوں گے تو وہ تنہائی میں، کسی کونے کھدرے میں جا کر نہایت احتیاط اور رازداری سے اسے کھولتا لیکن اسے تو اب یہ یقین ہوچکا تھا کہ اس جھونپڑی میں کبھی کسی کو کوئی بڑا نوٹ دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔ اس لئے وہ پوٹلی کو بھی ذرا

سے تجسس کے تحت مگر یونہی بے دلی سے کھولنے کھڑا ہو گیا تھا۔

نوٹوں پر نظر پڑتے ہی پہلا خیال اس کے دل میں یہی آیا کہ جلدی سے انہیں دوبارہ رومال میں لپیٹ کر نیفے میں اڑس لے۔ مگر اب وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ لکھو اس کے قریب ہی کھڑا حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔

"یہ.......... یہ کس کے پیسے ہیں؟" لکھو ہکلایا۔

"اس کا صحیح جواب دینا تو بہت مشکل ہے.........." شاہد نوٹوں کو سیدھا کرتے ہوئے بولا۔ "بہرحال.......... میرا خیال ہے اس ڈاکو کے جو رات آ کر میری چارپائی کے نیچے چھپا تھا۔ بے خبری میں اس سے گر گئے.......... بہت گھبرایا ہوا تھا نا وہ.......... لیکن ظاہر ہے یہ اس کے اپنے بھی نہیں ہوں گے۔ معلوم نہیں کس بے چارے کے گھر سے لوٹ کر لایا ہو گا"۔

شاہد نے نوٹ سیدھے کر کے گننے شروع کر دیئے۔ وہ کل تیرہ ہزار سات سو روپے تھے۔ اس نے ان کی پتلی سی گڈی بنائی۔ ذرا اور اچھی طرح انہیں سیدھا کیا پھر اس پتلی سی گڈی کو دہری کر کے بڑے اطمینان سے جیب میں رکھنے لگا۔ اس وقت تک آسو اور اس کی ماں بھی اس کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" لکھو حیرت سے بولا۔

"جیب میں رکھ رہا ہوں.......... اور کیا کر رہا ہوں۔ شاہد نے جواب دیا۔ "یہ اللہ نے میرے لئے امداد بھیجی ہے۔ میں ایسے ہی کسی معجزے کا انتظار کر رہا تھا۔ میری یادداشت میں ایک محاورہ گونج رہا ہے کہ اللہ جب دیتا ہے چھپڑ پھاڑ کر دیتا ہے۔ مجھے اللہ نے چھپڑ پھاڑ کر تو نہیں' البتہ دروازہ توڑ کر مدد دی ہے۔ اب میں آرام سے کراچی جا سکوں گا"۔

"معلوم نہیں تم کیا الٹی سیدھی بکواس کر رہے ہو"۔ لکھو ذرا برہمی سے بولا حالانکہ وہ بہت ہی ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ کبھی کسی پر برہم نہیں ہوتا تھا۔ اپنی بیوی اور بیٹے سے تو پھر بھی کبھی کبھار سختی سے بول لیتا تھا لیکن شاہد سے کبھی سخت لہجے میں بات نہیں کرتا تھا مبادا اس کے دل کو ٹھیس لگ جائے اور وہ یہ سمجھے کہ لکھو اسے خود پر ایک بوجھ تصور کرتا ہے۔

"اس میں بکواس والی کیا بات ہے؟" شاہد نے اطمینان سے پوچھا۔

"تم یہ رقم نہیں رکھ سکتے.........." لکھو کو گویا بات کرنے کے لئے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

"چلو.......... میں اکیلا نہیں رکھتا۔ کچھ رقم تم لوگوں کو بھی دے جاتا ہوں تم تو واقعی مجھ سے بھی زیادہ ضرورت مند ہو"۔ اس نے نوٹ جیب سے نکالے اور ان میں سے کچھ لکھو کو دینے کے لئے گننے لگا۔

لکھو میر بحر کا سانولا چہرہ غصے سے تاریک پڑ گیا۔ جسم میں ہلکی سی کپکپی آ گئی۔ وہ ٹھٹی

ٹی سی آواز میں بولا۔ "شاہد میاں! یہ تم نے بات نہیں کی بلکہ میرے منہ پر طمانچہ مارا بہت اچھا صلہ دیا ہے تم نے میری محبت اور خدمت کا۔ اتنا عرصہ تم اس گھر میں رہے لکھو کو نہیں سمجھ سکے۔ میں تمہیں رقم رکھنے سے اس لئے منع نہیں کر رہا ہوں کہ اس میں سے اپنا حصہ چاہیے۔ میں تو لعنت بھیجتا ہوں ایسی لوٹ مار اور چوری ڈکیتی کی پر"۔

شاہد رقم گنتے گنتے رک گیا اور دم بخود اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لکھو ایک لمحے کے خاموش ہوا تو شاہد گویا سنبھلتے ہوئے بولا۔ "تو پھر آپ کا مطلب کیا تھا؟"

"میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ یہ حرام کی رقم ہے۔ اسے تم بھی اپنے پاس مت رکھو۔ ل میں تو یہ اس کی امانت ہے جس سے ڈاکو نے لوٹی ہوگی لیکن ہم چونکہ اسے اس تک ں پہنچا سکتے اس لئے شام کو ٹھیکیدار کے آدمی کے ساتھ اس گاڑی میں بیٹھ کر گاؤں چلا ں گا اور وہاں تھانے میں جمع کرا آؤں گا۔ ساری بات بھی بتاؤں گا۔ تم یہ رقم مجھے دو"۔ ونے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

شاہد نے یوں لکھو کی طرف دیکھا جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ لکھو کی دماغی حالت ب تھی۔ پھر اس نے سر کو خفیف سا جھٹکا دیا اور پوری رقم جیب میں رکھتے ہوئے ۔ "چاچا! اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ میں جا کر رقم کو نہر میں پھینک دوں"۔

"ہاں.......... اس میں بھی کوئی حرج نہیں"۔ لکھو اطمینان سے بولا۔ "اگر ہمیں لی اور صحیح طریقہ نہ سوجھا تب بھی اس رقم کو خود استعمال کرنے سے بہتر ہے کہ ہم اسے یں ہی پھینک دیں۔ یہ حرام کی رقم ہے ہمارے لئے حرام ہے"۔

"ایک تو تم غریب لوگ حلال حرام کے چکر میں بہت پڑتے ہو.........." شاہد نے ب پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس طرح کہا گویا وہ خود کوئی کروڑ پتی ہو۔ "اگر تمہارے لئے یہ رقم م ہے تو تم اس کے چکر میں مت پڑو تم سمجھو کہ تم نے مجھے پوٹلی اٹھاتے دیکھا ہی ۔ خدا کے لئے کم از کم ایسی بے وقوفی کی باتیں مت کرو کہ تم یہ رقم لے کر پولیس ہاں چلے جاؤ گے۔ تھانے سے پھر تمہیں اللہ ہی واپس لائے گا شاید تم بھول گئے ہو کہ ں سے تم نے یہ کہا تھا کہ یہاں کوئی ڈاکو نہیں آیا۔ اب وہ تمہاری بات کا یقین تھوڑا کریں گے کہ ڈاکو نے ہمیں پستول کے نشانے پر رکھا ہوا تھا۔ وہ کہیں گے اگر ایسی بات تو ہم ڈاکو کے فرار ہونے کے فوراً" بعد تو جا کر انہیں بتا سکتے تھے۔ پولیس تو اس وقت بستی میں موجود تھی۔ وہ سمجھیں گے تم کوئی چکر چلا رہے ہو۔ شاید تمہارے پاس ڈاکو کا بھی مال موجود ہو جسے تم سے برآمد کرنے کے لئے وہ تمہیں الٹا لٹکا کر چھتر سے تمہاری لیا شروع کر دیں۔ پولیس والوں کو کسی کی بات پر اعتبار کرنے کی عادت ذرا کم ہی ہوتی ۔ انہیں دن رات ایک سے ایک برے آدمی سے واسطہ پڑتا ہے اس لئے پہلے پہل تو وہ

ہر ایک کو ہی جھوٹا سمجھتے ہیں"۔

لکھو کی رنگت ایک بار پھر ذرا متغیر ہوگی۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ شاہد اسے خوفزدہ دیکھ کر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس لئے تم اس حرام رقم کو میرے ہی رہنے دو۔ اس کا گناہ و ثواب مجھ پر ہی ہوگا۔ تم خواہ مخواہ کے چکروں میں پڑ کر اپنے پریشانی کا سامان مت کرو"۔

سیدھا سادا لکھو خاموش تھا۔ اس کے بیٹے آسو نے پہلی بار زبان کھولی اور کھنکار کر صاف کرتے ہوئے بولا۔ "اگر ڈاکو اپنی رقم لینے کسی رات اسی طرح یہاں آگیا جس طرح پہلے آیا تھا؟"

شاہد نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "اول تو اس کی اتنی ہمت نہیں ہوسکتی دوسرے اسے سا یقین ہوگا کہ رقم یہیں گری ہوگی۔ معلوم نہیں وہ کہاں سے دھکے کھاتا یہاں پہنچا ہوگا یہاں سے نکلنے کے بعد پتہ نہیں کہاں کہاں گیا ہوگا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ یہ رقم تو طور پر میرے لئے امداد غیبی کے طور پر آئی ہے۔ اس لئے تو یہ میری چارپائی کے نیچے تھی تم اسی سے اندازہ لگا لو۔ یہ بھی قدرت کا ایک اشارہ ہے۔ ورنہ یہ کسی اور کی چارپائی کے نیچے بھی پڑی ہوئی مل سکتی تھی"۔

لکھو، آسو اور لکھو کی بیوی خاموش کھڑے تھے۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔ "اگر خدانخواستہ ڈاکو آ بھی جائے تو تم کہہ دینا کہ تمہیں رقم کے بارے میں کچھ معلوم نہیں، بے شک وہ تلاشی لے لے.......... اس جھونپڑی میں تو ظاہر ہے اسے نوٹ بھی نہیں ملے گا.......... اور نہ ہی یہاں کی حالت سے ظاہر ہوگا کہ یہاں کبھی ایک ہزار پانچ سو کی رقم بھی آئی تھی"۔

لکھو اور کی بیوی بیٹے نے گویا ہتھیار ڈال دیئے اور خاموش رہے۔ شاہد نے رقم احتیاط سے جیب میں رکھ لی۔ لکھو اور آسو تو مچھلیاں پکڑنے چلے گئے۔ شاہد کو شام کے کا انتظار تھا جو مچھلیاں لینے کے لئے گاڑی لے کر آتا تھا۔ لکھو سے اس نے تمام معلومات لی تھی کہ کراچی جانے کے لئے اسے کیا کرنا چاہیے۔

شام سے پہلے لکھو اور آسو واپس آ گئے۔ جتنی مچھلیاں انہوں نے پکڑی تھیں ٹوکرے میں ان کے پاس موجود تھیں۔ حسب معمول وہ ٹوکرا لے کر اس جگہ کی طرف چلے ہوئے جہاں ٹھیکیدار کا آدمی گاڑی لئے مچھلیاں وصول کرنے کے لئے موجود رہتا تھا۔ بھی ان کے ساتھ چل دیا۔ لکھو کی بیوی نے بجھے بجھے سے انداز میں اسے خدا حافظ کہا۔ اس جھونپڑی سے رخصت ہوتے وقت بہت خوش تھا کہ اسے افلاس اور بوریت کی زندگی سے نجات مل رہی تھی لیکن بظاہر اس نے بھی اپنے میزبانوں کی طرح مغموم صورت بنائی ہوئی تھی۔

گاڑی والے سے بیس روپے کرایہ طے کرکے وہ مچھلی والی گاڑی میں بیٹھ کر گاؤں آیا۔ وہاں سے بس حیدر آباد جاتی تھی لیکن وہ رات میں نہیں چلتی تھی۔ رات گزارنا وہاں ایک مسئلہ تھا کیونکہ گاؤں میں کوئی ہوٹل یا سرائے وغیرہ تو تھی نہیں۔

یہاں بھی ٹھیکیدار کا آدمی ہی اس کے کام آیا۔ اس نے اسے اس گودام میں ٹھہرا لیا جہاں مچھلیاں برف میں پیک کر کے لکڑی کی پیٹیوں میں رکھی جاتی تھیں اور اگلی صبح ٹرک کے ذریعے حیدر آباد بھیجی جاتی تھیں۔ شاہد نے وہ رات وہاں تقریباً جاگ کر ہی گزار دی۔ ایک تو مچھلیوں کی بو کی وجہ سے سونا دشوار تھا۔ دوسرے شاہد کو اپنی رقم کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ کسی کو یہ احساس نہ ہونے پائے کہ اس کے پاس سو دو سو سے زیادہ رقم موجود ہے۔ چند ہزار کی وہ رقم اس وقت اس کے لئے لاکھوں سے زیادہ اہم تھی۔

صبح اس نے ایک چائے خانے میں ناشتہ کیا۔ وہیں سے حیدر آباد کے لئے بس پکڑی اور سہ پہر کے قریب وہاں پہنچ گیا۔ بس نے اسے اسٹیشن کے قریب اتارا تھا اس لئے اس نے ٹرین سے ہی کراچی جانے کا فیصلہ کیا۔

کئی گھنٹے کے انتظار کے بعد وہ ایک ٹرین میں بیٹھ کر کراچی روانہ ہوا تو اس کا دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک بڑے شہر کی کچھ دھندلی سی پرچھائیاں کراچی ہی کی تھیں یا کسی اور شہر کی؟ اس کے علاوہ لکھو، آسو اور بستی کے کچھ دوسرے لوگوں نے بھی کراچی کا کچھ نقشہ کھینچا تھا۔ شاہد کچھ خوفزدہ بھی تھا۔ وہ منہ اٹھا کر ایک بڑے شہر کی طرف چل تو دیا تھا لیکن اسے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ وہ شہر اسے راس آ سکے گا یا نہیں؟ وہاں اس کا گزارا ہوسکے گا یا نہیں؟ کراچی اس پر مہربان ہوگا یا نامہربان.......... وہ ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

☆ ============ ☆ ============ ☆

ٹرین خاصی تاخیر سے کراچی پہنچی۔ آدھی رات سے کچھ پہلے وہ کراچی کینٹ کے پلیٹ فارم پر اترا تو اس کی مرعوبیت، اس کا خوف جیسے یکدم ہی ختم ہوگیا۔ اس کے دل میں جو ایک ہوا سا بیٹھا ہوا تھا وہ جیسے یک لخت ہی دور ہوگیا۔ اسے وہ ایک عام سا اسٹیشن لگا اور باہر آنے پر بھی ارد گرد اسے کوئی عمارت یا سڑک مرعوب کن معلوم نہیں ہوئی۔ شاید اس کے لاشعور میں اس شہر سے کوئی شناسائی موجود تھی۔ گو کہ بظاہر اسے راستے اور عمارتیں اجنبی محسوس ہو رہی تھیں۔

اس کے جسم پر دیہاتیوں والا معمولی سا شلوار قمیض تھا۔ اس کی داڑھی اور بال جھاڑ جھنکار کی طرح بڑھے ہوئے تھے اور وہ کچھ زیادہ صاف ستھرا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کے انداز و اطوار میں خود اعتمادی کی کمی نہیں تھی۔ اس نے سردست شہر جانے کی کوشش نہیں کی اور اسٹیشن کے قریب ہی ذرا نچلے درجے کے ایک ہوٹل میں کمرہ لے کر

ٹھہر گیا۔ وہ بری طرح تھکا ہوا تھا۔ سب سے پہلے آرام کرنا چاہتا تھا۔

وہ صبح اٹھا تو اس نے اپنے آپ کو خاصا تازہ دم محسوس کیا۔ ناشتے کے بعد اس
قریب ہی ایک ہیئر ڈریسر کی دکان میں جا کر بال ترشوائے۔ داڑھی اس نے صاف نہیں کرا
البتہ اسے بھی فیشن ایبل انداز میں تراشوا لیا۔ وہ جب غسل سے فارغ ہوا تو اس کی رنگ
جو اب کچھ سانولی ہو چکی تھی ذرا نکھر آئی۔

دوپہر کے قریب وہ پوچھتا پاچھتا ایک بس میں بیٹھ کر شہر دیکھنے اور کچھ شاپنگ کر
کے ارادے سے نکلا۔ شام تک مسلسل آوارہ گردی کرکے اس نے خاصی جگہیں بھی د
لیں اور ضرورت کی خاصی چیزیں بھی خرید لیں جن میں کچھ ملبوسات بھی شامل تھے
درمیانے سائز کا ایک سوٹ کیس بھی خرید لیا اور وہ چیزیں اس میں بھر لیں۔ ملبوسات
ایک دکان میں ہی اس نے لباس بھی تبدیل کر لیا تھا۔

اب وہ ایک اچھا خاصا شہری نوجوان نظر آ رہا تھا۔ ہوٹل وہ چھوڑ آیا تھا تاکہ جب
بدلے ہوئے حلیے میں وہاں پہنچے تو اسے مشکوک نہ سمجھا جائے۔ اس نے زیادہ وقت صد
میں ہی گزارا تھا۔ رات کو وہ صدر ہی کے ایک ہوٹل میں جا ٹھہرا۔

اس کے بعد کئی دن تک اس کا یہی معمول رہا۔ وہ صبح ناشتہ کرکے ہوٹل سے نک
کھڑا ہوتا اور رات گئے تک آوارہ گردی کرتا۔ وہ شہر کو سمجھنے اور راستوں سے واقفیہ
حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بات اسے خود بھی عجیب لگی کہ جتنا وہ ڈر رہا تھا۔
اس شہر سے اس کا دسواں حصہ بھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔

ابتداء میں گو کہ راستے اس کے لئے اجنبی تھے لیکن وہ منہ اٹھا کر کسی بھی طرف نک
جانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اگر اسے کسی راستے، کسی بس یا ویگن
روٹ یا کسی اور معاملے میں بھی کچھ جاننے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی تو وہ راہ چلتے
بھی شخص کو روک کر پوچھنے میں قطعاً ہچکچاتا نہیں تھا۔ پندرہ بیس روز میں ہی اسے کچھ
محسوس ہونے لگا جیسے وہ پندرہ بیس سال سے یہاں رہ رہا تھا۔

ایک روز اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے پاس تو پیسے تیزی سے ختم ہو ر
ہیں۔ رقم کا بیشتر حصہ ختم ہو چکا تھا اور ابھی تک اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کی گ
اوقات کا ذریعہ کیا ہوگا۔ اس نے حساب کتاب لگایا تو اندازہ ہوا کہ اسے ہوٹل میں رہنا خا
مہنگا پڑ رہا تھا۔

اس نے درمیانے درجے کے ریستوران میں بھی کھانا پینا فوراً چھوڑ دیا اور کئی
ٹھکانے تلاش کر لئے۔ رکشا ٹیکسی میں سفر بالکل چھوڑ دیا اور مکمل طور پر بسوں اور ویگنو
پر انحصار کرنے لگا۔ ساتھ ہی اس نے نہایت کم کرائے کے کسی کمرے کی بھی تلاش شرو
کر دی۔ ہوٹل کی لابی میں بیٹھ کر وہ وہاں پڑے ہوئے اخبارات میں "کرائے کے لئے

والے کالم بھی بڑی توجہ سے پڑھا کرتا۔

ذریعہ معاش کے بارے میں بھی فی الحال اس کا غوروخوض اور مشاہدہ جاری تھا۔ وہ
دفتر میں نوکری تلاش کرنے نہیں جاسکتا تھا کیونکہ اس کے پاس کوئی کاغذات ہی نہیں
اس کی صورت حال عجیب ہی تھی۔ اسے انگریزی اور اردو پڑھنے میں کوئی دقت پیش
آتی تھی لیکن اسے یہ یاد نہیں تھا کہ وہ کتنا پڑھا ہوا تھا۔

تاہم اب وہ ایک بدلا ہوا انسان تھا۔ جھوٹ وہ نہایت فراٹے سے بول سکتا تھا۔
ضرورت پڑنے پر وہ کہیں بھی اپنی تعلیم کچھ بھی بتا سکتا تھا۔ مسئلہ صرف یہ تھا کہ اسے ثابت
کرنے کے لئے اس کے پاس کوئی سرٹیفکیٹ نہیں تھا۔ ہوٹل میں بھی وہ خوب فراٹے سے
بولتا تھا۔ ہوٹل کا عملہ اس سے خاصا شناسا ہو چکا تھا۔ لیکن وہ سب لوگ اسے اندرون
سندھ کے کسی اوسط درجے کے زمیندار کا بیٹا سمجھتے تھے جو اپنے کچھ ضروری کام نمٹانے شہر
آیا ہوا تھا۔

سردست اس کے خیال میں کسی سستی اور ذرا پائیدار بنیادوں پر چلنے والی رہائش کا
بندوبست کرنا ضروری تھا۔ ایک روز اسے اخبار میں کرائے کے ایک ایسے کمرے کا اشتہار نظر
آیا جو فوری طور پر اسے اپنے مطلب کا محسوس ہوا۔ لکھا تھا۔ "........بیچلر کے لئے ایک عمدہ
کمرہ، ڈپازٹ دو ہزار، کرایہ پانچ سو.........."

یہ نہایت مناسب ڈپازٹ اور کرایہ تھا۔ شاہد اب اس سے زیادہ کا وہ متحمل بھی نہیں
ہوسکتا تھا۔ اشتہار میں فون نمبر موجود تھا۔ شاہد نے فوری طور پر فون کیا۔ کرخت سی آواز
والی ایک خاتون نے فون ریسیو کیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہی مکان مالکن تھیں۔

شاہد کو زیادہ بولنے کا موقع دیئے بغیر وہ بولیں.......... "بھیا.......... بات یہ ہے
کہ کمرہ تو بہت سے لوگ لینا چاہتے ہیں۔ صبح سے کئی فون آ چکے ہیں۔ کئی لوگ دیکھنے آ
چکے ہیں.......... لیکن مجھے بہرحال کمرہ بہت دیکھ بھال کر کسی شریف اور معقول آدمی کو دینا
ہے۔ آپ آجایئے، بات کرکے دیکھیں گے.......... سوچیں گے۔ بات کرنے میں کیا حرج
ہے۔ اگر آپ ہمیں معقول آدمی لگے تو دوسرے امیدواروں کو جواب دے دیں گے"۔

شاہد نے شکریہ ادا کرکے فون بند کیا اور سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ابھی تو اخبار آئے
تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔ کیا اتنی ہی دیر میں "بہت امیدوار" کمرہ دیکھنے پہنچ گئے تھے؟ وہ
مسکرا دیا۔ خاتون خاصی "فنکار" معلوم ہوتی تھیں لیکن شاہد اب خود کو بھی "فنکار" ہی
محسوس کرتا تھا۔ اس نے اپنی باقی پونجی جیب میں ڈالی اور اس ایڈریس پر جا پہنچا جو خاتون نے
اسے سمجھایا تھا۔

وہاں پہنچ کر شاہد نے دیکھا وہ خاصے صاف ستھرے علاقے میں واقع ایک کافی بڑا، دو
منزلہ کوٹھی نما مکان تھا۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہوا کہ کمرہ تو اچھا خاصا ہی ہوگا۔ وہ اپنے

عمدہ ترین لباس میں بڑے اہتمام سے آیا تھا۔ جوتے بھی پالش کرائے تھے۔ کلون بھی
فیشن ایبل داڑھی کو بھی ہیئر ٹانک سے ذرا چمکایا تھا۔ مکان مالکن کے حضور میں پہنچ
اس نے چہرے پر نہایت گھمبیر سنجیدگی اور متانت طاری رکھی۔

وہ اوپر کی منزل پر رہتی تھیں اور جس ڈرائنگ روم میں انہوں نے شاہد کا اس
وہ اچھا خاصا کشادہ اور آراستہ وہ پیراستہ تھا۔ مکان مالکن کافی عمر رسیدہ تھیں۔ مگر ان
بال گہرے سیاہ رنگے ہوئے تھے اور لباس بھی جدید تراش خراش کا پہنا ہوا تھا۔ انہو
گہری نظر سے شاہد کا سرتاپا جائزہ لیا۔ شاہد کو اندیشہ تھا کہ ان کے سامنے کمرے
امیدوار قطار باندھے بیٹھے ہوں گے مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

کمرے کے بارے میں مذاکرات شروع ہوئے تو خاتون بولی......... "با
برخوردار......... کہ کمرہ دینے کے معاملے میں ہماری شرائط بعض لوگوں کے نکاح نا
شرائط سے زیادہ لمبی ہوتی ہیں..........."

شاہد ان کی بات کاٹتے ہوئے بولا........ "آپ کی تمام معقول شرائط مجھے
ہوں گی......... اور آپ چونکہ مجھے نہایت معقول، شائستہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون
ہوتی ہیں اس لئے مجھے یقین ہے کہ آپ کی شرائط بھی معقول ہوں گی۔ میں خود چونک
معزز زمیندار فیملی سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس لئے میں آپ جیسے معزز لوگوں کے زیر
کر ہی اپنی رہائش کا مسئلہ حل کرنا چاہتا تھا۔ آپ پہلے مجھے کمرہ دکھا دیجئے۔ شرائط تو
ہی جائیں گی"۔

خاتون کے چہرے اور لہجے کی کرختگی خاصی حد تک ملائمت میں بدل گئی۔ اپ
معقول، شائستہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ کے الفاظ سن کر ان کے دل میں یقیناً طمانیت کی لہر
تھی کیونکہ پاس پڑوس کے لوگوں اور ان کے کسی کرائے دار نے آج تک ان کے لئے
اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ہر ہفتے دس دن بعد محلے پڑوس میں کسی نہ کسی سے
معرکہ برپا ہو جاتا تھا اور وہ آستینیں چڑھا کر حریف کو ایسی بے نقط سناتی تھیں
کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ گڑے مردے اکھاڑنے والے یہ بھی
تھے کہ وہ آٹھویں پاس تھیں۔ ان کے ابا مرحوم اپنی زندگی میں اسٹیشن پر نان پکوڑوں
لگایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ بے چارے چلتی ٹرین میں جاتے ہوئے ایک مسافر سے
روپے وصول کرنے کے لئے ٹرین کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے کہ کیلے کے ایک چھ
پاؤں پھسل جانے کی وجہ سے ٹرین کے نیچے آ کر اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔

اس کے بعد خاتون پکی عمر کی ہو گئیں لیکن شادی ہونے میں نہ آئی۔ غربت اور
بھی اس کی وجہ تھی لیکن ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ موصوفہ کے بارے میں کچھ نارو
کے قصے مشہور تھے۔ پھر ہوا کچھ یوں کہ ایک اچھا خاصا آسودہ حال لیکن عمر رسیدہ شخص

یویاں یکے بعد دیگرے اسے داغ مفارقت دے چکی تھیں۔ کریم النساء بیگم پر مہربان
شاہد کو بعد میں معلوم ہوا کہ خاتون کا نام کریم النساء تھا......... اور وقت گزرنے
کے ساتھ تو اسے ان کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوتا چلا گیا۔)

اس خوشحال شخص سے کریم النساء بیگم کی پہلی ملاقات کہاں اور کس طرح ہوئی،
کس طرح پروان چڑھے......... تاریخ اس سلسلے میں خاموش تھی لیکن قصہ مختصر
کہ کریم النساء بیگم کی اس شخص نے شادی ہو گئی۔ جاننے والے بتاتے تھے کہ اس کے
کریم النساء بیگم کے جتنے برس بھی گزرے، بہت اچھے گزرے۔ اس کے ساتھ وہ خوب
پھریں، اچھے سے اچھا کھایا، اچھے سے اچھا پہنا اور بظاہر خاصی رنگین سی زندگی بسر
..... لیکن یہ عرصہ صرف آٹھ دس سال پر محیط رہا۔ اس کے بعد شوہر صاحب
داغ مفارقت دے گئے۔

وہ مکان جس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی وہ شاہد کو کرایہ داری کی شرائط سے آگاہ کر
تھیں، اس کے شوہر کا چھوڑا ہوا تھا جو وہ اپنی زندگی میں ہی ان کے نام کر گیا تھا۔ بیوہ
کے کچھ عرصے بعد کریم النساء بیگم نے نیچے کی منزل کے تمام کمروں میں تھوڑا بہت رد
کرا کے انہیں کرائے پر اٹھا دیا تھا۔ بظاہر برسوں سے یہی ان کی گزر اوقات کا ذریعہ
اب وہ "کے این" آنٹی کے نام سے مشہور تھیں۔ ان کا اصل نام بہت کم لوگ جانتے

شاہد جب ان کے ساتھ گراؤنڈ فلور پر کمرہ دیکھنے پہنچا تو ایک لمحے کے لئے ان اس
خوابوں کی بنیادیں خطرناک حد تک لرز گئیں۔ درحقیقت گراؤنڈ فلور کے تمام کمرے تو
کرائے پر اٹھے ہوئے تھے اب جو کمرہ وہ شاہد کو دکھا رہی تھیں وہ درحقیقت کسی زمانے میں
...تھا لیکن کافی عرصے سے وہ اسے بھی کرائے پر اٹھاتی آ رہی تھیں۔ یہ دوسری بات تھی
کوئی بیچلر بھی اس میں زیادہ عرصے ٹکتا نہیں تھا۔ وہ نیچی سی چھت کا ایک تنگ و تاریک
...تھا جس کے در و دیوار نہ جانے کب سے رنگ و روغن کو ترس رہے تھے اور پلستر کئی
...سے اکھڑ رہا تھا۔

شاہد سے پہلے وہاں جو چھڑا رہ کر گیا تھا اس نے کئی مقامات پر اسکرز اور پوسٹرز کے
ذریعے کمرے کے "تن داغدار" کو چھپانے کی کوشش کی تھی مگر اب وہ اسکر وغیرہ بھی اکھڑ
رہے تھے۔ کونے کھدروں میں جالے لگے ہوئے تھے۔ کمرے کے ایک طرف ایک چوکور سا
...تھا جو شاید کسی زمانے میں الماری رہی ہو۔ اب اسے باتھ روم کی شکل دی جا چکی تھی۔
کمرے میں سب سے نمایاں خوبی شاہد کو یہ نظر آئی کہ اس میں فرش پر فوم کا ایک
...اور پرانا سا گدا موجود تھا جو شاید اس سے پہلے وہاں رہنے والا چھڑا چھوڑ گیا تھا۔ غنیمت
...کہ اس کی بنیاد پر کے این آنٹی نے کمرے کو "فرنشڈ" قرار نہیں دیا تھا۔

شاہد نے جلدی ہی مایوسی کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھالیا
اسے تو سر چھپانے کے لئے ایک ٹھکانہ چاہیے تھا اور فی الحال رہائش جتنی بھی کم
ہوتی' اس کے حق میں بہتر تھا۔

کے این آنٹی نے گویا اس کے تاثرات بھانپتے ہوئے جلدی سے جتایا۔ "کمرہ لینے
خواہش مند تو میرے پاس کئی آچکے ہیں لیکن میں کسی شریف اور معزز آدمی کو......
شاہد دوبارہ ان کی تقریر سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس نے پیسے نکال کر ان کے
پر رکھے اور چابی لے کر دوسرے روز شفٹ ہونے کا وعدہ کر کے ہوٹل واپس آگیا۔
اس کے پاس بہت تھوڑی رقم رہ گئی تھی۔ دوسرے روز وہ اس کمرے میں شفٹ ہوگیا۔

☆ ========== ☆ ========== ☆

اس کمرے میں شاہد نے خاصا طویل عرصہ گزارا۔ اس تمام عرصے میں اسے
معقول نوکری نہ مل سکی۔ صرف ایک جگہ اسے کچھ عرصہ سکون اور عزت آبرو سے گزا
کا موقع ملا۔ وہ ایک فلاحی ادارہ تھا جس میں وہ رضاکار کی حیثیت سے بھرتی ہوگیا تھا۔ کہ
وہ رضاکار تھا لیکن اسے وہاں ڈیڑھ ہزار روپے ماہانہ الاؤنس ملتا تھا لیکن پھر وہ ادارہ
ہوگیا۔ اس کے بعد کسی رضاکار نے شاہد علی سے نہ پوچھا کہ اس کی رضا کیا تھی۔
اس عرصے میں اسے اگر کوئی تجربہ تسلی بخش طور پر حاصل ہوا تھا تو وہ انٹرویو د
تجربہ تھا۔ صحیح تعداد تو اسے یاد نہیں تھی کہ اب تک اس نے کتنے انٹرویو دیئے تھے
اسے اب محسوس یہی ہونے لگا تھا کہ شاید اس کی زندگی کا آغاز بھی انٹرویو سے ہوا تھا
اختتام بھی انٹرویو پر ہوگا۔

اس کے باوجود اب تک وہ ہر دفتر میں بڑے صبر و تحمل سے ان تمام سوالات
جواب دیتا تھا جو اس سے ہزاروں مرتبہ پوچھے جا چکے تھے۔ اس کے بعد وہ نہایت ٹھنڈ
دماغ کے ساتھ مہذب الفاظ کے پردے میں چھپا ہوا یہ انکار بھی سنتا تھا...... "آپ
ایڈریس تو ہمارے پاس موجود ہے۔۔ جیسے ہی آپ کی ضرورت محسوس ہوئی ہم آپ
اطلاع کردیں گے......"

اب صبر و تحمل اور استقامت ہی شاہد علی کی آخری پونجی تھی۔ اس دوران اس
بہت سے ایسے کام کئے تھے جن میں اپنے کاغذات پیش کرنے کی ضرورت پیش نہیں
تھی۔ کبھی اس نے بندرگاہ پر دہاڑیاں لگائی تھیں۔ کبھی کسی ریسٹوران میں ویٹر کے فرائض
انجام دیئے تھے۔ کبھی ڈاک خانے کے سامنے بیٹھ کر لوگوں کو خط لکھ کر دیئے تھے یا ایسے
کسی اور عارضی وسیلے سے اس نے اپنی اداس روح کو چھریرے جسم میں مقید رکھنے
بندوبست کیا تھا۔ لیکن اس قسم کے غیر یقینی ذرائع معاش سے ان لوگوں کو مطمئن نہیں
جاسکتا جو ہر ماہ یقینی طور پر شرفاء کے دروازوں پر دستک دیتے ہیں۔ مثلاً" چوکیدار' دودھ وا

انے والا' پان سگریٹ والا' قریبی ریسٹوران کا ویٹر۔
چھوٹے موٹے عام سے قرض خواہ اور مکان مالکن وغیرہ...... ایک بار شاہد ایک جگہ
ویو کے لئے گیا تو انتظار کے دوران اس کے برابر بیٹھے ہوئے ایک دوسرے امیدوار نے
اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یار!...... تین چار سال پہلے ٹی وی پر ایک سنگر
ی کبھار گایا کرتا تھا...... اختر حسین نام تھا شاید اس کا...... تمہاری شکل میں اس
خاصی شباہت نظر آتی ہے......"
شاہد کے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ اسے یہ احساس تو تھا کہ اس کا ماضی کہیں کھو گیا
۔ اسے اپنے بارے میں صحیح طور پر کچھ یاد نہیں تھا۔ آج ایک اجنبی نے پہلی بار بغور اس
ے باریش چہرے کی طرف دیکھ کر ایسی بات کی تھی جس سے اس کے دل میں امید کی کرن
نمودار ہوئی۔ کہیں وہ واقعی کوئی ٹی وی سنگر تو نہیں تھا؟
لیکن حیرت کی بات تھی کہ جب سے وہ مچھیروں کی بستی سے جان چھڑا کر کراچی آیا
ا اسے کبھی گانے وغیرہ سے کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ عام لوگوں کی طرح کبھی
بھار وہ باتھ روم میں گنگنانے کی کوشش کرلیتا تھا لیکن اسے کبھی اپنی آواز ذرا بھی سریلی
حسوس نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی وہ کوئی لمبی تان کھینچ سکتا تھا۔ سروں اور راگوں کے بارے
یں اسے ایک بات بھی معلوم نہیں تھی۔ اس صورت میں تو اس کا ماضی بھی اس کے کسی
کام نہیں آسکتا تھا۔ اگر اسے اپنی آواز پر کنٹرول ہی نہیں تھا' سر اور راگ کے بارے میں
کوئی علم ہی نہیں تھا تو وہ گلوکار ہونے کا دعویٰ کیونکر کرسکتا تھا؟
اس کے باوجود اس نے ایک بار ٹی وی اسٹیشن جاکر بھی قسمت آزمائی کا فیصلہ کرلیا۔
دوسرے روز بھی وہ بڑے اہتمام سے تیار ہوکر ٹی وی جا پہنچا۔ اس وقت نو بجے تھے۔ ٹی وی
سنٹر کی عمارت پر ویرانی کا راج نظر آرہا تھا۔ شاہد نے کھڑکی سے جھانک کر اندر دیکھا۔ میز پر
ایک استقبالیہ کلرک بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اختر نے کھنکار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔
"جی...... فرمایئے؟" کلرک نے گردن موڑ کر چندھی چندھی آنکھوں سے اس
کی طرف دیکھتے ہوئے بیزاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔
"آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟" شاہد نے جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔
کلرک نے ذرا بھی توجہ دینے کی زحمت کئے بغیر اسی بیزاری سے جواب دیا۔ "
بھائی۔۔۔ میرے ساتھ "کسوٹی کسوٹی" مت کھیلو۔ یہاں تو پانچ دس سال آدمی باقاعدگی سے
ٹی وی پر کام کرتا ہے تب جاکر ہمیں اس کی پہچان ہوتی ہے۔ لہٰذا تم خود ہی بتادو کہ تم کون
ہو؟"

"میں اختر حسین ہوں......" شاہد نے کافی خود اعتمادی سے کہا اسے امید تھی کہ
شاید اتنا بتانا ہی کافی ثابت ہو۔

"کون اختر حسین؟ بھائی! اس شہر میں کم از کم پچیس ہزار اختر حسین ہوں گے۔ اب میں سب سے واقف تو نہیں ہو سکتا"۔

شاہد کا دل بجھ سا گیا تھا لیکن وہ اپنا حوصلہ اور مسکراہٹ برقرار رکھتے ہوئے بولا.......... "بھئی میں سنگر اختر حسین ہوں۔ تین چار سال پہلے ٹی وی پر گایا کرتا تھا۔ آپ کو یاد نہیں؟"

"تین چار سال پہلے تو میں یہاں تھا ہی نہیں۔ بہرحال.......... آپ کیا تین چار سال بعد یہاں آئے ہیں؟" کلرک گویا فارغ وقت میں اس کا انٹرویو لینے پر تلا ہوا تھا۔ شاہد کے دل پر اضطراب غلبہ پانے لگا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا ٹی وی اسٹیشن میں داخل ہونا ہی اتنا دشوار مرحلہ ثابت ہوگا۔

"ہاں.......... میں تین چار سال بعد آیا ہوں.........." وہ ذرا مایوسی سے بولا۔

کلرک اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا.......... "کیا دبئی چلے گئے تھے روپیہ کمانے..........؟ یا انگلینڈ امریکہ کی طرف لمبی ہی بکنگ مل گئی تھی؟"

"وہ دراصل.........." شاہد اب ہکلانے لگا تھا.......... "میرا خیال ہے مجھے کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا.......... اور میری یادداشت کھو گئی تھی.......... آج.......... میرا مطلب ہے.......... کل کسی نے میری صورت دیکھ کر کہا کہ تم گلوکار اختر حسین معلوم ہوتے ہو.........."

"اور آپ نے اس کی بات کا یقین کرلیا؟" کلرک اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ اب اس کے ہونٹوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ نمودار ہو رہی تھی۔

"میں نے سوچا مجھے ٹی وی اسٹیشن جا کر چیک تو کرلینا چاہیے"۔ شاہد دھیمے لہجے میں بولا۔

"میں خود کسی زمانے میں لاہور ٹی وی پر سنگر بننے پہنچا تھا۔ آج کراچی ٹی وی پر ریسپشنسٹ بنا بیٹھا ہوں"۔ کلرک نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا پھر پاس بک ایک طرف کھسکا کر اچانک ہی اس نے میز سے طبلے کا کام لیتے ہوئے ایک بول گنگنایا اور بولا..........

"بتائیے یہ ٹھمری تھی یا دادرا؟"

"جی..........؟ یہ.......... یہ تو مجھے معلوم نہیں.........." شاہد بے بسی سے بولا۔

"بہت خوب.......... اور آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ گلوکار اختر حسین ہیں؟ ماشاء اللہ..........!" کلرک کے تیور بدل گئے۔

شاہد علی خاموش تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ٹی وی کے استقبالیہ پر اسے اس قسم کے شخص سے واسطہ پڑے گا۔ کلرک گویا اس پر ترس کھاتے ہوئے بولا۔ "اچھا یہ

ۓ آپ کس پروڈیوسر کے پاس جانا چاہتے ہیں؟"

"کسی بھی پروڈیوسر کے پاس بھیج دیجئے.......... یا پھر ان کے پاس بھیج دیجئے جو مجھے پروگراموں میں لیا کرتے تھے"۔ شاہد علی جلدی سے بولا۔

"بھائی! میں تین چار سال پرانے پروگراموں اور ان کی پوری پوری کاسٹ کا مکمل رڈ نہیں رکھتا۔ دوسری بات یہ کہ وہ پروڈیوسر اب تک یہاں نہیں بیٹھا ہوگا جو تمہیں کیا کرتا تھا۔ یہاں دو سال سے زیادہ کوئی پروڈیوسر ٹکنے نہیں پاتا۔ اس کا تبادلہ ہو جاتا ۔ تیسری بات یہ کہ ابھی تو پروڈیوسر اپنے اپنے گھروں پر خواب خرگوش کے مزے لے ے ہوں گے۔ چوتھی بات یہ کہ جب تمہیں گانا نہیں آتا اور راگوں کی بھی پہچان ں.......... تو پھر تم پروڈیوسر سے مل کر کیا کرو گے؟"

شاہد کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا لیکن وہ ایک موہوم سی امید کے ارے بولا۔ "تم مجھے کسی ڈرامہ پروڈیوسر کے پاس ہی بھیج دو"۔

"کیا تم اس سے درخواست کرو گے کہ وہ تمہاری زندگی کی کہانی پر ڈراما ئے.......... کہ کس طرح ایک گلوکار کی یادداشت کھو گئی؟ وہ اپنا ماضی بھول گیا.......... ا بھول گیا؟" کلرک اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "بھائی! یہ یم بہت پرانا ہو گیا ہے۔ بے شمار فلمیں بن چکی ہیں اس پر.......... ٹی وی پروڈیوسر یہ یڈیا سنتے ہی اپنے یا تمہارے بال نوچنے لگے گا۔ بہتر یہی ہے کہ فی الحال تم اپنے گھر جاؤ اور ظار کرو کہ کبھی کوئی حادثہ پیش آئے یا تمہاری کھوپڑی پر کوئی چوٹ لگے.......... یا تم ہی جھنجلا کر اپنے سر پر کوئی پیپر ویٹ وغیرہ مار لو اور تمہاری یادداشت واپس آجائے"۔

شاہد ملائمت سے بولا۔ "یار! اگر تم اتنی باتیں کرنے کی بجائے اندر جانے دو تو اس ں تمہارا کیا حرج ہے؟ مجھے اندر جا کر لوگوں سے ملنے تو دو۔ شاید کوئی بات بن جائے"۔

کلرک ایک لمحے عجیب سے انداز میں اسے گھورتا رہا پھر ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے لا۔ "اندر آجاؤ.......... میں ذرا دیکھتا ہوں کہ تمہارے بارے میں کیا کیا جاسکتا ہے"۔

شاہد گھوم کر گیٹ سے گزر کر اندر استقبالیہ کمرے میں چلا گیا۔ کلرک نے اسے ایک رسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں ابھی آیا"۔

وہ ایک چھوٹے سے ملحقہ کمرے میں چلا گیا۔ شاہد کو وہاں ایک اور شخص کی جھلک ظر آئی۔ جو شاید وہاں ذرا آڑ میں ہو کر ناشتہ کر رہا تھا۔ کلرک نے اس کمرے میں داخل ہو ر دروازہ بند کر لیا۔ نہ جانے کیوں شاہد کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے کلرک کا نداز کچھ مشکوک لگ رہا تھا۔

شاہد نے مضطربانہ انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے میں اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ کھڑکی یا دروازے سے باہر بھی اسے کوئی کھڑا دکھائی نہ دیا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور دبے پاؤں

ملحقہ کمرے کے اس چھوٹے سے دروازے پر پہنچا۔ اس نے دروازے سے کان لگا کر سنا اندر سے کلرک کی نہایت مدہم سی آواز سنائی دی۔ "یار! باہر ایک نوجوان آیا ہے....... وہ خیال ظاہر کر رہا ہے کہ شاید وہ گلوکار اختر حسین ہے حالانکہ اسے گائیکی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ کہتا ہے اس کی یادداشت کھو گئی تھی اس لئے وہ گانا بھی بھول گیا........"

اندر ناشتہ کرتے ہوئے شخص نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔ کلرک نے جلدی سے اسے ٹوکا۔ "آہستہ ہنسو یار! وہ سن لے گا۔ ویسے اس کی شکل میں اختر حسین کی تھوڑی بہت شباہت پائی جاتی ہے۔ وہ اختر حسین کا بڑا اور باریش بھائی معلوم ہوتا ہے"۔

"وہ یقیناً" کوئی فراڈیہ ہوگا اور اسی شباہت کا فائدہ اٹھانے آگیا ہوگا۔ لیکن اسے بہت تاخیر سے آئیڈیا سوجھا ہے۔ اختر حسین بے چارہ کب کا مرکھپ چکا ہے۔ اب تو قبر میں اس کی ہڈیاں بھی نہیں رہی ہوں گی لیکن یہ بہت بری بات ہے کہ یہ شخص اس کی موت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے"۔

"اب کیا کرنا چاہیے؟" کلرک نے مشورہ طلب کیا۔

"کیا کرنا ہے--- سیکیورٹی والوں کو بلا کر اسے پولیس کے حوالے کر دو۔ وہ خود ہی اس کے دماغ سے اختر حسین ہونے کا بھوت نکال دیں گے۔ اس فراڈ کو شروع میں ہی ناکام بنا دینا چاہیے۔ کہیں کل کو یہ پریس کانفرنسیں وغیرہ کرکے اپنے دعوے کی پبلسٹی نہ کرنے لگے"۔ دوسرے شخص نے غصیلے سے لہجے میں مشورہ دیا۔

شاہد کو اس معاملہ میں چونکہ اپنی شخصیت پر اعتماد نہیں تھا وہ اپنے اختر حسین ہونے کے بارے میں کچھ زیادہ پریقین نہیں تھا۔ اس لئے سیکیورٹی اور پولیس کا ذکر سن کر اس کی ٹانگوں سے گویا جان نکل گئی۔ وہ تیزی سے مڑا اور دبے قدموں کمرے سے نکل آیا۔

اس دن کے بعد اس نے کبھی ٹی وی اسٹیشن کا رخ کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ اگر مزید ایک آدھ بار کسی نے اس سے کہا بھی........ کہ اس کی صورت میں اختر حسین کی شباہت آتی ہے تو اس نے ہنس کر ٹال دیا کہ دنیا میں ایسے اتفاقات ہوتے رہتے ہیں۔ اس کی صورت میں تو محض شباہت تھی جبکہ کبھی کبھی تو دو مکمل ہم شکل بھی پیدا ہو جاتے تھے۔

وہ زندگی کے سمندر میں بدستور ہاتھ پاؤں مار رہا تھا لیکن اب اس پر کچھ مایوسی اور جھنجلاہٹ سی سوار ہوتی جا رہی تھی۔ اسے خود بھی احساس ہونے لگا تھا کہ یہ زندگی کوئی زندگی نہیں تھی جو وہ گزار رہا تھا۔ دنیاوی دوڑ میں آگے بڑھنے کے لئے اسے راستہ نہیں مل رہا تھا۔

ابھی وہ کشمکش، الجھن اور فرسٹریشن کے اس دور سے نکلنے کی کوئی تدبیر نہیں کر پایا تھا

کہ ایک روز علی الصبح اس کی مکان مالکن کے این آنٹی اس عالم میں اس کے کمرے یا "کمرہ نما" کا دروازہ دھڑ دھڑا کر اندر آئیں کہ ان کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ شاہد کو وہ شعلے بنکاک کے شعلوں سے بھی زیادہ خطرناک محسوس ہوئے۔

کے این آنٹی کے نتھنے پھول پچک رہے تھے اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ ان کے عقب میں دو لمبے تڑنگے نوجوان بھی کھڑے تھے۔ وہ ایک خاص ٹائپ کے نوجوان تھے جن کے ہاتھوں میں عموماً" چاندی کے کڑے اور گلے میں زنجیر یا لاکٹ ہوتا ہے۔ آستین تھوڑی سی چڑھی ہوتی ہے اور گریبان کھلا ہوتا ہے لیکن وہ کرائے کے بدمعاش نہیں تھے۔

شاہد انہیں سرسری حد تک جانتا تھا وہ اب آنٹی' ان کے گھر بار اور ان کے حالات سے بہت اچھی طرح واقف ہوچکا تھا۔ ان دونوں نوجوانوں کو وہ اس حوالے سے تھوڑا سا جانتا تھا کہ دونوں ہی مکان مالکن کی اکلوتی صاحبزادی کے بیک وقت امیدوار تھے۔

دونوں یونیورسٹی میں ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ دونوں ہی آنٹی کا دل جیتنے کے لئے ہر جتن کر رہے تھے۔ اس معاملے میں دونوں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے کوشاں تھے۔ شاہد کو قوی امید تھی کہ ان دونوں کے درمیان کوئی فیصلہ نہیں ہوسکے گا اور لڑکی کوئی تیسرا ہی شخص بیاہ کر لے جائے گا۔ ویسے اس نے زندگی میں دو رقیبوں کو اتنا متحد کبھی نہیں دیکھا تھا۔

آنٹی نے ساڑھے چھ ماہ کے کرائے' بجلی' پانی وغیرہ کا بل شاہد کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کئی مرتبہ کا دہرایا ہوا جملہ ایک بار پھر دہرایا۔ "صبر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے........" جملہ پرانا تھا لیکن لہجہ نیا اور قطعی طور پر فیصلہ کن تھا۔ "غضب خدا کا........ ایک تو تم تین سال سے اسی پانچ سو روپلی مہینے پر اس کمرے پر قبضہ کئے بیٹھے ہو۔ آج تک ایک پیسہ کرایہ نہیں بڑھایا اوپر سے کرایہ دینے کا بھی تمہارا اپنا ہی ایک نرالا طریقہ ہے جس سے نباہ کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ کبھی تم پورے دو ماہ کا کرایہ ادا کرتے ہو........ کبھی سوا تین ماہ کا........ کبھی انیس دن کا........ کبھی اکیس دن کا........ اور کبھی ایک عرصے تک پیسوں کا نام نہیں۔ اب تمہارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو یہ بل اسی وقت ادا کر دو اور آئندہ کے لئے کرایہ چھ سو روپے مہینے سمجھو یا پھر وہ راستہ پکڑو جو اس گھر سے باہر کی طرف جاتا ہے"۔

شاہد نے ایک گہری سانس لی اور ندامت آمیز سے انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ "آنٹی! میں آج اس سلسلے میں غور و خوض کر رہا تھا........"

"مجھے غور و خوض کی نہیں' پیسوں کی ضرورت ہے"۔ آنٹی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تمہیں خود بھی احساس ہونا چاہیے کہ کرائے کے علاوہ میرا کوئی ذریعہ آمدن نہیں ہے"۔

"لیکن آنٹی..........!" شاہد اپنے روایتی صبر و تحمل سے بولا۔ "میری معلومات کے مطابق تو بینک کے سیونگ اکاؤنٹ میں آپ کے ایک لاکھ بیاسی ہزار تین سو پچاس روپے اور فکسڈ ڈپازٹ میں پانچ لاکھ روپے موجود ہیں۔ آپ خدانخواستہ کوئی ایسی غریب و نادار خاتون تو نہیں ہیں۔ میرے سوا باقی سب کرایہ دار تو باقاعدگی سے کرایہ دیتے ہی ہیں"۔

"لیکن تمہیں کیسے.......... میرا مطلب ہے یہ بینک والی بات تمہیں کیسے..........؟" آنٹی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور جملہ بھی مکمل نہ کرسکیں وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شاہد کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"ایک بار میں آپ سے ملنے اوپر گیا تھا آپ گھر پر نہیں تھیں۔ آپ کی صاحبزادی نے مجھے اجازت دے دی تھی کہ میں آپ کے کمرے میں ہی بیٹھ کر آپ کا انتظار کرلوں اور چاہوں تو رنگین ٹی وی پر میچ بھی دیکھتا رہوں.........." شاہد نے جان بوجھ کر توقف کیا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ صرف آنٹی کی نہیں بلکہ دونوں نوجوانوں کے چہروں کی رنگت بھی متغیر ہو رہی تھی۔

ایک لمحے کی صبر آزما خاموشی کے بعد شاہد نے سلسلہ کلام جوڑا۔ "میں کمرے میں بیٹھ گیا تھا اور آپ چونکہ کافی دیر تک واپس نہیں آئی تھیں اس لئے وقت گزاری کی خاطر ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگا تھا۔ ویسے بھی آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں لیکن میں اپنے اور آپ کے درمیان اپنائیت کا ایک رشتہ محسوس کرتا ہوں۔ آپ کے گھر کو اپنا ہی گھر سمجھتا ہوں اس لئے تھوڑی بہت بے تکلفی میں کوئی حرج نہیں سمجھتا.........."

"تم اصلی سوال کا جواب دو"۔ آنٹی بے تابی سے بولیں۔

"آپ غلطی سے اپنی الماری کا ایک پٹ کھلا چھوڑ گئی تھیں اور اس میں سامنے ہی سب سے نچلے خانے میں آپ کی دونوں بینک بکس پڑی نظر آ رہی تھیں۔ میں کافی دیر تک حسرت سے ان دونوں کا جائزہ لیتا رہا۔ ویسے آپ اطمینان رکھئے.......... میں نے ان کے علاوہ کسی چیز کو چھوا تک نہیں تھا"۔

"بدمعاش.......... اچکے..........!" آنٹی غصے کی شدت سے باقاعدہ تھر تھر کانپنے لگیں۔ ایک پستہ قد لیکن فربہ اور چربی زدہ خاتون پر کپکپاہٹ طاری ہونا بجائے خود ایک حیرت انگیز عمل تھا۔ "اب تو تم بل ادا کرکے اور کرایہ بڑھا کر بھی یہاں نہیں رہ سکتے۔ تمہاری تو چوروں والی فطرت ہے۔ تمہارا کیا بھروسہ.......... کل کلاں کو موقع پا کر مجھ بیوہ کا گلا دبا کر گھر گرہستی ہی لے کر چمپت ہو جاؤ۔ تم فوراً" کمرہ خالی کر دو"۔

شاہد اندیشہ محسوس کر رہا تھا کہ آج شاید اسے کمرہ خالی کرنا ہی پڑ جائے کیونکہ اس کے پاس ساڑھے چھ ماہ کا کرایہ وغیرہ تو درکنار' دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے بھی پیسے نہیں تھے۔ ناشتے کے بارے میں وہ اس لئے فکر مند نہیں تھا کہ ناشتہ وہ کرتا ہی نہیں تھا۔

"آنٹی..........! آپ جیسی معزز خاتون کو یہ انداز گفتگو زیب نہیں دیتا"۔ شاہد نے سر اٹھا کر باوقار لہجے میں کہا۔ "آپ کو ایک معزز زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ سے تو کم از کم اس لہجے میں گفتگو نہیں کرنی چاہیے"۔

"ارے بھاڑ میں گیا تمہارا زمیندار گھرانہ"۔ آنٹی ہاتھ نچا کر بولیں۔ "آخر رہتا کہاں ہے وہ زمیندار گھرانہ؟ آج تک کسی کو تم سے ملنے کے لئے تو آتے نہیں دیکھا.......... اور پھر ایسے زمیندار گھرانے کا کیا فائدہ جو تمہیں پانچ سو روپلی ماہوار کے کمرے کا کرایہ ادا کرنے کے لئے بھی ذرا سی رقم نہ دے سکے۔ خود تو تم ازل کے نکھٹو ہو اور امید ہے زندگی بھر نکھٹو ہی رہو گے۔ میں تمہارے اس خیالی زمیندار گھرانے کا جتنا لحاظ کرسکتی تھی کرچکی۔ اب تم کوئی اور گھر تلاش کرو"۔

"ٹھیک ہے محترمہ کریم النساء بیگم!" شاہد نے پہلی مرتبہ خاتون کو ان کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے پروقار لہجے میں کہا۔۔۔ "آپ مجھے تیار ہونے کا موقع دیں۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں آپ کا کمرہ چھوڑ جاؤں گا۔ اس کمرے میں کچھ چیزیں آپ کی ہیں اور کچھ میری۔ اپنی چیزوں کے لئے میں بعد میں کوئی آدمی بھیج دوں گا یا خود آکر لے جاؤں گا"۔

"اگر بل کی رقم کا بندوبست نہ ہو تو یہ زحمت بھی مت کرنا"۔ کے این آنٹی نے بے رحم لہجے میں کہا اور واپس جانے کے لئے مڑ گئیں۔ دونوں نوجوانوں بھی سعادت مندی سے ان کے پیچھے چل دیئے تاہم جانے سے پہلے انہوں نے شاہد کو قہر آلود نظروں سے گھورنا ضروری سمجھا تھا۔ شاہد ان نظروں سے کچھ زیادہ مرعوب نہیں ہوا۔

ان کے جانے کے بعد شاہد نہ تو سر تھام کر بیٹھا اور نہ ہی اس نے زیر لب اپنی تقدیر سے کوئی شکوہ کیا۔ وہ اب ایسی باتوں کا قائل نہیں رہا تھا۔ اس کے خیال میں پریشان ہونے کا کوئی بھی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ کمرہ چھوڑنے کی اسے تشویش ضرور تھی لیکن وہ یہ سوچ کر اس صورت حال سے سمجھوتا کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ اس کی زندگی کا ایک اہم موڑ تھا اور زندگی میں موڑ خواہ اچھے ہوں یا برے' ان سے گزرنا تو پڑتا ہی تھا۔

دروازہ بند کرکے اس نے گہری سانس لی اور وقت ضائع کئے بغیر باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اس باتھ روم کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں داخل ہونے کے لئے دروازہ کھولنے کی زحمت نہیں کرنا پڑتی تھی۔ کیونکہ دروازہ اس میں تھا ہی نہیں۔

اس کے اندر موجود چیزوں کی حالت بھی خاصی عبرت ناک تھی۔ کموڈ اور واش بیسن شاید کبھی سفید رہے ہوں گے لیکن شاہد جب سے یہاں آیا تھا اس نے انہیں زرد پایا تھا اور اب جبکہ وہ یہاں سے رخصت ہو رہا تھا تو ان کا رنگ تقریباً" سیاہ ہوچکا تھا۔

فلش کی ٹنکی انگریزوں کے زمانے کی تھی۔ ٹنکی کیا بس کچے لوہے کا ایک بھاری بھرکم صندوق تھا۔ اس کی ایک حیرت انگیز خوبی یہ تھی کہ زنجیر کھینچنے سے پانی کموڈ میں نہیں آتا تھا

بلکہ کموڈ پر بیٹھے ہوئے شخص پر گرتا تھا۔ بہرحال اب یہ ٹنکی اپنی اس حیرت انگیز خوبی سے بھی محروم ہوچکی تھی کیونکہ اب اس میں زنجیر ہی نہیں رہی تھی۔ شاہد نے اس ٹوٹی ہوئی زنجیر کو دروازے کے قریب لٹکا دیا تھا اور اسے "زنجیر عدل" کا نام دے دیا تھا۔

واش بیسن پر جو آئینہ لگا ہوا تھا وہ اتنا زیادہ میلا اور چٹخا ہوا تھا کہ آئینہ کم اور مکڑی کا جالا زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ شاہد کو اس میں نظر تو کچھ نہیں آتا تھا' بس ویسے ہی اس کے سامنے کھڑے ہو کر شیو بنانے اور منہ دھونے کی عادت تھی۔

حسب عادت آج بھی اس نے اسی آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر شیو بنایا' منہ دھویا اور اپنا وہ اکلوتا سوٹ نکال کر پہنا جو بسوں میں دھکے کھا کھا کر بے حال ہوچکا تھا مگر جسے ہر رات شاہد جھاڑ پونچھ کر' نہایت دل جمعی سے استری کرکے دوسری صبح پہننے کے قابل بنا لیا کرتا تھا۔ اس کے ہمراہ پہنی جانے والی شرٹ بھی شاہد نے نہایت احتیاط سے استعمال کی تھی اور اسے دھوتے وقت ہمیشہ خیال رکھا تھا کہ اس کا کالر پھٹنے نہ پائے۔ گرمیاں شروع ہونے کے بعد بھی کافی دنوں تک شاہد اسی سوٹ کو رگیدتا رہتا تھا۔ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ سوٹ خواہ کتنا ہی گھسا پٹا اور معمولی کیوں نہ ہو' آدمی اس میں ذرا معزز نظر آتا تھا۔

تیار ہونے کے بعد وہ خاصا تعلیم یافتہ اور آسودہ حال نوجوان معلوم ہونے لگتا تھا۔ یہ بات اسے خود بھی معلوم تھی۔ جوتوں پر ایک بار پھر اچھی طرح کپڑا پھیرنے اور بالوں میں دوبارہ کنگھی کرنے کے بعد اس نے ڈربہ نما کمرے پر الوداعی نظر ڈالی۔ زندگی خواہ اس پر کتنی ہی نامہربان رہی تھی لیکن اس کمرے نے ہمیشہ آغوش مادر کی طرح اسے پناہ دی تھی۔

دیواروں کے اکھڑے ہوئے پلستر اور رنگ و روغن کی بدنمائی کو چھپانے کے لئے اس نے بھی سابق کرایہ دار کی طرح اسٹکر چپکانے کی ترکیب جاری رکھی تھی۔ اسے جہاں سے بھی اور جس قسم کا بھی اسٹکر مفت مل جاتا تھا' لا کر کمرے میں لگا دیتا تھا۔ اس کے گدے کے سرہانے ایک لبوترا سا کارڈ چسپاں تھا جو سابق کرائے دار نے لگایا ہوا تھا اس پر حقیقت میں تو یہ لکھا تھا۔

"ماں کے بغیر بھی گھر کوئی گھر ہے!"

لیکن شاہد نے نہایت صفائی سے لفظ "ماں" پر چٹ چپکا کر جملہ یوں بنا دیا تھا۔

"دولت کے بغیر بھی گھر کوئی گھر ہے"۔

ایک اسٹکر پر لکھا تھا۔۔۔ باتھ روم میں بیٹھ کر "سگریٹ نوشی مت کیجئے" لیکن یہ اسٹکر باتھ روم کے بجائے الماری پر لگا ہوا تھا۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے بہت سے اسٹکر جو عموماً" جہازوں یا اچھے ہوٹلوں وغیرہ میں چسپاں ہوتے ہیں' نہ جانے کن کن اتفاقات کے تحت شاہد کے پاس جمع ہوگئے تھے۔

کمرے کے در و دیوار اور ان کے درمیان بکھرا ہوا کاٹھ کباڑ اس کے لئے اتنا مانوس

ا اسے چھوڑ کر جانے کے خیال سے وہ ایک لمحے کے لئے افسردہ سا ہوگیا لیکن پھر اس
سر جھٹکا اور دنیا کے سمندر میں ایک نئے رخ' ایک نئے عزم سے ہاتھ پاؤں مارنے کے
نکل کھڑا ہوا۔

معمول کے مطابق آج بھی سب سے پہلے وہ اپنے علاقے کی پر رونق مارکیٹ کے ایک
اسٹال پر پہنچا اس کا مالک شاہد کے دیر تک وہاں کھڑے ہونے اور رسالے یا اخبار الٹنے
پر از راہ مروت اعتراض نہیں کرتا تھا۔ ورنہ اس معاملے میں دوسروں کے ساتھ وہ
بت بدلحاظ تھا۔

کبھی کبھی تو شاہد دو دو تین تین گھنٹے یہاں گزار دیتا تھا اور نہ جانے کتنے اخبار وغیرہ
ڈالتا تھا۔ اس عمل سے اس کے سامنے گویا سوچ کی نئی راہیں کھل جاتی تھیں اور وہ
ن میں نہ جانے کیسا کیسا نیا آئیڈیا اور کیسی کیسی نئی امیدوں کے خزانے سمیٹ کر ایک نئے
صلے سے زندگی کی دوڑ میں شریک ہونے کے لئے نکل کھڑا ہوتا تھا۔

یہ دوسری بات تھی کہ شام تک وہ کوئی چھوٹا موٹا کام کرکے یا محض آوارہ گردی
رکے تھکا ماندہ اور لٹا پٹا سا گھر لوٹ آتا تھا۔ اس کا دامن دل اکثر کسی نوید سے خالی ہی رہتا
الیکن یہ بک اسٹال بہرحال اگلی صبح اسے پھر تازہ دم کر دیتا تھا آج بھی وہاں پہنچ کر وہ
خباروں اور رسالوں کی دنیا میں کھو گیا۔ وقت گزرنے کا اسے احساس ہی نہ رہا۔

وہ اس وقت چونکا جب بک اسٹال والے نے پوچھا۔ "صاحب! آج کھانا کھانے بھی
میں جاؤ گے کیا؟"

وہ خود اس وقت کھانا کھانے کے لئے جانے کی تیاری کر رہا تھا اور بک اسٹال پر
لاسٹک کی شیٹ پھیلا رہا تھا۔ شاہد اس وقت انگریزی کا ایک اخبار دیکھ رہا تھا جو شام کا اخبار
کہلاتا تھا مگر دوپہر سے پہلے ہی آجاتا تھا۔ اس کی شہ سرخی ہمیشہ بڑی سنسنی خیز ہوتی تھی لیکن
تن میں یا تو اس کا مطلب ہی کچھ اور نکلتا تھا یا دوسرے روز اس کی تردید آجاتی تھی۔

شاہد نے اخبار نہایت احتیاط سے تہہ کرکے واپس رکھا اور پتلون کی کریز درست کرتے ہوئے بولا۔ "ہاں........ جانا تو ہے لیکن میں فیصلہ نہیں کرپا رہا کہ کس ہوٹل میں جانا چاہیے"۔

"ظاہر ہے آپ تو کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ہی جائیں گے"۔

بک اسٹال والا استہزائیہ لہجے میں بولا۔ اسے شاہد کی مالی حالت کا یقیناً" اندازہ تھا۔ ظاہر تھا جو شخص اتنے عرصے سے اخبار رسالے وہیں کھڑے ہو کر پڑھ رہا تھا' کبھی خرید کر نہیں لے گیا تھا' اس کی مالی حالت کیا ہوسکتی تھی۔

"ہاں۔۔۔" شاہد نے گہری سنجیدگی سے اثبات میں سرہلایا۔ "میں بہ حالت مجبوری ہی کبھی کبھی فور اسٹار ہوٹل میں کھانا کھاتا ہوں ورنہ فائیو اسٹار میں ہی کھانا پسند کرتا ہوں"۔

وہ نہایت پروقار انداز میں قدم اٹھاتا وہاں سے چل دیا۔ بک اسٹال والا کئی لمحے ت
اپنا کام چھوڑ کر حیرت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے اسے جاتے دیکھتا رہا۔

شاہد کی خوش قسمتی تھی کہ کچھ عرصے اسے امپورٹ ایکسپورٹ کی ایک فرم میں ڈ
منٹ سپروائزر کی حیثیت سے بھی کام کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ واحد باعزت ملازمت
جو اسے تجربے اور کاغذات کے بغیر مل گئی تھی وہ بھی شاید اس لئے کہ اس میں تنخواہ بہ
کم تھی لیکن تن تنہا شاہد جو بدترین حالات میں بھی گزر بسر کا عادی ہوگیا تھا اس کے گزار
کے لئے کافی تھی۔

فرم دو بھائیوں کی ملکیت تھی جن کے نام طارق اور جودت تھے لیکن پیٹھ پیچھے ش
انہیں "طاق اور جفت" کہا کرتا تھا کیونکہ ان میں سے ایک شادی شدہ تھا اور دوسرا غیر شا
شدہ۔ ان کی فرم میں شاہد کی ملازمت کا مختصر سا عرصہ گویا اس کی نئی زندگی کا سنہرا حصہ تھ
کچھ عزت سے گزر بسر ہونے لگی تھی لیکن یہ عزت داری اسے کچھ زیادہ راس نہیں آ
تھی۔ اس نے جنرل منیجر سے جھگڑا مول لے لیا تھا اور گو کہ جنرل منیجر غلطی پر تھا لیکن ن
وہی جاتا ہے جس کی پوزیشن کمزور ہوتی ہے۔ لہٰذا شاہد کو نکال دیا گیا تھا۔

اس ملازمت میں شاہد کو ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا تھا کہ اس نے ازسرنو اچھے ہوٹلو
کی شکل دیکھ لی تھی اور دو ایک میں تو اپنے "صاحبوں" کے ساتھ کھانا بھی کھا لیا تھا کیونکہ
اسے چند ایک ایسی میٹنگوں میں بھاری بھاری فائلیں اٹھوا کر ساتھ لے گئے تھے جہا
اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

اسی فرم کے ڈرائیور کے ساتھ باہر آتے جاتے اس نے گویا ازسرنو ڈرائیونگ سیکھ
تھی۔ تاہم اسے اس میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا اس کے پاس لائسنس نہیں تھا لیکن فرم میں
نوکری چھوٹنے کے بعد اس نے کئی جگہوں پر ڈرائیور کے طور پر بھی ملازمت حاصل کر
کے لئے ہاتھ پاؤں مارے تھے لیکن ظاہر تھا ڈرائیور کی نوکری لائسنس کے بغیر تو نہیں مل
سکتی تھی۔

اس سنہری مگر مختصر دور کو یاد کرتے ہوئے اس نے کئی ٹھنڈی سانسیں لیں اور سڑک
پار کر کے بس اسٹاپ پر پہنچ گیا۔ اس وقت اس کی جیب میں صرف ایک ایک روپے کے تین
نوٹ اور دو چونیاں تھیں لیکن اس کی مطلوبہ بس آئی تو وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل جانے کے
ارادے سے اس میں لٹک گیا۔ بس اس ہوٹل کے سامنے سے تو نہیں البتہ کچھ دور سے
گزرتی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ ہوٹل کے کسی قریبی اسٹاپ پر اتر کر باقی فاصلہ پیدل طے کر
لے گا۔ اس کے حق میں بہتر بھی یہی تھا کہ ہوٹل کے عین سامنے بس سے نہ اترے۔

آج اس کی کیفیت کچھ عجیب ہی تھی۔ اپنی زندگی کے اس دوسرے دور میں اس نے
کبھی اپنی قوت ارادی کو مرتکز کر کے مکمل یکسوئی سے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا لیکن آج اس

نے کم از کم یہ تہیہ ضرور کر لیا تھا کہ زندگی اگر اسے ذلت کا زہر پلانا ہی چاہتی تھی تو وہ اسے
قطرہ قطرہ نہیں بلکہ یکدم ہی پینے کی کوشش کرے گا اور دیکھے گا کہ کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔
اس کے علاوہ اس نے ایک فیصلہ یہ بھی کیا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ ظلم اور زیادتی تو بہرحال
نہیں کرے گا لیکن ان محرومیوں کو جھٹک پھینکے گا جو آسیب کی طرح اس کے وجود سے چمٹ
گئی تھیں۔ وہ رواداری' مروت' وضعداری اور راست بازی کا تو پہلے ہی دل میں کچھ زیادہ
قائل نہیں رہا تھا لیکن اب اس نے اپنے اندر کافی عرصے سے انگڑائیاں لیتی ہوئی کچھ
صلاحیتوں کو بھی استعمال کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

جن دنوں اس کے مالی حالات زیادہ مخدوش ہوتے تھے وہ بس میں ٹکٹ لینے کا تکلف
نہیں کرتا تھا۔ وہ فائیو اسٹار ہوٹل سے کچھ پہلے ہی اتر گیا اور جوتوں سے گرد جھاڑ کر جیبوں
میں ہاتھ ڈال کر کسی ایسے آسودہ حال تاجر یا خوش فکر نوجوان ایگزیکٹو آفیسر کی طرح سیٹی بجاتا
چلنے لگا جو ذرا فرصت میسر آنے پر دفتر سے اٹھ کر قریب ہی کسی دوسرے دفتر میں دوست
سے گپ شپ کرنے چل دیا ہو۔

ہوٹل میں عقبی راستے سے داخل ہوا۔ سامنے ہی ایک صاف ستھرے شوکیس میں
پلاسٹک کے حروف سے ہوٹل کے مختلف حصوں میں ہونے والی تقریبات کا پروگرام درج تھا
لیکن ابھی کسی تقریب کا وقت نہیں ہوا تھا۔ وہ مختلف ہالوں کے بند دروازوں کو حسرت سے
دیکھتا ہوا لاؤنج میں جا بیٹھا۔ سامنے کے دروازے سے اندر آنے والے اور ہوٹل میں مقیم
افراد اس کے سامنے سے گزر کر لفٹوں وغیرہ کی طرف جا رہے تھے۔ شاہد غیر محسوس طور
پر ان سب کا جائزہ لے رہا تھا۔

اسے تین افراد کی ٹولی بھی ریستوران کی طرف بڑھتی نظر آئی جن کے چہروں پر دولت
مندی اور آسودہ حالی کی چمک کے ساتھ سادہ لوح اور شریف انسانوں والی مخصوص سی
معصومیت کا پرتو بھی تھا۔ وہ تینوں ریستوران میں جا چکے تو شاہد نے تھوڑی دیر انتظار کیا پھر
اٹھ کر ریستوران کی طرف بڑھا۔

دروازے پر رک کر اس نے ہال کا جائزہ لیا۔ بیشتر میزیں پر ہو چکی تھیں لیکن اس کی
خوش قسمتی تھی کہ ان تینوں افراد نے جو میز منتخب کی تھی اس کے قریب ایک میز خالی تھی۔
وہ مسکراتا ہوا ان کی طرف بڑھا اور ان تینوں میں جو زیادہ عمر کا تھا اور جس نے باریک فریم
کی عینک لگا رکھی تھی۔ اس کی طرف جھکتے ہوئے نہایت شائستہ اور پراعتماد لہجے میں بولا۔ "
انعام صاحب! سیٹھ حبیب اللہ صاحب نے پیغام بھیجا ہے کہ آپ ان کے ساتھ کھانا کھانے
کے لیے اس ہوٹل کے بجائے دوسرے فائیو اسٹار ہوٹل میں تشریف لے آئیں۔ وہ بے حد
معذرت خواہ ہیں کہ بعض ناگزیر مجبوریوں اور پروگرام میں تبدیلی کی وجہ سے وہ اس ہوٹل
میں نہیں آ سکیں گے"۔

"آپ کو شاید غلطی ہوئی ہے۔۔۔" عینک والے ادھیڑ عمر شخص نے خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرا نام انعام نہیں منور کمال ہے۔۔۔ اور اگر آپ انہی حبیب اللہ کا ذکر کر رہے ہیں جو اس ملک کے بہت بڑے بزنس مین۔۔۔ بلکہ بزنس میگنیٹ ہیں تو میں یہ بھی عرض کر دوں کہ بدقسمتی سے میری ان سے ذرا بھی شناسائی نہیں ہے"۔

"اوہ........" شاہد گویا شرمندہ سا ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا پھر اس نے الجھن زدہ سے انداز میں ایک بار ہال پر نظر دوڑائی اور بولا۔ "لیکن مجھے جو حلیہ بتایا گیا تھا اس پر تو صرف آپ ہی پورے اترتے نظر آئے تھے........ خیر........ میں معذرت چاہتا ہوں۔ دراصل انعام صاحب کو دیکھا میں نے بھی نہیں ہے۔ بس مجھے صرف یہ معلوم ہے کہ سیٹھ حبیب اللہ سے ان کا ٹیکسٹائل مشینری کا کوئی سودا چل رہا ہے۔ بہرحال میں بیٹھ کر ان کا انتظار کرلیتا ہوں"۔

وہ برابر کی خالی میز پر بیٹھ گیا اور بظاہر ان کی طرف سے لاتعلق سا ہوگیا۔ ویٹر اس کے قریب آیا تو اس نے پروقار لہجے میں کہا۔ "میں ایک صاحب کا انتظار کر رہا ہوں"۔

ویٹر مودبانہ انداز میں سر کو جنبش دے کر واپس چلا گیا۔ اردگرد کی میزوں پر ڈشیں سروس کی جا رہی تھیں اور ان کی خوشبو سے شاہد کی بھوک یک لخت ہی اتنی تیز ہوگئی تھی کہ معدے میں اینٹھن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کے برابر والی میز پر ان تینوں افراد کے سامنے بھی کھانا سجایا جانے لگا تھا ان کی پلیٹوں سے تو انواع و اقسام کی خوشبوئیں گویا براہ راست ہی شاہد کے نتھنوں میں گھسی جا رہی تھیں۔

"آئے نہیں انعام صاحب؟" عینک والے اور ادھیڑ عمر منور کمال نے برابر کی میز سے پوچھا۔

"ابھی تک تو اس حلیے کا آپ کے سوا اور کوئی دکھائی نہیں دیا........" شاہد نے گھڑی دیکھ کر قدرے بے چینی سے کہا۔ "ان کے انتظار میں میرا بھی کھانے کا وقت نکلا جا رہا ہے۔ مجھے بھی دوسرے ہوٹل میں سیٹھ صاحب کے ساتھ ہی لنچ کرنا تھا"۔

"لنچ آپ ہمارے ساتھ ہی کیوں نہیں کر لیتے"۔ منور کمال نے قدرے تاخیر کے ساتھ، لیکن شاہد کی توقع کے عین مطابق کہا۔ "اس طرح کچھ دیر اور انتظار بھی ہو جائے گا"۔

"میں بن بلایا مہمان بن کر آپ کے سر پر مسلط ہونا نہیں چاہتا"۔ شاہد نے کہا لیکن جملہ مکمل کرنے تک وہ ان کی میز پر پہنچ چکا تھا۔ ہال میں پلیٹوں سے کانٹے چھریاں اور چمچے ٹکرانے کی آوازیں اب اسے موسیقی کی دھن کی طرح محسوس ہونے لگی تھیں۔

کھانے کے دوران منور کمال نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کا قدرے تفصیلی تعارف کرایا۔ منور کمال خود ٹھیکیدار تھا۔ اس کا ایک ساتھی ایک سرکاری ادارے میں افسر تھا۔ اس

کا تعارف منور کمال نے ذرا ہچکچاتے ہوئے اور کافی محتاط انداز میں کرایا تھا اور وہ افسر گویا خود بھی اپنی اصل شخصیت مخفی ہی رکھنا چاہتا تھا۔ تیسرا شخص افسر ہی کا دوست تھا اور منور کمال اس سے زیادہ واقف معلوم نہیں ہوتا تھا۔ شاہد حسین کے لئے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ منور کمال در حقیقت سرکاری افسر کو خوش کرنے کے لئے لنچ پر لایا تھا۔

اپنی طرف سے تعارف کا فریضہ انجام دینے کے بعد نوالا چباتے ہوئے منور کمال نے متوقع سی نظروں سے شاہد کی طرف دیکھا اور ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کیا سیٹھ حبیب اللہ کے سیکرٹری ہیں؟"

شاہد مربیانہ انداز میں مسکرایا۔ "جی نہیں........ میں ان کا ملازم نہیں ہوں"۔ اس نے بہ مشکل اپنے آپ پر جبر کرتے ہوئے اپنے آپ کو تیزی سے کھانا کھانے سے باز رکھا ہوا تھا ورنہ دل تو اس کا یہی چاہ رہا تھا کہ ہر چیز پر ندیدوں کی طرح ٹوٹ پڑے مگر مصلحتاً اسے نزاکت و نفاست سے کھانا پڑ رہا تھا۔ اسے اپنے آپ کو مہذب، خوش اطوار اور آسودہ حال ظاہر کرنا تھا۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ "سیٹھ حبیب اللہ سے میرے تعلقات کچھ کاروباری بھی ہیں اور کچھ دوستانہ بھی، میں تو بہت چھوٹا سا آدمی ہوں یہ ان کی شفقت اور مہربانی ہے کہ وہ مجھ سے اپنوں کی طرح ملتے ہیں۔ میں دراصل دبئی میں سیٹل ہوں۔ وہیں سیٹھ صاحب سے میری ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ مجھے کراچی آئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ اب سیٹھ صاحب چاہتے ہیں کہ میں یہیں ان کے ساتھ کوئی چھوٹی موٹی حصے داری کرکے سیٹل ہو جاؤں اور میرا دبئی والا چھوٹا سا بزنس وہ ٹیک اوور کرکے اپنے ایک رشتے دار کو دے دیں"۔

"بہت خوب........ بہت خوب........" منور کمال کچھ رشک آمیز سے لہجے میں بولا۔ "میں سیٹھ صاحب کو ذاتی طور پر نہیں جانتا لیکن سنا ہے کہ وہ پارس ہیں۔ جس سے چھو جائیں اسے سونا بنا دیتے ہیں"۔

شاہد نے گفتگو میں مزید وقت ضائع کرنا بہتر نہ سمجھا اور اس بات کا جواب ایک بار پھر مربیانہ انداز میں مسکراتے ہوئے محض اثبات میں سر ہلا کر دیا اور غیر محسوس انداز میں ذرا تیزی سے کھانے کا صفایا کرنے لگا۔

کھانے اور کافی سے فارغ ہو کر منور کمال نے چیک طلب کیا اور ادائیگی کرتے وقت پانچ پانچ روپے کے دو کرارے نوٹ ویٹر کے لئے ٹپ کے طور پر بھی چھوڑ دیئے جنہیں یونہی جاتے دیکھ کر شاہد کی ہتھیلی میں کھجلی سی ہونے لگی اور بے اختیار اس کا جی چاہا کہ سب کی نظر بچا کر انہیں فولڈر میں واپس کھینچ لے۔

وہ لوگ وقت گزاری کے موڈ میں معلوم نہیں ہوتے تھے۔ منور کے بل ادا کرتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ شاہد بھی اب "انعام صاحب" کے مزید انتظار کو فضول قرار دے کر ان

کے ساتھ ہی چل دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ قریب ہی کی ایک اور میز پر بیٹھا ہوا ایک شخص بار بار کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

تب اسے یاد آیا کہ جب وہ اپنے میزبانوں کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا تب بھی وہ شخص بظاہر کافی پی رہا تھا لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس کے کان انہی کی گفتگو پر لگے ہوئے تھے شاہد اس کی دلچسپی کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ بظاہر ایک 'معزز' بارعب اور پختہ عمر کا شخص تھا۔ اس کی رنگت میں بڑی سرخی تھی۔

شاہد نے اسے کوئی خاص اہمیت نہ دی اور باہر آگیا۔ پارکنگ لاٹ میں پہنچ کر منور کمال نے پوچھا۔ "آپ کے پاس گاڑی ہے یا.........؟"

"جی نہیں......... میں ٹیکسی میں آیا تھا"۔ شاہد نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "یہاں مستقل رہنے کا ارادہ بنے گا تبھی گاڑی لوں گا۔ اچھا......... خدا حافظ۔ لنچ کا بہت بہت شکریہ"۔

وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ منور کمال نے جلدی سے کہا۔ "آپ کو دوسرے فائیو اسٹار ہوٹل ہی جانا ہے تو ٹیکسی تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم آپ کو چھوڑ دیں گے۔ ہم ڈیفنس کی طرف جا رہے ہیں۔ ادھر سے ہی نکل جائیں گے"۔

منور کمال کی گاڑی نہایت عمدہ تھی۔ اس ایئرکنڈیشنڈ اور بڑی سی پر تعیش گاڑی میں بیٹھ کر شاہد گویا کسی اور ہی چھوٹی سی دنیا میں پہنچ گیا۔ منور کمال نے اسے عین دوسرے ہوٹل کے دروازے پر اتارا۔ اونچے طرے والے دربان نے شاہد کو پندرہ لاکھ کی گاڑی سے اترتے دیکھا تو جھک کر سلام کیا۔ دروازہ کھولنا اس کے فرائض میں شامل نہیں تھا ورنہ وہ بھی لپک کر کھولتا لیکن دروازہ چھت میں نصب ایک ٹی وی کیمرے کی آنکھ سے منسلک نظام کے ذریعے خود ہی کھلتا اور بند ہوتا تھا۔

شاہد نے ایک بار پھر منور کمال کا شکریہ ادا کیا۔ اس کا وزیٹنگ کارڈ لیا اور فارغ وقت میں اسے سیٹھ حبیب اللہ سے ملانے کا وعدہ کر کے قدرے رعونت بھرے انداز میں چلتا ہوا دربان کی طرف مطلق توجہ دیئے بغیر اندر پہنچا اور سیدھا استقبالیہ پر چلا گیا۔ استقبالیہ پر ملکی اور غیر ملکی مہمانوں کی خاصی بھیڑ بھاڑ تھی۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی رجسٹروں پر جھکے ہوئے تھے اور لوگوں کے سوالات کی بھرمار کی وجہ سے اور کچھ اندراجات کے سلسلے میں خاصے سٹپٹائے ہوئے تھے۔

شاہد نے ہجوم کے درمیان سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ "ذرا فور ففٹی ون کی چابی دے دیجئے گا"۔

اس نے پیچھے دیوار میں ایک بورڈ پر مختلف نمبروں پر بہت سی چابیاں لٹکی دیکھ لی تھیں اور غیر ارادی طور پر ان میں سے چار سو اکیاون نمبر کو منتخب کر لیا تھا۔ چابی کے لئے ہاتھ

بڑھاتے وقت اس کی دھڑکن کچھ تیز ہو چکی تھی لیکن اس وقت اس نے غیر محسوس طور پر سکون کی سانس لی جب کلرک لڑکے نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی اور مطلوبہ نمبر پر سے چابی اتار کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ وہ اطمینان سے لفٹ کی طرف چل دیا۔ کھانا اس نے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کھا لیا تھا۔ اب وہ ستانے کے لئے دوسرے فائیو اسٹار میں آگیا تھا۔ پہلے ہی دن اونچی جگہوں پر جا کر اپنے مسائل حل کرنے میں شاہد خود کو زیادہ خوفزدہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔

دونوں لفٹیں اوپر گئی ہوئی تھیں۔ بٹن دبانے کے بعد شاہد لفٹ کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے بعد لفٹ نیچے آئی اور اس نے کئی افراد کو اپنے شکم سے اگل دیا۔ شاہد نے اس کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ عقب سے کسی نے اس کا کندھا تھپتھپایا ایک بار تو گویا اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ تاہم اس نے کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ کئے بغیر مڑ کر دیکھا۔

وہی پختہ عمر کا سرخ سے چہرے والا شخص اسے اپنے پیچھے کھڑا نظر آیا جسے اس نے دوسرے ہوٹل میں کھانا کھانے کے دوران بھی اپنی طرف متوجہ محسوس کیا تھا۔ اس کی سانس قدرے پھولی ہوئی تھی۔ وہ شاید کافی عجلت میں شاہد کے پیچھے یہاں پہنچا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔

"معاف کیجئے گا......... میں تو وہی 'مان نہ مان میں تیرا مہمان' والا معاملہ کر رہا ہوں"۔ اجنبی نے نہایت ملنسارانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ لیکن ایک خاص وجہ سے میں اس ڈھٹائی کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ آپ نے شاید اب بھی مجھے نہیں پہچانا۔ دوسرے ہوٹل میں بھی اسی امید پر آپ کی طرف دیکھ رہا تھا کہ شاید آپ مجھے پہچان لیں گے اور خود ہی گفتگو کا شرف بخشیں گے۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ......... اب مجبوراً خود ہی آپ کے پیچھے پیچھے دوڑا آیا ہوں"۔

"مجھے آپ کی صورت تو کافی شناسا لگ رہی ہے"۔ شاہد نے با آسانی اپنے چہرے پر خوش خلقی اور خجالت کا امتزاج پیدا کیا۔ "لیکن یاد نہیں آرہا......... میرا مطلب ہے........."

"ارے صاحب! میں وہی احمد خان ہوں جس کی دبئی میں مڈل ایسٹ الیکٹرانکس کے نام سے الیکٹرانک سامان کی کافی بڑی دکان ہے۔ کبھی کبھی آپ وی سی آر کے کیسٹ وغیرہ ہول سیل میں خریدنے کے لئے وہاں تشریف لایا کرتے تھے"۔ اجنبی نے تیزی سے کہا۔

"ارے ہاں......... خوب یاد دلایا میں بھی سوچ رہا تھا کہ چہرہ تو جانا پہچانا ہے"۔ شاہد گرمجوشی سے بولا۔ "سنایئے......... کراچی کب آئے؟ کہاں کہاں گھوم پھر رہے ہیں؟"

"ارے صاحب..........! گھومنا پھرنا کیسا.........." احمد خان نے آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔ "بڑے بھائی کے ناگہانی انتقال کی وجہ سے یہاں آنا پڑا اور کافی عرصے کے لئے یہیں پھنس کر رہ گیا ہوں.........."

پھر اس نے گویا دانستہ طور پر اس غم ناک تذکرے کو ادھورا چھوڑتے ہوئے کہا۔ "آپ یہیں ٹھہرے ہوئے ہیں؟ چلئے آپ کے کمرے میں چلتے ہیں۔ وہیں بیٹھ کر اطمینان سے بات کریں گے۔ وہ آپ نے سیٹھ حبیب اللہ کا تذکرہ کیا تھا۔ وہ کہاں ہیں؟"

"میں یہاں پہنچا تو وہ میرا انتظار کرکے جا چکے تھے"۔ شاہد نے اطمینان سے کہا۔ "آپ کو کوئی کام تھا ان سے؟ ابھی چلے چلتے ہیں ان کے پاس"۔

"نہیں.......... نہیں.........." احمد خان جلدی سے بولا۔ سیٹھ صاحب کے جانے کا سن کر اس نے گویا اطمینان کی سانس لی تھی۔ میرا کام تو شاید آپ سے ہی بن جائے"۔

"تشریف لایئے"۔ شاہد نے لفٹ کی طرف اشارہ کیا جو اب تک ایک چکر اور لگا چکی تھی۔ وہ دونوں لفٹ میں سوار ہوگئے۔ شاہد کو بڑے ہوٹلوں کے اس سسٹم کا اندازہ تھا کہ کمرے کا نمبر اگر چار سو سے شروع ہوتا تھا تو وہ چوتھے فلور پر ہوتا تھا۔ یعنی کمروں کے نمبر میں پہلا ہندسہ درحقیقت فلور کی نشاندہی کرتا تھا۔ محض تاثر بڑھانے کے لئے نمبر اس حد تک بڑھائے جاتے تھے ورنہ ہوٹل میں اتنے کمرے نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ اس نے چوتھے فلور کا بٹن دبایا۔

لفٹ سے نکل کر وہ راہداری میں آئے جہاں دائیں بائیں دونوں طرف کمروں کی قطاریں تھیں۔ شاہد نے باتیں کرتے کرتے بھی اتنا ضرور دیکھ لیا تھا کہ بائیں طرف کمروں کے نمبر بڑھ رہے تھے۔ چنانچہ وہ اسی سمت میں مڑا اور عین کمرہ نمبر چار سو اکیاون کے سامنے جا رکا۔

بڑے اعتماد سے اس نے کمرے کا تالا کھولا اور پہلے احمد خان کو اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ خود اندر آنے کے بعد وہ یہ دیکھ کر کچھ سٹپٹا گیا کہ کمرہ ڈبل بیڈ تھا اور اس میں بکھرے ہوئے سامان سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس میں کوئی جوڑا مقیم تھا۔

دروازے کے پیچھے ہی ایک طرف کپڑوں کی الماری تھی۔ اس کا سلائیڈنگ دروازہ بھی تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور اس میں شوخ رنگوں اور غیر ملکی تراش خراش کے نسوانی لباس جھولتے نظر آ رہے تھے۔ ایک سرخ اسکرٹ بیڈ پر بھی تڑامڑا پڑا تھا۔

صوفے کے ہتھے پر ایک مردانہ کوٹ پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ بڑی سی ڈریسنگ ٹیبل پر ٹی وی کے قریب میک اپ کا سامان بھی بکھرا ہوا تھا۔ کمرے میں ایک مخصوص سی خوشبو مقید تھی جو کئی خوشبوؤں کا مرکب تھی اور نسوانیت کی نشاندہی کرتی تھی۔ کمرے میں کچھ دیر پہلے سگار بھی پیا گیا تھا اور اس کی مردانہ سی خوشبو' نسوانی خوشبوؤں پر غالب آنے کی

کوشش میں ناکام ہو چکی تھی۔

شاہد نے اپنے بن بلائے مہمان کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"بیگم بھی ساتھ آئی ہوئی ہیں؟" احمد خان نے متجسس سی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"ظاہر ہے.........." شاہد نے اعتماد سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میرا قیام غیر معینہ مدت کے لئے ہے۔ اتنا عرصہ بیگم کے بغیر تو نہیں گزارا جاسکتا نا.........."

"ہاں.......... یہ بات تو ہے.........." احمد خان نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ پھر وہ گویا کچھ سوچتے ہوئے بولا.......... "ویسے.......... رہا تو جاسکتا ہے لیکن بیگمات رہنے کب دیتی ہیں صاحب!"

شاہد نے محض مسکرانے پر اکتفا کیا اور فون کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کے لئے کیا منگواؤں؟" اسے معلوم تھا کہ روم سروس کے لئے اسے کوئی نمبر ڈائل کرنا پڑے گا یا ریسیور اٹھاتے ہی آپریٹر سے سلسلہ مل جائے گا اور وہ مطلوبہ نمبر ملائے گا.......... تاہم یہ معلوم نہ ہونے کے باوجود اس کے انداز میں بڑی خوداعتمادی تھی۔

"ارے نہیں صاحب..........! تکلفات کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں"۔ احمد خان جلدی سے ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا.......... "آپ کو معلوم ہی ہے کہ انٹرکان میں کھانے کا سلسلہ چل رہا تھا۔ میں بھی کھانا کھا کر اور کافی پی کر اٹھا تھا"۔

"تو پھر فرمایئے.......... میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟" اس نے اپنے لہجے کے اضطراب کو کامیابی سے چھپاتے ہوئے پوچھا۔ شاہد کو اب کمرے میں قدرے گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ وہ یہاں زیادہ دیر رکنے کے ارادے سے نہیں آیا تھا اور نہ ہی اس کی نیت کوئی باقاعدہ لمبی چوڑی واردات کی تھی۔

وہ تو صرف پانچ سات سو روپے حاصل کرنے کی فکر میں تھا تاکہ جب وہ آرام سے بیٹھ کے روپے کمانے کی کوئی تدبیر سوچنے میں کامیاب ہو جائے تو پھر اس پر عملدرآمد کے سلسلے میں بس' رکشے یا ٹیکسی میں بھاگ دوڑ کرنے کا متحمل ہوسکے۔ اس سے زیادہ رقم یا کوئی اور چیز چرانے کا اس کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ وہ اپنے آپ کو نوسرباز بننے پر تو آمادہ کرچکا تھا لیکن کمینہ قسم کا باقاعدہ چور بننے کا خیال اس کے ذہن میں ہرگز نہیں تھا' مگر یہ احمد خان نہ جانے کیوں اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔ اب تو شاہد کو اس کمرے سے پانچ سات سو روپے اڑانا بھی مشکل نظر آ رہا تھا۔

"میں صبح سے کسی اچھے کاروباری شناسا کی تلاش میں بھٹک رہا تھا جس کا دبئی میں کاروبار ہو.........." احمد خان بریف کیس تپائی پر رکھتے ہوئے ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "میرا بھی دبئی میں چھوٹا موٹا کاروبار ہے.......... اور چھوٹا موٹا کاروبار کرنے والے کبھی

کبھی عجیب سی پریشانیوں میں پھنس جاتے ہیں..........."

وہ الجھن آمیز سے انداز میں خاموش ہوگیا۔ شاہد منتظر سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد احمد خان نے پوچھا۔ "دبئی میں آپ کی فرم کے دفتر میں فیکس تو ہوگا؟"

"کیوں نہیں..........." شاہد سنبھلتے ہوئے بولا........... "فیکس تو آج کل چھوٹی موٹی فرموں میں بھی ہوتا ہے..........." پھر اس نے فراٹے سے فیکس نمبر بھی بتا دیا۔ درحقیقت اسے "طارق اینڈ جودت" کا فیکس نمبر یاد تھا جن کے ہاں وہ ملازمت کرتا تھا۔ وہ فیکس جس نمبر سے منسلک تھا اس میں شاہد نے دبئی کا کوڈ نمبر شامل کر دیا تھا۔

پھر شاہد نے بڑی اپنائیت سے پوچھا........... "مسئلہ کیا ہے؟"

"بس جناب...........! بعض اوقات آدمی ذرا سی غلطی سے بڑے چکر میں پھنس جاتا ہے..........." احمد خان کی آنکھوں میں آنسو مچلنے لگے........... "آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ عرب ریاستوں میں کاروبار کے لئے کسی مقامی کو اسپانسر بنانا پڑتا ہے جو کچھ کئے بغیر باقاعدہ حصے دار کی طرح لگی بندھی رقم وصول کرتا ہے اور عموماً وہ بڑا بدلحاظ ہوتا ہے۔ دوستی وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑتا۔ مجھے ہنگامی طور پر یہاں آنا پڑا تھا اس لئے نقد رقم کا کوئی خاطر خواہ بندوبست کرکے نہیں آیا تھا۔ بس محدود سی رقموں کے دو چیک سائن کرکے منیجر کو دے آیا تھا۔ میرا قیام یہاں بعض معاملات میں الجھنے کی وجہ سے لمبا ہوگیا۔ اب آج صبح منیجر کا فون آیا تھا کہ میرے دبئی والے اسپانسر نے چالیس ہزار ریال کے لئے ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ کاروبار بند کرانے کی دھمکی دے دی ہے۔ منیجر سخت پریشان تھا..........."

"آپ نے بینک سے رجوع کیا ہوتا........... آج کل تو رقم کی فوری ترسیل کوئی مسئلہ نہیں رہی..........." شاہد بولا۔

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں..........." احمد خان منہ بنا کر بولا........... "میں نے بینک سے معلوم کیا تھا۔ کہنے لگے ٹرانزیکشن میں دو تین دن لگیں گے۔ کوئی قابل اعتماد ہنڈی والا بھی نہیں مل رہا تھا۔ اب صبح سے پاکستانی کرنسی میں یہاں رقم لئے پھر رہا ہوں کہ کوئی صاحب بے شک یہاں کچھ منافع لے لیں لیکن دبئی میں فیکس پر اپنے کسی آدمی کو ہدایت کر دیں کہ میرے بتائے ہوئے پتے پر میرے منیجر کو چالیس ہزار ریال پہنچا دے..........."

یہ کہہ کر اس نے بریف کیس کھول کر شاہد کو نوٹوں کی گڈیوں کی جھلک بھی دکھا دی۔ بڑے بڑے نوٹ تو نظر نہیں آ رہے تھے البتہ سو سو کے نوٹوں کی بہت سی گڈیاں قرینے سے بریف کیس میں رکھی تھیں۔

ایک لمحے کے لئے تو جیسے شاہد کا دل دھڑکنا بھول گیا لیکن پھر اس نے اپنے آپ کو سمجھایا........... زیادہ ہاتھ پاؤں چھوڑنے کی ضرورت نہیں برخوردار! یہ تو تم سمجھ ہی چکے ہو

جس میدان میں تم نے ابھی ابھی قدم رکھا ہے........... یہ شخص اس میدان کا پرانا کھلاڑی ہے۔ بہرحال تم بھی اپنے کھیل کا آغاز کچھ ایسے صبر و سکون اور مہارت سے کرو کہ اسے نانی یاد آجائے........... حالانکہ اسے یقین تھا کہ اس شخص کا نام احمد خان ہرگز نہیں لیکن اس نے چند لمحے سوچ میں ڈوبے رہنے کی اداکاری کرنے کے بعد ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں کہا........... "دیکھئے احمد خان صاحب! کسی کے آڑے وقت میں اس طرح منافع وغیرہ کی بات کرنا اچھا تو نہیں لگتا لیکن آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ کاروباری آدمی کاروبار کا کوئی نفع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اس لئے میں پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ کتنا منافع آفر کر سکتے ہیں؟ میرے اس سوال کا برا مت منائیے گا..........."

"ارے صاحب! آپ برا منانے کی بات کر رہے ہیں۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا..........." احمد خان نے خوشی سے کھل اٹھنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا........... "میں آپ کو پاکستانی کرنسی میں پچیس ہزار زیادہ ادا کرنے کو تیار ہوں..........."

شاہد کو اچھی طرح اندازہ ہوچکا تھا کہ احمد خان ذرا اونچے درجے کا نوسرباز تھا۔ اس کا ایک ساتھی یقیناً دبئی میں بھی موجود تھا جو وہاں رقم وصول کرکے غائب ہو جاتا ہوگا۔

شاہد نے اس کی پیشکش سن کر ہنکارا بھرا اور کچھ ایسی اداکاری کی جیسے وہ اپنی خوشی کو بمشکل چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا........... "لائیے........... رقم دیجئے........... پہلے میں اسے ہوٹل کے سیف ڈیپازٹ میں رکھوا آؤں۔ پھر ذرا چند منٹ آرام سے بیٹھ کر چائے پئیں گے۔ آپ کا مسئلہ حل ہونے کی خوشی میں کم از کم چائے تو ہونی ہی چاہیے۔ امید ہے اب آپ انکار نہیں کریں گے۔ چائے پیتے ہی ہم سیٹھ حبیب اللہ کے ہیڈ آفس میں جا کر فیکس بھجوا دیتے ہیں۔ دبئی میں آپ کے آدمی کو رقم مل جائے گی۔ خواہ وہاں بینک بند ہوچکے ہوں۔ آپ کو اب فکر کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں..........." وہ مسکرایا۔

"بالکل ٹھیک ہے..........." احمد خان نے بریف کیس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے آج اخبار میں ریال کا ریٹ دیکھ کر پوری رقم گن کر اس بریف کیس میں پہلے ہی تیار کرکے رکھی ہوئی ہے۔ اس میں پچیس ہزار منافع بھی شامل ہے۔ بہرحال آپ چاہیں تو پھر بھی اپنے اطمینان کے لئے گن لیں..........."

شاہد نے بریف کیس کھول کر صرف گڈیاں الٹ پلٹ کر دیکھیں اور بڑے کاروباری لوگوں کی طرح بے پروائی سے بولا........... "سر بہ مہر گڈیاں ہیں۔ رقم ٹھیک ہی ہوگی........... گنتی کی کیا ضرورت ہے........... گنا بھی ہوئی تو سیٹھ حبیب اللہ کے آفس میں پہنچ کر ہی گن لیں گے..........."

وہ بریف کیس بند کرکے اٹھ کھڑا ہوا.......... "آپ اطمینان سے تشریف ر
اور پریشانی کو ذہن سے جھٹک دیجئے.......... میں ایک منٹ میں حاضر ہوا.........."

نیچے پہنچ کر لفٹ سے نکلتے ہی مختصر سا لاؤنج تو شاہد نے محض چند لمبے لمبے ڈگ بھ
عبور کیا اور دروازے سے نکل کر تو اس نے باقاعدہ دوڑنا شروع کر دیا۔ ہوٹل کے سامنے
سروس روڈ پر چند ٹیکسیاں کھڑی تھیں شاہد کو ان میں سے جو سب سے قریب نظر آئی وہ ا
کا دروازہ کھول کر جلدی سے بیٹھ گیا۔

"ایئرپورٹ.........." اس نے ڈرائیور کو حکم دیا۔

اس کا ارادہ ملک یا شہر سے فرار ہونے کا نہیں تھا کیونکہ اس کی جیب میں پاسپور
ویزا وغیرہ نہیں تھا اور نہ ہی اس کے اندازے کے مطابق ابھی اس کے وسائل اتنے ب
ہوئے تھے.......... اس نے تو اپنی دانست میں صرف ایک طویل راستہ اختیار کرنے
کوشش کی تھی۔ اس سفر کے دوران وہ بریف کیس کا جائزہ لینا اور کچھ سوچ بچار کرنا چا
تھا۔

ٹیکسی شارع فیصل پر پہنچی تو اس نے اطمینان سے بریف کیس کھول کر گھٹنوں پر ر
کر یوں گڈیوں کا معائنہ شروع کیا کہ ڈرائیور عقب نما آئینے میں ان کی جھلک نہ دیکھ سکے۔
اس کا اندازہ تقریباً" درست ہی تھا۔ تمام گڈیوں میں اوپر اور نیچے کا ایک ایک نو
اصلی تھا۔ باقی سب کے سب جعلی.......... بہرحال نقل اتنی بری نہیں تھی۔ کافی حد تک
اصل کے مطابق ہی تھی۔ اگر شاہد کچھ زیادہ ہی جرات سے کام لیتا تو انہیں بھی چلانے
کوشش کرسکتا تھا لیکن ابھی وہ اس حد تک خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ رو
پیسے سے فی الحال اس کا واسطہ کچھ کم ہی رہا تھا لیکن اصل اور نقل میں امتیاز کرنے کی
تک تو خدا نے اسے عقل سے نوازا ہی تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جعلی کرنسی
دھندے میں ملوث ہو کر انسان زیادہ لمبا ہی پھنس سکتا تھا۔

گڈیوں میں جتنے نوٹ اصلی تھے وہ فی الحال بڑی خوشی سے انہی پر قناعت کے لئے
تیار تھا۔ وہ تو گھر سے نکلتے وقت صرف اسی فکر میں تھا کہ کسی ترکیب سے کہیں سے
سات سو روپے ہاتھ آجائیں۔ اس کا کوئی شکار پھانسنے کا بھی ارادہ نہیں تھا۔ احمد خان تو خ
بخود ہی اس کے پاس آن پھنسا تھا۔ اس نے خود ہی آگے بڑھ کر اپنی گردن پیش کی تھی لو
گویا درخواست کی تھی.......... "جناب مجھے ذبح کر لیجئے.........." وہ یقیناً" شاہد
کہیں زیادہ تجربے کار اور گھاگ نوسرباز تھا لیکن وہ شاہد کو موٹی آسامی سمجھ کر آن پھنسا تھا
وہ محض دوسرے ہوٹل میں شاہد کی باتیں سن کر ہی چکر میں آگیا تھا۔ اسے امید ہو چلی
کہ اس لائن میں وہ کامیابی سے آگے بڑھ سکتا تھا اور بڑے ہاتھ بھی مار سکتا تھا۔ آغاز ہی
ہوگیا تھا۔

ں نے اصلی نوٹ گڈیوں سے علیحدہ کر لئے۔ گویا اب اس کے پاس تقریباً" سات
م ایسی موجود تھی جسے وہ اطمینان سے خرچ کرسکتا تھا۔ باقی نوٹوں اور بریف کیس کو
وہ کسی گندے نالے میں پھینک دینے کا تھا۔ اسے اپنی نئی زندگی کے لئے صرف
ر تک سہارے کی ضرورت تھی اور یہ رقم سہارے کے طور پر کافی تھی۔ وہ اب
عتماد ہو چکا تھا۔

☆ =========== ☆ =========== ☆

لڑکی بے حد خوبصورت تھی لیکن کچھ دانشور سی دکھائی دیتی تھی کیونکہ وہ خوب
لیکن موٹے فریم کی نظر کی عینک لگاتی تھی جو اس کی پتلی، تیکھی اور نازک سی ناک
دکھائی دیتی تھی۔ اس کے تراشیدہ بھورے اور نفیس بال اتنی ملائمت سے اس کے
چہرے کے گرد ہلکورے سے لیتے رہتے تھے کہ بعض اوقات ان پر پانی کی ان کی لہروں
گزرتا تھا جن پر ڈوبتے سورج کی کرنوں نے جال سا پھیلا رکھا ہو۔

اس کے پتلے پتلے ہونٹ لپ اسٹک کے بغیر بھی سرخ نظر آتے تھے اور ان
گھوم پھر کر وہی "گلاب کی پنکھڑی" والی گھسی پٹی تشبیہ سوجھتی تھی۔ وہ حسین ہونٹ
کھنچے کھنچے سے رہتے تھے مگر ان کے لئے اس سے زیادہ موزوں تشبیہ کوئی
نہیں.......... اس کی رنگت بہت ہی سپید تھی۔ اگر اس کے رخساروں پر ہلکی سی
ہوتی تو یہ رنگت کچھ بے کشش لگتی۔

اس کے ہاتھوں کی لمبی اور پتلی انگلیاں سنگ مرمر سے تراشیدہ لگتی تھی مگر
مشابہت کے باوجود انہیں دیکھ کر نزاکت، گداز اور حرارت کا احساس ہوتا تھا۔ کار
اسٹیرنگ وہیل پر جمی ہوئی تو یہ انگلیاں بہت ہی بھلی لگتی تھیں۔

لباس وہ نہایت سادہ لیکن کسی نہ کسی ایسے کپڑے، ہی سے بنا ہوا پہنتی تھی جس
اس کا حسن نکھرا نکھرا اور اجلا اجلا محسوس ہوتا تھا۔ اس کی کار بھی نئے ماڈل کی یا بہت
نہیں تھی ایک پرانی لیکن نہایت عمدہ حالت کی سرخ اسپورٹ کار تھی اور کنورٹیبل
اس کی کینوس کی چھت وہ زیادہ تر کھلی ہی رکھتی تھی۔ کھلی چھت کی گاڑی میں بیٹھ کر
کرتے وقت وہ دور سے ہی لوگوں کی نظر میں آتی تھی۔

شاہد کو اس کی جو خصوصیت سب سے اہم لگتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ بڑے باپ
تھی۔ اس نے بڑی محنت اور مشاہدے سے اس لڑکی کے بارے میں حتی المقدور مع

ںھیں۔ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کے لئے اس نے بڑے پاپڑ بیلے

اس کا نام رخسانہ تھا لیکن اس کے کلاس فیلو لڑکے لڑکیاں اسے گوشی کہتے تھے۔ نام
رنیت دونوں ہی عامیانہ سے تھے لیکن خاص بات یہی تھی کہ اس کے باپ کا نام
ادر باٹلی والا تھا اور اس کا کروڑوں کا بزنس تھا۔

رخسانہ چونکہ اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھی اور بزنس اسے ہی سنبھالنا تھا اس لئے وہ
کی موروثی تعلیم کے علاوہ نصابی تعلیم بھی حاصل کر رہی تھی۔ وہ ایم بی اے کے
سال میں تھی۔

باٹلی والا کی پرشکوہ کوٹھی ہل پارک کے قریب بلندی پر واقع تھی۔ شاہد نے نہ جانے
بار رخسانہ کو کار میں اس ڈھلواں سڑک سے گزرتے دیکھا تھا جس میں ایک ہی موڑ تھا
وہ خاصا خطرناک تھا۔ رخسانہ نے البتہ کبھی شاہد کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو ڈرائیو کرتے
شاید کسی کو بھی نہیں دیکھتی تھی۔ وہ تو بس گویا اپنی ہی دھن میں مگن، نہ جانے کس
میں گم، سیدھ میں نظر جمائے، ایک بازو بے پروائی سے کھڑکی میں ٹکائے اور ایک ہاتھ
اسٹیرنگ سنبھالے اچانک سڑک پر نمودار ہوتی تھی اور چند سیکنڈ میں ہی غائب ہو جاتی

شاہد تب سے ہی اس کے چکر میں تھا جب سے اس کے حالات کچھ بہتر ہوئے تھے
بازی اور ہیرا پھیری میں وہ کچھ کامیاب جا رہا تھا اور چند جگہ ہاتھ مارنے میں کامیاب
تھا۔ اب وہ نرسری کے قریب ایک معقول قسم کے کمرے میں رہ رہا تھا اور باہ ہزار
ے میں ایک ایسی ڈاج بھی خرید چکا تھا جسے اس کا مالک کباڑی کے ہاتھ بیچنے کے ارادے
ایک دوسری گاڑی کے ساتھ باندھ کر لے جا رہا تھا۔ شاہد نے اس پر تھوڑے سے پیسے
خرچ کئے تھے جس کے بعد اس میں یہ خوبی پیدا ہوگئی تھی کہ ہفتے میں دس پندرہ میل
لتی تھی۔

شاہد کا فاقہ کشی کا دور تو اسی روز ختم ہوگیا تھا جس روز اس کی سابق مکان مالکن نے
اپنے ڈربہ نما کمرے یا کمرہ نما ڈربے سے نکالا تھا۔ اس کے بعد تو دن بدن حالات میں
تائی چلی گئی تھی۔ اس نے کھلم کھلا جرم کی راہ اختیار نہیں کی تھی۔ کم از کم اپنے ضمیر
سامنے تو وہ مطمئن ہی تھا۔ اس کا ضمیر ویسے بھی اگر مکمل سویا ہوا نہیں تھا تو غنودگی کی
میں تو ضرور رہتا تھا۔

اس نے دراصل "چوروں کو مور" والی پالیسی اپنائی تھی۔ اس کے علم کے مطابق جو
بڑے ہی نوسرباز تھے یا مختلف ہتھکنڈوں کے ذریعہ لوگوں کا خون چوس رہے تھے، انہیں
رہے تھے، بے وقوف بنا رہے تھے، شاہد ان کے بارے میں معلومات حاصل کرتا تھا اور

کسی نہ کسی طرح "خود تشخیصی نظام" کے تحت ان لوگوں سے اپنا حصہ وصول ک
پہنچ جاتا تھا۔ اس کام میں اسے لطف بھی آنے لگا تھا اور تھوڑا بہت عیش بھی ہو رہا
مثلاً" اسے وہ وقت یاد کر کے بڑا لطف آتا تھا جب وہ لوگوں کو باہر بھجوانے کا دعویٰ ک
والی ایک ریکروٹنگ ایجنسی کے عالیشان دفتر میں پہنچا تھا۔ اب تک اسے تجربہ ہو چکا تھا کہ
قسم کے بزنس کرنے والے عام طور پر اپنا دفتر زیادہ سے زیادہ شاندار بنانے کی کوشش ک
تھے۔ اپنی بساط سے بڑھ کر شان و شوکت دکھانے کی کوشش کرتے تھے۔ شاید اس لئے
شکار پہلے ہی مرحلے پر متاثر ہو جائے، اچھی طرح پھنس جائے اور رسی تڑا کر بھاگ
پائے۔

شاہد جس ریکروٹنگ ایجنسی کے دفتر میں داخل ہوا اس کا دفتر بھی خوب آرا
پیراستہ تھا لیکن شاہد کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ ساری آرائش و زیبائش کرائے کے فرنی
ادھار کے سامان کی رہین منت تھی اور میز پر تین رنگوں کے جو ٹیلی فون سیٹ پڑے تھ
میں سے درحقیقت ایک کا بھی کنکشن موجود نہیں تھا.......... شاہد تو ایک قریبی پنواڑ
کھوکھے سے بڑی تدبیروں سے یہاں تک معلومات حاصل کر چکا تھا کہ استقبالیہ پر خوبصو
سی جو دو لڑکیاں میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ، تمام آنے والوں کا استقبال کرتی تھیں ان
درحقیقت اسی علاقے کے ایک پولیس آفیسر کے سامنے رات کو ساقی گری کا کام بھی لیا
تھا۔

شاہد چپڑاسی کو خاطر میں لائے بغیر سیدھا مالک کے کمرے میں چلا گیا جس
دروازے پر "دلشاد جعفری" کے نام کی پیتل کے حروف والی بڑی خوبصورت تختی لگا
تھی شاہد کو یقین تھا کہ وہ نہ دلشاد تھا اور نہ ہی جعفری.........."

شاہد نے اس کی میز پر ایک موٹی سی فائل پٹختے ہوئے نہایت اکھڑے اکھڑے
بارعب لہجے میں کہا.......... "یہ کیا دھندا شروع کر رکھا ہے تم نے؟ بغیر کنکشن کے
فون.......... استقبالیہ پر وہ آوارہ لڑکی جو ابھی تک ایک ہوٹل والے کیس میں پیشیاں
رہی ہے.......... گڑھ تم نے کراچی کو بنا رکھا ہے اور اشتہار سرحد، پنجاب اور بلو
کے اخباروں میں دیتے ہو۔ سیدھے سادے اور ان پڑھ ضرورت مندوں سے دھڑا
رقمیں لے کر تجوری بھرے جا رہے ہو.......... صرف علاقے کے ایس ایچ او کو پھانس
تم سمجھ رہے ہو کہ تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں رہا؟"

وہ کرسی کھینچ کر دھم سے بیٹھ گیا۔

دلشاد جعفری.......... یا جو بھی اس کا نام تھا.......... شاہد کی آمد کے
ریوالونگ چیئر پر بہت پھیل کر بیٹھا ہوا تھا وہ تھری پیس سوٹ میں تھا اور اس کی مونچھیں
کو چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ بڑی متاثر کن شخصیت کا مالک تھا لیکن شاہد کی پھٹکار سن کر

لت کچھ سکڑ سا گیا۔ مونچھیں کچھ ڈھیلی سی پڑ گئیں اور رنگت میں زردی جھلک آئی۔
وہ دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر آگے کو آیا۔ "آپ کی تعریف؟"

"حفیظ الرحمان.......... فرام ایف آئی اے"۔ شاہد نے بے نیازی سے کہا اور
ف کے ضمن میں مزید کچھ کہے بغیر فائل کھول کر اس کے کاغذات میں نظر دوڑاتے
ے کہنا شروع کیا.......... "تم نے مورخہ چار فروری کو گلاب خان ولد نعمت خان سکنہ
ر سے چوبیس ہزار آٹھ سو روپے وصول کئے اور اس کا پاسپورٹ بھی لے لیا۔ تم نے
نہ پانچ فروری کو ملک عبد ولد ملک شفیع محمد سکنہ خوشاب سے ستائیس ہزار روپے وصول
اور اس کا پاسپورٹ بھی تحویل میں لے لیا۔ ان کے نمبر بالترتیب یہ ہیں۔ اس کے علاوہ
نے.........."

شاہد نے چند منٹ تک اس فہرست کا مطالعہ جاری رکھا پھر فائل چہرے کے سامنے
ہٹاتے ہوئے بولا؟.......... "بس..........؟ یا پوری فائل پڑھ کر سناؤں؟" حالانکہ
سے آگے وہ کچھ پڑھ کر سنا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس سے آگے فائل میں سادہ کاغذ لگے
ئے تھے۔ شاہد نے یہ معلومات اس دفتر کے قریب ہی واقع ایک سستے سے چائے خانے
رتاً" فوقتاً" بیٹھ کر جمع کی تھیں جہاں کئی ایسے امیدوار عموماً" آکر بیٹھے رہتے تھے جو اس
ز کے توسط سے باہر جانے کے انتظار میں گن گن کر دن گزار رہے تھے۔

شاہد نے بارعب لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "آٹھ ماہ گزر چکے ہیں، تم نے
ی کو دبئی یا بحرین تو کیا لانڈھی اور ملیر بھی نہیں بھجوایا.......... کیا بستر بوریا گول کر کے
گنے کا پروگرام ہے؟ میرے خیال میں تو جتنی مرغیاں ذبح کر چکے ہو اتنی ہی کافی ہیں۔ اب
برے دھیرے سامان سمیٹنا شروع کر دو.......... ورنہ خطرے کی لپیٹ میں آجاؤ گے۔ آٹھ
ہت ہوتے ہیں زیادہ لالچ اچھا نہیں ہوتا.........." اس نے ایک بار پھر فائل کی طرف
تھ بڑھایا۔ "میں تمہیں فہرست مزید پڑھ کر سناتا ہوں.........."

دلشاد جعفری نے فائل پر ہاتھ رکھ کر اسے کھولنے سے باز رکھا اور بولا.......... "
لس بس.......... اور پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ خدمت بتائیے.........."

"ہمارا حصہ کم سے کم دو لاکھ تو ہونا چاہیے.......... لمبا ہاتھ مار رہے ہو..........
ر ہم نے تمہیں اتنی چھوٹ دی ہے۔ ڈائریکٹر صاحب تو بہت پہلے سے کہہ رہے تھے، اس
لڑکے کو پکڑ کر لاؤ.......... مگر میں نے ہی ان سے کہا کہ سر.......... پھل ذرا پک
نے دیجئے.........." شاہد نے ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے روانی سے کہا۔

"دو لاکھ..........؟" دلشاد جعفری کی آنکھیں پھیل گئیں۔
مونچھیں کچھ اور ڈھلک گئیں۔ "اتنا تو میں نے کمایا بھی نہیں.........."

"بکواس کرتے ہو.........." شاہد بلند آواز میں بولا۔ "ہمارے اندازے کے مطابق

سب خرچ نکال کر کم از کم چالیس لاکھ بٹور چکے ہو............ اور ہمارے لئے دو لاکھ بھ نہیں ہیں؟ یہ سارے کوئی میں تھوڑا ہی رکھ لوں گا۔ دفتر میں اوپر' نیچے' دوسرے لوگوں بھی حصہ ہوگا"۔

"آہستہ بولئے جناب؟" دلشاد نے گھبرا کر ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ خاصی بحث و تمحیص کے بعد بالآخر چالیس ہزار پر سودا طے پا گیا۔ اتنا نیچے آنے کی وجہ یہ تھی کہ خود شاہد کو اند ہی اندر گھبراہٹ لگی ہوئی تھی کہ کہیں وہ بیٹھا بھاؤ تاؤ ہی کرتا رہ جائے اور اوپر سے پچ کوئی ایف آئی اے یا سی آئی اے والا آن پہنچے۔ اس کے بعد کے حالات کا وہ تصور بھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس کے علاوہ دلشاد کے پاس اس وقت نقد رقم اتنی ہی تھی اور شاہد وعدۂ فردا پر نہ رہنا چاہتا تھا۔ وہ اتنا احمق نہیں تھا کہ دوبارہ اس دفتر کے قریب پھٹکنے کا خطرہ مول لیتا۔ دل نے اسے چالیس ہزار نکال کر دے دیئے اور شاہد دم دبا کر وہاں سے بھاگا۔ یہ اس کی ا وقت تک کی سب سے بڑی واردات تھی لیکن وہ اپنی اس قسم کی وارداتوں کو "خراج وصولی" کہا کرتا تھا۔

اس رقم کو شاہد نے نہایت سمجھداری سے استعمال کیا۔ ایک سال کا ایڈوانس دے اس نے نرسری کے قریب ایک ذرا باعزت قسم کا کمرہ حاصل کیا۔ بارہ ہزار کی ڈاج خریدا کچھ پیسے اس پر مزید خرچ کئے۔ ایک سستے ریستوران والے کو احتیاطاً" کافی رقم پیشگی دے دی کہ اگر اس پر آڑا وقت آجائے اور جیب میں بالکل ہی پیسے نہ ہوں تب بھی بھوکا مرنا پڑے۔ جس طرز زندگی کا وہ عادی ہوتا جا رہا تھا اس میں برے سے برے وقت کے تیار رہتا تھا۔

اس کے بعد وہ بے فکری سے گھومنے پھرنے لگا۔ البتہ دلشاد جعفری کے دفتر سامنے سے وہ دوبارہ اس وقت تک نہیں گذرا تھا جب تک دلشاد بستر بوریا لپیٹ کر روپ نہیں ہوگیا اور پولیس نے دفتر سیل نہیں کر دیا تھا۔

انہی دنوں کی آوارہ گردی کے دوران رخسانہ عرف گوشی اس کی نظر چڑھی تھی لو پوری تندہی سے اس کی ٹوہ میں لگ گیا تھا کیونکہ اب اس نے اپنا ٹارگٹ یہی بنا لیا تھا کہ کسی طریقے سے کسی کروڑ پتی کا داماد بننے کی کوشش کرے گا۔ وہ ساری زندگی تو نوسر میں نہیں گزار سکتا تھا۔ اس میں بہرحال خطرات موجود تھے۔ اب تک بھی شاید وہ اسی بچا ہوا تھا کہ وہ ایسے لوگوں کو لوٹتا تھا جو خود اپنی جان بچائے رکھنے کی فکر میں ہوتے تھے وہ اس کے خلاف فریاد لے کر کہیں نہیں جاسکتے تھے لیکن یہ کام بھی بہرحال آسان نہیں وہ اب سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا کہ کسی طرح وہ کسی کروڑ پتی یا اس کی بیٹی کو متاثر کر میں کامیاب ہو جائے اور سیٹھ اسے اپنے "سایہ عاطفت" میں لے لے تو باقی زندگی چین

ے گزار جائے۔ رخسانہ باٹلی والا عرف گوشی سے تعارف حاصل کرنے اور اسے متاثر نے کے سلسلے میں اس نے ایک ابتدائی اسکیم تیار کی تھی۔

اس روز اسی اسکیم کے سلسلے میں وہ ہل پارک کی ایک قریبی ڈھلواں سڑک پر اس یں کھڑا تھا کہ اس کی ڈاج کے دو پہیئے سڑک سے اتر کر کچے میں پھنس چکے تھے اور کچی پہاڑی سے گاڑی ٹکرانے کے باعث اس کی ایک ہیڈ لائٹ ٹوٹ چکی تھی۔ بونٹ ٹیڑھا تھا اور کار پر کچی سی پہاڑی سے ٹوٹ کر گرنے والے ڈھیلوں اور مٹی کا انبار سا لگ گیا

رخسانہ کی گاڑی لہرا کر ایک کوٹھی کی دیوار سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی اور چند ں کو کچلتی ہوئی آڑی ترچھی ہو کر رک گئی تھی۔ ہوا اصل میں یہ تھا کہ پہلے شاہد نے سوں سے انداز میں اس موڑ پر چھپ کر دور سے رخسانہ کی گاڑی کو معمول کے مطابق ؛ دیکھا تھا۔ تب وہ دوڑ کر جلدی سے اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ اس نے سڑک کا بیشتر گھیرتے ہوئے عین اس وقت گاڑی آگے بڑھائی تھی جب اسے آواز سے اندازہ ہوگیا تھا رخسانہ کی گاڑی موڑ کاٹنے والی تھی۔ شاہد نے نہایت مہارت اور عمدگی سے یہ ظاہر نے کی کوشش کی تھی کہ صرف اس کی حاضر دماغی کی وجہ سے دونوں گاڑیوں میں ٹکراؤ ، ہوتے بچا تھا۔

اس وقت شاہد اور رخسانہ دونوں اپنی اپنی گاڑی کے قریب کھڑے خشمگیں نظروں ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ شاہد زیادہ دیر تک اپنے چہرے پر غصے کے تاثرات ، نہ رکھ سکا۔ اتنی معصوم اور حسین لڑکی کے سامنے جھوٹ موٹ بھی زیادہ غصہ دکھانا کے بس کی بات نہیں تھی۔ ویسے بھی ضرورت سے زیادہ غصہ کام بگاڑ سکتا تھا۔

"محترمہ!" اس نے نہایت شائستگی اور ملائمت سے کہا............ "مانا کہ آپ کی ا لیفٹ ہینڈ ڈرائیو ہے............ لیکن آپ کو اسے چلانا تو ملکی اصولوں کے مطابق ہی ے............ اب یہ امریکہ تو نہیں ہے جہاں آپ سیدھے ہاتھ پر چلی آ رہی .... جبکہ یہ تو ویسے ہی بلائنڈ ٹرن ہے............" اس نے موڑ کی طرف اشارہ ہاں سے ان دونوں کی گاڑیاں محض شاہد کی "مہارت" اور "ایثار" کی وجہ سے ٹکراتے تے بچی تھیں۔ یعنی شاہد نے اپنی گاڑی کو پہاڑی میں گھسیڑ کر "تباہ" کرنا گوارہ کر لیا تھا۔

"یہاں الٹے اور سیدھے ہاتھ کا سوال نہیں پیدا ہوتا ہے مسٹر............" لڑکی نے درست کرتے ہوئے کہا۔

"شاہد علی میرا نام ہے............" وہ جلدی سے بولا۔

"ــ ہاں تو مسٹر شاہد! یہ سڑک اتنی تنگ ہے کہ اس پر یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ کی گاڑی دائیں ہاتھ پر جا رہی ہے اور کون سی بائیں ہاتھ پر............" رخسانہ بات

جاری رکھتے ہوئے بولی......... "دو بڑی گاڑیاں سامنے آجائیں تو انہیں بچ بچاکر، کچے پر اتر کر ہی گزرنا پڑتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ میں نے ہمیشہ کی طرح موڑ پر پہنچ پر ہارن دیا تھا۔ آپ کو چاہیے تھا کہ آپ ہارن سن کر کچے پر ہو جاتے......... میں روزانہ ادھر سے گزرتی ہوں۔ میرا گھر یہیں پہاڑی پر ہے......... آج تک کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا........."

"لیکن آج تو ہوگیا ہے........." شاہد نے مزید نرم......... بلکہ کسی حد تک دردناک لہجے میں کہا......... "غلطی گو کہ آپ ہی کی ہے لیکن ہمارے ملک میں رواج ہے کہ جب بھی کوئی حادثہ ہوتا ہے، دونوں گاڑیاں چلانے والے اگر زندہ سلامت ہوں تو اتر کر لڑنا شروع کر دیتے ہیں اور ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرانا شروع کر دیتے ہیں۔ میں اس روایت کو آگے بڑھانا نہیں چاہتا۔ میں چونکہ ایک مہذب اور تعلیم یافتہ انسان ہوں اس لئے چلئے......... محض ناگواری کو بڑھانے سے بچنے کی خاطر میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں......... لیکن آپ کو اتنا احساس ضرور ہونا چاہیے کہ آپ کی معمولی سی بے پروائی کی وجہ سے ایک شریف آدمی کی اچھی بھلی گاڑی تباہ ہوگئی........."

شاہد کی اس تقریر دلپذیر اور شائستگی کی وجہ سے لڑکی کے چہرے پر ہمدردی کے تاثرات ابھر آئے اور وہ شاہد کی گاڑی کے قریب آگئی.........

"آپ اسے اچھی بھلی گاڑی کہہ رہے ہیں......... تعجب ہے؟" اس نے محض ایک نظر گاڑی کی طرف دیکھ کر معصومیت سے کہا......... "غالباً" پینسٹھ کا ماڈل ہے"۔

"جی نہیں......... سڑسٹھ کا........." شاہد نے اپنا لہجہ جلا بھنا بناتے ہوئے کہا۔

"چلئے......... سڑسٹھ کا ہی سہی......... اسے پینٹ بھی آپ نے مشین سے نہیں کرایا۔ شاید خود ہی برش سے کیا ہے........." وہ گاڑی پر انگلی پھیرتے ہوئے بولی۔ "پینٹ غالباً" اس کمپنی کا ہے جس کے اشتہار میں لکھا ہوتا ہے کہ یہ ایک گھنٹے میں سوکھ جاتا ہے۔ حالانکہ یہ پورے ایک مہینے میں سوکھتا ہے......... یہ دیکھئے۔۔" اس نے گاڑی پر پھیری ہوئی انگلی شاہد کو دکھائی جس پر رنگ کا دھبہ لگ چکا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی......... "اس کا مطلب ہے کہ آپ کو گاڑی رنگ کئے بھی ایک ماہ پورا نہیں ہوا......... ویسے بائی دی وے......... کتنے میں لی یہ گاڑی؟ آٹھ ہزار میں یا نو ہزار میں؟"

شاہد دم بخود تھا کہ بظاہر معصوم سی نظر آنے والی وہ لڑکی ان معاملات میں اتنی سوجھ بوجھ کیونکر رکھتی تھی؟ شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ گاڑی آٹھ نو ہزار سے زیادہ کی نہ تھی۔ شاہد نے ہی مہنگی خریدی تھی۔ شاید وہ کچھ دیر اور دم بخود رہتا لیکن پھر اسے خیال

آیا کہ اس موقع پر اسے ذرا غصے کا اظہار کرنا چاہیے........."

"میں نے یہ گاڑی آٹھ نو میں نہیں، پورے بیس ہزار میں خریدی تھی........." اس نے ہلکی سی برہمی سے کہا......... "آپ تو شاید کسی سیٹھ کی بیٹی ہیں۔ آپ کو کیا معلوم کہ ایک سفید پوش آدمی کے لئے بیس ہزار کیا معنی رکھتے ہیں"۔

"اوہ......... چہ چہ......... چچ......... چہ........." رخسانہ عرف گوشی کے لہجے میں ہمدردی عود کر آئی......... "آپ دل برداشتہ نہ ہوں۔ اس سے پہلے کہ لوگ تماشہ دیکھنے کے لئے جمع ہونے لگیں، آپ میرے ساتھ میرے گھر چلئے......... میں ازراہ" آپ کو ہرجانے کے طور پر ڈیڈی سے کچھ رقم دلوا دوں گی........."

شاہد نے دل ہی دل میں "وہ مارا" کا نعرہ لگایا۔ گویا پہلا مرحلہ کامیابی سے مکمل ہو رہا تھا۔ اس کے لئے ابتدائی مسئلہ تو سیٹھ عبدالقادر باٹلی والا سے ملاقات کرنا ہی تھا۔ یہ مسئلہ تو حل ہوگیا تھا اسے امید ہو چلی تھی کہ آگے بھی اسی طرح کچھ بات بن ہی جائے گی۔

☆ ========== ☆ ========== ☆

سیٹھ عبدالقادر باٹلی والا پچپن کے پیٹے میں تھے مگر نہایت چست اور مستعد نظر آتے تھے۔ اپنی بیٹی کی زبانی سارا قصہ سننے کے بعد ان کے چہرے پر کچھ برہمی کے آثار پیدا ہوئے لیکن شاہد سے گفتگو کرنے کے بعد وہ نہ صرف مہربان نظر آنے لگے بلکہ یہ بھی بھول گئے کہ وہ کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

شاہد کو اب تک جتنی بھی نوکریاں کرنے کا موقع ملا تھا ان میں یہ تجربہ حاصل ہوا تھا کہ دولت اور اختیارات رکھنے والے لوگ اپنے آپ کو کسی بھی معاملے میں مورد الزام ٹھہرایا جانا بالکل پسند نہیں کرتے تھے خواہ وہ کتنی ہی بڑی غلطی کرچکے ہوتے تھے۔ ان کے دل میں گھر کرنے کا بہترین طریقہ یہی نظر آتا تھا کہ کسی بھی متنازع معاملے میں سارا الزام اپنے سر لے لیا جاتا۔ شاہد نے نہایت انکساری سے یہی کہا تھا۔

"میں آپ کے پاس ہرجانہ لینے یا شکایت کرنے نہیں آیا سیٹھ صاحب!" اس نے نہایت شیریں لہجے میں کہا......... "بے شک آج کل میرا کاروبار ختم ہوچکا ہے اور ہاتھ تنگ ہے لیکن خاندانی لوگوں کے لئے روپیہ ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا......... میں تو محض اس لئے آپ کی صاحبزادی کے ساتھ چلا آیا تھا کہ آپ کے نیاز ہی حاصل ہو جائیں گے۔ آپ سے شرف ملاقات حاصل ہونا بھی تو کوئی معمولی بات نہیں......... کاروبار کی دنیا میں بڑا چرچا سنا ہے آپ کا......... بڑا مقام ہے آپ کا......... مجھے معلوم ہے بہت سے لوگ تو آپ سے صرف پانچ منٹ کی ملاقات کے لئے پانچ پانچ دن انتظار کرتے ہیں۔ میں تو اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھ رہا ہوں کہ آپ نے مجھے اتنا وقت دیا........."

اس کے بعد جوں جوں اس کی زبان سے خوشامد کا شہد ٹپکتا گیا، سیٹھ صاحب کی کرسی

اس کے نزدیک آتی گئی۔ حتیٰ کہ وہ وقت بھی آیا جب دونوں کی کرسیاں ٹکرا گئیں اور یہ
لمحہ تھا جب باٹلی والا اور اس کی بیٹی، دونوں نے ہم آہنگ ہو کر شاہد کو دوپہر کے کھانے ک
دعوت دے ڈالی۔

کھانا ختم ہونے تک شاہد گھر کا ہی ایک فرد نظر آنے لگا تھا۔ اس حد تک کامیابی ک
اسے خود بھی توقع نہیں تھی اور اب اپنے اس نظریئے پر اس کا یقین کچھ اور پختہ ہوگیا تھا
جو لوگ چہرہ چھپا کر یا بغیر چھپائے، بندوق یا پستول لے کر دکانوں، بینکوں یا کوٹھیوں میں ڈاکے
ڈالنے کے لئے گھستے تھے وہ اول درجے کے احمق ہوتے تھے۔ کبھی نہ کبھی وہ پکڑے ج
جاتے تھے اور جتنا مال ان کے ہاتھ لگا ہوتا تھا اس سے زیادہ نکل جاتا تھا۔ کبھی کبھار تو جا
سے بھی جاتے تھے۔ شاہد کے نظریئے کے مطابق چوروں کے لئے مور بننا یا عقل سے کا
لیتے ہوئے، باقاعدہ لوٹ مار کئے بغیر لمبے ہاتھ مارنا زیادہ دلچسپ اور محفوظ کام تھا۔

شاہد کا خیال تھا کہ کھانے کے بعد سیٹھ باٹلی والا اسے ہزار دو ہزار کا چیک دے کر ا
پھر کبھی آفس میں ملنے کی دعوت دے کر رخصت کر دیں گے............ لیکن ایسا معلوم ہو
تھا کہ سیٹھ صاحب کا اسے رخصت کرنے کا کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔ کافی پلانے کے لئے
انہوں نے اسے اسٹڈی میں لے جا کر بٹھایا اور خود باپ بیٹی معذرت کر کے باہر چلے گئے
انہوں نے کہا تھا کہ وہ ایک ضروری بات کر کے تھوڑی دیر میں واپس آجائیں گے۔

کافی ختم کر کے شاہد کتابوں سے بھری شیلفوں کا جائزہ لینے لگا۔ کتابوں سے اب ا
کافی دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ ان سے بہت کچھ سیکھتا تھا لیکن یہ دیکھ کر ا
قدرے مایوسی ہوئی کہ اس عظیم الشان اسٹڈی میں زیادہ تر کتابیں قانون اور بزنس ک
موضوع پر تھیں۔

تب شاہد کو یاد آیا، اس نے سیٹھ باٹلی والا کے ایک اخباری انٹرویو میں پڑھا تھا کہ ب
شک اس نے کبھی پریکٹس نہیں کی تھی لیکن بار ایٹ لاء ضرور کیا تھا۔ گویا وہ ایک پڑھا لکھا
سیٹھ تھا۔ خاندان میں کافی عرصے سے دولت ہونے کے باوجود اس نے پڑھنے کے لئے وقت
نکال لیا تھا۔

لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ قانون پڑھنے کے بعد وہ عدالتی کارروائیوں سے بہ
خوف کھانے لگا تھا۔ ہر معاملے میں اس کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ بات
عدالت تک نہ پہنچنے پائے۔ یہ اعتراف اس نے بڑی معصومیت سے اپنے انٹرویو میں بھی
تھا۔ اتنا بڑا کاروبار چلاتے ہوئے بارہا ایسے مواقع آتے ہیں جب آدمی کو عدالت سے واسطہ
ہی جاتا ہے لیکن سیٹھ باٹلی والا کا ریکارڈ تھا کہ وہ کبھی کسی عدالت میں پیش نہیں ہوئے تھے
یہی سب کچھ سوچتے ہوئے اور شیلفوں پر نظر دوڑاتے ہوئے شاہد کھڑکی کے قریب
سے گزرا تو اس نے دیکھا سیٹھ باٹلی والا اور رخسانہ لان کے قریب پختہ روش پر ٹہل رہے

تھے اور انداز بتاتا تھا کہ وہ بڑے زور و شور سے کسی مسئلے پر صلاح مشورے میں مصروف
تھے۔

شاہد نے جب انہیں اسٹڈی کی سیڑھیوں کی طرف واپس آتے دیکھا تو جلدی سے
واپس کرسی پر آ بیٹھا اور بڑے انہماک سے اخبار دیکھنے لگا لیکن دونوں باپ بیٹی اس کے بعد
بھی بہت دیر تک اسٹڈی میں داخل نہیں ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ راستے میں کہیں
رک گئے تھے۔

وہ انتظار کرتے کرتے تھک گیا۔ اسے گھبراہٹ بھی ہونے لگی۔ ایک بار تو بے اختیار
اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر وہاں سے نکل بھاگے لیکن اس نے اٹھ کر دیکھا تو دروازہ باہر سے
مقفل تھا۔ تب تو اس کی گھبراہٹ اور بھی بڑھ گئی۔ کہیں سیٹھ صاحب کو اس پر کسی قسم کا
شک تو نہیں ہوگیا تھا؟ کہیں وہ اس پر کوئی الزام لگا کر، کوئی بہانہ بنا کر اسے پولیس کے
حوالے کرنے کی فکر میں تو نہیں تھے؟

ان سب خیالات نے اسے وحشت زدہ سا کر دیا۔ وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا
تھا اور وہاں سے نکل بھاگنے کی کوئی تدبیر سوچ رہا تھا۔

دفعتاً" دروازے کے تالے میں چابی گھومنے کی آواز سنائی دی۔

دوسرے ہی لمحے سیٹھ باٹلی والا کمرے میں آگئے۔ اب رخسانہ ان کے ساتھ نہیں
تھی۔ شاہد کو ان کے چہرے پر ذرا سی مسکراہٹ دیکھ کر اطمینان ہوا۔

"معاف کرنا برخوردار شاہد"۔ انہوں نے محبت سے کہا اور ان کے منہ سے "مسٹر"
کی جگہ "برخوردار" سن کر شاہد کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ حالات نہایت تیزی سے خود بخود اس
نہج پر جا رہے تھے جس پر وہ انہیں لے جانا چاہتا تھا۔

سیٹھ صاحب اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولے۔ "میں نے تمہیں اتنی دیر تک تنہا
بٹھا کر بداخلاقی کا مظاہرہ کیا ہے، لیکن میں دراصل اپنی بیٹی سے تمہارے بارے میں نہایت
ضروری مشورہ کر رہا تھا۔ دراصل میری بیٹی میں مردم شناسی کی صلاحیت مجھ سے کہیں زیادہ
ہے.........." سیٹھ صاحب کچھ مضطرب سے انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے اچانک خاموش
ہوگئے۔ شاہد کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ تاہم وہ خاموش اور منتظر رہا۔

چند لمحے کے توقف کے بعد سیٹھ صاحب مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔
"ایک طرح سے تم نہایت ہی صحیح وقت پر پہنچے ہو.......... وہ.......... کیا بولتے ہیں اس
کو.........؟ فرشتہ رحمت کی طرح.......... میرا اور میری بیٹی کا خیال ہے کہ تم ہمارے
کاروبار اور فیملی کے لئے کئی طرح سے کارآمد ثابت ہوسکتے ہو۔ تم نے بتایا کہ تم آج کل
فارغ بھی ہو.......... بس میں اپنی بیٹی کے مشورے پر عمل کر کے تم پر اندھا دھند اعتماد
کرتے ہوئے ایک اہم کام تمہارے سپرد کرنے لگا ہوں.........." وہ ایک بار پھر جیسے سوچ

میں پڑ گئے۔

"ارشاد......... ارشاد........." شاہد نے بے تابی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں......... ارشاد اس کام کے لئے بالکل غلط آدمی ہے........." سیٹھ صاحب اپنی دھن میں بولے......... پھر یک لخت جیسے انہیں احساس ہوا کہ شاہد کا مطلب کیا تھا۔ وہ ذرا شرمندہ ہو کر بولے......... "ہاں......... میں بتا رہا ہوں کہ کام کیا ہے......... تم یہ بتاؤ کہ پشاور تمہارا دیکھا بھالا ہے نا؟"

"بہت اچھی طرح........." شاہد نے بلا تامل جواب دیا حالانکہ جہاں تک اسے یاد تھا وہ کبھی پشاور کے قریب بھی نہیں پھٹکا تھا لیکن اب اس قسم کے معاملات میں اس کی زبان فراٹے سے چلتی تھی......... وہ روانی سے بولا......... "جن دنوں میں ہوزری کے بزنس میں تھا تو اکثر وہاں کے چکر لگتے تھے........."

"ہاں......... ہوزری کی وہاں بڑی کھپت ہے........." سیٹھ باٹلی والے نے نہ جانے کیوں ایک سرد آہ بھری۔ پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولے......... "آج اتوار ہے، تمہیں آج شام ہی ساڑھے چار بجے والی فلائٹ سے پشاور جانا ہوگا اور وہاں میرے دوست نیابت خان سے ملنا ہوگا۔ وہ ایک وولن مل کے مالک ہیں اور پشاور میں میرے بعض پراجیکٹس میں میرے حصے دار بھی ہیں۔ تم ان کے نام میرا یہ انتہائی خفیہ نوعیت کا خط لے کر جاؤ گے........."

سیٹھ صاحب نے کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ لفافہ سیل بند تھا اور سیل کے نیچے لکھا تھا......... "یہ لفافہ بروز بدھ ٹھیک بارہ بجے دوپہر مسٹر شاہد علی، مسٹر نیابت خان کی موجودگی میں کھولیں گے جن کا ایڈریس لفافے کی پشت پر درج ہے........."

شاہد نے لفافہ پلٹ کر دیکھا......... اس طرف نیابت خان کے دفتر کا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ ایک کونے میں سیٹھ باٹلی والا کے گروپ آف کمپنیز کا نام اور مونو گرام وغیرہ بھی چھپا ہوا تھا۔ یہ لفافہ ہاتھ میں آتے ہی شاہد کو نہ جانے کیوں اپنا آپ بے حد اہم محسوس ہونے لگا۔

"تم پشاور پہنچ تو آج ہی جاؤ گے لیکن فوری طور پر نیابت خان سے نہیں ملو گے........." سیٹھ صاحب نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا......... "تم کسی اچھے ہوٹل میں ٹھہرو گے اور بدھ کے دن ہی جا کر نیابت خان سے ملو گے، اس میں بھی ایک مصلحت ہے جو میں فی الحال ظاہر نہیں کرسکتا......... البتہ اگر یہ کام ٹھیک طریقے سے انجام دے کر تم نے اپنے آپ کو اعتماد کا اہل ثابت کر دیا تو پھر تم ہمارے ہر راز میں شریک ہو جاؤ

.... تمہارے پاس ٹکٹ اور دیگر اخراجات کے لئے تو رقم موجود ہے نا؟"

"جی ہاں......... جی ہاں......... آپ اس کی فکر نہ کریں"۔ شاہد نے جلدی کہا......... حالانکہ اس وقت اس کی جیب میں صرف سوا پانچ سو روپے موجود تھے لیکن احساس تھا کہ اس موقع پر اسے اپنا بھرم برقرار رکھنا تھا۔ اس کے تھوڑے بہت پیسے میں بھی موجود تھے لیکن اب بینک ٹائم نکل چکا تھا۔

"میں تمہیں ابھی اخراجات کے لئے رقم دے دیتا لیکن اتفاق سے اس وقت گھر میں اہ کیش موجود نہیں ہے........." سیٹھ صاحب بولے......... "البتہ میرے پاس سنگا ری ڈالرز میں کافی رقم موجود ہے کیونکہ تم سے بات ختم کرنے کے بعد میں سیدھا پورٹ جا رہا ہوں۔ مجھے سنگاپور کے لئے فلائٹ پکڑنی ہے........."

پھر وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولے۔ "میں تمہیں بھی اپنے ساتھ ہی گاڑی میں لے چلتا ن تمہاری فلائٹ میں خاصا وقت باقی ہے۔ اس دوران تم تھوڑی بہت ہنگامی تیاری بھی کتے ہو۔ اس کے علاوہ تمہیں اپنا ٹکٹ خریدنے کے ایئرلائن کے آفس بھی جانا ہوگا۔ اس لئے ں تم سے اجازت چاہوں گا۔ گوشی آج کل فرنچ سیکھ رہی ہے۔ وہ اس کی کلاس اٹینڈ رنے کے لئے روانہ ہو چکی ہے۔ اس لئے میں معذرت خواہ ہوں کہ تمہیں ٹیکسی میں جانا ے گا......... اور ہاں......... اخراجات کی قطعاً فکر نہ کرنا۔ نیابت خان کے سامنے ب تم یہ خط کھولو گے تو تمہاری زحمتوں کی تلافی ہو جائے گی......... اوکے؟"

"اوکے........." شاہد نے سعادت مندی سے کہا۔

سیٹھ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسٹڈی کے ایک گوشے میں اسٹینڈ پر ان کا ایک یف کیس اور چھوٹا سا سفری بیگ رکھا تھا۔ وہ دونوں چیزیں غالباً سفر کے لئے ہر وقت تیار ھی جاتی تھیں۔ سیٹھ صاحب کے آواز دینے پر ایک باوردی ڈرائیور اندر آیا اور وہ دونوں زیں اٹھا کر آگے چل دیا۔

"سنگاپور سے میری واپسی پانچ دن بعد ہوگی........." سیٹھ صاحب نے شاہد کے انہ بہ شانہ چلتے ہوئے کہا......... "اس وقت تک تم یقیناً واپس آ چکے ہو ے......... پھر تم سے مزید باتیں ہوں گی........."

"ٹھیک ہے........." شاہد نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا۔ وہ ابھی تک خدا کی ان پر غور کر رہا تھا اور اس غور و خوض کی ابتداء اس خیال سے ہوئی تھی کہ بڑے لوگ س طرح بات کرتے کرتے بریف کیس اٹھا کر بیرون ملک چل دیتے ہیں۔

ڈرائیور نے سیٹھ صاحب کے لئے پورش کار کا دروازہ کھولا تو شاہد اپنے خیالات کی یا سے باہر آتے ہوئے بولا......... "مجھے ذرا راستے میں میری کار کے پاس چھوڑ دیجئے ۔ میں اسے نکالنے کی کوشش کروں گا"۔

سیٹھ صاحب نے بخوشی اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ ڈرائیور نے جب شاہد کی ہدایت کے مطابق اس موڑ پر گاڑی روکی جہاں شاہد کی کار کچے میں پھنسی ہوئی تھی' تو سیٹھ صاحب نے کھڑکی سے سر نکال کر دو تین سیکنڈ کے لئے اظہار افسوس بھی کیا پھر گھڑی دیکھتے ہوئے بولے۔ "جلدی چلو ڈرائیور! غیر ملکی ایئرلائنوں والے تو وقت کے بہت ہی زیادہ پابند ہوتے ہیں.........."

شاہد نے انہیں خدا حافظ کہا اور اپنی گاڑی نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک دو ر گیروں نے اس کی مدد کی اور بالآخر اس کی گاڑی کچے سے نکل ہی آئی۔ غنیمت تھا کہ اسٹارٹ بھی ہوگئی تھی۔ شاہد اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوگیا۔ پہلے اس کی گاڑی سے جو آوازیں برآمد ہوا کرتی تھیں' اب ان میں کئی گنا اضافہ ہوچکا تھا.......... لیکن آوازوں سے شاہد کی یکسوئی میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس کے کمرے تک راستہ مختصر ہی تھا لیکن کمرے تک پہنچتے پہنچتے وہ اپنا لائحہ عمل طے کرچکا تھا۔

گاڑی کمرے کے سامنے کھڑی کرکے وہ بھاگم بھاگ بک اسٹال پر پہنچا۔ حالات قدرے اچھے ہو جانے کے باوجود اس نے اخبار خریدنا شروع نہیں کیا تھا۔ وہ بک اسٹال پر کھڑے کھڑے ہی اخبار دیکھتا تھا۔ اخبار میں ٹرینوں کے اوقات دیکھ کر اسے معلوم ہوا کہ آئندہ چند گھنٹوں میں سب سے پہلے اس کے مطلوبہ روٹ پر روانہ ہونے والی ٹرین تیز گام تھی جو پنڈی تک جاتی تھی اور ساڑھے پانچ بجے چلتی تھی۔

دوسرے روز پنڈی پہنچ کر وہ پشاور کے لئے کوئی اور ٹرین یا بس پکڑ سکتا تھا اور کسی سستے سے ہوٹل یا سرائے میں مزید ایک دن گزار کر بدھ کو نیابت خان سے مل سکتا تھا۔ اس طرح وہ سیٹھ صاحب کی ہدایات کی تھوڑی سی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا لیکن اسے امید تھی کہ اس میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ جب اسے نیابت خان سے ملاقات بدھ کو ہی کرنی تھی تو سیٹھ صاحب نے اسے دو دن پہلے پشاور پہنچنے اور کسی اچھے ہوٹل میں ٹھہرنے کی تاکید کیوں کی تھی؟ اس سے سیٹھ صاحب یا نیابت خان کو کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا؟ اس میں کون سی مصلحت پنہاں ہوسکتی تھی؟ صاف ظاہر تھا کہ سیٹھ صاحب صرف اسے آزمانا چاہتے تھے کہ وہ آنکھیں بند کرکے ان کی ہدایات پر عمل کرتا ہے یا نہیں؟ دولت مندوں کو ایسے ہی لوگ اچھے لگتے تھے جو زیادہ دلیل بازی نہیں کرتے تھے' چونکہ چنانچہ میں نہیں الجھتے تھے' بلکہ آنکھیں بند کرکے احکامات کی تعمیل کرتے تھے۔

جس انداز میں سیٹھ باٹلی والا نے اسے لفافہ دیا تھا اور جس طرح "ٹائم ٹیبل" سا... تھا اس سے شاہد کو یہ شبہ بھی ہو چلا تھا کہ شاید اصل اور جائز کاروباروں کے ساتھ ان کا کوئی خفیہ کاروبار بھی چل رہا تھا۔ شاہد کی وفاداری اور سعادت مندی وغیرہ کا تعین کرلینے کے بعد

شاید وہ شاہد کو اسی لائن میں کوئی ذمہ داری سونپنا چاہتے تھے۔

بہرحال شاہد کے لئے بعد میں انہیں یہ یقین دلانا زیادہ مشکل نہیں تھا کہ اس نے سیٹھ صاحب کی ہدایت پر حرف بہ حرف عمل کیا تھا۔ جہاز سے پشاور گیا تھا' اچھے ہوٹل میں ٹھہرا تھا اور خوب دل کھول کر پیسے خرچ کیے تھے۔ اس قسم کے ثبوت فراہم کرنا اور کسی کو چکر دینا اب اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ تاہم فی الحال وہ سیٹھ صاحب کی ہدایات پر عمل اپنے مالی حالات کے حساب سے ہی کرسکتا تھا۔

اخبار رکھ کر وہ واپس کمرے میں آیا اور جلدی جلدی ایک بریف کیس میں شیو کا سامان' چپل' کرتا پاجامہ اور تولیہ وغیرہ رکھ کر' جس حال میں تھا اسی حال میں رکشے میں بیٹھ کر اسٹیشن چل دیا۔

ریلوے اسٹیشن پر اسے ایک قلی سے چند منٹ مذاکرات کرنا پڑے جن کے دوران اس کی جیب سے پچاس کے ایک نوٹ نے قلی کی جیب کی طرف سفر کیا جس کے نتیجے میں قلی نے اسے ایک کمپارٹمنٹ میں سیٹ دلوا دی۔ وہ ڈبا ویسے تو تھرڈ کلاس ہی کا تھا مگر اس کی پیشانی پر سیکنڈ کلاس کا جھومر لٹکا دیا گیا تھا۔ ریلوے والوں کے خیال میں مسافروں کی تکالیف دور کرنے کا نہ سہی لیکن ان کا احساس کمتری کسی حد تک دور کرنے کا کچھ سامان ہونا چاہیے تھا۔

ٹرین جب کراچی سے روانہ ہوئی تو شاہد اچھا بھلا ٹانگیں پسار کر بیٹھا تھا لیکن روہڑی تک پہنچتے پہنچتے وہ نہ صرف اکڑوں بیٹھ چکا تھا بلکہ سکڑتے سکڑتے اس کا جسم درد کرنے لگا تھا۔ اس کے دائیں بائیں' اوپر نیچے مسافر ہی مسافر اور سامان ہی سامان تھا۔ ہر قسم کا سامان اور ہر قبیل کے مسافر اس ڈبے میں دستیاب تھے۔ جھاڑو سے لے کر پلنگ تک اس ڈبے میں موجود تھا۔

ایک دو بار شاہد نے باتھ روم تک رسائی حاصل کرنے کی بھی کوشش کی لیکن جونہی پاؤں سیٹ سے اتار کر فرش پر رکھنے کی کوشش کی' آہ و بکا کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ وہاں سے پاؤں ہٹایا تو کوئی اور چلانے لگا۔ "ابے کون ہے؟ میری ناک نظر نہیں آرہی کیا؟" شاہد گھبرا کر دوبارہ اکڑوں بیٹھ گیا۔

دوسرے روز رات کو جب وہ پنڈی کے اسٹیشن پر اترا تو دیر تک اسے یہی وہم رہا کہ وہ کوئی غیر انسانی مخلوق بن چکا تھا مگر رفتہ رفتہ جب اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے ہوئے' جسم حرکت کرنے لگا اور دماغ ٹھکانے پر آیا تو اپنے اشرف المخلوقات ہونے پر اس کا یقین بحال ہوگیا لیکن ساتھ ہی دوسری مصیبت شروع ہوگئی۔ پنڈی میں سردی اتنی زیادہ تھی کہ اس کے نہ صرف دانت بلکہ گھٹنے بھی بجنے لگے۔ اس کا پرانا اور ہلکا سا سوٹ جسے کراچی میں پہن کر اسے پسینہ آ جاتا تھا' ململ کے کرتے پاجامے سے بھی زیادہ باریک محسوس ہونے لگا۔ اب اسے

احساس ہوا کہ اس لحاظ سے ٹرین کا "ایئرٹائٹ" ڈبا کتنا غنیمت تھا۔

چائے کے دو گرما گرم کپ معدے میں انڈیل کر وہ جوں توں ٹیکسی میں بیٹھ کر لاری اڈے پہنچا اور پشاور جانے والی بس میں سوار ہوگیا۔ بس میں کچھ مسافر موجود تھے۔ انجن اسٹارٹ تھا اور دروازے بند تھے۔ شاہد کو کچھ سکون محسوس ہوا تاہم دانت بجنے بند نہیں ہوئے۔

صبح کے قریب وہ پشاور پہنچا۔ ابھی اجالا نہیں پھیلا تھا۔ لاری اڈے سے نکل کر اس نے دیکھا' سڑکیں ویران تھیں اور کہیں کہیں ایک آدھ قمقمہ ٹمٹا رہا تھا۔ سردی نے ایک بار پھر اسے لرزانا شروع کر دیا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ چکرا کر وہیں گر پڑے گا۔ اس کی لاش پر غالباً" لاکھوں من برف جم جائے گی اور ہزاروں سال بعد ماہرین آثار قدیمہ اس کی لاش دریافت کریں گے بڑے حیران ہوں گے کہ موسم سرما میں اتنے ہلکے کپڑے کا سوٹ پہن کر یہ شخص پشاور میں کیا کرنے آیا تھا؟ خودکشی کے تو کئی اور طریقے بھی موجود تھے جو کم تکلیف دہ تھے۔

چند لمحے کی سوچ بچار کے بعد اس نے ایک ٹیکسی ڈرائیور کی خدمات حاصل کیں۔ اس کی مدد سے شاہد آخر کار ایک ایسا ہوٹل تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا جس کے سنگل کمرے کا کرایہ پچاس روپے تھا۔ یہ ہوٹل درحقیقت ایک تین منزلہ مکان تھا جسے شاہد کے اندازے کے مطابق دس سال قبل گر جانا چاہیے تھا۔ قدرت شاید اس لئے اس پر نظر کرم رکھے ہوئے تھی کہ وہ شاہد جیسے سفرزدگان کو پناہ دینے کے کام آ رہا تھا۔

کمرے میں پہنچتے ہی شاہد بستر پر ڈھیر ہوگیا اور ابھی گھوڑے بیچنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ بلبلا کر اٹھ بیٹھا۔ بتی جلائی تو اس پر انکشاف ہوا کہ بستر پر کھٹملوں کی پوری فوج اس کے خلاف جنگی مشق میں مصروف تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار اتنے کھٹمل یکجا دیکھے تھے۔

اس نے بستر کو بالکونی میں لے جا کر نیچے گلی میں جھاڑا اور دوبارہ بچھا کر لیٹ گیا۔ اسے اطمینان ہوگیا تھا کہ جب تک کچھ کھٹمل واپس آنے میں کامیاب ہوں گے یا ان کا کوئی نیا دستہ پلنگ سے برآمد ہوگا تب تک وہ سوچکا ہوگا۔ اس حالت میں وہ کچھ خون چوس بھی لیں تو کوئی حرج نہیں.......... شاید اس طرح اس کا شمار خون کا عطیہ دینے والوں میں ہوسکے۔ یہ سوچ کر وہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔

اپنی تمام تر دفاعی کوششوں کے باوجود وہ زیادہ دیر سونے میں کامیاب نہیں ہوسکا اور دو تین گھنٹے بعد کھٹملوں نے نئے سرے سے باہم اتحاد قائم کرکے اسے بستر بدر کر دیا۔ اس نے مزید سونے کا ارادہ ترک کر دیا اور کھٹملوں کے خلاف کوئی نئی حکمت عملی اختیار نہیں کی کیونکہ اسے احساس ہوگیا تھا کہ وہ سونے کا نہیں' عمل کا وقت تھا۔ سیٹھ باٹلی والا کی ہدایات

کرتے ہوئے وہ آنکھیں بند کرکے کسی نہ کسی طرح پشاور تو پہنچ گیا تھا لیکن اب وہ ہر سوچ سمجھ کر کچھ اس طرح اٹھانا چاہتا تھا کہ اس میں اس کا اپنا بھی کچھ عمل دخل ہو۔ ادھند محض کسی کے بتائے ہوئے راستے پر ہی نہ دوڑتا چلا جائے۔

اس نے سیٹھ باٹلی والا کا دیا ہوا لفافہ نکال کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اگر وہ اسے ڈالتا تو اس پر لگی ہوئی سیل خراب ہو جاتی اور وہ ایسا دوسرا لفافہ ایک اجنبی شہر میں رات تک تو تیار نہیں کراسکتا تھا۔ اگر وہ کراچی میں ہوتا اور اس کے پاس مناسب ہوتی تو وہ یہ بھی کر گزرتا۔ اس کے لئے ایسا لفافہ تیار کرانا زیادہ مشکل کام نہیں تھا سیٹھ باٹلی والا کے گروپ آف کمپنیز کا نام' مونوگرام اور سیل موجود ہوتی۔

اس نے لفافہ کھولنے کی کوشش نہیں کی البتہ اسے بلب کے عین سامنے لے جاکر جائزہ لینے لگا۔ چند منٹ کے معائنے نے اسے کئی چیزوں کا اندازہ ہوگیا لفافے میں ہلکے رنگ کے کاغذ پر لکھا ہوا کوئی خط تھا۔ وہ اس قسم کے رائٹنگ پیڈ کا کاغذ معلوم تھا جو لڑکیوں کو پسند ہوتے ہیں۔ شاہد کو رائٹنگ پیڈ کا بھی خاصی حد تک اندازہ ہوگیا۔

معائنہ ختم کرکے شاہد خط کو احتیاط سے بریف کیس میں رکھ کر ہوٹل سے نکل آیا۔ پنگ سوٹ میں تھا۔ بزنس سوٹ اس نے ہوٹل کے اکلوتے بیرے کے حوالے کر دیا وہ اسے ذرا برش پھروا کر استری کروا کے لے آئے۔ بازار میں کافی دیر تک گھومنے کے بعد اس نے ایک رائٹنگ پیڈ' دو قلم' سیاہی' بلیڈ اور گم وغیرہ خریدی اور ہوٹل آگیا۔

کمرے کی چھوٹی سی تپائی پر بیٹھ کر اس نے لفافے کا آپریشن شروع کیا۔ لفافہ لمبوترا شاہد نے دیکھا کہ لوگوں کو اس قسم کا لفافہ بھی بند کرنے کے سلسلے میں اگر احتیاط کرنی تھی تو وہ صرف اسی طرف کوئی ٹیپ لگاتے تھے یا سیل کرتے تھے جدھر لفافہ کا منہ ہوتا لفافے کے دوسرے سرے پر بھی ایک جوڑ ہوتا تھا لیکن اس کی طرف لوگوں کا دھیان جاتا تھا اور سیٹھ باٹلی والا نے تو ویسے بھی شاید لفافہ عجلت میں ہی تیار کیا تھا۔

شاہد نے نہایت احتیاط' نہایت نفاست اور مہارت سے بلیڈ کی مدد سے اسی دوسرے کی طرف سے لفافہ کھولنا شروع کیا۔ اس نے لفافے یا اس کی سیل کو ذرا بھی خراب ہونے دیا اور اسے کھول لیا۔ اس کام میں ذرا دیر تو لگی لیکن اس کی کارکردگی قابل داد

لفافے سے اس کے اندازے کے مطابق ہلکے نیلے رنگ کے دو ورق برآمد ہوئے۔ نے نہایت احتیاط سے انہیں کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ پہلے ورق پر لکھا تھا۔

رخسانہ گوشی کی طرف سے مسٹر شاہد علی کے نام!

شاہد صاحب! ڈیڈی تو آپ کو پولیس کے حوالے کرتا یا پھر سوئمنگ پول میں غوطے

دلوانا چاہتے تھے لیکن اس وجہ سے باز رہے کہ وہ پولیس اور عدالتوں کے چکر میں پڑنا پ
نہیں کرتے۔ دوسرے میں نے بھی انہیں سمجھایا کہ آپ بظاہر خاصے معقول اور معز
نوجوان معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے آپ کے ساتھ اتنا ذلت آمیز سلوک نہیں ہونا چاہئ
بلکہ آپ کے ساتھ کوئی دلچسپ قسم کی ہی جوابی کارروائی ہونی چاہیے۔ جلدی میں ہم ا
طریقہ سوچ سکے ہیں کہ آپ کو بھاگم بھاگ پشاور بھیجا جائے جہاں غضب کی سردی ہو گ
امید تو نہیں ہے کہ آپ کے پلے کچھ رقم ہوگی۔ اگر ہوئی بھی تو وہ ہوائی سفر اور ہوٹل
قیام میں اڑ جائے گی۔ آپ اس امید پر فراخدلی سے خرچ کریں گے کہ نیابت خان آپ
جیبیں نوٹوں سے بھر دیں گے۔ نیابت خان کے نام جو رقعہ ہمراہ منسلک ہے اسے دیکھ کر آ
کی یہ خوش فہمی بھی دور ہو جائے گی۔

مجھے اور ڈیڈی کو پورا یقین ہے کہ آپ اپنے آپ کو ہماری نظر میں ایک سعادت م
اور کار آمد آدمی ثابت کرنے کے لئے ڈیڈی کی ہدایت کے مطابق اس لفافے کو نیابت خا
کی موجودگی میں ہی ٹھیک بارہ بجے کھولیں گے۔ اس وقت یہ خط پڑھ کر یقیناً" آپ
کھوپڑی گھوم جائے گی۔

تاہم آپ کی مشاقی، مہارت اور ایثار کی میں داد دوں گی۔ ایک امیر آدمی اور اس
بیٹی سے تعارف حاصل کرنے کے لئے آپ نے پرانا اور فلمی سا طریقہ اختیار کیا لیکن آ
کے انداز میں خاصی انفرادیت تھی جس عمدگی سے آپ نے گاڑی کچی پہاڑی سے ٹکرائی ا
سے ایک لمحے کے لئے تو مجھے اس پر حقیقی حادثے ہی کا گماں گزرا تھا۔

ویسے برسبیل تذکرہ میں اس مستری کو بھی داد دیتی چلوں جس کی خدمات آپ
حاصل ہیں اور جس نے آپ کی کار کو اس قابل بنا رکھا ہے کہ وہ اس حال میں بھی ا
چڑھائی چڑھ لیتی ہے ورنہ میرے خیال میں تو اب تک اسے بے شمار حصوں میں تقسیم ہو
شیر شاہ کے کباڑیوں کے پاس پہنچ جانا چاہیے تھا۔ ان حصوں کو جس طرح متحد رکھا گیا ہ
یہ آپ کا اور آپ کے مستری ہی کا کمال ہے۔

بہرحال قسمت آزمائی جاری رکھیں۔ کوئی امیر زادی نہ سہی، کوئی عقل کی اندھی
پھنس ہی جائے گی.......... خدا حافظ۔

خط پڑھ کر ایک لمحے کے لئے تو واقعی شاہد کو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی کھوپڑ
بھک سے اڑ گئی تھی۔ وہ دیر تک گم صم سا بیٹھا رہا۔ یہ اس کی مختصر نوسربازانہ زندگی کا پہ
جھٹکا تھا اور وہی اتنا شدید تھا کہ اس نے گویا اسے عرش سے فرش پر لا پھینکا تھا لیکن وہ جا
ہی سنبھل گیا اور دوسرا خط پڑھنے لگا۔ رائٹنگ اس میں بھی وہی تھی لیکن اس کا مضمون
تھا۔

سیٹھ عبدالقادر باٹلی والا کی طرف سے نیابت خان کے نام!

پیارے نیابت! اس نوجوان کے بارے میں تو تمہیں کبھی ملاقات ہونے پر ہی بتاؤں
ی الحال تم صرف اتنا کرو کہ اسے پشاور سے کراچی تک کا ٹرین کا تھرڈ کلاس کا کرایہ دے
ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ پشاور کی سڑکوں پر گھومنے لگے گا اور راہگیروں کو روک
کر کہے گا۔ "بھائی صاحب! میں ایک ضروری کام سے پشاور آیا تھا میری جیب کٹ
میرے پاس واپسی کا کرایہ بھی نہیں ہے.........." وغیرہ وغیرہ۔ میں اس وقت ذرا
میں ہوں۔ سنگاپور جا رہا ہوں۔ وہاں سے واپسی پر تمہیں فون کروں گا۔ پھر ساری
بتاؤں گا۔ مختصراً" یہ سمجھ لو کہ اس نوجوان نے نہایت سنجیدگی سے ہمیں بے وقوف
ی کوشش کی تھی۔ ہم بھی نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس سے مذاق کر رہے ہیں۔ خدا
ا

نیچے کوئی دستخط وغیرہ نہیں تھے۔ شاہد کے معدے میں گویا کچھ گرہیں سی پڑ چکی تھیں
خاصی دیر میں جا کر ڈھیلی ہوئیں۔ اب تک وہ یہی سمجھتا آیا تھا کہ زیادہ تر دولت مند بے
ف ہوتے ہیں اور ان کے پاس دولت ہونا صرف قسمت کی مہربانی ہوتی ہے لیکن اب وہ
نظریئے میں کچھ ترمیم کرنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ پہلے ہی جھٹکے پر اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ
دولت مند احمق نہیں ہوتے تھے۔ اگر وہ احمق ہوتے تو شاید دولت مند نہ ہوتے۔

دل ہی دل میں وہ لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے لفافہ کھول کر دیکھ لیا تھا۔ اگر
سیٹھ صاحب کے اندازوں کے مطابق واقعی ان کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے دوسرے
لفافہ اسی طرح بند اور محفوظ حالت میں نیابت خان کے پاس لے جاتا اور ٹھیک بارہ بجے
کے سامنے کھولتا تو اس کی کیا حالت ہوتی۔

اس نے سر ہلایا اور زیر لب بولا.......... "کوئی بات نہیں سیٹھ صاحب اور محترمہ
سانہ عرف گوشی صاحبہ! آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ آپ کو کس فنکار سے پالا پڑا ہے"۔

اس نے رائٹنگ پیڈ اور قلم سنبھالا۔ وہ دونوں خط سامنے رکھے اور اس رائٹنگ کی
کامیاب نقل اتارتے ہوئے ایک اور ہی خط خود اپنے نام لکھنے لگا۔ خوب سمجھ سمجھ کر
ت آہستگی سے اس نے خط مکمل کیا۔ پھر دوسرا خط اس نے نیابت خان کے نام لکھنا
ع کیا۔

دونوں خط نہایت احتیاط سے مکمل کرنے کے بعد اس نے انہیں تنقیدی نظر سے پڑھا
مطمئن ہونے کے بعد لفافے میں ڈال کر لفافے کو بہت معمولی سی گوند سے نہایت صفائی
دوبارہ بند کر دیا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس لفافے کو کھولا گیا تھا یا اس سے چھیڑ چھاڑ
گئی تھی۔ لفافہ بالکل پہلے ہی کی طرح تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کے اندر دونوں خط
ل ہو چکے تھے۔

دوسرے روز شاہد تقریباً گیارہ بجے نیابت خان کے دفتر جا پہنچا۔ نیابت خان کا دفتر اچھا

خاصا شاندار تھا لیکن وہ خود سیدھا سادا اور انکسار پسند آدمی معلوم ہوتا تھا۔ شاہد جب شکن سوٹ میں نہایت تمکنت سے بریف کیس ہاتھ میں لئے اس کے دفتر میں داخل ہوا تو اپنی شاندار ریوالونگ چیئر سے یوں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا جیسے وہ شاہد کا ادنیٰ ملازم تھا۔

شاہد نے اس سے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ اسے سیٹھ باٹلی والا نے بھیجا ہے۔ نیابت خان گویا اس کے قدموں میں بچھنے لگا۔ وہ باٹلی والا کا بہت احسان مند معلوم ہوتا تھا۔ شاہد نے اس کے چہرے سے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ پچھلے دو دنوں کے دوران باٹلی والا نے سنگا پور سے یا گوشی نے کراچی سے نیابت خان کو فون کرکے اصل بات تو نہیں بتا دی تھی؟ لیکن نیابت خان کے چہرے سے اسے ایسا کوئی سراغ نہیں ملا۔

نیابت خان احمق یقیناً نہیں تھا لیکن عیار اور شاطر بھی نہیں تھا۔ وہ اداکاری کرنے کا بھی اہل معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس تک یقیناً ابھی شاہد کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں پہنچی تھی۔ شاید سیٹھ باٹلی والا اور گوشی نے اس معاملے کو کوئی اہمیت دینے کے قابل سمجھا ہی نہیں تھا۔ وہ اسے پشاور کی طرف دھکا دینے کے بعد اپنے اپنے کاموں میں الجھ گئے تھے اور کچھ دیر محظوظ ہونے کے بعد شاید اب تک اس بات کو بھول بھی چکے تھے۔

نیابت خان کی طرف سے کچھ مطمئن ہونے کے بعد شاہد نے رازدارانہ انداز میں سیٹھ باٹلی والا کا لفافہ نکال کر اسے دکھایا تو اس کے تاثرات کچھ اور عاجزانہ ہوگئے۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ شاہد کو سیٹھ باٹلی والا کا خاص آدمی سمجھ رہا تھا اور اسے اپنی خوش قسمتی یا اپنے لئے ایک اعزاز سمجھ رہا تھا کہ سیٹھ نے اس کے پاس اپنے خاص آدمی کو بھیجا تھا۔

جب قہوے اور اس کے لوازمات کا دور ختم ہوچکا تو نیابت خان نے بے تابی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "ہاں......... تو اب اس لفافے کو کھولا جائے؟"

"ابھی نہیں........." شاہد نے ایک کہنی میز پر ٹکاتے ہوئے پروقار لہجے میں کہا۔ "آپ نے دیکھا نہیں لفافے پر کیا لکھا ہے؟"

اس نے ایک بار پھر لفافے پر درج ہدایات کی طرف توجہ دلائی......... "یہ لفافہ بروز بدھ ٹھیک بارہ بجے مسٹر شاہد علی' مسٹر نیابت خان کی موجودگی میں کھولیں گے"۔

پھر اس نے وال کلاک کی طرف اشارہ کیا۔ ابھی بارہ بجنے میں تین منٹ باقی تھے۔ تین منٹ انہوں نے یوں خاموشی سے گزارے گویا کمرے میں کوئی تعزیتی اجلاس منعقد ہو رہا ہو۔ شاہد لفافہ چاک کرنے والی چھری ہاتھ میں تھامے گویا کسی پر حملہ کرنے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔

جوں ہی وال کلاک نے بارہ بجنے کا اعلان کرنے کے لئے پہلا گھنٹہ بجایا' شاہد نے لفافہ چاک کر ڈالا۔ لفافے سے اس نے اپنے ہی لکھے ہوئے دونوں خط نکالے' نہایت مدبرانہ

انداز میں ان پر نظر ڈالی۔ پھر ان میں سے وہ خط بظاہر پڑھنے لگا جو اس کے اپنے نام تھا۔ درحقیقت وہ صرف وقت گزاری کر رہا تھا۔

دونوں خط پڑھنے کے بعد شاہد نے گہری سانس لے کر نیابت خان کی طرف دیکھا۔ وہ مجسم اشتیاق بنا ہوا تھا اور خطوں کے بجائے شاہد کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا گویا تاثرات سے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ خطوں میں کیا لکھا تھا۔ شاہد نے کچھ ایسا تاثر دینے کی کوشش کی جیسے اسے کوئی مشکل کام بتا دیا گیا ہو۔

"کیا لکھا ہے؟" بالآخر نیابت خان پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"یہ خط تو میرے نام ہے........." شاہد نے وہ خط بند کرکے جیب میں رکھتے ہوئے کہا جو واقعی اس کے نام تھا۔ "مجھے تو سیٹھ صاحب نے ذرا سے خط میں سینکڑوں کام بتا دیئے ہیں۔ یہ خط آپ کے نام ہے"۔ اس نے ذرا بیزاری سے دوسرا خط نیابت خان کی طرف بڑھایا۔ وہ بھی تبدیل شدہ خط تھا اور اس کا مضمون اب کچھ یوں تھا۔

ڈیئر نیابت! سلام۔

حامل رقعہ ہذا کو ایک نہایت اہم مشن پر روانہ کر رہا ہوں۔ صورت حال کچھ ایسی ہے کہ اسے نہ تو اپنے پاس سے کیش دے سکتا ہوں اور نہ ہی اسے چیک ایشو کر سکتا ہوں۔ جلدی بھی بہت ہے کیونکہ اسی وقت سنگا پور روانہ ہو رہا ہوں۔ یہ خط بھی گوشی سے لکھوا رہا ہوں۔ تم صرف اتنی زحمت کرنا کہ اس نوجوان کو سفر خرچ وغیرہ کے لئے جتنی رقم درکار ہو فوری طور پر دے دینا۔ ہم بعد میں حساب کرلیں گے......... والسلام.........

عبدالقادر باٹلی والا۔

نیابت خان نے نہایت سرسری سے انداز میں رقعہ پڑھا اور بلاہچکچاہٹ بولا۔ "آپ کو کتنی رقم درکار ہوگی جناب؟"

"دیکھ لیجئے........." شاہد نے گویا اسے اندازہ لگانے کی دعوت دیتے ہوئے کہا......... "سب سے پہلے تو مجھے یہاں سے بائی ایئر اسلام آباد جانا ہے۔ وہاں ٹریڈ سیکرٹری سے ملنے کے بعد کراچی پہنچنا ہوگا۔ وہاں سیٹھ صاحب کی واپسی کا انتظار کئے بغیر میں ایک کنیکٹنگ فلائٹ کے ذریعے بلجیم روانہ ہو جاؤں گا۔ بلجیم سے دہلی آکر میں سنگا پور کے لئے کے ایل ایم کی پاکستان سے روانہ ہونے والی فلائٹ راستے میں پکڑوں گا اور عین اس وقت سنگا پور پہنچوں گا جب سیٹھ صاحب پاکستان روانہ ہونے والے ہوں گے۔ ان کے ساتھ کچھ سامان ہوگا جسے پاکستان بھجوانے کا انتظام میں ہی کروں گا۔ یہ بڑا لمبا چکر ہے اور بہت ہی نازک معاملہ ہے۔ فی الحال میں تفصیل نہیں بتا سکتا"۔

اس نے رک کر نیابت خان کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہ بے حد متاثر نظر آرہا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

شاہد نے گلا صاف کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”سیٹھ صاحب نے ان مقامات پر اپنے ٹریول ایجنٹوں کو فون تو کر دیئے تھے۔ کنفرم ٹیکسیاں بھی ہر ایئرپورٹ پر مجھے ملتی رہیں گی لیکن ادائیگی تو بہرحال مجھے ہی کرنی ہوگی۔ ہوٹلوں میں قیام وغیرہ کے اخراجات بھی ہوں گے۔ ڈالرز میں کچھ رقم تو میرے پاس ہے۔ میرا خیال ہے اگر آپ صرف اسی ہزار اور دے دیں تو کام چل جائے گا“۔

نیابت خان نے گھنٹی بجا کر چپڑاسی کے ذریعے اپنے اکاؤنٹینٹ کو بلایا اور اسی ہزار کا چیک کاٹ کر اسے بینک کی طرف دوڑا دیا کیونکہ بینک ٹائم ختم ہونے میں چند منٹ ہی رہ گئے اور نیابت خان کے پاس وقت زیادہ کیش نہیں تھا۔

انتظار کے لمحات شاہد نے بظاہر پرسکون انداز میں گزارے لیکن درحقیقت اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ بار بار اس کی نظر غیر ارادی طور پر فون کی طرف اٹھ جاتی تھی کہ عین اس وقت جبکہ اس کا داؤ کامیاب ہونے والا تھا کہیں کراچی سے گوشی کا فون نہ آجائے۔ کہیں وہ یہ جاننے کے لئے نیابت خان کو فون نہ کرلے کہ وہ چغد شاہد اس کے پاس پہنچ گیا یا نہیں؟ اور اگر پہنچ گیا ہے تو اس وقت اس کا کیا حال ہے؟

لیکن خیریت ہی رہی۔ فون نہیں آیا۔ بڑے لوگ شاید کچھ زیادہ ہی مصروف تھے۔

نیابت خان کا اکاؤنٹینٹ رقم لے کر ہانپتا کانپتا واپس آیا تو شاہد نے بریف کیس اس طرح گھٹنوں پر رکھ کر گڈی اس میں رکھی کہ نیابت خان کو بریف کیس کے خالی ہونے کا اندازہ نہ ہوسکے۔ بریف کیس بند کرکے اس نے نیابت خان کا شکریہ ادا کیا اور گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ نیابت خان نے دفتر کے دروازے تک آکر نیک تمناؤں کے ساتھ اسے رخصت کیا۔

باہر آتے ہی شاہد نے ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھنے کے بعد مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ ہوٹل میں چھوٹا موٹا کاٹھ کباڑ لینے بھی نہیں گیا۔ اس نے سیدھا لاری اڈے کا رخ کیا..........

☆ ========== ☆ ========== ☆

راوی فی الحال چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

نئی زندگی شاہد کو خوب راس آگئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دنیا کو سمجھا ہی اب تھا اور اسے جینے کا سلیقہ ہی اب آیا تھا۔ بات بہرحال جو بھی تھی' شاہد کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسے تو بس اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے زندگی کی سب آسائشیں حاصل کرلی تھیں۔

پچھلے ایک ڈیڑھ سال میں اس نے مزید کئی بڑے ہاتھ مارے تھے جسے وہ اب بھی بے ایمان اور بددیانت لوگوں سے خراج وصول کرنا ہی کہتا تھا۔ اس کے متاثرین کی فہرست میں

کئی نام شامل ہوچکے تھے۔

مثلاً“ ایک ملک ارشاد الحق تھے جو ایک بہت بڑے ڈیری فارم کے مالک تھے جس میں ”ڈیری“ تو برائے نام تھی۔ بس فارم ہی فارم تھا۔ ان کے تیار کردہ مکھن کا ایک برانڈ بہت مشہور تھا اور انہوں نے زیادہ دولت اسی کی فروخت سے بنائی تھی۔ یہ مکھن ایسی گائیوں اور بھینسوں کے دودھ سے تیار کیا جاتا تھا جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔ یعنی ان کا دعویٰ تو یہی تھا کہ وہ گائیوں اور بھینسوں کے دودھ سے تیار ہوتا تھا لیکن اگر کوئی ان گائیوں اور بھینسوں کو دیکھنا چاہتا تو اس کی یہ آرزو پوری نہیں ہوسکتی تھی۔

شاہد نے ہیلتھ انسپکٹر بن کر ان سے خاصی رقم وصول کی۔ اس کے علاوہ شاہد نے مختصراً“ اشتہار بازی کے ذریعے دور دراز مقامات کے دو تین ایسے پلاٹ بھی کوڑیوں کے بھاؤ' فروخت کئے جن کے لالچی خریداروں کو یقین تھا کہ وہ زمین خریدتے ہی ان کے قدموں میں دولت کے ڈھیر لگ جائیں گے۔

ان دنوں گھڑ دوڑ بھی کافی عرصے کی پابندی کے بعد ڈھکے چھپے سے انداز میں شروع ہوئی تھی۔ شاہد نے گھڑ دوڑ کی نہایت سالڈ ٹپس فروخت کرنے کا دھندا بھی کیا۔ دھندا اس نے یونہی شغل کے طور پر شروع کیا تھا حالانکہ اسے ریس کی کوئی خاص شدبد نہیں تھی لیکن خلاف توقع اس دھندے میں بھی اسے خاصی آمدنی ہوئی۔ اس سے پہلے کہ لوگ اسے زیادہ پہچاننے لگتے' یا ریس کے منتظمین تک بات پہنچتی' اس نے وہ دھندا چھوڑ دیا۔ تاہم اب اسے یہ یقین ہوچکا تھا کہ قسمت اس پر مہربان تھی اور وہ مٹی میں بھی ہاتھ ڈالے تو وہ سونا بن جائے گی۔ اس احساس نے اس کی خوداعتمادی اور بڑھا دی تھی۔

اس نے ایک روز نہایت اہم نکتہ بھی پالیا تھا۔ وہ نکتہ یہ تھا کہ صرف غریب لوگ ہی راتوں رات دولت مند بننا نہیں چاہتے تھے بلکہ کروڑ پتی بھی یہ چاہتے تھے کہ ان کے اثاثے دن دگنے اور رات چوگنے ہوتے چلے جائیں۔ معاشرے میں ”ایزی منی“ کی ہوس تو بہت ہی بڑھ چکی تھی۔ کوئی ضرورت مند کو دس روپے دینے کے لئے تیار نہیں تھا لیکن اپنی رقم دگنی چوگنی کرنے کے لئے یا ہوشربا قسم کے فائدے حاصل کرنے کے لئے لوگ اپنی جمع پونجی ہاتھوں میں اٹھائے دوڑے آتے تھے۔ شاہد کو جہاں جہاں موقع ملا تھا' اس نے کچھ ایسے لوگوں کی کمزوریوں سے بھی فائدہ اٹھایا تھا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ وہ سوسائٹی کے علاقے میں ایک کشادہ اور باعزت اپارٹمنٹ میں رہائش پذیر تھا۔ آمد و رفت کے لئے اس کے پاس ایک سیکنڈ ہینڈ مگر خاصی بڑی اور بارعب گاڑی بھی موجود تھی جو کافی آسودہ حال ہونے کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ شاہد کا نوکر روزانہ اسے ایسی محنت سے چمکاتا تھا کہ وہ سیکنڈ ہینڈ کی بجائے نئی نظر آتی تھی۔

شاہد کا دل تو چاہتا تھا کہ اس کے پاس سوٹوں کا انبار ہو کیونکہ اس نے کافی طویل

عرصہ لنڈے کے ایک سوٹ میں گزارا تھا۔ تاہم اب اس نے نہایت احتیاط سے چار پانچ نہایت فیشن ایبل قسم کے سوٹ سلوائے تھے۔ اس سے اس کی معلومات میں بھی اضافہ ہوا تھا اور اسے اونچے طبقے میں اٹھنے بیٹھنے میں بھی مدد ملی تھی۔ مثلاً اسے پتا چلا تھا کہ بہت اونچے طبقے میں "پیا کارڈیا" کے سوٹ امارت کی نشانی سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک دکان سے اس کمپنی کا ایک فرانسیسی سوٹ بھی خرید ڈالا تھا۔

وہ ابھی مالی اعتبار سے اپنے آپ کو اونچے طبقے میں تو شمار نہیں کر سکتا تھا لیکن ایسا تاثر ضرور دے سکتا تھا کہ اس کا تعلق کسی اعلیٰ خاندان سے تھا جس میں دولت کئی نسلوں تک رہی تھی لیکن بدقسمتی سے دولت کے وہ انبار اس تک نہیں پہنچ سکے تھے تاہم وہ کچھ ایسا گیا گزرا بھی نہیں تھا۔ ہاتھی گویا مر کر بھی سوا لاکھ کا تھا۔

اپنی انہی صلاحیتوں کی بناء پر اس نے زرینہ مرچنٹ سے تعارف حاصل کیا تھا۔ زرینہ مرچنٹ انہی امیرزادیوں میں سے تھی جو میک اپ کے بغیر کسی کے سامنے نہیں آتیں کہ دیکھنے والا خوف سے چیخیں نہ مارنے لگے۔ تاہم اسے اپنی شکل و صورت کی ہر خامی کو اپنی نخرے بازیوں، اپنی گفتگو، اپنے رکھ رکھاؤ اور نہایت امیرانہ قسم کے مشاغل کے تذکرے میں چھپانے کا فن خوب آتا تھا۔

رکھ رکھاؤ کے اعتبار سے وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو کسی کو کھانے کے دوران کانٹا ایک انچ سے زیادہ منہ میں لے جاتے دیکھتی تو اسے فوراً گھٹیا خاندان کا فرد قرار دے دیتی ہیں۔ شاہد اس قسم کی نخریلی لڑکی کی نظر میں بھی اپنے آپ کو ایک اعلیٰ اور دولت مند خاندان کا بچا کھچا چشم و چراغ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

شکل و صورت کے اعتبار سے زرینہ خواہ کیسی بھی تھی لیکن جس وقت شاہد نے اس سے تعارف حاصل کیا، اس وقت بھی اس کے کم از کم پانچ امیدوار موجود تھے۔ شاہد نے نہایت صفائی سے سب کا پتا صاف کر دیا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ اس کے بعد بھی اسے شادی کے مرحلے تک پہنچنے کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔

شادی کے معاملے میں شاہد بے حد سنجیدہ ہو چکا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ کم از کم چونتیس برس کا ہو چکا تھا۔ اچھا کھاتا تھا، اچھا پہنتا تھا اور چار بڑے بڑے کمروں پر مشتمل پر تعیش اپارٹمنٹ میں صرف ایک نوکر کے ساتھ رہتا تھا اس لئے اسے باہر سے ہی نہیں، اندر سے بھی تنہائی محسوس ہونے لگی تھی اور روح کی اس تنہائی کا کوئی علاج اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

وہ خود کو ادھورا ادھورا محسوس کرنے لگا تھا۔ رات کو گہری نیند سے اچانک اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ اپنا جسم پسینے میں بھیگا ہوا پاتا۔ رات کا سناٹا اسے قبرستان کا سکوت محسوس ہونے لگتا اور اپنا کشادہ بیڈ روم قبر سے مشابہ محسوس ہوتا۔ پسینہ خشک ہوتا تو جیسے ہر

جاں سے شرارے پھوٹنے لگتے وہ بستر سے نکل کر دیر تک کھڑکی میں کھڑا رہتا اور ے آنے والی خنک ہواؤں سے روح اور جسم کی تپش کم کرنے کی کوشش کرتا۔

انہی کیفیات سے گزرتے وقت ایک روز اچانک اسے عرفان ہوا تھا کہ اسے اب شادی نی چاہیے۔

اب چونکہ ذہنی اعتبار سے وہ ایک نیا ہی جنم لے چکا تھا اور اس کے خیالات اس دور مقابلے میں بالکل ہی بدل گئے تھے جب وہ اختر حسین ہوا کرتا تھا اس لئے محبت اور شادی کے جذباتی معاملات میں بھی اس نے مالی پہلو کو نظرانداز نہیں کیا تھا۔ اب وہ شاہد علی ب وہ کسی اور ہی انداز میں سوچ بچار کا عادی تھا۔ اس لئے اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اگر ی ہونے والی بیوی بیس تیس لاکھ نقد اور چالیس پچاس لاکھ کا جہیز ساتھ لے .... نیز وہ بے اندازہ دولت و جائیداد کی بھی وارث ہو تو کوئی مضائقہ .... اس طرح بھی زندگی کو مزید سنوارا جاسکتا تھا۔

اسی سنجیدہ سوچ بچار کے نتیجے میں وہ زرینہ مرچنٹ کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوا تھا۔ وہ گرہ گیر گو کہ چار پانچ انچ سے زیادہ لمبی نہیں تھی اور اس میں گرہ وغیرہ جیسی فضولیات کوئی گنجائش نہیں تھی لیکن شاہد نے خود کو مضبوطی سے اس زلف کے بندھن میں جکڑ تھا۔

زرینہ سے کورٹ شپ کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ شاہد کو اس طبقے میں نہایت بے ی سے نشست و برخاست اور میل جول بڑھانے کے مواقع مل رہے تھے جس میں اس شکار وافر تعداد میں دستیاب تھے۔

اسی طبقے کی ایک محفل میں اس نے سیٹھ جواد کے ہیروں کا تذکرہ سرگوشیوں سے سنا نہایت معتبر ذرائع سے مراد جس قسم کے لوگ ہوتے ہیں اسی قسم کے کچھ لوگ وشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ شاہد نے ان سرگوشیوں سے جو نتائج اخذ کئے وہ یہ تھے مذکورہ ہیرے تعداد میں صرف سات تھے لیکن نہایت بیش قیمت تھے اور سیٹھ جواد کی ہت کمزوری تھے۔

سیٹھ جواد انہیں اپنے بیڈ روم کے سیف میں ہی رکھتا تھا۔ شاہد نے دیکھا تھا کہ ت مندوں میں کچھ عجیب عجیب سے کمپلیکسز ہوتے ہیں۔ سیٹھ جواد کا کمپلکس یہ تھا کہ زانہ رات کو سونے سے پہلے وہ ان ہیروں کو تجوری سے نکال کر ضرور دیکھتا تھا ورنہ اسے نہیں آتی تھی۔ ہیروں کا نظارہ اس کے لئے گویا خواب آور گولیوں کا اثر رکھتا تھا۔

ان ہیروں کا تذکرہ شاہد نے ایک بار نہیں، کئی بار سنا اور لالچ سے زیادہ شاید تجسس اثر دکھایا تھا کہ اس کے دل میں پہلی مرتبہ چوری کی خواہش ابھری.......... حالانکہ اس اپنے لئے جو ضابطہ اخلاق مقرر کر رکھا تھا اس کے مطابق چوری ایک گھٹیا کام تھا اور وہ

اسے جرم بھی تسلیم کرتا تھا جبکہ اپنا کام اس کی نظر میں ایک "معزز پیشے" کا مقام ر
تھا........ یعنی بے ایمان اور بددیانت لوگوں سے خراج وصول کرنا......... لیکن یہ
والی بات نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں اٹک گئی تھی اور نکالے نہیں نکلتی تھی۔

یہ خیال ایک بیماری کی طرح تھا۔ ابتداء میں گویا صرف چند جرثوموں نے اس
ذہن کے خلیوں پر حملہ کیا تھا مگر جوں جوں دن گزرتے گئے، بیماری پھیلتی گئی اور نا
ناقابل علاج ہوگئی اسے اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہیروں کے خواب آنے لگے پھر رفتہ
اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ اگر اس نے ہیرے حاصل نہ کئے اور ان کے نظارے سے
دل سیر نہ کیا تو اس کی راتیں بھی بے خواب ہو جائیں گی اسے بھی ساری ساری رات
نیند نہیں آیا کرے گی۔

مگر سوال یہ تھا کہ ہیرے حاصل کیسے کئے جائیں؟ چوری پر اگر ذہن آمادہ ہو بھی
تب بھی اس خیال پر عملدرآمد بہرحال کوئی آسان کام نہیں تھا۔

سیٹھ جواد سے اس کا رسمی تعارف تھا تاہم اس کے بارے میں بنیادی معلومات
حاصل تھیں۔ جواد تقریباً" پینتالیس سال کی عمر کا ایک بے اولاد رنڈوا تھا۔ چودہ پندرہ
پہلے اس نے کسی معزز خاندان کی ایک نوعمر لڑکی سے شادی کی تھی جو چند ماہ بعد ہی
حادثے میں ہلاک ہوگئی تھی۔ اس کے بعد نہ جانے کیوں اس نے شادی نہیں کی تھی۔

اس کا بنگلہ ڈیفنس میں تھا جس میں وہ تنہا ہی رہتا تھا البتہ سرونٹ کوارٹرز میں
مالی، چوکیدار، خانساماں اور ڈرائیور اپنے اپنے کنبوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ڈرائیور کو تو
نے دیکھا ہوا بھی تھا وہ ایک سانولا اور منحنی سا نوجوان تھا۔

سیٹھ جواد اگر کسی تقریب میں شرکت کے لئے ہوٹل یا کسی کے گھر میں موجو
تھا تو باہر ڈرائیور گاڑی سے ٹیک لگائے خلا میں گھورتا رہتا تھا اگر اس کے جسم پر ڈرائی
والی وردی اور سر پر ٹوپی نہ ہوا کرتی تو وہ اچھا بھلا فلسفی معلوم ہوتا۔

اپنے خیال کو عملی شکل دینے کے لئے شاہد کی نگاہ انتخاب ادھر ادھر بھٹکتے بھٹکتے
اسی ڈرائیور پر آکر رکی۔ وہ پریشان حال معلوم ہوتا تھا اور روپے پیسے کے لالچ میں مبتلا
تھا۔

سیٹھ جواد کا دفتر چندریگر روڈ کی ایک بلند و بالا عمارت میں تھا جس کے اطراف
بہت سی چھوٹی چھوٹی گلیاں تھیں۔ ان گلیوں میں بہت سے کاروبار ہوتے تھے۔ چھوٹی
دکانیں، معمولی ریستوران اور گھٹیا چائے خانے بھی کھلے ہوئے تھے۔ زیادہ تر بڑے
صاحبوں کے ڈرائیور اور چپڑاسی انہی ہوٹلوں اور چائے خانوں میں پائے جاتے تھے
دوپہر کے کھانے کے وقت تو ان میں ہجوم ہوتا تھا۔

شاہد نے پتہ چلایا کہ سیٹھ جواد کا ڈرائیور بھی اپنے فارغ اوقات میں یا اپنے

ظار کے دوران انہی ریستورانوں میں سے ایک میں بیٹھا رہتا تھا۔ یہ معلوم کرلینے کے
چار دن بعد شاہد اسی ریستوران میں اس کے قریب ہی ایک میز پر موجود تھا۔ لیکن اس
اس کا حلیہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ ڈرائیوروں والے حلئے میں تھا جسم پر مکمل وردی، سر
اور پیروں میں پرانے سے جوتے تھے۔ اس نے اپنی فیشن ایبل داڑھی بھی کچھ اور
کر اتنی چھوٹی کرلی تھی کہ اب وہ محض چند دن کا بڑھا ہوا شیوا معلوم ہو رہی تھی۔
جواد کے ڈرائیور نے پہلے بھی کبھی آنکھ اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا اگر دیکھا ہوتا
بھی وہ موجودہ بہروپ میں شاہد کو نہیں پہچان سکتا تھا۔

شاہد کو اس سے تعارف حاصل کرنے میں مزید چار دن لگ گئے کیونکہ وہ واقعی فلسفی
نوجوان معلوم ہوتا تھا۔ گرد و پیش سے بالکل لاتعلق سا رہتا تھا زیادہ تر ڈرائیوروں کے
برعکس وہ نہایت کم گو اور نہایت کم آمیز تھا ہر وقت نہ جانے کن خیالوں میں کھویا رہتا
آخر شاہد کو وہی پرانا حربہ استعمال کرنا پڑا یعنی ایک روز بھیڑ بھاڑ کے اوقات میں کوئی میز
نہ پاکر اس کی میز پر جا بیٹھا۔

پہلے روز اسے ڈرائیور کا صرف نام معلوم ہوسکا جو محمد حنیف تھا۔ اسی دن سے شاہد
اس پر چائے پان اور سگریٹ جیسی نوازشات کی بارش کر دی لیکن ان کی دوستی نہایت
رفتاری سے بڑھی۔ کافی دنوں بعد محمد حنیف اس سے اس حد تک بے تکلف ہو سکا کہ
نے شاہد کے اس نظریے سے اتفاق کرلیا......... "ڈرائیوروں کی بھی کوئی زندگی
.... عیش تو دولت والوں کے ہیں"۔

اس کے بعد کام کچھ آسان ہوگیا۔ مزید کئی دنوں کی محنت کے بعد گفتگو آخر اس
ب پر آگئی۔۔ "ڈرائیوری کرتے ہوئے تو ساری عمر یونہی ترستے ہوئے گزرے گی حنیف
ی! ہم، ہماری بیویاں اور بچے چٹنی سے روٹی کھاتے رہیں گے اور ٹکے ٹکے کی چیزوں کو
تے رہیں گے......... اور اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ محنت کرتے کرتے کبھی ہمارے پاس
چار پیسے جمع ہو جائیں گے تو یہ محض تمہاری خوش فہمی ہے۔ تم خود بھی سوچو.........
ے پاس نہ سفارش ہے نہ تعلیم ہے اور نہ ہی کوئی خاص ہنر ہے......... آخر ہمارے
کس ذریعے سے روپیہ آئے گا؟ میری بات کو پتھر پر لکیر سمجھو......... اگر ہم نے کوئی
ہاتھ نہ مارا تو دن بہ دن حالات بدتر ہی ہوں گے......... اچھے نہیں......... مہنگائی
مسائل دن بدن قیامت کی رفتار سے بڑھ رہے ہیں......... کم نہیں ہو رہے"۔

یہ دیکھ کر شاہد کو خوشی ہوئی کہ اس کی ایسی باتوں پر اب حنیف تائید کے سے انداز
دھیرے دھیرے سر ہلانے لگا تھا۔ پھر وہ مزید گہری سوچ میں ڈوب جاتا تھا کیونکہ گہری
چ میں تو وہ ہمیشہ ہی ڈوبا ہوتا تھا۔

مزید چند دن بعد آخر کار گفتگو اہم ترین موڑ پر آگئی محمد حنیف کو شاہد یہ تاثر تو دے

ہی چکا تھا کہ ان دونوں کے "صاحب" ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے لیکن اس اپنے "صاحب" کا کبھی واضح طور پر تذکرہ نہیں کیا تھا کہ وہ تھے کون؟ وہ بس حنیف سے دو گھنٹے گپ شپ کرنے اور اسے اپنی راہ پر لانے کا عمل غیر محسوس سے انداز میں انجام دینے کے بعد ٹوپی درست کرکے اور کھانے یا چائے وغیرہ کا بل ادا کرکے چل دیتا تھا۔ وہ کہہ کر جاتا تھا کہ اب اسے اپنے صاحب کو لے کر جانا ہے............ لیکن حنیف بھی ایک ہی بے نیاز شخص معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ شاہد صاحب کون تھا۔

اس روز شاہد نے بات چیت کا اہم ترین مرحلہ شروع کرتے ہوئے کہا............ "میں نے ایک بار اپنے صاحب کو تمہارے صاحب کے بارے میں کسی سے بات کرتے سنا تھا ان کے پاس پانچ یا سات بہت قیمتی ہیرے ہیں جنہیں............"

محمد حنیف بہت کم بولتا تھا لیکن جب بولتا تھا تو سیدھی مطلب کی بات کرتا تھا اِدھر اُدھر کی نہیں ہانکتا تھا اور نہ ہی لمبی تمہیدیں باندھتا تھا۔ وہ شاہد کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "اگر تمہارا خیال ہے کہ ہم ان ہیروں کو چرا سکتے ہیں تو یہ خیال اسی وقت دل سے نکال دو اور کوئی دوسرا' کام کا منصوبہ سوچو"۔

"لیکن ہیروں کو چرانے میں کیا برائی ہے؟" شاہد نے پوچھا اس کی دھڑکنیں تیز ہو جا رہی تھیں............ "تم ان کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"میں ان کے بارے میں تقریباً" سبھی کچھ جانتا ہوں"۔ حنیف ذرا بیزاری سے بولا............ "حتیٰ کہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ سرخ رنگ کے ایک مخملی ڈبے میں رکھے ہوئے ہیں............ اور تعداد میں پانچ یا سات نہیں' پورے نو ہیں۔ یہ بات مجھے خانساماں رب نواز نے بتائی تھی وہ ایک بار صاحب کو دودھ کا گلاس دینے عین اس وقت ان کے بیڈ روم میں چلا گیا تھا جب وہ ہیروں کا ڈبا کھولے بت بنے بیٹھے تھے۔ صاحب تو گویا ان ہیروں کی پوجا کرتے ہیں۔ انہیں سامنے رکھنے کے بعد دیر تک صاحب کو کسی بات کا ہوش نہیں رہتا............ وہ ہیرے واقعی خوبصورت بھی اتنے ہیں کہ آدمی انہیں دیکھ کر بت بن جاتا ہے............ لیکن انہیں چرانا ناممکن ہے"۔

شاہد ہیروں کا تذکرہ قدرے تفصیل سے سن کر دبے دبے جوش سے بولا............ "دنیا میں کسی چیز کو چرانا ناممکن نہیں............ بشرطیکہ عقل استعمال کی جائے اور صحیح قسم کے ساتھی مل جل کر کام کریں۔ میں نے ایک مرتبہ ایک رسالے میں پڑھا تھا............ وہ کون سا شہر ہے............ ہاں ٹورانٹو............ وہاں کے چڑیا گھر سے ایک مرتبہ کچھ لوگ شیر کو اس کے پنجرے سمیت چرا کر لے گئے تھے۔ تمہیں تو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ افریقہ کی ایک ریاست میں کچھ لوگوں نے ٹرین کا انجن چرا لیا تھا۔ ہم تو پھر بھی ہیروں کے ایک

چھوٹے سے ڈبے کی بات کر رہے ہیں۔ تمہارے خیال میں اسے چرانا کیوں ناممکن ہے؟"

"دیکھو............ بنگلے پر دو چوکیدار ہیں ایک دن کا............ ایک رات کا............" حنیف نے گویا سمجھانا شروع کیا............ "دن میں بے شک صاحب باہر ہوتے ہیں لیکن گھر میں نوکروں وغیرہ کی خوب آمد و رفت رہتی ہے اور چوکیدار بھی ایک لمحے کے لئے گیٹ نہیں چھوڑتا۔ اسے سختی سے حکم ہے کہ صاحب کی غیر موجودگی میں کسی کو گھر میں داخل نہ ہونے دے اور اگر کوئی اپنے آپ کو صاحب کا دوست یا رشتے دار بتائے تو چوکیدار پہلے صاحب کے دفتر فون کرکے اس کے بارے میں تسلی کرلے۔ اسی لئے صاحب نے چوکیدار کے لئے گیٹ کے پاس چھوٹا سا گیٹ ہاؤس بھی بنوا رکھا ہے اور اس میں ٹیلی فون بھی لگوا رکھا ہے۔ بنگلہ بھی اتفاق سے ایسی جگہ ہے کہ پچھلی گلی میں بھی تھوڑی بہت آمد و رفت رہتی ہے اور اُدھر سے دیوار پھاندنے کی کوشش کرو تب بھی دھر لئے جاؤ گے............ اور پھر اِدھر ایک کتا بھی کھلا پھرتا رہتا ہے جو سو بھی رہا ہو تو ذرا سی آہٹ سے جاگ اٹھتا ہے"۔

"اس قسم کے انتظامات آج کل تقریباً" سبھی دولت مندوں کے گھروں میں ہوتے ہیں لیکن کیا اس کا مطلب ہے کہ ان میں سے کسی کے ہاں کبھی چوری ڈاکا نہیں پڑتا؟" شاہد گویا ان باتوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بولا پھر اس نے غیر محسوس سے انداز میں بات کو آگے بڑھایا............ "اگر میں نے تمہاری مدد سے ہیرے چرانے کا منصوبہ بنا بھی لیا تب بھی میں دن میں تو بنگلے میں داخل ہونے کی جرات نہیں کرسکتا"۔

حنیف نے بھی نہایت ہوشیاری سے لائن پر آتے ہوئے کہا............ "فرض کرو تم رات کو ہی پچھلی دیوار پھلانگ کر آؤ اور میں کتے کو گوشت کے ساتھ بے ہوشی کی کوئی دوا کھلا کر پہلے ہی سلا رکھوں۔ اس کے علاوہ میں تمہیں صاحب کے بیڈ روم تک پہنچانے کا بھی کوئی بندوبست کر دوں تب بھی کوئی فائدہ نہیں۔ سردی ہو یا گرمی' صاحب اپنا بیڈ روم مقفل کرکے سوتے ہیں۔ سردیوں میں تو خیر کھڑکیاں دروازے بند رکھنے سے کوئی پریشانی نہیں ہوتی لیکن وہ گرمیوں میں بھی بند رکھتے ہیں اور ایئرکنڈیشنر چلا کر سوتے ہیں............"

حنیف اب خود بخود بات آگے بڑھا رہا تھا ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا............ "فرض کرو کسی ترکیب سے تم نے بیڈ روم کا تالا کھول لیا تب بھی تجوری کے تالے کا مسئلہ آجاتا ہے۔ اس کے تالے کی چابی صاحب اپنے سرہانے رکھ کر سوتے ہیں اور کھولنے کا سسٹم کچھ ایسا ہے کہ ایک خفیہ بٹن دبائے بغیر اگر تالے میں چابی لگائی جائے تو الارم بجنے لگتا ہے............"

"تمہیں یہ سب باتیں کیسے معلوم ہیں؟" شاہد نے شک زدہ نظروں سے اسے گھورا۔

"آخر میں برسوں سے اس گھر میں گھر ہی کے ایک فرد کی طرح رہ رہا

ہوں.........." حنیف گہری سانس لے کر بولا.......... "صاحب کی موجودگی میں ہمیں بلا روک ٹوک پورے گھر میں گھومنے پھرنے کی آزادی ہے اور صاحب ہم سب نوکروں پر اعتماد بھی کرتے ہیں۔ ان کی بہت سی خاص باتیں ہم لوگوں کو معلوم ہیں پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ میں نے ان ہیروں کے بارے میں کبھی نہیں سوچا ہوگا؟ لیکن کیا کروں.......... بھاری پتھر سمجھ کر چوم کر چھوڑ دیا تھا.......... اور پھر اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑ سکتا ہے"۔

"ہوں.........." شاہد نے پرخیال انداز میں ہنکارا بھرا.......... "آدمی تو تم کام کے ہی ہو.......... اب یہ سمجھ لو کہ ایک اور ایک گیارہ ہوگئے ہیں۔ اچھا.......... یہ بتاؤ تمہارے صاحب نیند کیسی سوتے ہیں؟"

"ہیروں کا دیدار کرلینے کے بعد تو وہ ایسی گہری نیند سوتے ہیں کہ ان کے سرہانے شیر بھی دہاڑتا رہے تو شاید نہ اٹھیں.........." محمد حنیف نے جواب دیا۔

"بس.......... تو پھر سمجھو سارے مسئلے حل ہوگئے.........." شاہد نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا.......... "میں ذرا اس مسئلے پر کچھ اور غور و خوض کرلوں۔ پرسوں میں تمہیں بتاؤں گا کہ الارم کو بے کار اور کتے کو بے ہوش کیسے کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ میں تمہیں چابی کی ڈپلیکیٹ بنوانے کا طریقہ بھی بتاؤں گا۔ اس کے بعد ہم باقی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی طے کرلیں گے اور آپریشن کا دن بھی مقرر کرلیں گے"۔

"آپریشن کا..........؟" حنیف نے حیرت سے دہرایا۔

"میرا مطلب ہے.......... اس مہم کو سر کرنے کا دن"۔ شاہد سنبھل کر بولا۔

حنیف نے جھجکتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا اتنے قریب کوئی بھی نہیں تھا کہ ان کی گفتگو سن سکتا۔ شاہد ہی کی پیشکش پر انہوں نے کافی دنوں سے ذرا بہتر قسم کے ایک ریستوران میں بیٹھنا شروع کردیا تھا۔

گرد و پیش سے ذرا مطمئن ہو کر حنیف کچھ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "فرض کرو.......... ہم.......... میرا مطلب ہے کہ تم میری مدد سے اس چکر میں کامیاب ہوگئے تو مجھے کیا ملے گا؟"

شاہد کو کافی دیر سے اس سوال کی توقع تھی اور جواب اس کے ذہن میں پہلے ہی تیار تھا۔ وہ مشفقانہ سے انداز میں بولا۔ "دیکھو میاں! ایک صورت تو یہ ہے کہ نو ہیروں میں سے اپنی پسند کے تین ہیرے تم لے لینا چھ ہیرے میرے ہوں گے.......... اور تم چاہو تو میں ہیرے حاصل کرنے کے دوسرے ہی دن تمہیں ڈیڑھ لاکھ روپیہ نقد لا دوں گا اور تم اس بات سے کوئی مطلب نہیں رکھو گے کہ ہیرے کتنے میں فروخت ہوئے.......... جس طرح بھی تم پسند کرو یا جس حد تک بھی تمہیں مجھ پر بھروسہ ہو.......... وہ طریقہ اختیار کرلو"۔

"ڈیڑھ لاکھ والی بات ہی ٹھیک ہے"۔ حنیف اپنے مخصوص شرمیلے سے لہجے میں

"ہیرے میں کہاں بیچتا پھروں گا.......... اور جہاں تک بھروسے کا سوال ہے تو تم سے اتنی دوستی ہوچکی ہے.......... تمہارے ساتھ بیٹھ کر اتنی خطرناک اسکیمیں بن ہیں.......... میں نے جس گھر کا نمک کھایا ہے اس میں نقب لگانے کو تیار ہوگیا.......... تو کیا یہ سب کچھ بھروسے کے بغیر ہی ہو رہا ہے؟"

شاہد کو کافی حد تک اسی بات کی توقع تھی۔ دو دن بعد ملاقات کا پروگرام طے کر کے ٹھ کھڑا ہوا۔

☆ ============ ☆ ============ ☆

دوسری طرف اپنے اصل روپ میں شاہد کی شام کی مصروفیات بھی جاری تھیں زانہ شام کو وہ زرینہ مرچنٹ کو ساتھ لے کر کسی اچھے ہوٹل میں پہنچا ہوتا تھا یا پھر کسی نہ تقریب میں جانے کے لئے ان کی ملاقات طے ہوتی تھی۔

حنیف سے بھی اس کا پروگرام طے ہوچکا تھا۔ آئندہ اتوار کی رات "آپریشن" کی ت قرار پائی تھی۔ حنیف نے وعدہ کیا تھا کہ تمام انتظامات مکمل ہوں گے۔ شاہد کا کام ف یہ ہوگا کہ بنگلے میں داخل ہو کر تجوری سے ہیرے نکالے اور انہیں بہ خیر و عافیت تھ لے جائے اور دوسرے روز حنیف کو اس کا حصہ پہنچا دے۔

آپریشن کی رات میں چار دن باقی تھے اس سے پہلے سال نو کی رات آگئی جن حلقوں ں شاہد کا اٹھنا بیٹھنا تھا ان میں نیو ایئر نائٹ دیوانگی آمیز جوش و خروش سے منائی جاتی تھی۔

شاہد بھی اس رات زرینہ کے ساتھ ایک صاحب کی طویل و عریض کوٹھی میں موجود ا۔ تقریبات کے لئے اس کوٹھی میں ایک خاص ہال موجود تھا جس میں شام ہی سے خوب یڑ بھاڑ تھی اور مختلف مشاغل جاری تھے۔

بارہ بجے سے ذرا پہلے تمام بتیاں بجھا دی گئیں شور شرابہ بالکل تھم گیا۔ ماحول پر یوں لوت اور تاریکی چھا گئی جیسے کوٹھی میں کوئی ذی روح موجود نہیں.......... پھر جیسے ہی وال لاک نے بارہ کا پہلا گھنٹا بجایا' ہال میں یک لخت جیسے روشنی کا سیلاب آگیا چیخوں کا طوفان پا ہوگیا مرد عورتیں' نو عمر لڑکے لڑکیاں سبھی کسی انجانی مسرت سے بے قابو ہو کر ہیسٹریائی نداز میں چیخنے لگے۔ دوسرے ہی لمحے پٹاخے اور غبارے پھوڑے جانے کی آوازیں ان یخوں میں ہم آہنگ ہوگئیں پھر در و دیوار کو لرزا دینے والی موسیقی یوں سنائی دی جیسے ساز و آواز کا آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔

تقریب کے میزبان جاپان سے نیا ہائی فائی سیٹ لائے تھے جس پر گونجنے والی انگریزی موسیقی سے در و دیوار جھنجھنا رہے تھے۔ اس سیٹ کے بارے میں میزبان کا دعویٰ تھا کہ اگر اسے بند کمرے میں فل والیوم پر چلایا جائے تو ارتعاش سے کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ جائیں گے۔

تمام حاضرین دیوانہ وار رقص کرنے لگے.......... حتیٰ کہ زرینہ مرچنٹ جو ڈانس میں پیروں کی جنبش میں بال برابر فرق گوارا نہیں کرتی تھی، وہ بھی اس وقت شاہد کے دونوں ہاتھ تھامے بے ہنگم انداز میں اچھل کود کر رہی تھی۔ بلاوجہ قہقہے لگانے کی وجہ سے اس کی گردن کی رگیں پھول رہی تھیں۔ غازے اور میک اپ کی فاؤنڈیشن سے چہرے کے مسام بند ہونے اور موسم ٹھنڈا ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر یوں پسینہ چمک رہا تھا جیسے وہ جون جولائی کی دوپہر میں مشقت کر کے آئی ہو۔

جس کوٹھی میں یہ ہنگامہ ہاؤ ہو جاری تھا' اسے باہر سے دیکھ کر اس کی باؤنڈری وال سے کان لگا کر کوئی اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ اندر کیا عالم تھا۔ صرف کمپاؤنڈ اور باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ کھڑی کاروں کی قطاروں سے پتا چلتا تھا کہ اندر کوئی تقریب جاری ہے لیکن تقریب کی نوعیت کا اندازہ پھر بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

تقریباً" پون گھنٹے کی اچھل کود کے بعد سبھی بے دم ہوگئے۔ پکی عمروں اور بڑی توندوں والے امراء تو بہت پہلے ہی سے بری طرح ہانپ رہے تھے لیکن اپنی یا دوسروں کی بیگمات کو یہ دکھانے کے لئے "ابھی تو میں جوان ہوں'.......... طوعاً" و کرہاً" رقص اور اچھل کود میں شامل تھے۔

آخر کار یہ ہنگامہ تھم گیا۔ موسیقی کچھ مدہم ہوگئی اور باوردی ملازمین ڈرنکس وغیرہ کی طشتریاں اٹھائے مہمانوں کے درمیان گردش کرنے لگے۔ زرینہ کو اس کا کوئی کزن مل گیا جو پھولی پھولی سانسوں کے درمیان اسے بتانے لگا کہ چپ بورڈ کی فیکٹری کے لئے اس کے باپ کا کئی کروڑ کا قرضہ منظور ہوگیا تھا۔ اس سے باتیں کرتے کرتے زرینہ کچھ دور چلی گئی تھی یا شاید مہمانوں کے ریلے میں شاہد خود ہی ایک طرف کو کھسک گیا تھا اسی دوران اس کی کہنی کسی کی کمر سے ٹکرائی اور اس کا گلاس چھلک گیا۔

دونوں ہی نے بروقت مڑ کر دیکھا اور دونوں ہی بیک وقت اپنی جگہ ساکت ہوگئے۔ جس کی کمر سے شاہد کی کہنی ٹکرائی تھی وہ رخسانہ باٹلی والا عرف گوشی تھی۔ ہونق سی شکل اور موٹی سی عینک والا ایک بے ہنگم سا نوجوان اس کے ساتھ تھا جس کے بے ہودہ جسم پر ایک نہایت نفیس سوٹ اپنی قسمت کو رو رہا تھا۔

شاہد کو حیرت تھی کہ اس نے تقریب میں اب تک رخسانہ کو کیوں نہیں دیکھا تھا.......... اس کی عقابی نگاہیں تو ہر مہمان اور خصوصاً" خواتین کا اچھی طرح جائزہ لے چکی تھیں۔ شاید رخسانہ ہال میں اندھیرا ہونے کے دوران اندر آئی تھی وہ ذرا بھی تو نہیں بدلی تھی۔

وہی ریشم جیسے سنہرے' ترشے ہوئے بال' وہی خوبصورت عینک' وہی کنول سے رخسار' وہی گلاب سے ہونٹ' وہی ذہین آنکھیں' وہی شبنمی چہرہ۔

اس نے بھی یقیناً" شاہد کو پہچان لیا تھا کیونکہ اس کے ہونٹوں پر دھیرے دھیرے مسکراہٹ طلوع ہو رہی تھی وہ پوری طرح اس کی طرف گھوم گئی اور سرتاپا اس کا جائزہ لینے لگی۔ اپنے ساتھی ہونق سے نوجوان کو اس نے قطعی نظرانداز کر دیا تھا۔ "تمہارے وجود سے دولت کی خوشبو آ رہی ہے.........." وہ ایسے دھیمے لہجے میں بولی کہ صرف شاہد ہی سن سکے.......... "لگتا ہے دھندا زوروں پر جا رہا ہے"۔

شاہد دم بہ خود کھڑا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بڑی مشکل سے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے پروقار لہجے میں بولا۔ "کون سا دھندا مس باٹلی والا؟"

"نوسر بازی کا دھندا.......... اور کون سا؟" رخسانہ نے اب بھی آواز دھیمی ہی رکھی۔

"آپ کی سینس آف ہیومینز بڑی ظالمانہ ہے' مس باٹلی والا" شاہد نے کھوکھلا سا قہقہہ لگایا۔ رخسانہ کے ہونق سے ساتھی نے آگے بڑھ کر ممناتے ہوئے گفتگو میں دخل دینے اور خود ہی شاہد سے اپنا تعارف کرانے کی کوشش کی لیکن رخسانہ نے ہاتھ کے تحکمانہ اشارے سے اسے پیچھے ہٹا دیا اور وہ کھسیانہ ہوئے بغیر کسی اور طرف کو چلا گیا۔

"ڈرو مت.........." رخسانہ دوبارہ شاہد کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔ "میں تمہاری پول کھولنے یا اسی ہزار کی اس رقم کا ذکر چھیڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی جو تم نیابت خان سے ٹھگ کر لے گئے تھے اور جو ڈیڈی کے حساب میں سے کاٹ لی گئی تھی۔ میں تو تم سے کچھ اور ہی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ آؤ.......... باہر چلتے ہیں.......... تمہارے ساتھ کوئی ہے کیا؟" اس نے شاہد کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں.......... زرینہ مرچنٹ میرے ساتھ ہے.........." شاہد نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

"ارے گولی مارو اس مگرمچھ کی بچی کو.......... اتنی بور لڑکی کے ساتھ تم کیا جھک مارتے پھر رہے ہو.........." رخسانہ نے اسے تقریباً" کھینچتے ہوئے کہا.......... اس کے گرم و گداز ہاتھ کا لمس شاہد کے جسم میں ایک اور نئی انوکھی حرارت پیدا کر رہا تھا۔

تب اس نے محسوس کیا کہ جسموں کے ردعمل بھی تو دراصل ذہنوں ہی کے تابع ہوتے ہیں۔ اسے یاد تھا کہ رخسانہ وہ پہلی لڑکی تھی جسے اس نے موٹی اسامی سمجھ کر منتخب کیا تھا اور ذہن میں ایک خاص منصوبہ لے کر اس کی طرف بڑھا تھا لیکن درحقیقت وہ اس کی نظر میں جچی بھی تھی اور آنکھوں کی راہ سے دل میں اتر گئی تھی مگر وہ اسے ناقابل حصول سمجھ کر اپنی دانست میں بھلا چکا تھا۔

وہ ہال کا ساؤنڈ پروف دروازہ کھول کر باہر آ گئے اندر کی فضا سانسوں کی حرارت' تمباکو اور مشروبات کی بو اور انواع و اقسام کے کلونز وغیرہ کی خوشبو سے بوجھل ہو چکی تھی۔

باہر تازہ اور خنک ہوا میں انہیں اپنے وجود کچھ ہلکے پھلکے محسوس ہونے لگے۔ وہ عمارت سے نکل کر لان میں چلے گئے اور فوارے کے گرد بنی ہوئی مرمریں دیوار پر بیٹھ گئے جو اوس سے نم آلود تھی۔ دانستہ یا نادانستہ طور پر شاہد کا ہاتھ اب بھی' رخسانہ کے ہاتھ میں تھا۔

آدھے چاندی کی دھندلی سی چاندنی میں وہ شاہد کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور اس کی مسکراہٹ نے جیسے چاندنی کا سارا دھندلا پن ختم کر دیا۔ اس کی مسکراہٹ صبح بہار کی طرح روشن تھی۔

"تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ مجھے اس وقت افسوس یا ناگواری کے بجائے ایک عجیب سی خوشی محسوس ہوئی تھی جب ڈیڈی نے غصے سے چلاتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ ہماری اسکیم کے جواب میں تم کس صفائی سے نیابت خان سے اسی ہزار روپے ٹھگ کر لے گئے۔ اپنے کمرے میں جا کر میں ہنستے ہنستے بے حال ہوگئی تھی اور اس کے بعد میں ہفتوں تک تمہارے بارے میں سوچتی رہی تھی"........ وہ اب دھیمی آواز میں بات کر رہی تھی۔ وہ اس کے کچھ اور قریب کھسک آئی۔ شاہد کو یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔

وہ تو رخسانہ کو دیکھتے ہی اس اندیشے سے سن ہوگیا تھا کہ اب وہ شور مچا کر لوگوں کو متوجہ کرے گی اور انہیں بتائے گی کہ یہ شخص اول درجے کا مکار اور جھوٹا ہی نہیں' دغا باز اور فراڈیا بھی تھا' اس کے ڈیڈی کا نام استعمال کر کے ان کے پارٹنر سے اسی ہزار روپے ٹھگ کر لے گیا تھا۔

لیکن رخسانہ تو اس کے اندیشوں کے برعکس اس پر مہربان نظر آ رہی تھی جبکہ پہلے اس کی ایک نظر عنایت کے لئے شاہد نے اتنے پاپڑ بیلے تھے۔ مصنوعی حادثہ کرایا تھا اور چھچھے دار گفتگو کے ذریعے اسے اور اس کے باپ کو متاثر کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ان باپ بیٹی نے اس کی چال کو سمجھتے ہوئے اسے ذلیل و خوار ہونے کے لئے پشاور دوڑا دیا تھا۔ لیکن اب........"

رخسانہ بات جاری رکھتے ہوئے بلا جھجک بولی........ "ظاہری طور پر بھی تم ہینڈسم اور اسمارٹ ہی ہو........ لیکن مجھے تمہاری اس اسمارٹ نس نے زیادہ متاثر کیا تھا کہ تم کسی بھی صورت حال میں ہاتھ پاؤں نہیں چھوڑتے۔ نروس نہیں ہوتے اور اپنا کام ہر حال میں دکھا جاتے ہو خواہ حالات موافق ہوں یا غیر موافق........ یہ سب ذہانت اور مستعدی کی دلیلیں ہیں۔ ایسی ذہانت اور مستعدی جو غلط راستے پر پڑ گئی ہے........ میں تمہیں سچی بات بتاؤں........ میں خوابوں کی دنیا میں کھوئی رہنے والی لڑکی نہیں........ لیکن اگر میں کبھی خواب دیکھتی تھی تو ایسے ہی تیز طرار' چالاک اور اسمارٹ نوجوان کے خواب دیکھتی تھی۔ ہم امیروں میں تم جیسے لڑکے کم ہی ہوتے ہیں۔ عموماً" بڑے ڈفر اور لکیر کے فقیر ہوتے

ہیں........ باپ نے بزنس کرا دیا........ بس اس کو چلا رہے ہیں۔ اس میں ان کا کوئی کمال نہیں ہوتا۔ انہیں ہر چیز بنی بنائی ملتی ہے۔ ان کا ذہن محدود سا ہوتا۔ انہیں ہر چیز بنی بنائی ملتی ہے۔ ان کا ذہن محدود سا ہوتا ہے اور معمولات لگے بندھے۔ ان میں سوچ بچار اور تخلیقی صلاحیت کی بڑی کمی ہوتی ہے۔ اپنے طور پر کوئی اچھوتی بات نہیں سوچتے........"

وہ گویا اپنے جوش و خروش کو دباتے ہوئے بول رہی تھی جس سے اس کی سانس پھول سی گئی تھی۔ شاہد اب نہایت صبر و سکون سے بیٹھا تھا اور توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی گھبراہٹ دور ہو گئی تاہم اس کی رگ و پے میں ہلکی سی سنسنی جاری تھی۔

رخسانہ نے سلسلہ کلام جوڑا........ "لیکن میں تمہیں مکمل طور پر فراڈ بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ میں ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ تمہاری گزر اوقات ہی نو سربازی اور جعل سازی پر ہو........" پھر وہ گہری سانس لے کر بولی........ "اور میں تمہیں سو فیصد نیک اور پارسا بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ سو فیصد پارسا انسان بھی آج کی دنیا داری میں نہیں چل سکتا۔ آج کی سوسائٹی کے سانچے میں فٹ نہیں ہوتا۔ جس طرح سو فیصد خالص سونے سے اچھا زیور نہیں بنتا........ اس میں برائے نام ملاوٹ کرنا پڑتی ہے........ اسی طرح میرے نظریے کے مطابق آدمی کو اچھا ہونا چاہئے لیکن اس میں تیزی طراری' چالاکی اور بدمعاشی کی تھوڑی سے ملاوٹ ہونی چاہئے تاکہ آج کی دنیا میں اس کا گزارہ ہو سکے........"

پھر ایک طویل سانس لے کر وہ بولی........ "بس........ یہی سب کچھ ذہن میں رکھتے ہوئے میں تمہارے بارے میں سوچتی رہی........ حتیٰ کہ میں نے ڈیڈی کو بھی قائل کر لیا کہ تم بڑے کام کے آدمی ثابت ہوسکتے ہو۔ انہوں نے بھی ناراضگی کو دل سے نکال دیا اور اس بات پر آمادہ ہوگئے کہ اگر آئندہ کبھی تم کہیں نظر آئے تو وہ تم سے ملاقات کریں گے' بات چیت کریں گے........ لیکن اس کے بعد تم کبھی انہیں یا مجھے نظر بھی نہیں آئے........ پھر رفتہ رفتہ تمہارا تصور ذہن کے کباڑ خانے میں جا گرا........"

"میں تمہیں نظر آجاتا تو تم کیا کرتیں؟" شاہد نے ملائمت سے پوچھا۔

"تمہیں اپنی مرضی کا آدمی بنانے کی کوشش کرتی........ یعنی کام کا آدمی........" رخسانہ نے جواب دیا۔

"ہر عورت جس مرد کو تھوڑا بہت پسند کرتی ہے یا جس سے اس کی شادی ہو جاتی ہے اسے وہ مکمل طور پر اپنی ہی مرضی کا آدمی بنانے کی کوشش کیوں کرتی رہتی ہے؟" شاہد نے بڑی سادگی سے پوچھا۔

"چالاک انسان........!" رخسانہ اس سے ذرا پرے کھسک کر بیٹھتے ہوئے بولی........ "میں تم سے تمہاری ذات کا کوئی جزو نہیں چھینوں گی۔ تمہیں کچھ دینے ہی

کی کوشش کروں گی۔ میں تمہیں توڑنا پھوڑنا نہیں' تعمیر کرنا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اس سوسائٹی میں سب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکو۔ آئندہ تمہیں کوئی اور رخسانہ نظر نہ آئے جسے دیکھ کر تمہارا رنگ فق ہو جائے"۔

"کیا تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہوگئی ہے؟" شاہد نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"اب تم یہ بات اور کس طرح مجھ سے کہلوانا چاہتے ہو؟" رخسانہ ذرا خفگی سے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولی.......... "اب ہم مڈل کلاس ٹین ایجرز تو نہیں ہیں کہ پہلے چھپ چھپ کر ایک دوسرے کو رقعے لکھیں.......... دردناک اشعار جمع کریں.......... اور رقعوں پر پانی کے چھینٹے مار کر لکھیں کہ یہ میرے آنسو ہیں.......... پھر کبھی تم تنہائی پاکر مجھ سے اقرار محبت چاہو گے اور میں اثبات میں سر ہلا کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر کوٹھڑی میں بھاگ جاؤں گی۔ ہم دونوں اب نہ تو اس عمر میں ہیں اور نہ اس کلاس میں.........."

"وہ تو ٹھیک ہے.........." شاہد نے گویا فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا.......... "لیکن کیا تمہارے ڈیڈی تمہاری شادی مجھ سے کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے؟"

"ہاں.......... بشرطیکہ میں ان سے کہوں.........." رخسانہ کھسک کر دوبارہ اس کے قریب آتے ہوئے مسکرائی.......... "آخر میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں اور اب تو ان کا آدھے سے زیادہ بزنس میں بھی چلا رہی ہوں.......... لیکن میں ان سے تبھی تمہارے بارے میں کچھ کہوں گی جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ تم اپنی لائن بدل چکے ہو اور مجھ سے مخلص ہو.......... کیونکہ اپنا سب کچھ کسی کو سونپ دینا بڑا نازک کام ہے۔ بہت سوچ کر کرنا پڑتا ہے.........."

"بے شک.........." شاہد نے تسلیم کیا اور ایک لمحے کے توقف سے بولا۔ "بہرحال.......... اگر تمہاری مرضی یوں ہے تو یوں ہی سہی.......... سمجھ لو کہ ہم نے اپنا آپ تمہارے نام لکھ دیا.......... تم بھی کیا یاد کرو گی.........."

"بہت بہت شکریہ شہنشاہ عالم! کنیز کورنش بجا لاتی ہے"۔ رخسانہ جھک کر آداب کرتے ہوئے بولی۔

پھر دونوں ہی نے ہم آہنگ ہو کر قہقہہ لگایا۔ رخسانہ نے اپنی تمام تر سنجیدگی اور متانت کو بالائے طاق رکھ کر کہا.......... "ہاؤ سویٹ یو آر..........!"

پھر جب اس کے جذبات اعتدال پر آئے تو وہ بولی.......... "لگن سچی ہو تو من پسند جیون ساتھی ضرور مل جاتا ہے۔ خواہ ذرا تاخیر سے ہی ملے۔ اگر تم مزید کچھ عرصہ مجھے نہ ملتے تو شاید میری شادی اس ہونق سے ہو جاتی جسے تم نے اندر میرے ساتھ

تھا.........."

دفعتاً" اس نے ایک مترنم سا قہقہہ لگایا اور بولی.......... "ارے ہاں.......... ے درمیان عہد و پیمان تو ہوگئے لیکن مجھے تمہارا اصل نام ابھی تک معلوم نہیں ویسے یاد ہے تم نے پہلی ملاقات پر اپنا نام شاہد بتایا تھا.........."

"میرا نام سچ مچ شاہد ہی ہے.........." شاہد مسکرایا۔

"بڑے دیدہ دلیر ہو.........." وہ اس کی ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے .... "وارداتوں میں بھی اصل نام استعمال کرتے پھرتے تھے"۔

"دراصل میں نے کبھی کوئی ایسا خاص قابل گرفت کام نہیں کیا جسے صحیح معنوں میں ات کہا جاسکے یا ثابت کیا جاسکے.......... اس لئے میں کبھی زیادہ متفکر نہیں .... آؤ اب اندر چلیں"۔ شاہد متانت سے بولا۔

وہ واپس ہال میں آ گئے جہاں مشروبات کے بعد موسیقی کی بدلی ہوئی دھن پر اب رہ رقص کا آغاز ہوچکا تھا۔ زرینہ مرچنٹ رقص نہیں کر رہی تھی۔ وہ ایک گوشے میں ڑی شاید شاہد کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے شاہد کو رخسانہ کے ساتھ دیکھا اور غالباً دونوں کے چہروں پر ایک خاص تعلق خاطر کا عکس بھی دیکھ لیا۔

وہ ایک لمحے کے لئے حیران ضرور ہوئی کہ اتنی سی دیر میں بساط کیونکر پلٹ .... لیکن اس ایک لمحے کی حیرانی کے سوا اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں .... وہ از خود تو شاہد کے قریب نہ آئی اور نہ ہی اس نے جاننے کی کوشش کی کہ کہاں گیا تھا اور رخسانہ سے اس کا تعارف کیونکر ہوا تھا۔

شاہد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے رسمی سے انداز میں مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ نہ نے اس پر تکلف اشارے کا بھی کوئی جواب نہیں دیا اور منہ پھیر کر جینز جیکٹ والے نوعمر لڑکے کی طرف بڑھ گئی جو اکیلا ہی موسیقی کی دھن پر تھرک رہا تھا اور اپنے لمبے بھورے بالوں کو یوں بار بار جھٹک رہا تھا جیسے وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہو۔

شاہد' رخسانہ کے ساتھ رقص کرنے لگا۔ زندگی آج اسے جتنی حسین لگ رہی تھی پہلے کبھی نہیں لگی تھی۔ رخسانہ ایک ایسی لڑکی تھی جس کے اس نے خواب تو بار بار ے تھے لیکن یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایسی لڑکی اس کا مقدر بھی ہو سکتی تھی۔

زرینہ سے پیچھا چھڑانے کی اسے کوئی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ وہ اس رات سے خود ایک لفظ کہے بغیر اس کا پیچھا چھوڑ گئی تھی۔ اس کے بعد پانچ دنوں کے دوران اس نے ف جگہوں پر شاہد اور رخسانہ کو ساتھ ساتھ دیکھا لیکن اتنی انا اس میں ضرور تھی کہ اگر نے اس سے ناتا توڑ لیا تھا تو وہ بھی اسے بالکل خاطر میں نہیں لائی۔ اس نے اپنے مسترد پانچ سابق عاشقوں میں سے ایک پر نئے سرے سے نگاہ التفات مرکوز کر دی تھی اور وہ

کچے دھاگے سے بندھا چلا آیا تھا۔

☆ ============ ☆ ============ ☆

آپریشن' کی رات شاہد بے حد چاق و چوبند تھا۔ اس نے چیتے کی سی پھرتی اور خاموشی سے بنگلے کی دیوار پھاندی اور چند لمحوں کے لئے سفیدے کے درخت کے عقب میں دبک گیا۔ حسب توقع کسی طرف سے کتے کے بھونکنے یا غرانے کی آواز سنائی نہیں دی...... تاہم آگے بڑھنے سے پہلے اس نے ایک بار پھر سوچا کہ اسے آپریشن واقعی مکمل کرنا چاہیے یا لوٹ جانا چاہیے؟

اس سوال پر گزشتہ چار دنوں میں وہ بارہا غور کرچکا تھا۔ رخسانہ سے ملاقات کے بعد اس کی زندگی میں جو انقلاب آیا تھا اور مستقبل اس کے لئے اپنے دامن میں جو کچھ سمیٹے رہا تھا اس کے بعد اسے اس آپریشن کی ضرورت تو نہیں رہی تھی اور اس نے رخسانہ کے سامنے حلفیہ سے انداز میں کہہ دیا تھا کہ اس نے اپنی لائن بدل لی ہے' اب وہ کوئی معیوب حرکت نہیں کرے گا' کسی جرم میں ملوث نہیں ہوگا لیکن دل بے ایمان تھا کہ سمجھانے میں ہی نہیں آتا تھا۔ بار بار بہکاتا تھا۔ اس کی اپنی بیسیوں دلیلیں تھیں۔ دلیلیں تو شیطان کے پاس بھی کافی ہوتی ہیں۔

شاہد سوچتا تھا کہ وہ واردات پکے ہوئے پھل والا معاملہ تھی اور اس پھل کو پکانے میں اس نے بڑی محنت کی تھی۔ اب تو صرف درخت کو ہلانے کی دیر تھی اور پھل جھولی میں آگرتے...... منزل عین سامنے تھی۔ ویسے بھی یہ منصوبہ اس نے رخسانہ سے ملاقات سے بہت پہلے بنا رکھا تھا۔ اس لئے یہ آئندہ والی قسم کے خانے میں نہیں آتا تھا جو اس نے رخسانہ کے سامنے کھائی تھی۔ یہ بڑا ہاتھ مارنے کے بعد واقعی اس کا کسی معمولی سی ہیرا پھیری کا بھی ارادہ نہیں رہا تھا۔ بس یہ آخری سطر رقم کرکے وہ اپنی زندگی کا یہ باب بند کر دینا چاہتا تھا۔

اس کا ذہن ایک اور وجہ کی بناء پر بھی بے ایمان دل کی ہمنوائی کرتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اس کا رہن سہن بے شک تھوڑا بہت امیرانہ تھا لیکن اس کے پلے حقیقت میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہیرا پھیری کی آمدنی میں برکت نہیں تھی...... رخسانہ کے سامنے اس کی حیثیت ایک تہی دست اور کنگال انسان کی تھی۔

اس میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ شادی کے بعد رخسانہ کی وجہ سے اس کی حیثیت تہی دست اور کنگال انسان کی نہ ہوتی۔ وہ اتنی محبت کرنے والی اور اعلیٰ ظرف لڑکی تھی کہ اپنے مقابلے میں شاید کبھی شاہد کو اس کی حیثیت کا احساس نہ دلاتی لیکن شاہد محض اپنی تسلی اور اپنی انا کی تسکین کے لئے اپنے پاؤں زیادہ سے زیادہ مضبوط رکھنا چاہتا تھا تاکہ کبھی بھی ضرورت پڑنے پر وہ ثابت کرسکے کہ شادی کے وقت اس کی اپنی حیثیت بھی کچھ ایسی معمولی

نہیں تھی۔

شاہد یہ بھی سوچ رہا تھا کہ ہیروں کی چوری کا معاملہ ٹھنڈا پڑ جانے کے بعد وہ انہی ہیروں کا کوئی سیٹ بنوا کر اپنی بیوی کو بھی پیش کرسکتا تھا...... اتنا بیش قیمت تحفہ نہ صرف ان کی محبت کے بندھن کو مضبوط تر کر دیتا بلکہ یہ احساس بھی ہمیشہ کے لئے اس کے ذہن میں جاگزیں ہو جاتا کہ اس نے کسی کم حیثیت شخص سے شادی نہیں کی تھی۔

یہی سب کچھ ذہن میں دہراتے ہوئے اس نے برآمدے کی طرف دیکھا۔ برآمدے میں ایک مرکزی بلب روشن ہو تو شاہد سمجھ لے کہ راستہ صاف ہے اور وہ بے خوف و خطر چلا آئے...... لیکن اگر بلب روشن نہ ہو تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ کوئی گڑ بڑ ہوگئی ہے یا کسی وجہ سے تیاریاں مکمل نہیں ہوسکیں اس لئے وہ باؤنڈری وال سے جھانک کر ہی واپس چلا جائے۔

بلب روشن تھا...... اس کی قسمت کے ستارے کی طرح! دبے قدموں اس نے ملگجے اندھیرے میں لان عبور کیا اور عقبی برآمدے میں پہنچا۔ عقبی دروازہ غیر مقفل تھا۔ محمد حنیف نے کہا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہوا وہ اس دروازے کو مقفل نہیں ہونے دے گا۔ شاہد نے ناب اس طرح گھمائی کہ ذرا بھی آواز پیدا نہ ہو۔ اسی خاموشی سے وہ چھوٹا سا دروازہ کھول کر اندر پہنچ گیا۔ دروازہ اس نے فوراً ہی بند کر دیا۔

اس کی آنکھیں ملگجے اندھیرے سے مانوس ہو چکی تھیں۔ وہ نہایت آسانی سے راہداری عبور کرکے حسب ہدایت بائیں طرف مڑا اور ان سیڑھیوں تک جا پہنچا جن کے اختتام پر عین سامنے ہی سیٹھ جواد کی خواب گاہ تھی۔

خواب گاہ کے دروازے پر پہنچ کر اس نے چند لمحے توقف کیا اور کان لگا کر سننے کی کوشش کی لیکن اندر سے اسے خفیف سی آواز بھی سنائی نہ دی۔ اب اس کے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہو چکی تھی اور ہتھیلیوں سے پسینہ پھوٹنے لگا تھا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو دلاسا دیا اور خاکی ڈانگری کی جیب سے ڈپلیکیٹ چابی نکال کر تالے کے سوراخ میں داخل کی۔ چابی گھمانے میں اس نے پورے پانچ منٹ صرف کئے۔

خواب گاہ میں داخلے کا مرحلہ بھی بخیر و خوبی مکمل ہوگیا۔ خواب گاہ کے ایک گوشے میں تپائی پر نائٹ لیمپ روشن تھا اور مدھم روشنی میں سیٹھ جواد کمبل لپیٹے دنیا مافیہا سے بے خبر پڑا سوتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے سرہانے سے تجوری کی چابی نکالنا بے حد کڑا مرحلہ ثابت ہوا۔ اس عمل کے دوران شاہد کے اعصاب وائلن کے تاروں کی طرح تنے رہے۔ یہی وہ مرحلہ تھا جس کے بارے میں ڈرائیور محمد حنیف نے اعتراف کیا تھا کہ اگر وہ اپنے اندر اس مرحلے کو سر کرنے کی ہمت محسوس کرتا تو کب کا خود ہی ہیروں پر ہاتھ صاف کرچکا ہوتا۔

چابی نکال لینے کے بعد بھی دیر تک شاہد دیوار سے ٹیک لگائے اپنے اعصاب کو

معمول پر لانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے تجوری کھولنے کا مرحلہ شروع کیا۔ اس مرحلے کے دوران اسے اندازہ ہوا کہ تجوری بے شک ڈائل والی اور جدید ساخت کی نہیں تھی لیکن اسے چابی کے ذریعے کھولنا بھی کاردارد تھا۔

دراصل وہ چابی کے ذریعے بھی ایک ٹرک سے ہی کھلتی تھی اور وہ ٹرک محض اتفاقاً ہی شاہد سے سرزد ہوگئی تھی کیونکہ وہ مسلسل آدھے گھنٹے تک چابی کو مختلف طریقوں اور مختلف زاویوں سے گھماتا رہا تھا۔ چابی دراصل ایک بار عام طریقے سے پھر ذرا زور لگا کر مزید اندر داخل کی جاتی تھی۔ اس کے بعد اسے ایک مرتبہ الٹی طرف گھما کر تھوڑا سا واپس کھینچ کر سیدھی طرف گھمایا جاتا تھا تب کہیں جا کر تجوری کھلتی تھی۔ خاصا پیچیدہ طریقہ تھا۔

وہ تو غنیمت تھا کہ الارم کی تار محمد حنیف حسب وعدہ کاٹ چکا تھا ورنہ کون اتنی دیر تک قسمت آزمائی کرسکتا تھا۔ شاہد کو ایک خیال یہ بھی آیا کہ شاید ڈرائیور محمد حنیف اس مرحلے تک بھی قسمت آزمائی کرچکا ہو لیکن اس سے تجوری نہ کھل سکی ہو۔

ٹرک معلوم ہونے اور دروازہ کھول لینے کے بعد بھی شاہد نے اندر ہاتھ مارنے میں عجلت سے کام نہیں لیا۔ ساری جدوجہد کے دوران اس کے اعصاب اتھل پتھل ہو چکے تھے اور سردی کے باوجود ڈانگری پسینے میں بھیگ چکی تھی۔ قدرے پرسکون ہونے کے بعد اس نے چھوٹی سی تجوری کے اندر ہاتھ مارا اور اسے فوراً ہی مخملی ڈبے کا لمس محسوس ہوگیا۔

ڈبا نکال کر وہ اسے کھول کر دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ ڈبا کھولتے ہی ہیروں کی جھلملاہٹ سے گویا کمرہ منور سا ہوگیا اور وفور مسرت سے شاہد کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ ہیرے واقعی پورے نو تھے اور ان کا حجم، خوبصورتی، تراش اور چمک دمک ان کے بے حد قیمتی ہونے کا پتہ دے رہی تھی۔ اس کی محنت بار آور ہو چکی تھی۔

وہ اب اپنے آپ کو خاصا غیر جذباتی آدمی سمجھتا تھا لیکن اس وقت نہ جانے کیوں خوشی سے اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور ڈبا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔

قالین پر ڈبے کے گرنے سے تو کوئی خاص آواز پیدا نہیں ہوئی تھی لیکن یک لخت جب وہ اضطراری طور پر اسے اٹھانے کے لئے جھکا تو اس کی کہنی تجوری کے کھلے دروازے سے ٹکرائی اور دروازہ خاصے زور دار کھٹکے سے بند ہوگیا۔

وہ کھٹکا گہری نیند سوئے ہوئے انسان کو بھی بیدار کرنے کے لئے کافی تھا۔ یہ احساس شاہد کو ڈبا اٹھانے کے بعد ہوا۔ اس نے ہڑبڑا کر بیڈ کی طرف دیکھا۔ سیٹھ جواد اسی طرح لیٹا تھا۔ کسمسایا تک نہیں تھا۔

شاہد کو اس کا انداز غیر حقیقی سا محسوس ہوا۔ پہلی بار اس کی چھٹی حس نے جھرجھری سی لی۔ وہ دبے قدموں بیڈ کے عین قریب جا پہنچا۔ اس نے ہمہ تن گوش ہو کر سننے کی کوشش کی مگر اسے سیٹھ جواد کی سانسوں کی آواز سنائی نہ دی۔ تب اس نے احتیاط کو بالائے

اتی رکھتے ہوئے سیٹھ جواد پر جھک کر اس کا چہرہ بغور دیکھا۔ چہرہ زندگی سے محروم تھا۔ یت وحشت کے سے عالم میں اس نے سیٹھ جواد کے جسم سے کمبل ہٹایا اور فوراً ہی ے اس خنجر کا دستہ نظر آگیا جس کا پورا پھل سیٹھ جواد کے پہلو میں پیوست تھا۔

ایک لمحے کے لئے تو اسے یہ سب کچھ ڈراؤنا خواب محسوس ہوا...... محمد یف...... وہ مخنی شرمیلا اور اناڑی سا نوجوان اتنی ہنرمندی سے جال نہیں بن سکتا ا

دفعتاً اس کی چھٹی حس نے اس کے جسم میں ہیجان سا برپا کر دیا۔ اس کی حالت اس بنے کی سی ہوگئی جسے اندھیرے میں بیسیوں شکاریوں نے گھیر لیا ہو۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے ا مگر یہ تیزی اس کے کسی کام نہ آئی۔ کوئی ٹھوس چیز اس کے سر سے ٹکرائی اور فوراً ہی ں کا ذہن یوں اندھیرے میں ڈوب گیا جیسے کسی بلب کا سوئچ آف کر دیا گیا ہو۔

آنکھ کھلی تو سب سے پہلا احساس اسے سر میں تکلیف کا ہوا۔ اس نے سر کو چھونے ے لئے ہاتھ ہلانا چاہا تو احساس ہوا کہ ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ اس نے نقاہت آمیز انداز میں ھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی۔ کمرے میں اسے گاڑھا اور سفید دھواں سا ابھرا نظر آ رہا تھا۔ ں دھوئیں میں کچھ انسانی پرچھائیاں اٹھتی بیٹھتی اور ادھر ادھر آتی جاتی نظر آ رہی تھیں۔ پھر ں نے قریب ہی کہیں سے ایک آواز سنی۔ اس آواز کو وہ پہچانتا تھا۔ یہ اس کے ساتھی، ے شریک جرم، محمد حنیف کی آواز تھی۔

"......ہاں جی...... میں گاڑی گیرج میں کھڑی کرکے بیڈ روم کے نیچے کھڑی رکے اپنے کوارٹر کی طرف جا رہا تھا......" وہ غمزدہ سے لہجے میں کہہ رہا تھا......" ہ میں نے اوپر کھٹکے کی سی آواز سنی۔ میں نے احتیاطاً پچھلے دروازے کو دیکھا۔ مجھے اس کا ا ٹوٹا ہوا ملا۔ میں دوڑا دوڑا اوپر آیا۔ بیڈ روم کا تالا بھی ٹوٹا ہوا تھا اور دروازہ تھوڑا سا کھلا ...... میں نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو صاحب کہنی کے بل بیڈ سے ذرا اٹھ کر ا شخص کو دیکھ رہے تھے...... یہ شخص ہیروں کا ڈبا ہاتھ میں لئے جانے کے لئے مڑ ا رہا تھا...... صاحب نے شاید چیخنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا مگر اس بدبخت نے انہیں لت نہ دی اور میرے سامنے ہی خنجر ان کی پسلیوں میں گھونپ دیا......"

اس نے بڑے دردناک انداز میں سسکی سی لی اور گویا بڑی دقت سے بات جاری کھتے ہوئے بولا...... "خنجر پسلیوں میں اتر جانے کے باوجود صاحب نے اس چور پر پٹنے کی کوشش کی مگر وہ بس بیڈ سے لٹک کر رہ گئے...... میں حواس باختہ سا ہوگیا تھا ر پھر مجھے دروازے کے قریب ہی پیتل کے اسٹینڈ والی یہ بھاری سی ایش ٹرے کھڑی نظر آ ئی اور میں نے یہ اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری۔ یہ بے ہوش ہوگیا تو میں نے چوکیدار کو واز دی۔ چوکیدار نے آ کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے پھر اسی نے آپ لوگوں کو فون

کیا..........“

”کسی نے سیٹھ صاحب کی لاش کو چھوا تو نہیں؟“ ایک تحکمانہ سی آواز نے پوچھا۔

”نہیں صاحب! ہمارے اندر تو اتنی ہمت ہی نہیں تھی“۔ محمد حنیف نے جواب دیا۔

”ہیروں کو بھی کسی نے نہیں چھیڑا؟“ تحکمانہ آواز دوبارہ ابھری۔

”نہیں جناب..........! جب میں نے چور کو ایش ٹرے ماری تو یہ اسی طرح بکھرے تھے..........“

”یہ تعداد میں نو ہی تھے؟“ ذرا توقف کے بعد تحکمانہ آواز نے پوچھا۔

”میرے خیال میں نو ہی ہوں گے جناب! ہمارے صاحب اکثر مذاق میں کہا کرتے تھے کہ ان کے پاس نو ایسے ہیرے ہیں جن سے وہ ڈیفنس میں نو بنگلے خرید سکتے ہیں.......... وہ تو ان کے سلسلے میں بینک کے لاکروں وغیروں تک پر بھروسا نہیں کرتے تھے.......... رات کو ایک بار انہیں دیکھے بغیر صاحب کو نیند نہیں آتی تھی..........“ محمد حنیف نے ایک بار پھر سسکیاں لینی شروع کر دیں۔

شاہد اپنی جگہ پڑے پڑے حیرت سے سوچ رہا تھا.......... ”اگر محمد حنیف نے ہیروں پر بھی ہاتھ صاف نہیں کیا تو اس نے مجھے جال میں پھنسایا کس لئے ہے؟ مجھ سے اس کی کیا دشمنی تھی؟“

پھر اس احساس سے اس پر بے ہوشی طاری ہونے لگی کہ کس طرح عین کنارے پر پہنچ کر اس نے خود اپنی نیا ڈبو لی تھی۔ خوش قسمتی جب رخسانہ کے روپ میں دونوں بازو پھیلائے اس کی طرف بڑھی چلی آرہی تھی تو اس نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی شہ رگ کاٹ لی تھی۔ اگر وہ ہیروں کے چکر میں نہ پڑتا.......... چوری جیسے مکروہ جرم کا ارادہ ترک کر دیتا تب بھی کیا رخسانہ سے شادی کے بعد اس کی زندگی میں کوئی کمی رہ جاتی؟

اب اسے یہ سوال اہم نہیں لگ رہا تھا کہ وہ بچ جائے گا یا اس ناکردہ جرم میں تختہ دار تک پہنچ جائے گا۔ اس کے دل میں تو اس سوال سے ہول رہا تھا کہ وہ رخسانہ کو کیا صورت دکھائے گا؟ رخسانہ اس کی صورت دیکھنے حوالات یا جیل میں آئے گی بھی یا نہیں؟

☆ =========== ☆ =========== ☆

ہائی کورٹ نے بھی شاہد کی سزائے موت برقرار رکھی.......... محمد حنیف نے ان تمام چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھا تھا جن کی بناء پر شاہد کو شک کا فائدہ دے کر بری کئے جانے کا امکان پیدا ہو سکتا تھا۔ شاہد کو اگر زندگی میں صحیح معنوں میں حیرت کا دورہ پڑا تھا تو حنیف کو گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے دیکھ کر پڑا تھا۔ کس خوبصورتی، کس صفائی اور معصومیت سے اس نے جھوٹ بول کر شاہد کو تختہ دار پر پہنچانے کا سامان کیا تھا۔

شاہد بہت چیخا چلایا۔ اس نے اپنے وکیل کی معرفت پوری اصل کہانی بار بار دہرائی

اسے محض وکیل کی داستان طرازی سمجھا گیا۔ ہائی کورٹ بھی اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئی کہ ہیروں کی چوری کا منصوبہ ان دونوں نے مل کر بنایا تھا اور بعد میں حنیف نے اسے جال میں پھنسایا تھا کیونکہ جال میں پھنسانے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا تھا۔ ہیرے جوں کے توں موجود تھے۔ کوئی اور چیز بھی چوری نہیں ہوئی تھی.......... یہ بات بھی جرح کے دوران شاہد خود ہی تسلیم کر چکا تھا کہ حنیف سے اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اپنے مالک سے بھی اس کی کیا دشمنی ہو سکتی تھی جو وہ اسے قتل کر کے' الزام شاہد پر دھرنے کی کوشش کرتا؟

تاہم شاہد کے وکیل نے سپریم کورٹ میں اپیل کی تیاری شروع کر دی تھی اور شاہد کو یقین دلایا تھا کہ اپیل سماعت کے لئے منظور ہو جائے گی لیکن سپریم کورٹ کا فیصلہ کیا ہو گا اس سلسلے میں وہ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ صادق مرزا نامی وہ وکیل شہر کے نامور اور قابل ترین وکیلوں میں سے تھا لیکن کسی کسی مقدمے کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے کہ بڑے سے بڑا قابل اور ذہین ترین وکیل بھی بے گناہی ثابت کرنے میں ناکام رہا جاتا ہے۔

قانون تو اندھا ہوتا ہے۔ جذباتی تقریریں نہیں' شہادتیں مانگتا ہے اور شہادتیں سب کی سب شاہد کے خلاف تھیں جو چھوٹی موٹی شہادتیں شاہد کے حق میں جا سکتی تھیں ان کا بھی حنیف نے ایسا پکا بندوبست کر دیا تھا کہ وہ اس کے حق میں نہیں جا سکتی تھیں۔

شروع شروع میں شاہد کو بڑا حوصلہ رہا کہ اسے بہت بڑے وکیل کی خدمات حاصل ہیں مگر اب اس کا دل بجھ چکا تھا۔ یہ بھی رخسانہ ہی کی نوازش تھی کہ اسے صادق مرزا جیسا وکیل میسر تھا ورنہ اس کا تو دنیا میں کوئی ایسا شناسا بھی نہیں تھا جو اسے جیل میں سگریٹ کا پیکٹ بھی دے جاتا۔

جیل پہنچ کر اسے سب سے تکلیف دہ احساس یہ ہوا تھا کہ اس نے زندگی میں ہر چیز حاصل کرنے کے لئے تگ و دو کی تھی لیکن کسی کو دوست بنانے' کسی کا خلوص حاصل کرنے کی کبھی سعی نہیں کی تھی۔

ایک رخسانہ کا دم غنیمت تھا جو خود بخود ہی اس پر مہربان تھی۔ شاہد کی توقعات کے بالکل ہی برخلاف وہ ہائیکورٹ کے فیصلے تک جیل میں اس سے ملنے آتی رہی تھی اور جو کچھ بھی اس کے بس میں تھا' کرتی رہی تھی اس نے کبھی شاہد کو شرمندہ نہیں کیا تھا کہ بے شک اس نے سیٹھ جواد کو قتل نہ کیا ہو' لیکن وہ چوری کرنے تو اس کے گھر میں گھسا تھا۔

البتہ آخری ملاقات پر اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اتنا ضرور کہا تھا۔ ”تم نے سب کچھ بہت غلط وقت پر کیا شاہد! بہت ہی غلط وقت پر.......... ایسے وقت میں جب منزل دو چار گام ہی رہ گئی تھی۔ ویسے بھی آخر تمہیں ہیرے چرانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ تمہارے پاس کس چیز کی کمی تھی' عمدہ اپارٹمنٹ.......... عمدہ گاڑی..........

بینک میں تھوڑا بہت روپیہ.......... اس کے علاوہ تمہارے اونچے خواب میں تمہاری زندگی میں آنے کے بعد پورے کرنے کی کوشش کرتی۔ پھر آخر تم نے یہ قدم کیوں اٹھایا؟"

یہ سوال شاہد خود بھی اپنے آپ سے بارہا کرچکا تھا مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ سوائے اس کے کہ تقدیر جب انسان کو ڈبونا چاہتی ہے تو اس کو ایسے ہی کسی کام میں دھکیل دیتی ہے جو اس کے لئے بھنور ثابت ہوتا ہے۔ شاید یہی قدرت کا انسان کو بعض ایسے گناہوں کی سزا دینے کا طریقہ ہوتا ہے جو ماضی میں اس سے سرزد ہوچکے ہوتے ہیں۔

رخسانہ سے اس کی وہ الوداعی ملاقات تھی۔ رخسانہ نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ شاہد کے ذہن پر نقش تھا۔

"شاہد میرے بس میں جو کچھ بھی تھا وہ میں نے کیا لیکن جب قسمت انسان کے خلاف ہو تو ہر جگہ الٹا ہی ہاتھ پڑتا ہے۔ میں نے جس پولیس آفیسر کو ایف آئی آر تبدیل کرنے کے لئے بھاری رشوت کی پیشکش بھجوائی وہ حد سے زیادہ ایماندار اور رشوت کا سخت مخالف نکلا۔ وہ الٹا مجھ سے اتنا ناراض ہوا کہ اس نے کسی اور وسیلے سے بھی میرا کام بننے کی راہ روک دی۔ جس جج پر میں نے اثر رسوخ کا دباؤ ڈالنے کے لئے انتظام کیا اس نے اس معاملے کو انا کا مسئلہ بنا لیا اور میرے سفارشی کو کھڑے پیروں ریٹائرنگ روم سے نکال دیا۔ میں نے اپنی دانست میں تمہیں بہترین وکیل فراہم کیا ہے مگر حالات کے سامنے وہ بھی بے بس ہوگیا ہے۔ میں نے یہ سب کچھ اپنی عزت و ناموس اور خاندانی ساکھ کو داؤ پر لگا کر کیا ہے شاہد!"

وہ گویا اپنی کسی آہ یا سسکی کا گلا گھونٹنے کے لئے ایک لمحے کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ "میں جو کچھ بھی کر رہی تھی ڈیڈی کی ناراضگی مول لیتے ہوئے کر رہی تھی۔ وہ کئی بار مجھے تم سے اور تمہارے معاملات سے لاتعلق رہنے کا حکم دے چکے ہیں۔ وہ رسوائی سے ڈرتے ہیں ان کا خوف بجا ہے۔ اخبار والوں کو یہ بات معلوم ہے کہ میں تمہارے لئے بھاگ دوڑ کرتی رہی ہوں اور جیل میں بھی تم سے ملنے آتی رہی ہوں۔ ان کے لئے یہ بہت بڑا اسکینڈل ہے۔ لیکن وہ کھل کر کچھ لکھنے سے اس لئے باز رہے ہیں کہ ان کے اخباروں کو ڈیڈی کے گروپ آف کمپنیز کے کافی اشتہارات ملتے ہیں"۔

پھر وہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔ "لیکن مجھے معلوم ہے یہ پردہ داری زیادہ دیر نہیں چلے گی۔ جلد ہی کوئی اخبار کوئی شوشا چھوڑ دے گا اور پھر ایک پینڈورا بکس کھل جائے گا۔ مجھ میں اس صورت حال کا سامنا کرنے کی جرات نہیں۔ میں جتنا آگے جاچکی ہوں اتنا ہی کافی ہے.........."

اس نے گویا الوداعی سے انداز میں ایک نظر شاہد کے چہرے کی طرف دیکھا لیکن فوراً ہی سر جھکالیا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بہت ہی دھیمے لہجے میں بولی۔ "میں اب

تمہیں حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ کر واپس اپنی دنیا میں جا رہی ہوں۔ اگر تمہاری اپیل سماعت کے لئے منظور ہوگئی تو شاید تمہیں پنڈی جیل میں منتقل کر دیا جائے۔ ظاہر ہے وہاں تو میں ویسے بھی تم سے ملنے نہیں آسکوں گی۔ اگر قسمت تم پر مہربان ہو جائے اور تمہیں کچھ عرصے بعد ان آہنی سلاخوں اور بلند و بالا دیواروں سے نجات مل جائے تو ایک بار مجھ سے ملنے ضرور آنا۔ شاید میں اس وقت بھی تمہیں منتظر ملوں۔ شاید میں کسی طرح ڈیڈی کو آمادہ کرسکوں کہ وہ تمہیں تمہارے ماتھے پر لگی ہوئی رسوائی کی کالک کے باوجود قبول کرلیں۔ اگر میں تمہارے لئے کچھ کرپائی ہوں تو اس کے لئے مجھے اپنے دل میں اچھے الفاظ میں یاد کرلینا اور اگر میں تمہارے خیال میں تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکی تو مجھے معاف کر دینا شاہد!"

اس کی آنکھوں سے نمی رخساروں پر جھلک آئی تھی اور آواز رندھ گئی تھی۔ اس نے عینک اتار کر ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی جسم اور چہرے کا بیشتر حصہ چادر میں چھپا رکھا تھا۔ اسی چادر کے پلو سے وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے یک لخت مڑی اور ملاقات کے کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی جیسے زندگی سے محبت بھی شاہد کے دل سے چلی گئی۔

یکدم ہی شاہد کا وجود کھوکھلا سا ہوگیا اور سینے میں دل مشت غبار کی طرح بکھر گیا۔ اپنی نظر میں تو وہ گر ہی چکا تھا شاید دوسروں کی نظر میں بھی اس کا وجود ریت کے گھروندے سے زیادہ بے وقعت ہو کر رہ گیا تھا۔ یکایک ہی ساری چیزوں' ساری باتوں سے اس کی دلچسپی ختم ہوگئی۔ اس شام اس نے وکیل صادق مرزا کو بھی منع کیا کہ وہ سپریم کورٹ میں اپیل دائر کرنا نہیں چاہتا۔ مگر صادق مرزا مصر رہا۔ ہر مؤکل کو کسی نہ کسی طرح امید کی سیر کرانا شاید اس کے پیشہ وارانہ زعم کی ضرورت تھی۔

اب صورت یہ تھی کہ شاہد کی گویا کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ اس نے داڑھی ایک بار پھر بڑھالی تھی اور اس کا بیشتر وقت جائے نماز پر گزرتا تھا۔ گفت و شنید اس نے تقریباً" ترک کر دی تھی۔ جائے نماز پر وہ اکثر مراقبے کے سے عالم میں بیٹھا رہتا۔ اس کی حرکات و سکنات میں بلا کا سکون' ٹھہراؤ اور طمانیت سی آگئی تھی۔

کبھی کبھی وہ جیل کے محافظوں سے باتیں کرتے ہوئے اتنا ضرور کہتا۔ "قتل تو میں نے نہیں کیا.......... لیکن شاید میں نے زندگی میں کوئی اور ایسا سنگین جرم کیا ہو جس کی سزا قدرت مجھے دینا چاہتی ہو.......... شاید میں نے کسی مظلوم کا دل دکھایا ہو.......... شاید میں نے کسی غریب کی دنیا اندھیر کی ہو.........." پھر وہ یوں سوچ میں ڈوب جاتا گویا اپنی زندگی میں ایسا کوئی لمحہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس نے کئی بار وکیل صادق مرزا سے کہا کہ وہ کسی نہ کسی طرح ڈرائیور محمد حنیف کو اس سے ملاقات کے لئے بھیجے۔ اسے پیغام دے کہ شاہد اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس سے چند منٹ بات کرنا چاہتا تھا۔ صادق مرزا نے اسے بتایا تھا کہ محمد حنیف اس سے ملنے پر

آمادہ نہیں تھا تاہم وہ اسے آمادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔

ایک روز محافظ نے اطلاع دی۔ ”صوفی صاحب! آپ کی ملاقات آئی ہے“۔

جب وہ اس حصے میں پہنچا جہاں قیدی اپنے ملاقاتیوں سے ملتے تھے تو اس نے سلاخوں کے پار محمد حنیف کو کھڑے پایا۔ وہ کچھ مضمحل سا نظر آ رہا تھا مگر اب شاہد کو وہ اتنا سادہ لوح اور مسکین دکھائی نہیں دے رہا تھا جتنا ماضی میں نظر آتا تھا۔

”کیا بات ہے.......... تم کیوں مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟“ محمد حنیف نے اکھڑے اکھڑے لہجے میں پوچھا۔ ”اگر تمہارا خیال ہے کہ کسی طریقے سے تمہاری پھانسی ٹل جائے گی تو یہ خیال دل سے نکال رکھو“۔

”تمہیں شاید یقین نہ آئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے اب اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی کہ مجھے پھانسی لگتی ہے.......... سزائے موت‘ عمر قید میں تبدیل ہوتی ہے یا رہائی ملتی ہے..........“ شاہد نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں ہمیشہ معرکے پہ معرکے مارتا رہا لیکن مطمئن نہیں ہوسکا۔ ہمیشہ ناآسودہ ہی رہا۔ اب میں تختہ دار کی طرف سفر کر رہا ہوں لیکن نہ جانے کیوں مجھے قرار سا آ گیا ہے۔ میں نے یہ خیال ہی دل سے نکال دیا ہے کہ دنیا سے کبھی میرا کوئی ناتا تھا مجھے اگر کبھی کوئی خلش بے چین کرتی ہے تو وہ صرف ایک سوال کی خلش ہے۔ تمہارا مقصد تو پورا ہو ہی چکا ہے۔ خدارا اب صرف میری یہ خلش دور کر دو۔ میں اپنے دل میں اس سوال کی خلش لے کر مرنا نہیں چاہتا۔ آخر تم نے مجھے کیوں قربانی کا بکرا بنایا؟ مجھ سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟“

محمد حنیف نے محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔ شاہد کو آج پہلی بار احساس ہوا کہ اس کی آنکھیں لومڑی جیسی تھیں وہ جگہ جہاں قیدی اپنے ملاقاتیوں سے ملتے تھے‘ ایک طویل برآمدے سے مشابہ تھی جس کے سامنے آہنی سلاخوں کی دیوار تھی اور دونوں سروں پر دروازے تھے جن پر گارڈز کھڑے رہتے تھے۔ محمد حنیف غالباً“ یہ دیکھ کر مطمئن ہوگیا کہ دوسرے قیدی ان سے کافی فاصلے پر تھے اور اپنے اپنے ملاقاتیوں سے گفتگو میں مگن تھے۔ وہ اپنوں سے ملنے کے لئے اتنے ترسے ہوئے تھے کہ دوسروں کی گفتگو پر دھیان دینے کا انہیں ہوش ہی نہیں ہوتا تھا۔

”تم سے تو میری کوئی دشمنی نہیں تھی“۔ محمد حنیف پہلی مرتبہ کسی قدر فاتحانہ انداز میں مسکرایا۔ ”البتہ سیٹھ جواد سے ضرور تھی۔ بات بڑی مختصر سی ہے اور اب میں تمہیں بتا دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا لیکن اگر تم نے سپریم کورٹ میں میرے اس بیان کا سہارا لینا چاہا تو میں اس سے صاف مکر جاؤں گا اور اسے تمہارا اور تمہارے وکیل کا چھوڑا ہوا نیا شوشا سمجھا جائے گا۔ ویسے بھی بیان تو وہی ہوتا ہے جو عدالت میں دیا جائے کہیں اور کھڑے ہو کر تو ہم جو باتیں چاہیں کرتے رہیں‘ اس سے کیا فرق پڑتا ہے“۔

اس نے مضطربانہ سے انداز میں ہونٹوں پر زبان پھیری ایک نظر اپنے جوتوں کی طرف دیکھا اور قدرے توقف سے بولا۔ ”میری بیوی بہت خوبصورت ہے شاہد! بہت کم عمری میں اس کی مجھ سے شادی ہوگئی تھی۔ اس وقت وہ مشکل سے سولہ سترہ سال کی تھی.......... اور آج.......... شادی کے چار برس بعد جبکہ وہ ایک بچے کی ماں بھی ہے.......... وہ ویسی کی ویسی ہے۔ شوخ‘ چنچل‘ حسین اور تازہ دم۔ وہ ذرا بھی نہیں بدلی۔ وہ تھوڑی بہت پڑھی لکھی بھی ہے۔ میری جب اس سے شادی ہوئی تو میں بے انتہا خوش تھا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے اتنی پیاری بیوی مل جائے گی“۔

اس نے ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر انگلیاں چٹخائیں پھر بولا۔ ”لیکن اس کی خوبصورتی میرے لئے عذاب بن گئی۔ غریب کی جھونپڑی میں لعل کون رہنے دیتا ہے؟ اسے دیکھتے ہی اس ادھیڑ عمر موٹے سیٹھ جواد کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے تحفے تحائف‘ روپے پیسے اور دیگر نوازشات کا زہر اسے دینا شروع کر دیا۔ اپنی دولت کی چمک سے اس الہڑ‘ شوخ اور کمسن لڑکی کی آنکھیں چکا چوند کر دیں۔ چپکے چپکے وہ اس کے جال میں پھنستی چلی گئی۔ مہینوں تو مجھے پتا ہی نہ چلا.......... میں اس کے عشق میں اتنا اندھا تھا یا میرا اعتماد اتنا معصوم تھا کہ مجھے اپنی بیوی پر کبھی شک نہ ہوا۔ میں اس کے پاس اتفاق سے کوئی چیز دیکھ لیتا جو مجھے اپنی حیثیت سے بڑی نظر آتی تو اس کی موجودگی کا وہ جو بھی جواز پیش کرتی‘ میں آنکھیں بند کرکے اس پر یقین کرلیتا۔ وہ راتوں کو اٹھ کر بھی دبے قدموں کوارٹر سے نکل کر سیٹھ کی خواب گاہ میں چلی جاتی لیکن میں بے خبر تھا۔ اصل میں ہر چیز کے ٹیڑھے پن پر انسان کی نظر اس وقت جاتی ہے جب اس کے دل میں شک کا بیج پھوٹ پڑے۔ میرے دل میں شک کا بیج بہت دیر سے پھوٹا..........“

اس نے جھرجھری سی لی اور شاہد سے نظر چراتے ہوئے مزید مدہم لہجے میں بولا۔ ”تم اندازہ نہیں کرسکتے کہ اس وقت میری کیا کیفیت ہوئی جب مجھے اصلی معاملے کا علم ہوا۔ میرے پاس اپنے کرب کو بیان کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں..........“

شاہد کو اس کے کرب کا اندازہ کرنے کے لئے الفاظ کی ضرورت نہیں تھی وہ دم بخود کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اسے اس کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

حنیف نے بات جاری رکھی۔ ”میں نے اپنی بیوی کا شکنجہ تو کس لیا۔ اسے گھر کی چار دیواری میں تقریباً“ قید کر دیا.......... لیکن سیٹھ کو یا اپنی بیوی کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں اصلی بات سے آگاہ ہوچکا ہوں۔ بلکہ میں نے صرف یہ تاثر دیا کہ مجھے اندیشہ ہے میری کم عمر اور نادان بیوی بھٹک نہ جائے۔ لیکن میرے اندر ہی اندر سیٹھ سے نفرت کا جو الاؤ روشن ہوچکا تھا اسے وقت بھی نہ بجھا سکا۔ اسے دیکھ کر اندر ہی اندر میری حالت عجیب ہو جاتی تھی۔ دل چاہتا تھا خنجر لے کر اس پر پل پڑوں اور اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے

کر دوں۔ گاڑی میں اسے لے کر کہیں جاتا تو دل چاہتا تھا کہ گاڑی نوے کی رفتار سے چلاتے ہوئے کسی درخت یا عمارت سے ٹکرا دوں۔ خود بھی مر جاؤں اور اسے بھی مار دوں۔ لیکن............"

اس نے تھکی تھکی سی نظروں سے شاہد کی طرف دیکھا اور ایک طویل سانس لے کر بولا۔ "لیکن میں بہت بزدل تھا۔ مجھے جان بہت پیاری تھی۔ میں سیٹھ کو مارنا چاہتا تھا اور خود بھی محفوظ رہنا چاہتا تھا۔ مجھے اپنی بیوی بھی بہت پیاری تھی۔ میں نے اسے اس کی بے وفائی کی بھی کوئی سزا نہیں دی تھی۔ صرف اس کی نقل و حرکت پر پابندی عائد کی تھی' اسے گھر میں قید کیا تھا............"

وہ ترحم آمیز سے انداز میں شاہد کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے مسکرایا۔ "پھر مجھے تم مل گئے............ ہیروں کی چوری کا منصوبہ لئے............ جوں جوں تمہارا منصوبہ میرے سامنے پھیلتا گیا' میرے ذہن میں اپنا ہی ایک منصوبہ جڑ پکڑنے لگا۔ آخر کار میں نے جوا کھیلنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ لیکن مجھے خود بھی امید نہیں تھی کہ میں اس حد تک کامیاب رہوں گا۔ بس یہ تھی ساری بات"۔

شاہد بدستور دم بخود کھڑا تھا۔ حنیف ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولا۔ "میں تمہیں سزا دلوانے کے معاملے میں جو اتنا ثابت قدم رہا ہوں اس میں درحقیقت سیٹھ جواد کے رشتے داروں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ وہ چونکہ آنکھیں بند کرکے یقین کر چکے تھے کہ قاتل تم ہی ہو اس لئے وہ میری پیٹھ پر تھپکی دیتے رہتے ہیں کہ میں تھانے کچہری میں بالکل نہ گھبراؤں اور جو کچھ بیان کرنا چاہتا ہوں بے خوف و خطر بیان کرکے رہوں۔ انہوں نے ہی مجھے پولیس کی زیادہ سخت تفتیش اور جرح بازی سے بچایا ہے۔ دراصل انہیں بڑی جلدی ہے کہ کیس نمٹے اور وہ سیٹھ جواد کی دولت و جائیداد کا بٹوارہ کریں"۔

پھر محمد حنیف ذرا سیدھا کھڑا ہو کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔ "کہو............ اب دور ہوگئی تمہارے دل کی خلش؟"

"ہاں! اب میں سکون سے مر سکوں گا"۔ شاہد نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنی کوٹھڑی کی طرف واپس چل دیا۔

سپریم کورٹ میں اس کی اپیل کی ابتدائی سماعت شروع ہوگئی۔ شاہد نے بہت کہا کہ وہ اپیل دائر کرنا نہیں چاہتا مگر اس کا وکیل صادق مرزا نہیں مانا۔ شاہد کے سامنے گویا ایک بار پھر گزرے لمحوں کی ہر بات دہرانے کا عمل شروع ہوگیا تھا۔

وہی بار بار دہرائی گئی باتوں کی تکرار............ وہی ججوں کے بے تاثر چہرے............ وہی مڑے تڑے کاغذات کے پلندے............ وہی پرانی فائلوں کی الٹ پلٹ۔

وہ شاہد کی زندگی اور موت کا معاملہ تھا مگر وہ اتنی بے دلی سے یہ سب کچھ دیکھتا تھا کہ ایک بار تو اس کے وکیل کو شبہ ہوا کہ شاید وہ کارروائی کے دوران اونگھنے لگا تھا۔ اس کی لاتعلقی کا یہ عالم تھا کہ تمام کارروائی اسے کسی ڈرامے کا حصہ محسوس ہوتی تھی جسے وہ نیم خوابی کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔

اس نے صادق مرزا کو وہ سب کچھ بھی نہیں بتایا تھا جو اسے محمد حنیف سے معلوم ہوا تھا۔ اسے یقین ہوچکا تھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ایک ایسے ملزم کو محض زبانی کلامی دعوؤں سے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ جس کی صفائی میں کوئی شہادت موجود نہیں تھی۔ اس کا ماضی جس حد تک اسے یاد تھا' وہ ابھی کچھ ایسا شریفانہ یا قابل فخر نہیں تھا کہ وہ اس کے حوالے دے سکتا یا اس میں سے اپنے دفاع کی کوئی دلیل تلاش کر سکتا۔

وہ اب پنڈی جیل میں تھا اور روز و شب حسب معمول صوفیانہ انداز میں گزر رہے تھے لیکن استغاثے کے گواہوں کے بیانات کی نوبت آنے سے پہلے ایک روز صادق مرزا غیر متوقع طور پر جیل میں اس کے پاس پہنچا۔ جوش کے مارے اس کا گندمی چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اپنا بریف کیس کبھی فرش پر رکھتا تھا' کبھی اٹھاتا تھا' کبھی عینک اتارتا تھا' کبھی لگاتا تھا۔

گارڈ کے ذرا دور چلے جانے کے بعد وہ پرجوش لہجے میں بولا۔ "میں تمہارے لئے بہت بڑی خوشخبری لایا ہوں۔ صبح ہی صبح پہلی فلائٹ پکڑ کر میں ساری پیشیاں چھوڑ کر یہاں دوڑا آیا ہوں۔ سنو............ غور سے سنو............ ایسی خوابیدہ سی آنکھوں سے میری طرف مت دیکھو............ اچھلو............ کودو............ ناچو گاؤ۔ محمد حنیف نے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا ہے اور سیٹھ جواد کے قتل کا اعتراف کر لیا ہے۔ میرا خیال ہے اپیل آج ہی کالعدم ہو جائے گی۔ کل پرسوں تک تم پولیس کی معیت میں میرے ساتھ کراچی واپس چلو گے اور ایک آدھ ہفتے میں تمہارے بری ہونے کی کارروائی مکمل ہو جائے گی............ تم آزاد ہو جاؤ گے............ کیسی خبر ہے؟"

صادق مرزا انتہائی سنجیدہ و مدبر شخص ہونے کے باوجود اس وقت کھل کر ہنس رہا تھا اور یوں داد طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے محمد حنیف کا اقرار جرم کرلینا اس کی "وکیلانہ" صلاحیتوں کی وجہ سے ہی ممکن ہوا تھا۔

شاہد محض مسکرا دیا............ اس مخصوص مربیانہ اور قلندرانہ سے انداز میں بڑی سے بڑی بات پر مسکرا دینا اس کی عادت بن چکی تھی۔ اس نے کسی غیر معمولی خوشی یا جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں کیا۔

☆ ============ ☆ ============ ☆

صادق مرزا کی تمام تر کوششوں کے باوجود شاہد کو رہا ہونے میں کئی ماہ لگ گئے۔ قتل کے مقدمے سے تو وہ بری ہو گیا لیکن اس کے بعد چوری کی نیت سے سیٹھ جواد کے گھر میں

داخل ہونے کے مقدمے میں اس کی سزا شروع ہوگئی۔ لیکن اس سزا کے دوران اسے کم از کم یہ علم تو تھا کہ فلاں تاریخ کو وہ جیل کی بلند دیواروں اور سلاخوں کے حصار سے نکل کر باہر کی دنیا میں پہنچ جائے گا۔

ایک بار پھر دنیاداری کی لگن اور محبت اس کے دل میں دھیرے دھیرے بیدار ہونے لگی جیسے ناامیدی کی راکھ میں دبی ہوئی کوئی چنگاری ہوا پا کر تاؤ پکڑنے لگی ہو۔

آخر کار وہ دن بھی آ ہی گیا جب اس نے جیل کے بلند و بالا گیٹ کے چھوٹے سے شکمی دروازے سے باہر قدم رکھا اور آزادی کی فضا میں سانس لی۔ ایک خاکی لفافہ اس کی بغل میں دبا ہوا تھا جس میں وہ چیزیں موجود تھیں جو اس کی ملکیت تھیں اور جیل والوں نے انتہائی شرافت اور شائستگی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے واپس کی تھیں۔

چند لمحے تک وہ گیٹ کے قریب ہی کھڑا گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔ سامنے سڑک پر اجلی اجلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور کھمبوں کے درمیان تنے ہوئے بجلی کے تاروں پر پرندے بیٹھے چہچہا رہے تھے۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک پرندے کی دم دوسری تار سے چھو گئی۔ اس طرح گویا تاریں شارٹ ہوگئیں اور پرندہ چر مرسا ہو کر نیچے آگرا۔ باقی پرندوں نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی اور بدستور چہچہاتے رہے۔

شاہد کو جھرجھری سی آگئی۔ موت اور زندگی کے درمیان بس اتنا ہی فاصلہ تھا۔ ایک ذرا سی غلط حرکت.......... اور زندگی کے کرنٹ کی جگہ موت کا شارٹ کٹ.......... پھر اسے خیال آیا کہ وہ پھانسی پا جاتا تب بھی دنیا کی گردش میں بھلا کیا فرق پڑ جاتا؟ کاروبار حیات یونہی جاری رہتا۔ کامیابیوں کے جشن جاری رہتے.......... دنیاداری کے ہنگامے ذرا بھی مدہم نہ پڑتے۔ کسی کو شاید پتہ بھی نہ چلتا کہ کب سورج کی پہلی کرن نمودار ہونے سے پہلے ہی جیل کی اونچی چار دیواری میں کسی کا چراغ حیات گل ہوگیا۔ بہت ہوتا تو اخبار کے کسی کونے کھدرے میں ایک سنگل کالمی خبر آجاتی۔ "ڈکیتی اور قتل کے مجرم کو پھانسی دے دی گئی"۔

لیکن اب وہ نکھری نکھری دھوپ، کھلی فضا اور ہنگاموں سے پر دنیا میں کھڑا تھا۔ یہ دیکھ کر ایک بار پھر محرومی اور تنہائی کا احساس اسے ڈسنے لگا کہ کوئی اسے لینے نہیں آیا تھا۔

"زندگی میں ایسا تنہا بھی کوئی نہ ہو کہ جنازہ اٹھے تو اشک بہانے والا کوئی نہ ہو اور حیات نو ملے تو محبت سے ہاتھ تھامنے والا کوئی نہ ہو"۔ اس نے سوچا اور دھیرے دھیرے کسی سواری کی تلاش میں قدم اٹھانے لگا۔

ٹیکسی کے پہیے حرکت میں آئے تو جیسے اس کی رگوں میں لہو کی گردش بھی تیز ہوگئی۔ مایوسی، شکستگی اور درماندگی کا غبار چھٹنے لگا۔ ذہن کے اندھیرے گوشوں میں سوئی ہوئی خواہشیں انگڑائیاں لینے لگیں۔ زندگی سے محبت بیدار ہونے لگی۔ دنیا ذرا بھی تو نہیں بدلی

تھی۔ صرف اس سے ناتا کچھ عرصے کے لئے ٹوٹ گیا تھا۔ اب ناتا بحال ہوا تھا تو جیل کے روز و شب خواب محسوس ہونے لگے تھے۔

اپنے اپارٹمنٹ ہاؤس کے سامنے ٹیکسی سے اتر کر وہ نیچے ہی واقع سپر مارکیٹ میں چلا گیا۔ چند لمحے بعد وہ ہیئر ڈریسنگ سیلون کی ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھا باربر کو ہدایات دے رہا تھا کہ وہ اس کی داڑھی صاف کر دے اور بالوں کی تراش خراش درست کر دے۔

داڑھی صاف ہونے، بال درست ہونے اور اسپرے سے منہ دھل جانے کے بعد شاہد نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں کچھ ابھر آئی تھیں۔ دھوپ روشنی اور ہوا سے زیادہ تر دور رہنے کی وجہ سے اس کی رنگت میں کچھ زردی آگئی تھی۔

ہلکے سروں میں سیٹی بجاتا وہ اوپر اپنے اپارٹمنٹ تک پہنچا۔ اس کی معمر پارسی پڑوسن مسز کوپر اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی وہ تیزی سے اندر گئیں اور ایک چابی ہاتھ میں لئے فوراً واپس آگئیں۔

چابی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ گھمبیر سنجدگی کے ساتھ انگریزی میں بولیں۔ "یہ آپ کا نوکر دے گیا تھا۔ گھر میں پیسے ختم ہوگئے تھے۔ کافی انتظار کرنے کے بعد وہ کہیں چلا گیا"۔

شاہد نے اس کا شکریہ ادا کیا اور چابی لیتے ہوئے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ بڑھیا کا چہرہ سپاٹ تھا۔

"کیا اسے علم نہیں کہ میں جیل میں تھا.......... یا ایک اچھے پڑوسی کی طرح وضع داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے شرمندہ نہ کرنے کی غرض سے انجان بنی ہوئی ہے؟" شاہد نے حیرت سے سوچا.......... مگر وہ کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔

اپارٹمنٹ کا تالا کھولتے وقت اسے اس بات پر بھی حیرت ہو رہی تھی کہ مقدمے کے چکر میں پھنس کر اسے قطعی یاد نہیں رہا تھا کہ اس کا ایک گھر بھی ہے اور اس گھر میں ایک نوکر بھی ہے۔ اس نے کبھی نوکر سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ ہی نوکر اسے تلاش کرتا ہوا پہنچا تھا۔ شاہد کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے نوکر کو حالات کا علم بھی تھا یا نہیں؟

اپارٹمنٹ میں داخل ہو کر اس نے چاروں طرف کا جائزہ لے کر ایک خوشگوار سی حیرت محسوس کی۔ نوکر نے کوئی چیز غائب نہیں کی تھی سب کچھ امانت کی طرح محفوظ چھوڑ گیا تھا۔

"گویا دنیا اتنی بری بھی نہیں.........." شاہد سوچتے ہوئے مسکرا دیا.......... ابھی یہاں اچھے لوگ خاصی معقول تعداد میں موجود ہیں.........."

کھڑکیاں دروازے اچھی طرح بند تھے اس کے باوجود چیزوں پر گرد کی ہلکی سی تہہ
ہوئی تھی۔ فی الحال صفائی کی اس میں ہمت نہیں تھی تاہم صرف اپنے آپ کو صاف کر
کے لئے وہ باتھ روم میں گھس گیا۔ لائٹ آن کرنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ بتی کٹ چ
تھی۔ بیرونی دروازے کے نیچے وہ مختلف بلوں اور نوٹسوں کا چھوٹا سا پلندہ تو دیکھ ہی چکا تھا
اس نے بھی اسے نہیں چھیڑا تھا۔

"سب چیزوں کو معمول پر لاتے ایک آدھ ہفتہ تو لگ ہی جائے گا.........." اس
نے سوچا اور ملگجے اندھیرے میں ہی میں شاور لینے لگا ساتھ ہی وہ گنگنا رہا تھا..........
زندگی.......... کیسی ہے پہیلی ہائے.........." مگر اس نے محسوس کیا کہ باتھ روم میں بھ
اس کی آواز خاصی بے سری لگ رہی تھی۔

شام کو وہ تیار ہو کر' ایک عمدہ سوٹ پہن کر' کلون لگا کر اپنے اپارٹمنٹ سے نکلا او
پارکنگ لاٹ میں آیا۔ ایک لڑکے کو کچھ پیسے دے کر وہ گاڑی کی جھاڑ پونچھ تو کروا چکا تھا مگ
کھڑے کھڑے بیٹری ڈاؤن ہو جانے کی وجہ سے وہ ذرا دقت سے اسٹارٹ ہوئی۔

گاڑی میں بیٹھ کر وہ رخسانہ کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کا ٹیلی فون بھی کٹ
چکا تھا ورنہ وہ پہلے اسے فون کر لیتا اور پوچھ لیتا کہ اگر فضا مناسب ہو تو وہ اس سے ملنے گھ
ہی آجائے ورنہ وہ رخسانہ کو کہیں باہر ہی بلا لیتا۔ ایک جگہ پبلک ٹیلی فون کا بورڈ پڑھ کر اس
نے گاڑی روک لی۔

رخسانہ کا نمبر ڈائل کرنے کے بعد اسے خاصی دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ آخر کسی نے
ریسیور اٹھایا اور ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی جو شاہد کے لئے اجنبی تھی۔

"مس رخسانہ ہیں؟" شاہد نے پوچھا۔

"آپ کون بول رہے ہیں؟" بھاری آوز نے پوچھا۔

شاہد گڑبڑا گیا اس سے پہلے اسے چند ایک مرتبہ رخسانہ کو فون کرنے کی ضرورت پیش
آئی تھی لیکن کبھی کسی نے نہیں پوچھا تھا کہ وہ کون تھا۔

"مم.......... میں.......... جی.......... وہ میں رخسانہ کا دوست ہوں"۔

"الو کا.........." بھاری آواز یک لخت بے حد بلند ہوگئی اور ساتھ ہی کھٹ سے
ریسیور رکھ دیا گیا۔ شاہد نے ریسیور رکھنے سے پہلے خجالت سے دوکاندار کی طرف دیکھا کہ
کہیں وہ آواز اس نے بھی تو نہیں سن لی تھی۔ مگر وہ کسی اور طرف متوجہ تھا۔

اس کے بعد شاہد دیر تک بے مقصد ادھر ادھر گاڑی گھماتا رہا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا
تھا کہ اسے رخسانہ کے گھر جانا چاہیے یا نہیں! بالآخر اس نے سوچا کہ محض اس کے گھر کے
سامنے چکر لگا لینے میں تو کوئی حرج نہیں..........

رخسانہ کے بنگلے پر دور ہی سے رنگین قمقمے اور بڑی بڑی آرائشی بتیاں دیکھ کر اس کا
ما تھنکا.......... لیکن جب وہ کھلے گیٹ کے سامنے سے گزرا تو اسے بنگلہ بالکل سنسان نظر
یا۔ لان کی روش پر صرف ایک شخص گن لئے ٹہل رہا تھا وہ چوکیدار معلوم ہوتا تھا۔ شاہد
ڑی سے اتر کر اس کے پاس پہنچا۔

"سب لوگ کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"کشمیر روڈ والے لان پر گئے ہیں.......... جدھر شادی بیاہ وغیرہ ہوتا ہے.........."
وکیدار نے جواب دیا۔

"کیوں؟" شاہد نے سرسراتی سی آواز میں پوچھا۔ چوکیدار نے یوں اس کی طرف دیکھا
یا کہنا چاہتا ہو کہ کیا اب بھی اس سوال کی ضرورت تھی؟

"رخسانہ بی بی کی شادی ہے نا صاب!" چوکیدار نے گویا طوعاً و کرہاً جواب دیا۔ پھر
برآمدے کے قریب اپنی پرانی سی کرسی پر جا بیٹھا۔

شاہد جب وہاں سے روانہ ہوا تو اسٹیرنگ وہیل پر اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور
ے بار بار کوٹ کی آستین سے آنکھیں رگڑنا پڑ رہی تھیں کیونکہ رکے رکے سے آنسوؤں
ے اس کے سامنے کا منظر دھندلا جاتا تھا۔ اس کے بعد اس کی گاڑی نہ جانے کتنی دیر تک
ن کن گلیوں میں سست رفتاری سے بھٹکتی رہی وہ کسی روبوٹ کی طرح ڈرائیو کر رہا تھا۔

اس کے دل میں ہولناک سناٹا پھیلا ہوا تھا اور رگوں میں خون جیسے سرد ہوگیا تھا۔ وہ
ھل کر رونا چاہتا تھا مگر اس سے رویا بھی نہیں جا رہا تھا۔ وہ رخسانہ کے چہرے کو یادوں کے
ق سے نوچ کر پھینک دینا چاہتا تھا لیکن یہ بھی اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

دفعتاً اسے احساس ہوا کہ وہ جس گلی سے گزر رہا تھا وہ اس کے لئے مانوس سی تھی
ں نے سر جھٹک کر گویا دھیان بٹانے کے لئے ادھر ادھر دیکھا تو اسے ایک جانا پہچانا گیٹ
ظر آیا۔ وہ زرینہ مرچنٹ کے بنگلے کا گیٹ تھا جس کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ اس کے سامنے
ے گزرتے وقت شاہد کو طویل و عریض لان پر ایک جگہ دودھیا روشنی کے سائبان تلے
زرینہ کی جھلک نظر آئی۔ وہ شیشے کی ایک تپائی کے قریب لان چیئر پر بیٹھی تھی۔

شاہد پہلے تو آگے نکلتا چلا گیا پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے گاڑی ریورس کی اور
گیٹ کے سامنے روک کر' اتر کر ڈرائیو وے پر چلا گیا۔ وہاں سے وہ رات کی رانی کے
پودوں کو پھلانگ کر لان میں زرینہ کی طرف بڑھنے لگا۔

زرینہ نے گردن ترچھی کرکے دور ہی سے اسے دیکھ لیا تھا۔ مگر کسی ردعمل کا اظہار
نہیں کیا تھا۔ اس کے سامنے شیشے کی تپائی پر کئی رنگ برنگی شیشیاں رکھی تھیں اور وہ مرکزی
بلب کی روشنی میں اپنے ناخنوں پر نیل پالش لگا رہی تھی وہ بدستور اپنے کام میں منہمک

رہی۔

شاہد دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈالے اس کے سامنے جا کھڑا ہوا تو اس نے سر اٹھایا اور کٹے ہوئے بالوں کی لٹیں ایک ادائے خاص سے پیشانی سے ہٹائیں۔ شاہد نے پہلی بار اسے میک اپ کے بغیر دیکھا تھا اس کی رنگت خاصی سانولی' آنکھیں دھنسی ہوئی اور رخساروں کی جلد بدنما لیکن اس سے بھی زیادہ بدنما وہ سرد مہری اور اجنبیت تھی جو اس کی آنکھوں میں موجود تھی۔

"کیا بات ہے؟ کس سے ملنا ہے؟" اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"زرینہ.........." شاہد کی آواز حلق میں پھنسنے لگی.......... وہ مزید کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی ہونٹ جیسے پتھرا گئے تھے۔

"میں یہ بالکل پسند نہیں کرتی کہ اجنبی یوں بے تکلفی سے مجھے مخاطب کریں یا اس طرح لان پر قلانچیں بھرتے میرے قریب چلے آئیں"۔ زرینہ پہلے سے زیادہ سخت اور بے مہر لہجے میں بولی.......... "مناسب اور مہذبانہ طریقہ یہ ہے کہ آدمی بیل دے.......... نوکر کے ہاتھ پیغام اندر بھجوائے اور اگر اسے ملاقات کی اجازت ملے تب اندر آئے"۔

"اپنے پاس ہی رکھو اپنے آداب اور تہذیب.........." شاہد نے سنبھل کر ایسے لہجے میں کہا جس میں غصہ بھی تھا اور اس کی مجروح انا کی کراہیں بھی.......... غصے میں اس نے ایک لان چیئر کو ٹھوکر بھی ماری۔ کرسی الٹ کر دور جا گری۔

زرینہ نیل پالش کی شیشی اور برش پٹخ کر مٹھیاں بھینچتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ غصے سے کانپ رہی تھی.......... "شرفو.......... بلو.......... عبدل.........." اس نے نوکروں کو آوازیں دینی شروع کر دیں مگر کسی نوکر کے نمودار ہونے سے پہلے ہی شاہد مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا گیٹ کی طرف چل دیا۔ اک ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے جا چکے تھے۔ ایک ذرا سی غلطی نے سب کچھ بدل دیا تھا۔

☆ ============ ☆ ============ ☆

اس کے اپارٹمنٹ کی بتی' ٹیلی فون' گیس' سب کچھ بحال ہو چکا تھا مگر زندگی سے اس کا رابطہ تمام تر کوشش کے باوجود بحال نہیں ہوا تھا.......... اس کے من میں بدستور اندھیرا تھا۔ اس کی سوچوں کی راہ گزر بدستور سونی تھی۔ گزرے قافلوں کے نقش قدم بھی اب تو مٹ چکے تھے.......... اس کے لہو میں جو یخ بستگی در آئی تھی وہ گیس کی حرارت سے تو کم نہیں ہو سکتی تھی۔

اس کا دل بجھ گیا تھا.......... زندگی اس کے لئے محض سوالیہ نشان بن کر رہ گئی

ں.......... وہ اکثر سوچتا کہ اس سے تو اچھا تھا وہ جیل میں ہی رہتا.......... مجاز کو نہ ں' حقیقت کو تو پالیتا.......... نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم.......... آسمان اور زمین کے میان لٹکنے کی یہ ذلت تو نہ اٹھانی پڑتی۔

اسے نیا نوکر مل گیا تھا.......... تب سے تو اس نے اپارٹمنٹ سے قدم ہی نہیں نکالا .... روزانہ وہ بالکونی میں کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا اور کھوئی کھوئی نظروں سے رواں ں ٹریفک کو دیکھتا رہتا.......... اس کا بیشتر وقت وہیں گزرتا..........

اس وقت بھی جبکہ شام کا دھندلکا پھیل چکا تھا اور مغرب کی طرف سے آنے والی تیز میں کافی خنکی آ چکی تھی' وہ وہیں بیٹھا تھا۔ سامنے ایک کونے پر ایک نو تعمیر شدہ دکان کے آمدے کا ماربل کے ٹائیلوں والا پالش شدہ فرش روشنی میں جھلملا رہا تھا۔

خوش پوش مردوں اور اجلی اجلی سی عورتوں کی اس دکان میں آمد و رفت جاری تھی۔ ڑک پر حسب معمول ٹریفک کا سیلاب تھا ٹریفک کا بہاؤ جیسے کبھی ٹوٹتا ہی نہیں تھا زندگی ت میں تھی صرف اس کی ذات ساکت ہو گئی تھی دنیا میں جیسے سبھی کو رفاقت میسر تھی۔ ف وہی تنہا رہ گیا تھا۔

دفعتاً" کال بیل کی مترنم ٹن ٹن نے اسے چونکا دیا۔ پچھلے دنوں میں کوئی بھی اس سے لے نہیں آیا تھا۔ چند لمحے بعد نوکر نے اطلاع دی۔ "صاحب! کوئی عورت آپ سے ملنا تی ہے.........."

وہ پراشتیاق انداز میں اٹھ کر ڈرائنگ روم کی طرف لپکا مگر نوکر نے عورت کو ئنگ روم میں نہیں بٹھایا تھا وہ بیرونی دروازے کی طرف لپکا.......... وہ عورت راہداری ں ہی کھڑی تھی.......... وہ نہ تو رخسانہ باٹلی والا تھی اور نہ ہی زرینہ مرچنٹ.......... شاید کوئی بھکارن تھی۔

مفلوک الحالی نے سر سے پاؤں تک اس کے وجود کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے کپڑے ' بال پریشان اور گرد میں اٹے ہوئے' ہونٹوں پر پپڑیاں اور آنکھوں میں ویرانی تھی۔ اس گود میں ایک بچہ تھا۔ اس کے کپڑے موسم کے لحاظ سے ناکافی اور میلے تھے۔ اس کی ناک رہی تھی اور رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں۔

مفلوک الحالی اور عسرت نے اپنے بے رحم پنجوں سے ماں اور بچہ' دونوں کے وجود کو ڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ ذرا آسائشوں کی ار پڑے تو یہ کملائے ہوئے پھول پھر سے نکھر آئیں گے۔

عورت کا چہرہ بتاتا تھا کہ زیادہ پرانی بات نہیں جب ان ہونٹوں کی لالی گلاب کی کھڑیوں کو شرماتی تھی۔ ان آنکھوں میں ستارے جھلملاتے تھے ان رخساروں پر شفق

پھولتی تھی۔ اس مانگ میں افشاں چمکتی تھی اور ان گھنیری زلفوں کی چھاؤں میں محبت ستاتی تھی۔

شاہد نوکر کو آواز دینے ہی لگا تھا کہ وہ اس عورت کا پانچ دس روپے دے کر رخصت کر دے مگر اسی لمحے عورت کے خشک ہونٹ کپکپائے اور وہ آنسوؤں سے بھیگی آواز میں بولی......... "میں بڑی مشکل سے آپ کا پتہ چلاتی اور ڈھونڈتی ڈھانڈتی یہاں تک پہنچی ہوں شاہد صاحب.........!"

شاہد کو حیرت ہوئی کہ وہ اسے اس کے نام سے مخاطب کر رہی تھی۔ عورت نے شاید اس کی آنکھوں میں ابھرتا ہوا سوال پڑھ لیا تھا۔ وہ دیوار کا سہارا لیتے ہوئے بولی......... "میں ڈرائیور محمد حنیف کی بیوی ہوں......... بیوی کیا......... بلکہ بیوہ ہی سمجھے......... آپ نے شاید اخبار میں پڑھا ہو کہ تین دن بعد اسے پھانسی دی جانے والی ہے........."

وہ گویا حلق میں پھنسی ہوئی کوئی چیز نگل کر اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی......... "میں ہی وہ عورت ہوں جس نے درحقیقت اسے پھانسی کے تختے تک پہنچایا ہے......... لیکن اگر میں ایسا نہ کرتی تو زندگی بھر دہری اذیت میں مبتلا رہتی......... اب اگر میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا بھی ہے تو صرف اپنے کردار کی کمزوریوں پر ہی کرتا ہے......... لیکن کم از کم یہ اطمینان تو ہے کہ اصل قاتل پھانسی کے تختے پر پہنچ رہا ہے......... خواہ وہ میرا شوہر ہی ہے........."

اس نے اپنی میلی چادر کے پلو سے آنکھیں پونچھیں اور لرزتی آواز میں بولی.........

"میں نے اس وقت اخبار میں آپ کی تصویر دیکھی تھی جب آپ کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی۔ تب سے میری راتوں کی نیند حرام ہوگئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ سیٹھ صاحب کا قاتل محمد حنیف تھا اور اس کے حصے کی سزا ایک بے گناہ کو مل رہی تھی لیکن میں کچھ کرنے سے معذور تھی۔ تھانے کچہریوں کا سامنا کرنے کی مجھ میں جرات نہیں تھی۔ ویسے بھی محمد حنیف نے مجھے تالے کنڈیوں میں بند کر رکھا تھا لیکن میں نے طعنے تشنوں سے اس کا جینا حرام کر دیا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے میں آپ کی تصویر اس کے سامنے کر دیتی اور کہتی......... دیکھ تو سہی کیسا خوبصورت جوان ہے۔ یہ بھی کسی ماں کا لال ہوگا......... کسی کا دلبر و دلدار ہوگا......... کسی کا چہیتا ہوگا......... کسی کی آرزوؤں کا مرکز ہوگا......... اور یہ محض تجھ جیسے مکار مگر بزدل کے جرم کی بھینٹ چڑھ جائے گا۔ ٹھیک ہے میں بھٹک گئی تھی......... لیکن اگر میرے بھٹکنے سے تیری غیرت پر ایسی ہی چوٹ پڑی تھی تو مجھے مار دیتا......... اور اگر سیٹھ ہی کو مارنا تھا تو سینہ تان کر اس کی سزا میں پھانسی چڑھ جاتا......... مگر تو لومڑی کا بچہ ہے......... مکار اور منحوس......... مجھے تیری صورت

ے نفرت ہے......... میں اس قسم کی باتوں سے دن رات اسے کچوکے لگاتی ہی......... مجھے اس بات کی بھی پروا نہیں رہی تھی کہ وہ طیش میں آکر مجھے بھی قتل کر سکتا تھا۔

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوئی پھر سسکی سی لے کر بولی......... "وہ یہ سب کچھ سنتا تھا......... دانت پیستا تھا اور غیظ و غضب سے میری طرف دیکھتا تھا مگر اس نے مجھے کوئی گزند پہنچانے کی کوشش نہیں کی اور آخر کار ایک روز اپنے آپ کو پولیس کے سامنے پیش کرکے اپنے جرم کا اقرار کرلیا......... اس سارے فساد کی جڑ میں ہوں شاہد صاحب........."

آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔ "نہ میں بھٹکتی......... نہ اتنا بڑا فساد کھڑا ہوتا......... لیکن میں بھی کیا کرتی شاہد صاحب! میری جب کھیلنے کودنے کی عمر تھی اس وقت ماں باپ مرگئے اور میں دور پار کے رشتے داروں کے در پر ٹھوکریں کھانے کے لئے رہ گئی۔ انہوں نے جتنی جلدی ہوسکا مجھے بوجھ کی طرح نہ صرف سر سے اتار پھینکا بلکہ کچھ رقم بھی کھری کرلی......... میں کمسن تھی......... کسی نہ کسی طرح تھوڑا سا لکھ پڑھ گئی تھی۔ شادی کے بارے میں میرے کچھ خواب تھے شاہد صاحب......... بڑے معصوم سے خواب.........! میں کسی بابو کی بیوی بننے کے خواب دیکھتی تھی کیونکہ بچپن ہی سے سکھیاں سہیلیاں اور استانیاں مجھے احساس دلاتی رہتی تھیں کہ میں بڑی حسین ہوں......... میرا بیاہ کسی بابو سے ہوگا........."

اس کا سر جھک گیا......... آنسوؤں میں کچھ روانی آگئی لیکن آواز گویا حلق میں اٹکنے لگی......... "مگر میں کسی بابو کے بجائے ایک کالے کلوٹے ڈرائیور سے بیاہ دی گئی جو تقریباً چوبیس گھنٹے یا تو صاحب کی خدمت میں حاضر رہتا تھا یا ان کے کسی کام سے گیا ہوتا تھا۔ گھر میں غربت و افلاس کے سائے تھے۔ تقریباً ساری تنخواہ وہ گاؤں اپنے ماں باپ کو بھیج دیتا تھا......... اور تنخواہ تھی بھی کتنی؟ صرف ایک ہزار روپے مہینہ......... میں سیٹھ کے ذرا ذرا سے تحفوں سے پسیج گئی......... نادان تھی......... بہک گئی......... مگر میں نے سزا بھی تو بہت بھگت لی ہے شاہد صاحب! مجھے بتایئے میں اب کہاں جاؤں؟"

اس نے سر اٹھا کر مجروح سی نظروں سے شاہد کی طرف دیکھا......... رہنے کو کوئی ٹھکانہ نہیں رہا......... اپنا پرایا کوئی مجھے اپناتا نہیں......... وقتی محبت کے لئے بہت سے ہاتھ بڑھاتے ہیں لیکن سر ڈھانپنے اور عزت کی زندگی دینے کے لئے کوئی ہاتھ میری طرف نہیں بڑھتا۔ بغیر ضمانت کے کوئی نوکری نہیں دیتا......... جن جن کو میری کہانی کا پتا چل جاتا ہے وہ تو قریب پھٹکنے بھی نہیں دیتے......... بچہ بھوک سے بلکتا ہے پیٹ میں تین

تین وقت کچھ نہیں جائے گا تو دودھ کہاں سے اترے گا؟ میرا آپ سے پوچھنے کا حق تو نہیں بنتا لیکن مجھے کم از کم اتنا ہی بتا دیجئے کہ میں کس سے اپنے مستقبل کے بارے میں سوال کروں.......... کیا کروں.......... کہاں جاؤں.......... خدارا مجھے کچھ تو بتا دیجئے.........."

وہ جیسے ہیجان کے سے عالم میں بولے جا رہی تھی۔ ہیجان ختم ہوا تو زبان گنگ ہوگئی۔ اس کی ٹانگوں میں جیسے جسم کا بوجھ سہارنے کی طاقت نہ رہی۔ دھیرے دھیرے وہ فرش پر بیٹھ گئی بچہ اس کی گود سے پھسل گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے بلک بلک کر رونے لگی اسے روتے دیکھ کر بچہ بھی رونے لگا۔

شاہد دم بخود کھڑا تھا.......... بہت دیر تک وہ یونہی کھڑا رہا۔

روتے روتے آخر کار عورت کو جیسے قرار سا آگیا۔ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ پورا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ بھیگی بھیگی آنکھوں سے اس نے ایک نظر شاہد کی طرف دیکھا اور بچے کو دوبارہ گود میں اٹھا کر نقاہت بھرے انداز میں اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی.......... "میں اب چلتی ہوں.......... میرے سوال کا جواب شاید آپ کے پاس نہیں.......... کسی کے پاس بھی نہیں.........."

شکست خوردہ قدموں سے چلتی ہوئی وہ دروازے تک پہنچ چکی تو شاہد گویا بت سے انسان بن گیا۔ کسی خواب سے چونکتے ہوئے وہ سنبھل کر اس کی طرف لپکا اور عقب سے اس کا بازو تھامتے ہوئے سرگوشی کے سے انداز میں بولا.......... "کہاں جا رہی ہو؟ اپنے گھر سے بھی کوئی یوں منہ موڑ کر جاتا ہے.........."

اس نے بچے کو عورت کی گود سے لے لیا.......... اس سہمی ہوئی، مفلوک الحال ننھی سی جان پر اسے بے پناہ ترس آیا اس نے اس کی بہتی ہوئی ناک اور آنسوؤں کی پروا کئے بغیر اسے چوم لیا۔ اس کی اپنی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے اور بچے کے آنسوؤں میں مدغم ہو رہے تھے۔

اب عورت کے ششدر رہ جانے کی باری تھی۔ شاہد نے اس کی طرف دیکھا اور ڈانٹنے کے انداز میں بولا.......... "کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو؟ چلو.......... اندر چلو.......... دو بھٹکے ہوئے راہی آج پہلی مرتبہ تو ایک ساتھ اس گھر میں اپنے گھر میں داخل ہونے لگے ہیں.......... آؤ.......... آؤ.........."

عورت نے خوف زدہ سی نظروں سے در و دیوار کو دیکھا پھر شاہد کی طرف دیکھا اور سرگوشی کے سے انداز میں بولی.......... "آپ مجھے کس حیثیت سے بلا رہے ہیں؟"

"تم نے سنا نہیں.......... میں نے اس گھر کو ہم دونوں کا گھر کہا ہے.......... میں

سے شادی کروں گا.........." شاہد بلا تامل بولا۔

اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ وہ یقیناً زندگی کے ایک عجیب موڑ پر کھڑی تھی۔ تین دن بعد اس کے شوہر کو پھانسی ہونے والی تھی اور ایک شخص اسے شادی کی پیشکش کر رہا تھا۔ اس نے چند لمحے سوچا.......... بالآخر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اندر گئی۔

☆ ============ ☆ ============ ☆

ڈرائیور محمد حنیف کی بیوی کا نام صنوبر تھا۔ محمد حنیف کی پھانسی کے بعد وہ بیوہ ہوگئی۔ عدت کے دن اس نے دارالامان میں گزارے.......... عدت پوری ہونے کے کچھ دن بعد شاہد نے اسے ساتھ لے جا کر چار چھ افراد کی موجودگی میں نہایت سادگی سے اس سے نکاح کیا اور وہ مسز شاہد علی بن کر اس کے اپارٹمنٹ میں آگئی۔

اسے تفکرات سے نجات ملی، صاف ستھرا رہن سہن، نئے کپڑے، اچھی خوراک اور محبت کرنے والے ایک مرد کی رفاقت میسر آئی تو چند دنوں میں ہی گویا اس کی کایا پلٹ گئی۔ وہ کیچڑ میں ہیرا تھی۔ کیچڑ ہٹی تو جگمگانے لگی۔ گھر میں اجالا سا رہنے لگا۔ وہ اور اس کا بچہ دونوں خوبصورت تھے ان کے رخساروں پر گلاب کھلتے تھے۔

شاہد انہیں دیکھتا تو اس کے دل میں مسرت کی لہریں سی اٹھنے لگتیں یہ نئی تبدیلی اس کے دل، اس کی روح کو بہت ہی بھلی لگی تھی اسے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ گھر میں محبت کرنے والی ایک بیوی اور چھوٹی چھوٹی معصوم سی ادھوری سی باتیں کرنے والا ایک بچہ موجود ہو تو زندگی کتنی خوبصورت کتنی مختلف ہو جاتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھتے تھے تو دونوں کے چہرے مسرت سے دمک اٹھتے تھے۔

ایک روز باتوں باتوں میں شاہد بولا.......... "ایسا لگتا ہے تمہیں محمد حنیف کی پھانسی.......... میرا مطلب ہے اس کی موت کا ذرا بھی دکھ نہیں.........."

اس کی رنگت صرف ایک لمحے کے لئے متغیر سی ہوئی۔ وہ سر جھکا کر بولی۔ "میں منافقت سے کام نہیں لوں گی.......... جب اسے پھانسی ہوئی تھی تو مجھے تھوڑا بہت دکھ ضرور ہوا تھا.......... میں نے اس کا آخری دیدار بھی نہیں کیا تھا۔ مجھ میں ہمت نہیں تھی.......... انسان گھر میں جانور بھی پال لے تو اس کی موت کا بھی کچھ نہ کچھ دکھ ضرور ہوتا ہے.......... حنیف تو پھر بھی میرا شوہر تھا.......... اور وہ مجھ سے محبت بھی بہت کرتا تھا۔ خرابی صرف یہ تھی کہ وہ محبت صرف یک طرفہ تھی۔ میں کوشش کے باوجود اپنے دل میں اس کے لئے محبت پیدا نہیں کر سکی.......... اور جب دل ہی نہ ملے ہوں تو ملنے کی خوشی کہاں اور بچھڑنے کا دکھ کیسا.......... وہ جو اس کی موت کا تھوڑا بہت افسوس

تھا.......... اب وہ بھی نہیں رہا.......... خصوصاً" آپ کو پا کر تو میں اسے بالکل ہی بھول گئی تھی.......... آج آپ نے یاد دلایا ہے تو مجھے یاد آیا.......... وہ شاید میری زندگی کی کتاب میں ایک حرف غلط تھا جسے قدرت نے مٹا دیا۔ اب میری زندگی صحیح ڈگر پر آ گئی ہے۔ یہی وہ زندگی تھی جس کے خواب میں دیکھتی تھی"۔

شاہد نے گہری سانس لی۔ وہ اپنے آپ کو مزید ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اسے خود بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی زندگی میں کچھ غلطیاں تھیں جو دست قدرت نے ہی دور کر دی تھیں۔ اس کے خیال میں بھی اب اس کی زندگی صحیح ڈگر پر آ گئی تھی۔ اس نے ہیرا پھیری، نوسربازی چھوڑ دی تھی۔ وہ اتنا خوش اور مگن تھا کہ اسے گویا یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ زندگی گزارنے کے لئے ایک ذریعہ معاش کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ بینک میں اس کی کچھ رقم موجود تھی گزارہ چل رہا تھا۔

وہ اس روز چونکا جب اس کا چیک پہلی بار ڈس آنر ہوا۔ وہ گھر واپس آیا تو ذرا افسردہ تھا۔ صنوبر اس کے چہرے پر ذرہ برابر تبدیلی کو فوراً" محسوس کرتی تھی۔

"خیریت تو ہے.........." وہ چائے کی پیالی اس کے ہاتھ میں تھما کر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی.......... "یہ من موہنا سا منہ اتنا لٹکا ہوا کیوں ہے؟"

"بینک میں پیسے ختم ہو گئے ہیں.........." شاہد نے دھیمی آواز میں کہا۔

"تو اس میں اتنا منہ لٹکانے کی کیا بات ہے؟" صنوبر بولی.......... اس کی نظر میں گویا یہ قطعی غیر اہم بات تھی۔

"آج مالک مکان کا کرایہ دینا تھا.........." شاہد نے قدرے ناگواری سے کہا۔

"کرایہ دے دیں گے اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ میرے پاس کچھ پیسے موجود ہیں"۔ صنوبر بے پروائی سے بولی۔

"تمہارے پاس کہاں سے آئے پیسے؟" شاہد چونکا اس کے دل میں بدگمانی کی خفیف سی لہر ابھری۔

"آنے کہاں سے تھے.........." وہ بولی.......... "آپ مجھے خرچ کے لئے جو کچھ دیتے رہے میں اس میں سے کچھ نہ کچھ بچاتی رہی ہوں جیسا کہ ہر سگھڑ اور کفایت شعار بیوی کرتی ہے.........."

"اچھا.........." شاہد نے گہری سانس لی.......... "تو تم سگھڑ اور کفایت شعار بھی ہو.......... تمہارے اندر اس خوبی کی تو میں توقع ہی نہیں کر رہا تھا.........."

"ابھی تو آپ کو ہمارے اندر اور نہ جانے کتنی خوبیوں کا پتہ چلے گا جن کی آپ نے توقع ہی نہیں کی ہوگی.........." صنوبر ہلکی سی شوخی سے بولی۔

یوں وہ ذرا آڑا وقت گزر گیا۔ مزید ایک آدھ ماہ بھی اسی طرح گزر گیا لیکن صنوبر کی ت بھی کہاں تک کام دیتی۔ اسے اس گھر میں آئے عرصہ ہی کتنا گزرا تھا ابھی وہ اتنا زیادہ تو ا نہیں پائی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت آنے لگی کہ گھر میں روٹی اور بچے کے دودھ کے بھی لے پڑنے لگے۔ دیگر اخراجات تو اپنی جگہ تھے۔ اپارٹمنٹ کا کرایہ بھی کافی تھا۔ وہ مہنگے تے کا ایک کشادہ اپارٹمنٹ تھا۔ شاہد قدرے پرتعیش زندگی کا عادی ہو چکا تھا۔ گاڑی بھی ب اکثر پٹرول نہ ہونے کی وجہ سے کھڑی رہتی تھی۔

ایک روز وہ اپنی سوچوں سے چونکتے ہوئے بولا.......... "میں سوچتا ہوں گاڑی بیچ ں۔ بہت بڑی ہے.......... اور خاصی مہنگی ہے.......... پٹرول زیادہ کھاتی ہے۔ اس کی ۔ ہم کوئی ذرا زیادہ پرانی اور سستی گاڑی لے لیتے ہیں اور اس اپارٹمنٹ کی جگہ دو کمروں ے کسی چھوٹے اپارٹمنٹ میں منتقل ہو جاتے ہیں جس کا کرایہ کم ہو۔ یہ ہماری ضرورت سے ا ہے۔ ہم افراد ہی کتنے ہیں.......... میاں بیوی اور ایک ننھا سا بچہ.........." وہ کھوکھلے ے انداز میں ہنسا.......... جب سے تنگ دستی آئی تھی گھر میں، حقیقی مسرت سے بھرپور ی ذرا کم ہی سنائی دینے لگی تھی۔

صنوبر دھیمے اور پرخیال لہجے میں بولی.......... "تجویز تو آپ کی ٹھیک ہے.......... ں طرح شاید ہم چند ہزار روپے بچانے میں کامیاب ہو جائیں اور آئندہ بھی اخراجات میں ت ہو جائے.......... لیکن اس طرح زندگی تو نہیں گزرے گی۔ بیٹھ کر کھانے سے تو رون کے خزانے بھی ختم ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم نے چیزیں ہی بیچنے پر کمر باندھ لی تب بھی خر کب تک گزارہ ہوگا؟"

بات معقول تھی شاہد سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ جب سے اس نے نوسربازی اور ہیرا پھیری چھوڑی تھی اس کی تیزی و طراری گویا ختم ہوتی جا رہی تھی۔ تھکے تھکے سے لہجے ں بولا.......... "تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"یہی کہ آپ کوئی نوکری کریں.......... یا کوئی چھوٹا موٹا کام کریں.......... کوئی ی مستقل روزگار اختیار کریں۔ اس کے بغیر گزارہ نہیں ہوگا.........." صنوبر سر جھکائے لی۔

"یہی تو مشکل ہے.........." شاہد بے بسی سے بولا.......... "کام مجھے کوئی آتا یں ہے کوئی کاروبار کرنے کی نہ مجھ میں اہلیت ہے نہ فی الحال میرے پاس رقم ہے۔ نوکری ں اس لئے نہیں کر سکتا کہ میرے پاس کوئی سرٹیفکیٹ کوئی ڈگری، کوئی ڈپلوما نہیں ہے۔ میں نے تو اپنا شناختی کارڈ بھی بڑی مشکل سے بنوایا ہے.........."

"تو کیا آپ پڑھے لکھے نہیں ہیں؟ یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟" صنوبر بے یقینی ـ بولی........ "آپ اتنی اچھی اردو........ اتنی اچھی انگریزی بولتے ہیں انگریزی اخ پڑھتے ہیں........"

"یہ سب مجھے معلوم نہیں کہ میں کیسے کرتا ہوں۔ میں نے تمہیں ابھی تک نہیں ؛ کہ میرے ساتھ کیا ٹریجڈی ہوئی تھی........ میری یادداشت........ یا یوں کہوں یادداشت کی زیادہ تر اہم کڑیاں کہیں کھو گئی ہیں۔ میرا ماضی مجھ سے چھن گیا ہے۔ مجھے ا بارے میں تمام باتیں صرف اس وقت سے یاد ہیں جب میں نے اندرون سندھ کی ایک گ بستی میں ایک مچھیرے کے جھونپڑے میں آنکھ کھولی تھی........" شاہد نے اسے ذ تفصیل سے اس واقعے کے بارے میں بتایا اور اس کے بعد کے حالات مختصراً" بتائے صنو حیرت زدہ رہ گئی۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا........ "میرا خیال تھا کہ دھیرے دھیرے مجھے نہ کچھ یاد آ جائے گا........ لیکن ایسا نہیں ہوسکا........ اتنا ضرور ہے کہ بہت چیزیں بہت سی جگہیں مجھے مانوس لگتی ہیں لیکن کیوں........؟ یہ ابھی تک سمجھ میں نہیں آتا........" صنوبر کے سامنے آج اس نے پہلی بار اپنی زندگی کے اس پہلو سے پردہ اٹھ تھا۔

صنوبر اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے بولی........ "تو پھر آخر اب تک آپ گز اوقات کے لئے کیا کرتے تھے؟ یہ ٹھاٹ باٹ کیسے قائم تھے؟"

"ہیرا پھیری کرتا تھا۔ لوگوں کو بے وقوف بناتا تھا۔ بے ایمانوں اور فراڈ قسم ـ لوگوں سے گویا ایک طرح کا خراج وصول کرتا تھا۔ آخر میں تو چوری چکاری پر بھی اتر تھا۔ تمہیں یاد نہیں میں نے تمہارے مرحوم شوہر کے ساتھ مل کر ہیروں کی چوری کا منص بنایا تھا جس نے میری زندگی کا رخ بدل دیا"۔

صنوبر نے سر جھکالیا........ ایک لمحے کے لئے خاموش رہی پھر بولی........ جہاں اتنی ہیرا پھیریاں اور جعلسازیاں کی ہیں وہاں ایک چھوٹی سی ہیرا پھیری اور لیجئے........ کہیں سے کوئی جعلی ڈگری حاصل کرلیجئے۔ کہیں ملازمت تو مل جائے گی۔

"ایک تو جعلی ڈگری حاصل کرنا میرے لئے مشکل کام ہے........" شاہد کچھ سو ہوئے بولا........ "دوسرے میں غلط کاموں سے توبہ کرچکا ہوں تیسرے یہ کوئی محف راستہ نہیں ہے۔ آج کل ڈگریوں کے بارے میں بڑی چھان بین ہوتی ہے........ میں نہیں چاہتا کہ میں اب کسی بھی غلط کام کے سلسلے میں پکڑا جاؤں۔ اس کے علاوہ ا

بات یہ بھی ہے کہ نقلی ڈگری ہونا بھی اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ مجھے نوکری مل جائے گی۔ تمہیں معلوم ہے ملک میں بے روزگاری کا کیا عالم ہے؟"

"یہ سب باتیں تو اپنی جگہ درست ہیں........" صنوبر بجھے بجھے سے لہجے میں بولی........ "لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا........ زندگی نہ جانے کتنی لمبی ہو........ آج صرف ایک بچہ ہے........ کل کو کنبہ بڑھنے کو ہے........" اس کے لہجے اور چہرے سے گرہستن عورتوں والی فکری مندی عیاں تھی۔ یکدم وہ اپنی عمر سے کچھ بڑی بڑی لگنے لگی تھی۔ شاہد کو یوں لگا جیسے وہ ہنی مون گزار چکا تھا اور اب شادی کو بھگتنے کا دور شروع ہو چکا تھا۔

دفعتاً" صنوبر سر اٹھاتے ہوئے بولی........ "لیکن میں آپ کو فکر مند بھی دیکھنا نہیں چاہتی........ آپ مجھے بے فکرے' کھلنڈرے اور لاابالی سے انداز میں ہی اچھے لگتے ہیں بس........ میں تو چاہتی ہوں گھر چلتا رہے........ خواہ آپ کے ساتھ مجھے بھی کام کرنا پڑے۔ میں زیادہ پڑھی لکھی اور قابل تو نہیں ہوں لیکن میرے لائق جو بھی کام ہو........ چاہے وہ محنت مزدوری ہی کیوں نہ ہو........ میں کرنے کو تیار ہوں........ زیادہ ٹھاٹ باٹ اور عیش و عشرت کا مجھے شوق نہیں........ بس........ مجھے آپ مل گئے ہیں........ اتنی ڈھیر سی خوشیاں مل گئی ہیں........ میں نے گویا زندگی میں سب کچھ پالیا ہے۔ اب مجھے کوئی ارمان نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ زندگی بھر آپ مجھے اسی طرح چاہتے رہیں"۔

"تمہیں نہیں چاہیں گے تو اور کسے چاہیں گے........ تم تو اب پلے بندھ گئی ہو........" شاہد دھیرے سے ہنسا........ صنوبر کی حوصلہ افزاء باتوں سے اس کے مزاج کی خوشگواری لوٹ آئی تھی........ "بے فکر رہو........ تمہیں کچھ نہیں کرنا پڑے گا........ شاہد کی بیوی ہو کر تم محنت مزدوری کرو........؟ ابھی یہ نوبت نہیں آئی۔ شرافت کی زندگی نے ابھی شاہد علی کو اتنا ناکارہ نہیں کیا........"

شاہد نے اسے بازوؤں میں بھرنے کے لئے بازو پھیلائے لیکن وہ پہلو بچاتے ہوئے بولی........ "اٹکھیلیاں چھوڑیئے........ میرے ذہن میں ایک کام کی بات آئی تھی........"

"چلو........ وہ بھی بتا دو........ میرا ذہن تو آج کل ویسے ہی کچھ زنگ آلود سا ہوتا جا رہا ہے........" شاہد بولا۔

"آپ اخبار میں اپنی ایک اچھی سی........ صاف سی تصویر کے ساتھ اشتہار دیں

کہ آپ کی یادداشت کھو گئی ہے.......... براہ مہربانی اگر کسی کو آپ کے بارے میں کچھ معلوم ہو تو وہ آپ سے رابطہ کرکے آپ کو بتائے.......... آپ کی یادداشت واپس لانے میں آپ کی کچھ مدد کرے.......... اس قسم کا کوئی مضمون ہونا چاہیے اشتہار کا..........“ صنوبر جھجکتے ہوئے بولی۔

”آئیڈیا اچھا ہے..........“ شاہد بولا.......... ”اس قسم کے خیالات کئی بار میرے ذہن میں بھی آئے مگر ڈر کے مارے ان پر عملدرآمد سے باز رہا“۔

”ڈر..........؟ کیسا ڈر؟“ صنوبر قدرے حیرت سے بولی۔

”میں اپنے آپ سے.......... اپنے گمشدہ ماضی سے خوفزدہ ہوں..........“ شاہد بولا۔ ”میں لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے پچھلا کچھ عرصہ جس طرح گزارا ہے اس سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ مجھ میں مجرمانہ رجحانات موجود ہیں۔ میں نے سمجھداری سے کام لیتے ہوئے انہیں دبایا ہوا ہے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ ماضی میں کہیں میں کوئی بڑا جرم کوئی بڑا فراڈ ہی نہ کرچکا ہوں.......... کسی شہر میں.......... یا اسی شہر میں میرے خلاف کوئی فائل نہ کھلی ہو.......... اشتہار دیکھ کر پولیس یا کسی اور ایجنسی والے مجھ سے ملاقات کے لئے نہ چلے آئیں.......... میں لوگوں کو مدد کے لئے بلانا چاہتا ہوں.......... الٹا کوئی دعویٰ لے کر چلا آئے‘ کہ تم نے مجھے اتنے کروڑ کا نقصان پہنچایا تھا.......... ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں..........“

صنوبر نے تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کچھ سوچا پھر بولی.......... ”لیکن جب آپ پر مقدمہ چل رہا تھا اور آپ کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی تب بھی تو بعض اخباروں میں دو ایک مرتبہ آپ کی تصویر چھپی تھی تب تو کوئی ایسی بات نہیں ہوئی..........“

”وہ تو یونہی ننھی سی اور دھندلی سی تصویر تھی.......... اس قسم کی تصویروں سے انسان کی واضح شناخت مشکل ہوتی ہے۔ ویسے بھی اس وقت بہرحال میری حیثیت شاہد علی کی تھی۔ اس لئے بھی بات کچھ اور تھی.......... اب اگر میں خود اپنی واضح تصویر چھپوا کر اقرار کرتا ہوں کہ میری یادداشت کھو چکی ہے.......... تو کچھ بھی ہوسکتا ہے.......... کسی بھی قسم کا کوئی دعوے دار سامنے آسکتا ہے۔ کوئی بات سچی بھی ہوسکتی ہے اور کوئی جھوٹی بھی.......... اس دنیا میں اچھے انسانوں کی بھی کمی نہیں ہے اور برے انسانوں کی بھی کوئی قلت نہیں ہے.......... میرے لئے کوئی پریشانی بھی کھڑی ہوسکتی ہے.......... بس یہی سوچ کر میں ریت میں منہ چھپائے ہوئے ہوں۔ میں سوچتا ہوں اگر کسی حادثے نے مجھے بے شناخت بنا دیا ہے.......... دنیا کی بھیڑ میں گم کر ہی دیا ہے تو میں اسی طرح

رہوں.......... مجھے اب کوئی ایسی پریشانی یا تکلیف تو ہے نہیں.......... بس روزگار کا مسئلہ ہے.......... وہ بھی حل ہو ہی جائے گا.......... زیادہ عیش و آرام سے نہ سہی‘ سادگی سے رہ لیں گے.......... ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں.......... بات تو آپ کی بھی ٹھیک ہے..........“ صنوبر نے تسلیم کیا۔

شاہد نے گاڑی اور کچھ دوسرا سامان تعیش بیچ دیا تھا جو کچھ ایسا ضروری نہیں تھا۔ گاڑی کی جگہ اس نے اسکوٹر لے لیا تھا۔ زیادہ کرائے کا اپارٹمنٹ بھی چھوڑ دیا تھا اور چھوٹے سے ایک سستے اپارٹمنٹ میں منتقل ہوگیا تھا۔ اس طرح جوڑ توڑ کرکے اس نے کچھ رقم کا بندوبست کیا تھا اور ایک نو تعمیر شدہ بلڈنگ کے نیچے کرائے کی دکان لے کر جنرل اسٹور کھول کر بیٹھ گیا تھا۔

کچھ رقم انہی تیاریوں کے دوران خرچ ہوگئی تھی اور باقی جنرل اسٹور میں لگ گئی تھی۔ وہ کچھ ایسا اعلیٰ درجے کا اسٹور نہیں تھا اس کے باوجود اس پر خاصی رقم اٹھ گئی تھی۔ اسٹور کچھ چلتا دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن شاہد امید کے سہارے بڑی باقاعدگی سے اسے کھولتا تھا اور دن بھر بیٹھتا تھا۔ دن کا بیشتر حصہ وہ جمائیاں لیتے یا اخبار رسالے پڑھتے ہوئے گزارتا.......... دن بھر چند گاہک آتے.......... جو رقم آتی وہ گھر میں خرچ ہو جاتی۔ اسے احساس تھا کہ یہ اس کا منافع نہیں تھا۔ وہ اپنی ہی پونجی کھا رہا تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ اس طرح ایک وقت آئے گا جب اسٹور خالی ہوجائے گا اور اس کے پاس مزید مال ڈالنے کے لئے رقم نہیں ہوگی.......... لیکن اس کے پاس اس کا کوئی حل نہیں تھا وہ سرے سے کاروباری آدمی ہی نہیں تھا۔

ایک روز وہ دکان پر وقت گزاری کے لئے کئی مرتبہ کا دیکھا ہوا ایک رسالہ الٹ پلٹ رہا تھا کہ دکان کے سامنے ایک نہایت شاندار اور بیش قیمت گاڑی آکر رکی اور ایک سروقد اور نہایت حسین عورت گاڑی سے اتری.......... خوبصورت تو وہ تھی ہی.......... لیکن دولت کی چمک دمک نے اس کے حسن کو کچھ اور نکھار دیا تھا اسکی صحیح عمر کا اندازہ لگنا بہت مشکل تھا۔ شاید وہ چالیس کے قریب رہی ہو لیکن رکھ رکھاؤ سے تیس کی نظر آتی تھی۔ قدرت بھی شاید اس پر مہربان تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے معلوم ہوتی تھی جن پر جوانی آتی ہے تو جانے کا نام نہیں لیتی۔

وہ ہاتھ میں ایک وزٹنگ کارڈ لئے اوھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ شاید کوئی ایڈریس تلاش کر رہی تھی اسے اردگرد کوئی نظر نہ آیا تو وہ قدرے نخوت اور متانت سے قدم اٹھاتی شاہد کی طرف بڑھی.......... کاؤنٹر کے قریب پہنچ کر اس نے دھوپ کا چشمہ ناک سے کھسکا کر

پیشانی پر ٹکایا پھر وہ بری طرح چونکی اور ایک ٹک شاہد کو دیکھنے لگی۔

شاہد بھی الجھن آمیز انداز میں اس حسین عورت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رسالہ اس نے کاؤنٹر پر رکھ دیا تھا نہ جانے کیوں اس کی رگوں میں لہو کی گردش تیز ہو گئی تھی اور اس کے ذہن کے کسی خانے میں مقید کوئی پرندہ گویا بے تابی سے پھڑپھڑانے لگا تھا اس کی سوچوں کے نامعلوم دریچوں سے گویا کوئی چیز آزاد ہو کر نکل آنے کے لئے بے چین تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا چیز تھی۔ اس کے اعصاب میں ایک عجیب سا ارتعاش تھا۔ خوبصورت عورتیں تو اسے روزانہ ہی سر راہ یا کہیں نہ کہیں نظر آتی تھیں۔ ان میں سے بعض اس عورت کی طرح غیر معمولی حد تک بھی خوبصورت ہوتی تھیں لیکن کسی کو دیکھ کر وہ اس طرح کبھی مضطرب نہیں ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس عورت میں آخر ایسی کیا بات تھی؟ وہ اس عورت کے انداز پر بھی حیران تھا آخر وہ کیوں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی؟

اس عورت نے ہی سکوت توڑا وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "اچھا.........! تو تم یہاں بیٹھے یہ معمولی سی دکان چلا رہے ہو! میں تو بہت عرصے تک حیران رہی تھی کہ آخر تم یکدم ہی کہاں غائب ہو گئے ہو؟ رفتہ رفتہ میں نے تمہارے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا"۔

شاہد دم بخود کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے پھر وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ "کیا آپ مجھے جانتی ہیں محترمہ؟"

عورت کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے بے یقینی سے شاہد کی طرف دیکھا پھر زیرلب سے لہجے میں بولی۔ "واہ.........! کیا معصوم سوال ہے!" اس نے وزٹنگ کارڈ بے دھیانی سے پرس میں رکھ لیا تھا وہ جس کسی کی تلاش میں آئی تھی اسے یقیناً" بھول چکی تھی۔

شاہد تھوک نگل کر بولا۔ "محترمہ! میں نے آپ کو نہیں پہچانا......... لیکن اگر آپ میرے بارے میں کچھ جانتی ہیں تو پلیز مجھے بتایئے"۔

اب عورت نے آنکھیں سکیٹر کر ذرا سنجیدگی سے شاہد کی طرف دیکھا جیسے وہ اس کی بات پر غور کرنے پر مجبور ہو گئی ہو ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ "تم نے واقعی مجھے نہیں پہچانا......... یا پہچاننا نہیں چاہتے؟"

"میں پہچاننے کی اپنی سی کوشش کر رہا ہوں لیکن کامیابی نہیں ہو رہی"۔ شاہد بے بسی سے بولا۔

"میں رمنا ہوں.........!" عورت نے کچھ ایسی تمکنت سے کہا گویا وہ کسی ریاست

کی ملکہ ہو۔ "اس نام کو سن کر تمہارے ذہن میں کوئی گھنٹی بجی یا نہیں؟"

شاہد نے اپنے ذہن کو ٹٹولا اسے ایسا کوئی نام یاد نہیں آیا اس کے ذہن میں گھنٹی تو نہیں بجی تھی لیکن ذہن پر دباؤ بہت بڑھ گیا تھا کنپٹیوں کی رگوں میں گویا کوئی چیز چبھ رہی تھی۔

"نہیں......... مجھے بالکل کچھ یاد نہیں آیا......... میں معافی چاہتا ہوں"۔ شاہد کے لہجے میں شائستگی بھی تھی اور بے بسی بھی۔

عورت کو اس کے تاثرات دیکھ کر گویا اس کی بات کا یقین آنے لگا اس کے چہرے سے برہمی معدوم ہونے لگی اس نے ایک طویل سانس لی۔ شاہد کی بات سن کر اسے پہلے اگر کچھ مایوسی اور خجالت کا احساس ہوا تھا تو اب نہ جانے کیوں اسے کچھ اطمینان سا بھی ہو گیا تھا۔

وہ کاؤنٹر پر جھکتے ہوئے ذرا اور دھیمی آواز میں بولی' "ان باتوں کو اتنا عرصہ تو نہیں گزرا کہ تم انہیں بھول جاتے.........!"

شاہد نہیں سمجھ سکا کہ ان باتوں سے عورت کی مراد کیا تھی لیکن اسے چونکہ یہ تو معلوم تھا کہ اسے صرف تین چار سال پہلے تک کی باتیں یاد تھیں اسے کوئی حادثہ پیش آیا تھا اور وہ اس سے پہلے کی تمام باتیں بھول گیا تھا اس عورت کے رویے سے اسے امید نظر آئی کہ شاید وہ اس کا گمشدہ ماضی یاد دلانے میں مدد کر سکتی تھی۔ اس عورت کا اس کے ماضی سے یقیناً کوئی تعلق تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس تعلق کی نوعیت کیا تھی۔ اس تعلق کی وجہ سے اب اسے نقصان پہنچ سکتا تھا یا فائدہ.........؟

اس سوال کا جواب تو اس کے پاس نہیں تھا لیکن اس نے خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا اور ہچکچاتے ہوئے اعتراف کر لیا۔ "بات دراصل یہ کہ کچھ عرصہ پہلے مجھے کوئی حادثہ پیش آیا تھا......... جس نے میری یادداشت چھین لی تھی......... کافی عرصہ میں نے یہاں سے بہت دور واقع ایک بستی میں بھی گزارا ہے......... اس سے پہلے کی مجھے کوئی بات یاد نہیں رہی"۔

"اوہ......... واقعی.........؟" عورت کے چہرے پر دلچسپی کی چمک نمودار ہوئی۔ "میں اپنی حقیقی زندگی میں پہلا شخص دیکھ رہی ہوں جس کی یادداشت گم ہو چکی ہے......... ورنہ میں نے اب تک فلموں میں ہی ایسا دیکھا تھا تمہارا مطلب ہے......... تمہیں واقعی اپنے ماضی کے بارے میں کچھ یاد نہیں؟"

شاہد نے نفی میں سر ہلایا۔ عورت کاؤنٹر کے سہارے کھڑی تھی وہ پر خیال انداز میں

اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو.......... تبھی تم اچانک ہی غائب ہو گئے تھے.......... اخباروں میں تو چھپا تھا کہ تم مر چکے ہو.......... تمہاری گاڑی نہر میں گر گئی تھی لیکن اب میں نے اچانک تمہیں یہاں دیکھا تو میرے ذہن میں یہی آیا کہ شاید تم نے مرجانے کا ڈرامہ رچایا تھا اور درحقیقت تم گمنامی کی زندگی گزارنا چاہتے تھے اس لئے غائب ہو گئے تھے لیکن اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی ہے تم واقعی یادداشت کھو بیٹھے ہو گے ورنہ تم اتنا عرصہ غائب نہیں رہ سکتے تھے کہیں نہ کہیں تم ضرور سامنے آتے۔ آخر تم ایک اچھے گلوکار تھے۔ شوبزنس کا آدمی زیادہ عرصے شو بزنس سے دور نہیں رہ سکتا"۔

"سنگر؟ شوبزنس کا آدمی؟" شاہد بے یقینی سے بولا "یہ بات دو ایک افراد نے پہلے بھی مجھ سے کہی تھی کہ میری شکل کسی گلوکار سے ملتی ہے۔ لیکن مجھے ان کی بات کا یقین نہیں آیا تھا کیونکہ مجھے گانا نہیں آتا۔ شاید لوگوں کو مجھ پر کسی اور کا گمان ہو رہا ہو.......... شاید آپ بھی دھوکہ کھا رہی ہوں.........."۔

"میری نظریں دھوکا نہیں کھا سکتیں"۔ عورت پر اعتماد لہجے میں بولی۔ "میرا تم سے تعلق ایسا تھا بھی نہیں.......... کہ میں دھوکا کھا جاؤں ذرا تم گردن ٹیڑھی کرو.........."۔

شاہد نے اس کے اشارے کے مطابق گردن ٹیڑھی کی عورت انگلی سے اس کے بائیں کان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "تمہاری گردن پر کان کے قریب چھوٹا سا یہ سرخ نشان موجود ہے.......... تم خود ہی بتایا کرتے تھے کہ یہ تمہارا پیدائشی نشان ہے.......... تم یقیناً" اختر حسین ہو.......... اس میں کسی شک وہ شبے کی گنجائش ہی نہیں ہے"۔

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی۔ "آواز کا استعمال ایک فن ہے تم چونکہ اپنی یادداشت کھو چکے ہو اس لئے شاید تمہیں اس فن پر عبور نہیں رہا تم گانا بھول چکے ہو تو یہ کوئی ایسی حیرت کی بات نہیں اگر تمہاری یادداشت واپس آ جاتی تو شاید تمہیں پہلے ہی کی طرح گانا بھی آ جاتا"۔

"شاید" شاہد آہستگی سے بولا۔ "اگر آپ برا نہ مانیں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ سے میرا کیا رشتہ تھا؟"

"رشتہ..........؟" عورت نے دہرایا۔ "بظاہر رشتہ نہیں تھا.......... لیکن ایک بے عنوان رشتہ تھا جو شاید بہت سے رشتوں پر بھاری تھا.........." پھر وہ اپنی گوری سڈول کلائی پر بندھی نہایت خوبصورت اور بیش قیمت سی دکھائی دینے والی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے

بولی۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم میرے ساتھ میرے گھر چلو.......... اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے"۔

"میری دکان.........." شاہد نے ادھر ادھر دیکھا۔

"ارے دفع کرو اس دکان کو.........." مجھے تو افسوس ہو رہا ہے تمہیں یہاں بیٹھے دیکھ کر.......... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم شہر کے اس کونے میں ایسی معمولی سی دکان پر بیٹھے مکھیاں مار رہے ہو۔ بند کرو اس دکان کو.......... اگر تم مجھ سے نہ بچھڑے ہوتے تو شاید اب تک اس پلازہ کے مالک ہوتے جس کے ایک ذرا سے کونے میں اس وقت تم بیٹھے ہو"۔

شاہد نے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں دکان بند کر دی اور اس کے ساتھ گاڑی میں جا بیٹھا وہ عورت جس کام سے وہاں آئی تھی اسے گویا بالکل بھول چکی تھی۔ گاڑی کا دروازہ بند ہوا اور ایئرکنڈیشنر کی سرسراہٹ ابھری تو شاہد گویا کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گیا اسے یاد نہیں تھا کہ وہ کبھی اتنی شاندار گاڑی میں بیٹھا تھا۔

عورت نے اپنا نام رمنا بتایا تھا شاہد دل ہی دل میں اس نام کو دہرا رہا تھا اس میں بڑی نغمگی تھی اس تصور سے اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ ایسی غضب کی عورت سے کبھی اس کی شناسائی رہی تھی اسے احساس تھا کہ ڈرائیونگ کے دوران کبھی کبھی وہ بڑے سے تاریک چشمے کے عقب سے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ لیتی تھی۔

گاڑی ایک نہایت مہنگے علاقے میں چڑھائی سی چڑھ کر ایک پہاڑی پر پھیلے ہوئے عظیم الشان بنگلے کے ڈرائیو وے میں جا رکی۔ بنگلہ کیا تھا ایک اچھا خاصا جدید دور کا محل تھا۔ شاہد گاڑی سے اتر کر سحرزدہ سے انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔

رمنا اسے مرعوب دیکھ کر مسکرائی اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک طرف چل دی۔ وہ بنگلے کے ایک بڑے حصے کے گرد چکر کاٹ کر عقب میں واقع سیڑھیوں تک پہنچی اور ایک ایسے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی جو نیچے کھڑے ہوئے شخص کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔

شاہد بھی اندر پہنچ چکا تو رمنا نے دروازہ آہستگی سے بند کر دیا اور شاہد کا رابطہ گویا باہر کی دنیا سے کٹ گیا وہ اب کسی اور ہی دنیا میں کھڑا تھا۔ وہ ایک طویل و عریض اور آراستہ و پیراستہ خوابگاہ تھی شاہد کے خیال میں صرف خوابوں میں ہی دیکھی جا سکتی تھی یا پھر شایدہ وہ ایسی خواب گاہ تھی جس میں واقعی خواب دیکھنے کو جی چاہتا تھا۔

وہ چند لمحے چاروں طرف دیکھتا رہا اور رمنا اسے دیکھتی رہی پھر وہ اس کی آنکھوں میں

جھانکتے ہوئے گویا اسے ہپناٹائز کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "ان در و دیوار کو غور سے دیکھو اور یاد کرنے کی کوشش کرو.......... کیا یہ کمرہ تمہیں جانا پہچانا نہیں لگ رہا؟ یہاں میری تمہاری زندگی نے ایک اہم موڑ لیا تھا.......... ان گنت خوبصورت یادیں یہاں کے گوشے گوشے میں بسی ہوئی ہیں"۔

شاہد نے گہری نظروں سے چاروں طرف دیکھا اس کے اندر اضطراب کچھ اور بڑھ گیا کوئی چیز گویا اس کے اعصاب کو اندر ہی اندر اتھل پتھل کر رہی تھی یا پھر شاید کوئی چیز اس کے دماغ کی نسوں کو چیر کر باہر آنا چاہتی تھی مگر آ نہیں پا رہی تھی۔ اسے کچھ احساس ہو رہا تھا کہ یہ طویل و عریض اور تین حصوں پر مشتمل کمرہ اس کے لئے شاید اجنبی نہیں تھا لیکن اسے قطعاً" یاد نہیں آ رہا تھا اگر وہ کبھی اس کمرے میں آیا تھا تو کب آیا تھا؟

اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات دیکھ کر رمنا نے اسے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولی۔ "آرام سے بیٹھ جاؤ.......... پریشان ہونے اور ذہن پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں اگر تمہیں کچھ یاد نہیں آ رہا تب بھی اتنا زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے لئے تو یہی کافی ہے کہ تم سے میری ملاقات ہو گئی۔ خصوصاً" آج کل تو میرے حالات کچھ ایسے ہیں کہ مجھے ایک ہمدم دیرینہ کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی"۔

شاہد خواب گاہ کے اس حصے میں بیٹھ گیا جو نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا رمنا اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے بولی۔ "ویسے.......... میرے خیال میں یادداشت کھو جانا ایک لحاظ سے اچھا ہی ہے۔ خوشگوار یادوں کے ساتھ ساتھ ناخوشگوار یادیں بھی تو ذہن کی تختی سے صاف ہو جاتی ہیں۔ ویسے اگر آدمی ان یادوں کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتا ہے تو نہیں جھٹک پاتا"۔

"ہاں.......... یہ تو ہے.........." شاہد پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "یہی سوچ کر میں نے بھی کئی بار خود کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی لیکن دل میں بہر حال ایک بے اطمینانی سی بس گئی تھی.......... اور اب.......... جب کہ میں نے اس بے اطمینانی سے سمجھوتا کر لیا تھا.......... تو آپ سے ملاقات ہو گئی.........."

پھر وہ گویا ہمت کر کے بولا۔ "آپ مجھے کچھ بتایئے نا.......... ہم ایک دوسرے سے کیوں کر.......... اور کس حد تک شناسا تھے؟ مجھے میرے بارے میں کچھ بتایئے.........."

وہ بے ساختہ ہنسی۔ اس کی ہنسی نے شاہد کے اعصاب میں تھرتھراہٹ سی پیدا کر دی وہ بلاشبہ ایک ساحرہ تھی وہ جب ایک ٹک شاہد کی طرف دیکھتی تھی تو گویا اس کے وجود کو مٹھی میں جکڑ لیتی تھی۔ اس کی ہنسی ہوش و حواس کو دھندلا دینے والی تھی شاہد نے کبھی سوچا

بھی نہیں تھا کہ ایسی کسی عورت سے اس کی شناسائی نکل آئے گی جو اس طرح اسے اپنی محل سرا کی تصوراتی خوابگاہ میں لے جائے گی۔

"کیسی عجیب بات ہے کہ کوئی اپنے بارے میں دوسروں سے پوچھے"۔ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "میں ضرور تمہیں بہت کچھ بتاؤں گی لیکن ایسی جلدی بھی کیا ہے پہلے مجھے موقع تو دو کہ میں تمہاری کچھ خاطرمدارت کروں.........."

وہ اٹھی اور الماری سے مشروب نکال لائی پھر اس نے فریج سے پینے پلانے کے دیگر لوازمات نکالے اور شیشے کی خوبصورت تپائی پر سجا دیئے۔ اس نے دو گلاس تیار کئے اور ایک شاہد کی طرف بڑھایا وہ گلاس لیتے ہوئے جھجکا۔ جب سے وہ شاہد کی حیثیت سے زندگی گزار رہا تھا اس کے روز و شب کچھ ایسے پارساؤں والے نہیں تھے لیکن پھر بھی اسے ایک حسین اور بے پناہ دولت مند نظر آنے والی خاتون کا یوں یکدم بے تکلفی سے پینا پلانا عجیب لگ رہا تھا۔

"اب لے بھی لو نا.......... شرما کیوں رہے ہو"۔ رمنا شوخ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "اس کمرے میں تمہارے ساتھ کئی نشستیں رہی ہیں"۔

شاہد نے گلاس تھام لیا دور چلنے لگا شاہد کا پینے کا انداز قدرے اناڑیوں والا تھا اسے احساس نہیں ہو سکا کہ وہ کچھ تیزی سے پی رہا تھا جبکہ رمنا محض چسکیوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ شاہد نروس تھا اسے کسی سہارے کی تلاش تھی مشروب نے اس کے اعصاب کو سہارا دینے کے بجائے اس کے ہیجان کو بڑھا دیا اس کی کنپٹیوں پر دباؤ بڑھنے لگا۔

رمنا ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں.......... گویا سوچ سوچ کر.......... سنبھل سنبھل کر اسے اس کے بارے میں بتا رہی تھی کہ اس کا اصل نام اختر حسین تھا اور رمنا نے اسے ٹی وی پر متعارف کروا کے ایک خاصا مقبول گلوکار بنایا تھا لیکن وہ زیادہ عرصے کام نہیں کر سکا تھا صحیح طور پر اپنا کیریئر نہیں بنا سکا اور سب کچھ چھوڑ کر نہ جانے کس طرح حادثے کا شکار ہو کر غائب ہو گیا اس نے شاہد عرف اختر کو یہ نہیں بتایا کہ وہ اس کے ہاتھوں اپنے شوہر کو قتل کرانے کی کوشش کر چکی تھی۔

اختر عرف شاہد کو ابھی تک رمنا سے اس کے بارے میں کچھ پوچھنے کی جرات نہیں ہوئی تھی ویسے ہی گفتگو طویل ہوتی جا رہی تھی اور کئی گلاس خالی کر جانے کے باعث اختر کا سر گھوم رہا تھا تاہم اس دوران ایک اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ اسے یقین آنے لگا تھا کہ رمنا اسے اس کے بارے میں جو کچھ بتا رہی تھی وہ سچ تھا اس سے اس کے ذہن پر دباؤ اور بھی بڑھ گیا تھا اس کے دل میں پچھتاوے نے گھر کر لیا تھا کہ پچھلے چند سال اس کی اصل شناخت

کھو جانے کی وجہ سے گویا ضائع ہی ہوگئے تھے۔ اس کا ذہن مسلسل اس جوڑ توڑ میں لگا ہوا تھا کہ کس طرح وہ اپنی کھوئی ہوئی شناخت دوبارہ حاصل کر سکتا تھا؟ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ رمنا جیسی عورت کے توسط سے یہ کام آسان ہو سکتا تھا لیکن فی الحال اس کا ذہن صحیح طور پر کام نہیں کر رہا تھا خیالات گڈمڈ ہوئے جا رہے تھے وہ کہتا کچھ اور چاہتا تھا منہ سے کچھ اور نکلتا تھا اس لئے فی الحال اس نے خود کو اس موضوع پر گفتگو سے باز رکھا تھا۔

اچانک اسے یاد آیا اس کی بیوی صنوبر گھر پر اس کا انتظار کر رہی ہوگی وہ اس کے بغیر کھانا بھی نہیں کھاتی تھی اس نے ابھی تک رمنا کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کچھ عرصہ پہلے شادی کر چکا تھا اور اس کی بیوی کا پہلے سے ایک بچہ بھی تھا لاشعوری طور پر ابھی وہ رمنا سے اپنی موجودہ زندگی کی زیادہ تر باتیں پوشیدہ ہی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

صنوبر کا خیال آتے ہی وہ گلاس چھوڑ کر جھومتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔ "اب.......... اب.......... میں گھر جاؤں گا.........." اسے ہچکی لگی ہوئی تھی اور اس سے سیدھا کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ پاؤں اس کے قابو میں نہیں تھے اور دماغ ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔

"اس حالت میں گھر جاؤ گے؟" رمنا نے مخمور سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا وہ مکمل طور پر ہوش و حواس میں تھی آنکھوں میں خمار کے ہلکے سے گلابی ڈوروں کے سوا اس میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آرہی تھی پینے پلانے میں اس کا ظرف یقیناً" شاہد سے کہیں بڑھ کر تھا اس کے باوجود اس وقت اس نے شاہد کے مقابلے میں بہت کم پی تھی چنانچہ اس کے لئے گویا کوئی فرق ہی نہیں پڑا تھا۔

"دل تو نہیں.......... چاہ.......... رہا.........." شاہد لہراتے ہوئے بولا۔ "لیکن مجبوری ہے.......... مجھے جانا ہوگا.........."

"کیا مجبوری ہے؟" رمنا پلک جھپکائے بغیر اس کی طرف دیکھ رہی تھی وہ اس طرح دیکھتی تھی تو اختر عرف شاہد کے دل کو کچھ ہونے لگتا تھا وہ اسے بتاتے بتاتے رہ گیا کہ اس کی بیوی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ حواس مختل ہونے کے باوجود اس نے کم از کم اس معاملے میں زبان پر قابو رکھا۔

"بس.......... ایک مجبوری.......... ہے.......... ورنہ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ .... یہیں.......... کسی تکیئے پر سر رکھ کر.......... سو جاؤں.........." اختر عرف شاہد اپنی آنکھیں بہ مشکل کھلی رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"تو پھر سو جاؤ کس نے تمہیں منع کیا ہے؟" رمنا کے ہونٹوں پر وہی قیامت خیز تبسم

ل۔ "کیا گھر پر کوئی تمہارا انتظار کر رہا ہے؟"

شاہد نے جواب دینے کے بجائے دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی لیکن وہ پتائی ے الجھ کر گر پڑا اور ایسا گرا کہ اٹھ نہیں سکا اس نے اپنے ذہن کو غنودگی کے شدید حملے ے بچانے اور بیدار رہنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوسکا ذہن پر مکمل تاریکی چھانے ے پہلے آخری احساس اسے صرف یہی ہوا تھا کہ اس قسم کی صورت حال شاید اس پر پہلے ی کبھی گزر چکی تھی وہ صرف اتنا ہی سوچ سکا اس کے بعد اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا لا گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو ایک کھڑکی کے دھندلے شیشے سے دھندلی دھندلی دھوپ اندر آرہی تھی وہ قالین پر ہی لیٹا ہوا تھا لیکن پتائی اس کے پاس سے ہٹادی گئی تھی اس کے رہانے ریشم کی طرح ملائم تکیہ رکھا ہوا تھا اور اس کے جسم پر ایک نہایت نرم و نفیس کمبل ھیلا ہوا تھا۔

کافی دیر تک وہ اسی طرح چت لیٹا چھت کو گھورتا رہا عجیب بات تھی کہ اس کا ذہن ب رفتہ کے نشے سے بوجھل نہیں تھا بلکہ ہمیشہ سے بہت زیادہ ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا ے کچھ یوں لگ رہا تھا کہ وہ چیز جو اس کے دماغ کی نسوں کو چیر کر باہر آنا چاہتی تھی وہ چکی تھی اور اس کی اذیت ختم ہو چکی تھی ہلکا سا بوجھ اس کے ذہن پر پہلے ہی رہتا تھا لیکن گزشتہ رات تو اس کی اذیت ناقابل برداشت ہوگئی تھی مگر یہ نئی صبح اس کے لئے گویا نجات کا پیغام لے کر آئی تھی۔ وہ صرف اپنے ذہن کو ہی نہیں اپنے پورے وجود کو روئی کے گالے کی طرح سبک محسوس کر رہا تھا۔

کئی لمحوں کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس کی یادداشت کی گم شدہ کڑیاں مل چکی تھیں اپنے ماضی کی تلاش میں اس کا جو اذیت ناک ذہنی سفر ایک عرصے سے جاری تھا وہ ختم ہو چکا تھا اسے ایک ایک بات اچھی طرح یاد آگئی تھی لیکن فلمی کہانیوں کی طرح اس کے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا کہ اگر اسے زندگی کا پچھلا دور یاد آگیا تھا تو اب وہ دوسرا دور بھول گیا ہو اسے پہلا دور بھی یاد آگیا تھا اور دوسرا دور بھی وہ نہیں بھولا تھا۔ اسے یاد آگیا تھا کہ گاؤں میں وہ آسیہ سے ملنے کے بعد انتہائی دلبرداشتہ اور صدمے کے عالم میں حادثے کا شکار ہوگیا تھا اس کی گاڑی نہر میں جاگری تھی اور اس کے بعد اس کی آنکھ لکھو مچھیرے کی جھونپڑی میں کھلی تھی..........! اس کے بعد اس نے جس انداز میں زندگی گزاری تھی اسے یاد کرتے ہوئے اسے جھرجھری سی آگئی۔ اس کی زندگی کے دونوں ور ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد تھے وہ عجیب سی قسم کے انقلابات اور طرح طرح کے

تجربات کا چلتا پھرتا مجموعہ بن کر رہ گیا تھا لیکن طمانیت کی بات یہ تھی کہ اب ایک بہت بڑا سوالیہ نشان اس کے ذہن سے مٹ گیا تھا یہ عقدہ کھل گیا تھا کہ وہ پہلے کیا تھا............!

اسے اچھی طرح یاد آگیا تھا کہ جس رمنا کی خواب گاہ میں وہ اس وقت لیٹا ہوا تھا وہ کون تھی............ کیا تھی............! اختر کو یہ بھی یاد آگیا تھا کہ اس نے کس طرح ٹوٹ کر رمنا کو چاہا تھا اور اس نے اسے کتنے بڑے جذباتی صدمے سے دوچار کیا تھا چند لمحوں کے اندر اندر اب تک کی زندگی کی ایک انتہائی تیز رفتار سی فلم اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گئی۔

"رمنا............!" وہ بے ساختہ کراہنے کے سے انداز میں بولا اور اٹھ بیٹھا۔

اس نے مڑ کر دیکھا رمنا اس سے کافی دور اپنے شاندار ڈبل بیڈ پر ٹانگیں پھیلائے گاؤ تکیئے کے سہارے نیم دراز تھی وہ شب خوابی کے لبادے میں تھی۔ اس کی ریشمی زلفیں بکھری ہوئی تھیں اور اس کے چہرے کے گرد ہالہ سا بنائے ہوئے تھیں اس بے ترتیبی میں ایک اور ہی طرح کا حسن تھا اختر گویا اس کے وجود کی خوشبو اتنی دور سے بھی محسوس کر سکتا تھا اس کا گلا خشک ہونے لگا۔

"رمنا!" وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔ "میرا خیال تھا کہ میری آنکھ کھلے گی تو تم یہاں ہوگی............" اس نے اپنے پہلو کی طرف اشارہ کیا۔

"ایسا بھی ہو سکتا ہے" وہ اپنی مرمریں انگلیاں بالوں میں پھیرتے ہوئے ایک ادائے بے نیازی سے بولی۔ "لیکن شادی کے بعد............"

پھر وہ افسردہ سے انداز میں مسکرائی۔ "ہم اس وقت شادی کا فیصلہ کر چکے تھے جب تم اچانک ہی غائب ہو گئے ہماری محبت کی کہانی ابھی تک ادھوری ہے گو کہ تاخیر بہت ہوگئی ہے لیکن میں اب بھی اس کہانی کو خوبصورت انجام دینے کی خواہشمند ہوں میں اب بھی تم سے شادی کے لئے تیار ہوں"۔

اسے ابھی احساس نہیں تھا کہ اختر کی یادداشت واپس آچکی تھی وہ نپے تلے قدم اٹھاتا اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "تو کیا تم نے اس معذور شوہر سے چھٹکارہ حاصل کر لیا ہے جسے تم نے میرے ہاتھوں مروانے کی کوشش کی تھی؟"

رمنا کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا لیکن وہ بڑے مضبوط اعصاب کی عورت تھی سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "تمہاری یادداشت واپس آگئی ہے یا گزشتہ شام سے میرے ساتھ ڈرامہ کر رہے تھے؟"

"کم از کم اختر کی حیثیت سے میری زندگی میں کبھی ڈرامے بازی کا عمل دخل نہیں رہا............ میں تو ایک بہت سیدھا سچا اور زندگی کی قدروں میں ایمان رکھنے والا آدمی تھا............ وہ نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "میری یادداشت کی گمشدہ کڑیاں ملنے کا معجزہ تو گزشتہ رات ہی رونما ہوا ہے............ وہ بھی میری بے خبری کے دوران............ مجھے یاد آگیا ہے تم نے میرے ہاتھوں اپنے شوہر سیٹھ رئیس کو قتل کرانے کی کوشش کی تھی............ اس لئے ہم نے مل بیٹھ کر ایک ناکام ڈکیتی کا منصوبہ بنایا تھا............"

"بس............ بس" رمنا ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔ "مجھے یہ سب کچھ یاد دلانے کی ضرورت نہیں میری یادداشت کھوئی نہیں ہے مجھے سب کچھ یاد ہے تم عین وقت پر غائب ہو گئے تھے تمہیں یقیناً" میرے بارے میں کوئی ایسی بات معلوم ہوئی تھی جس نے تمہیں مجھ سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا"۔

"ہاں............ سیٹھ رئیس نے مجھے وہ گفتگو سنوائی تھی جو اس وقت تم اسی خوابگاہ میں اپنے اصل عاشق سے کر رہی تھیں"۔ اختر تلخ لہجے میں بولا۔

یکدم ہی رمنا کی آنکھوں میں آنسو آگئے اس نے آگے بڑھ کر اختر کا ہاتھ تھام لیا اس کے لمس سے گویا اختر کا پتھرایا ہوا سا وجود پگھلنے لگا گیر لہجے میں بولی۔ "اختر............! مجھے اعتراف ہے میں ان دنوں کوئی زیادہ اچھی عورت نہیں تھی............ وہ میرا کچھ زیادہ ہی گمراہی کا دور تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری روح اس وقت بھی محبت ہی کی تلاش میں بھٹک رہی تھی مگر میں اپنی روح کی اس طلب............ اس پیاس کو نہ جانے کن کن طریقوں سے بجھانے کی کوشش کر رہی تھی"۔

اس کی آنکھوں سے نمی اس کے گلاب سے رخساروں پر چھلک آئی تھی وہ اختر کے ہاتھوں پر رخسار ٹکاتے ہوئے ہچکیاں سی لیتے ہوئے بولی۔ "اب وہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے بہت دیر میں جا کر میری سمجھ میں آیا ہے کہ عورت کو بھنورے کی طرح آنے اور اڑ جانے والے عیش و نشاط کے طلب گاروں اور پل دو پل کے ساتھیوں کی نہیں ایک مضبوط اور سچے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے جو محبت سے اس کا ہاتھ تھامے تو قبر تک نہ چھوڑے۔ عورت خواہ کسی بھی مقام پر پہنچ جائے اس کی ضرورت یہی رہتی ہے بے شک مجھے بہت تاخیر ہوگئی ہے لیکن میں صحیح نتیجے پر پہنچ گئی ہوں............ اور تبھی مجھے یہ اندازہ بھی ہوا کہ درحقیقت مجھے تم سے کتنی محبت تھی میں تمہیں بے وقوف نہیں بنا رہی تھی بلکہ حقیقت میں خود بے وقوف بن رہی تھی میں اب وہ رمنا نہیں ہوں جس سے تم ملا کرتے تھے میں اب سچ مچ وہ رمنا ہوں جسے شاید تم مجھے اپنے خوابوں خیالوں اور خواہشوں میں دیکھا کرتے

تھے میں نے سب کچھ چھوڑ دیا ہے بس اپنی اندر کی پیاس کو بجھانے کے لئے ایک یہ پینے پلانے کی بری عادت باقی ہے.......... اور مجھ میں کوئی برائی نہیں رہی.......... تم ہاتھ تھام لو گے تو شاید یہ تشنگی بھی مٹ جائے اور یہ بری عادت بھی چھوٹ جائے"۔

اس کے آنسوؤں سے اختر کے ہاتھ تر ہوگئے تھے اختر کا وجود اندر سے خزاں رسید پتے کی طرح کانپ رہا تھا اسے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ آنسو رمنا کی سچائی کی گواہی دے رہے تھے ورنہ اسے اختر جیسے بے حیثیت شخص کا ہاتھ تھام کر زار و قطار رونے اور اپنی سچائی کا یقین دلانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ اگر اب بھی پہلے ہی جیسی ہرجائی پہلے ہی جیسی تتلی صفت ہوتی تو اسے کسی نو عمر لڑکی کی طرح آنسو بہاتے ہوئے اختر کو اپنے پچھتاووں کے بارے میں بتانے کی بھی ضرورت نہیں تھی وہ اتنی حسین اتنی دولت مند اور اتنی بڑی عورت تھی کہ آج بھی اختر سے کہیں بہتر لوگ گھڑی دو گھڑی کے لئے بھی اس کا ہاتھ تھامنے میں فخر محسوس کرتے۔

اختر کی ٹانگوں میں جان نہ رہی وہ گھٹنوں کے بل بیڈ کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ رمنا نے سر اس کے کندھے پر ٹکا دیا اس کی زلفوں سے پھوٹتی خوشبو نے اختر کے حواس دھندلا دیئے رمنا آنسوؤں سے بھیگی سرگوشی میں بولی۔ "میں یہ اصرار نہیں کروں گی کہ تم ضرور میری باتوں کا یقین کرو۔ میرے لئے تو بس یہی خوشی کافی ہے کہ تم زندگی کی راہ میں ایک بار پھر مجھ سے ٹکرا گئے اور میں نے یہ سب کہہ ڈالا میرا دل ہلکا ہوگیا ہے اور میرا ضمیر مطمئن ہوگیا ہے۔ اب بے شک تم نفرت سے میرا ہاتھ جھٹک کر بھی چلے جاؤ تو مجھے تم سے کوئی شکوہ.......... کوئی شکایت نہ ہوگی۔ میں اسے تمہارا حق سمجھوں گی کہ تم مجھ سے نفرت کرو کبھی میں واقعی اتنی ہی بری ہوا کرتی تھی.........."

اختر کی انگلیاں بے اختیار اس کے ریشمی بالوں سے الجھنے لگیں حالانکہ وہ ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا یہ سب کچھ غیر ارادی اور اضطراری طور پر ہو رہا تھا۔ اس کے دل و ذہن کی کیفیت بدلتی جا رہی تھی رمنا کی حالت اور اس کی گفتگو نے اس کے دل کو پانی کر دیا تھا۔

"لیکن ہم شادی کیسے کر سکتے ہیں؟" وہ دھیمی سی آواز میں بولا "سیٹھ رئیس کے ہوتے ہوئے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" "سیٹھ رئیس مرچکا ہے"۔ رمنا اس کے شانے سے سر اٹھاتے ہوئے تیزی سے بولی اس کے چہرے کا گلاب آنسوؤں کی شبنم سے بھیگا ہوا تھا۔

اختر نے بری طرح چونک کر اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں جھانکا وہ جلدی سے بولی۔ "نہیں.......... نہیں.......... ایسی شکی سی نظروں سے میری طرف مت دیکھو میں نے اس نے اسے نہیں مروایا تھا میں قسم کھانے کے لئے تیار ہوں.......... وہ خود ہی

مر گیا تھا.......... اس کا انتقال ہارٹ اٹیک سے ہوا تھا۔ یہ تمہارے غائب ہونے کے چار پانچ ماہ بعد کی بات ہے میرے پاس اس کے ڈاکٹروں کی رپورٹیں موجود ہیں جن میں تصدیق کی گئی ہے کہ اس کی موت ہارٹ اٹیک سے واقع ہوئی تھی اس کے انتقال کی خبر اخباروں میں بھی چھپی تھی میرے پاس تراشے موجود ہیں.........."

اس نے گہری سانس لیتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی اور بولی۔ "میں خواہ مخواہ اسے مروانے کے لئے اتنا تردد کر رہی تھی اسی چکر میں میں نے تمہاری نظر میں اپنا امیج بھی خراب کیا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ چند ماہ بعد وہ یوں پلک جھپکتے میں مرجائے گا تو میں ہرگز ان چکروں میں نہ پڑتی مگر شاید اسی کا نام تقدیر ہے دست تقدیر اسی طرح ہم انسانوں کو اپنی انگلیوں کے اشاروں پر نچاتا ہے"۔ وہ بیڈ سے اتر کر قالین پر اسی کے برابر آ بیٹھی دونوں نے بیڈ سے ٹیک لگا لی۔

"..........تو گویا تم اب ایک آزاد اور خود مختار عورت ہو!!" اختر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بوجھل سی سانس لے کر بولا۔

"بے شک"۔ رمنا مسرور سے انداز میں مسکرائی "بالکل آزاد اور خود مختار..........! صرف آزاد اور خود مختار ہی نہیں.......... بے پناہ دولت مند بھی"۔

"لیکن ہم پھر بھی شادی نہیں کر سکتے"۔ اختر بجھے بجھے سے لہجے میں بولا۔ "کیونکہ میں شاید تمہاری طرح آزاد اور خود مختار نہیں ہوں"۔

"کیوں..........؟ تمہیں کیا ہوا؟" رمنا نے حیرت سے پوچھا۔

"میں شادی شدہ ہوں"۔ اختر نے یوں سر جھکا لیا گویا انجانے میں اس سے کوئی غلطی سرزد ہو چکی ہو۔

"تم شادی کر چکے ہو؟" رمنا نے بری طرح چونک کر اس کی طرف دیکھا اسے گویا حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

"ہاں یادداشت کھونے کے بعد جب میں شاہد کی حیثیت سے زندگی گزار رہا تھا تو میں نے ایک عورت سے شادی کر لی تھی جس کا ایک بچہ تھا اس کا گھر شاید میری وجہ سے اجڑا تھا.......... اور میں اس کے شوہر کی وجہ سے پھانسی چڑھتے چڑھتے بچا تھا.........." پھر اختر نے مختصراً اسے بتا دیا کہ کس طرح صنوبر سے اس کی شادی ہوئی تھی۔

پوری بات سننے کے بعد رمنا نے ایک بار پھر بیڈ سے ٹیک لگائی لیکن اب اس کے انداز میں بے پناہ تھکن تھی اس کے رنگت پھیکی سی پڑ گئی تھی اور جوش و خروش ختم ہوگیا تھا۔ اختر کو بھی یکدم چپ سی لگ گئی تھی وہ صنوبر کے ساتھ کچھ ایسا غیر مطمئن یا ناخوش

بھی نہیں تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس عورت نے اسے بہت آرام اور بہت سی چھوٹی چھوٹی خوشیاں دی تھیں لیکن وہ بہرحال اختر کی محبت کی شادی نہیں تھی۔ اس میں تھوڑی بہت مجبوری اور انسانی ہمدردی کو دخل تھا دوسرے اس وقت اختر کے سامنے کوئی چوائس بھی نہیں تھی۔

رمنا اب اچانک ہر فکر ہر بندھن سے آزاد ہو کر اس کے سامنے آئی تھی اور اس کی یادداشت بھی واپس آگئی تھی تو گویا دل میں حسرت کا کوئی زخم جاگ اٹھا تھا اب تو اسے ایک بدلی ہوئی عورت ہونے کا بھی دعویٰ تھا رمنا بہرحال اختر کی نو عمری اور نوجوانی کی پہلی محبت تھی ویسے بھی وہ عورت نہیں گویا ایک ساحرہ تھی۔ اختر کا ذہن اس کے سحر میں بری طرح گرفتار تھا اب وہ خود اس کی جھولی میں آ گرنے کے لئے تیار تھی تو اس کے پاؤں میں مجبوری کی زنجیر پڑی ہوئی تھی۔

"تمہیں اس بے ہودہ سے انداز میں شادی کرنے کی بھلا ضرورت ہی کیا تھی۔؟" رمنا کچھ سوچتے ہوئے یکدم ہی گویا جل کر بولی۔ "ایک ڈرائیور کی بیوی.......... ایک بچے کی ماں ...... تقریباً" ان پڑھ عورت.......... تمہارا بھلا اس سے کیا میل تھا..........؟ تمہارا اس کے کیا میل تھا؟"

"بس وہ ایک جذباتی لمحہ تھا جب میں نے اس سے شادی کا فیصلہ کیا..........اس وقت کچھ سوچا نہیں تھا حالانکہ اس کی مدد کرنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہو سکتے تھے .... مگر شاید اس وقت میں بھی خود کو بہت تنہا.......... بہت کمزور محسوس کر رہا تھا"۔

اختر کے لہجے میں پچھتاوے بول رہے تھے رمنا کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ اس نے بے ہودہ انداز میں شادی کی تھی اب تو اسے خود بھی اپنی شادی بے ہودہ نظر آ رہی تھی۔

رمنا گویا اس کے لہجے میں بولتے ہوئے پچھتاووں سے حوصلہ پا کر بولی۔ "اس عورت سے تمہارا اپنا تو کوئی بچہ نہیں ہے نا؟"

"نہیں.......... فی الحال میں باپ بننا چاہتا بھی نہیں تھا۔" اختر نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"پھر تو تمہاری اس سے زیادہ جذباتی وابستگی نہیں ہوگی اسے طلاق دے کر فارغ کرو اس سوسائٹی میں تو مردوں کے لئے یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے تین لفظ بولے.......... عورت کی چھٹی!" رمنا استہزائیہ سے انداز میں بولی بظاہر وہ مسکرا رہی تھی لیکن تجویز یقیناً" سنجیدگی سے پیش کر رہی تھی۔

"بغیر کسی معقول عذر کے تو یہ کوئی اچھا کام نہیں ہے"۔ اختر ہچکچاہٹ سے بولا۔

"بھئی وہ تو محض مصیبت کے عالم میں مدد طلب کرنے کے خیال سے تمہارے پاس آئی تھی تم نے ہمدردی میں آ کر اور کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو کر یہ زنجیر خود ہی اپنے پیروں میں ڈالی ہے اب بھی اگر تم اسے چھوڑو گے تو اس کا مسئلہ جذباتی کم اور مالی زیادہ ہو گا لہٰذا اسے کچھ دے دلا کر رخصت کر دو تم صرف تین لفظ کہنے کی ہمت کر لو اسے دو چار لاکھ روپے میں دے دوں گی"۔

اختر نے کوئی جواب نہ دیا ایک لمحے کی خاموشی کے بعد رمنا بولی۔ "بولو نا .... کیا کہتے ہو؟"

اختر بدستور ہچکچاہٹ کا شکار تھا وہ رمنا سے نظر چراتے ہوئے بولا۔ "مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگے گا.......... بڑی خود غرضی سی لگ رہی ہے.........." وہ ایک بار پھر پہلے والا اختر حسین بن چکا تھا جس کی فطرت میں مروت لحاظ اور وضعداری تھی۔ "وہ مجھ سے محبت بھی تو کرتی ہے.......... بہت محبت کرتی ہے.........."

"وہ تو معلوم نہیں محبت کرتی تھی ہے یا نہیں.......... لیکن مجھے لگتا ہے تم ضرور اس کی محبت میں گرفتار ہو چکے ہو" رمنا جل کر بولی۔ "میں خواہ مخواہ تمہارے ساتھ مغز ماری کر کے اپنا اور تمہارا وقت ضائع کر رہی ہوں شاید تمہاری مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں رہی"۔

"نہیں یہ مت کہو"۔ اختر گویا تڑپ کر بولا۔ "تم میرا خواب ہو مجھے ابھی پتہ چلا ہے کہ میرے ذہن سے تمہارے نقوش ابھی تک نہیں مٹے اور شاید کبھی نہ مٹ سکیں"۔

"تو پھر کوئی راستہ نکالو.......... میں تمہاری دوسری بیوی کی حیثیت سے تو نہیں رہ سکتی تم اگر میرے بنو گے تو صرف، میرے ہی رہو گے۔ میں تمہیں کسی اور کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی"۔ رمنا نے گویا فیصلہ سنا دیا اختر کے چہرے سے کشمکش کی اذیت عیاں تھی۔

دفعتہ" رمنا کھل اٹھی اور اس کا بازو تھامتے ہوئے بولی۔ "میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے تم اس سے کہہ سکتے ہو کہ تمہاری یادداشت واپس آگئی ہے ظاہر ہے یہ بات کوئی جھوٹ بھی نہیں ہے جھوٹ تم صرف اتنا سا بولو گے کہ تمہارے گم ہونے اور یادداشت کھونے سے پہلے درحقیقت میں ہی تمہاری بیوی تھی جب تم نے اس سے شادی کی وہ تو ایک طرح سے تمہارا دوسرا ہی جنم تھا تمہارا اس سے شادی کرنا ایک قسم کی نادانستہ غلطی تھی۔ اب تم اپنی اصل زندگی اور اصل دنیا میں واپس جانا چاہتے ہو تم اس سے نرمی محبت اور عاجزی سے درخواست کرنا ساتھ اچھی خاصی رقم کی پیشکش کرنا وہ تھوڑا بہت روئے دھوئے گی لیکن آخر مان جائے گی"۔

اختر اب بھی خاموش تھا۔ وہ واقعی زندگی کے ایک عجیب دوراہے پر کھڑا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے ایسی صورت حال سے بھی واسطہ پڑ سکتا.......... وہ رمنا کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ رمنا کو پانے کی خواہش اس کے دل میں بڑی شدت سے عود کر آئی تھی۔

رمنا بولی.......... "اب میں کچھ ایسی نو عمر اور نوخیز بھی نہیں رہی کہ بیٹھی تمہارا انتظار کرتی رہوں۔ عمر کی ریت میری مٹھی سے پھسلی چلی جا رہی ہے۔ میں چاہتی ہوں اس بڑے سے گھر میں اپنے من چاہے جیون ساتھی کے بازوؤں کی پناہ میں ایک پرسکون عورت کی طرح زندگی گزاروں۔ تنہا رہنے اور ادھر ادھر بھٹکنے سے مجھے خوف آنے لگا ہے.........."

"میری ہمت نہیں پڑ رہی کہ جا کر صنوبر سے یہ سب کچھ کہوں.........." اختر بولا۔

"میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں.......... میں اس سے بات کروں گی" رمنا بولی۔ اختر بدستور ہچکچاہٹ کا شکار تھا لیکن رمنا کی مزید تھوڑی دیر کی بحث و تمحیص کے بعد وہ اسے ساتھ لے جانے پر رضامند ہو گیا۔

ناشتہ کرنے اور تازہ دم ہونے کے بعد وہ رمنا کے ساتھ اس کی شاندار گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوا۔ گاڑی جب اس سڑک پر پہنچی جس پر وہ پلازہ واقع تھا جس میں اختر رہتا تھا تو صنوبر اسے دور سے ہی فٹ پاتھ پر آتی نظر آ گئی۔ اس کی حالت پاگلوں جیسی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں وحشت تھی۔ پیروں میں چپلیں گھسیٹتی وہ دیوانوں کی طرح ادھر ادھر دیکھتی آ رہی تھی۔ بچہ اس کی انگلی پکڑے ساتھ گھسٹتا آ رہا تھا۔ صنوبر سڑک اور فٹ پاتھ پر آنے جانے والے ہر چہرے کو متلاشی نظروں سے دیکھتی جا رہی تھی۔

اختر نے رمنا کو اشارے سے بتایا کہ فٹ پاتھ پر آتی ہوئی وہ بدحواس سی عورت اس کی بیوی تھی۔ گاڑی ایک ہلکے سے دھچکے کے ساتھ اس کے قریب جا رکی۔ وہ ہڑبڑا کر ذرا پیچھے ہٹ گئی لیکن اختر کو گاڑی سے اترتے دیکھ کر بے تابانہ آگے بڑھی۔ بچہ بھی توتلی سی زبان میں "ڈیڈی.......... ڈیڈی" کرتا اختر کی ٹانگوں سے آن لپٹا۔

"تم کہاں تھے شاہد؟" صنوبر رو دینے والے انداز میں بولی۔ "میں تو رات بھر تمہارے انتظار میں جاگتی رہی.......... روتی رہی.........." اس کی سرخ اور سوجی ہوئی آنکھیں اس بات کی گواہی دے رہی تھیں کہ اس کی رات واقعی جاگتے اور روتے گزری تھی۔

وہ ہچکی سی لے کر بات جاری رکھتے ہوئے بولی.......... "میں تو صبح سے پبلک کال آفس والے سے سب بڑے اسپتالوں اور تھانوں کے نمبر معلوم کر کے ٹیلیفون کرنے کی کوشش کر رہی تھیں.......... کہیں سے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا.......... اب میں خود تمہارا پتا کرنے نکلی تھی.......... کہاں رہ گئے تھے تم؟"

اختر کے دل کو جیسے کچھ ہونے لگا.......... اتنی محبت کرنے والی عورت کو وہ کیسے چھوڑ سکتا تھا؟

اس دوران رمنا بھی گاڑی سے اتر کر ان کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی اور نخوت آمیز تجسس سے صنوبر کا سر تاپا جائزہ لے رہی تھی۔ صنوبر کا لباس معمولی اور شکن آلود تھا۔ شب رفتہ کی پریشانی، درماندگی اور تھکن نے اس کے چہرے میں پنجے گاڑے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ ذرا بھی دلکش نظر نہیں آ رہی تھی۔ رمنا اس کے سامنے کسی ملکہ کی سی تمکنت سے کھڑی - تھی۔ اس کے مقابل ہونے کی وجہ سے صنوبر کی شخصیت کی بے کیفی کچھ اور نمایاں ہو گئی تھی۔ ان دونوں کے درمیان کچھ ایسا ہی فرق نظر آ رہا تھا جیسا کسی چمکتے دمکتے ہیرے اور عام سے پتھر میں ہو سکتا تھا۔

صنوبر نے نہ جانے کیوں خوفزدہ سی نظروں سے رمنا کی طرف دیکھا۔ پھر اس کی شاندار اور لمبی سی چمکتی دمکتی گاڑی پر نظر ڈالی۔ اس کی آواز گویا حلق میں ہی اٹک گئی۔ وہ مزید کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ بچہ "ڈیڈی.......... ڈیڈی" کہتے ہوئے بار بار بازو اوپر اٹھا رہا تھا۔ رمنا بھی خاموش تھی۔ اس کا چہرہ سنگ مرمر سے تراشا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بھی کسی تاثر کا اندازہ کرنا مشکل تھا کیونکہ اس نے بڑے بڑے شیشوں والا تاریک چشمہ لگا لیا تھا۔

ایک طویل لمحے کے سکوت کے بعد صنوبر سرسراتی سی آواز میں اختر سے مخاطب ہوئی.......... "یہ عورت کون ہے شاہد؟"

جواب اختر کے بجائے رمنا نے دیا۔ وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔ "یہ شاید نہیں.......... اختر ہے.......... چلو.......... ذرا گھر چلو.......... ہمیں تم سے ضروری بات کرنی ہے"۔ اس نے صنوبر کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

چند لمحے بعد وہ پلازہ کی چار دیواری میں داخل ہوئے تو وہاں کا منظر اختر کو کچھ اچھا نہیں لگا۔ مختصر سے کمپاؤنڈ میں چاروں طرف بچوں کا ہجوم تھا جن کے حلیے کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے۔ اس روز اسکول کی چھٹی تھی اس لئے وہ سب مختلف کھیلوں میں مشغول تھے۔ کسی کونے میں کرکٹ ہو رہی تھی.......... کہیں بیچ راستے میں فٹ بال میچ جاری تھا اور کہیں جوش و خروش سے ہاکی چل رہی تھی۔ جگہ کی کمی کے باعث سب ٹیمیں ایک دوسرے میں گڈمڈ تھیں۔ بڑی سی گاڑی کھڑی کرنے کی کہیں مناسب جگہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

رمنا وحشت زدہ سے لہجے میں بولی.......... "خدا کی پناہ! یہ لوگ تو گاڑی کے شیشے وغیرہ توڑ دیں گے.......... میرا خیال ہے گاڑی باہر ہی کہیں کھڑی کر دوں.........."

اس نے گاڑی ریورس کی۔ باہر کی گلیوں میں بھی اسی طرح مختلف میچ جاری تھے۔

ایک ہنگامہ برپا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک درخت کے نیچے محفوظ سی جگہ دیکھ کر رمنا نے گاڑی پارک کی اور وہ پلازہ میں واپس آئے۔ مختلف گیندوں سے بچتے ہوئے چلنا رمنا کے لئے ایک آزمائش سے کم نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر بد مزگی کے آثار تھے اور وہ زیر لب کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

تنگ سی سیڑھیوں پر کونے کھدروں میں پان کی پیکوں کے بے شمار نشانات تھے۔ جگہ جگہ کوڑے کے ڈبے رکھے تھے جن سے کوڑا اُبلا پڑ رہا تھا۔ بعض ڈبے لڑھکے ہوئے بھی تھے۔ رمنا ناک پر بڑا سا رومال نما ٹشو پیپر رکھتے ہوئے بولی.......... "اوہ.......... مائی گاڈ! اختر.......... مجھے یقین نہیں آرہا تم یہاں رہ رہے تھے.........."

"گزشتہ برسوں میں' میں اس سے بھی بد تر جگہوں پر رہا ہوں.........." اختر دھیمے لہجے میں بولا۔ وہ 'جگہ' وہ پلازہ آج اسے خود بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ یادداشت واپس آنے اور رمنا کی جنت میں ایک رات گزارنے کے بعد گویا اس کے اندر کوئی انقلاب آگیا تھا لیکن ابھی صنوبر اور بچے کی کشش کا احساس باقی تھا۔ تاہم وہ بھی پہلے سے بہت مدھم اور کمزور تھا۔

ڈربہ نما دو کمروں کے فلیٹ میں پہنچ کر وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ رمنا ناگواری سے ایک میلے سے صوفے کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ صنوبر قطعی خاموش تھی اور دہشت زدہ سی نظر آ رہی تھی.......... حتیٰ کہ اب تو بچہ بھی خاموش ہو چکا تھا۔ شاید اسے بھی کسی تبدیلی کا احساس ہو چکا تھا۔ ایک لمحے کے لئے کمرے میں اعصاب شکن سکوت طاری رہا۔

رمنا ہی نے سکوت توڑا اور صنوبر کو مخاطب کیا.......... "تمہیں یہ تو معلوم ہی تھا کہ اختر.......... جسے تم شاہد کے نام سے جانتی تھیں.......... اپنے ماضی کو بھولا ہوا تھا۔ اس کی یادداشت کھو چکی تھی۔ اس نے خود ہی اپنا نام شاہد رکھا ہوا تھا ورنہ اس کا اصل نام اختر حسین ہے اور یہ درحقیقت ٹی وی کا ایک معروف گلوکار تھا.......... شاید تم نے بھی کبھی اسے ٹی وی پر دیکھا ہو.........."

صنوبر نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی قوت گویائی جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ بس ایک ٹک رمنا کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد رمنا سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔ "یہ بھی غنیمت ہے کہ گزشتہ رات اختر کی یادداشت واپس آئی تو اسے اپنی زندگی کا دوسرا ادوار بھی یاد رہا ورنہ ہوتا عموماً" یہ ہے کہ اس طرح کے لوگوں کی اگر یادداشت واپس آتی ہے تو وہ اپنی زندگی کا دوسرا دور بھول جاتے ہیں۔ اختر کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ اسے اپنا یہ گھر یاد رہا.......... تم یاد رہیں.......... اور یہ بھی یاد رہا کہ یہ تم سے شادی کر چکا تھا اگر اسے یہ یاد

نہ رہتا تو ہمارے یہاں آنے کی نوبت ہی نہ آتی.........."

صنوبر یہ سب باتیں سن تو رہی تھی لیکن اس کا ذہن جیسے کہیں اور تھا۔ وہ تھوک نگل کر یکدم ہی بولی.......... "آپ کون ہیں؟"

رمنا گہری سانس لے کر بولی.......... "میں اختر کی پہلی بیوی ہوں۔ میں اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک چکی تھی.......... اور اب تو میں تقریباً مایوس ہی ہو چکی تھی جب یہ اچانک مل گیا۔ یہ بھی بس ایک معجزہ ہے کہ مجھ سے ملنے کے بعد اس کی یادداشت واپس آگئی ورنہ پہلے پہل تو اس نے مجھے پہچانا ہی نہیں تھا.........."

صنوبر کی یک لخت جیسے کمر سی ٹوٹ گئی۔ اس کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی اور آنکھیں نمی سے دھندلا سی گئیں۔ اس نے اختر کی طرف دیکھا تو گلوگیر سی آواز میں پوچھا.......... "اب آپ کیا چاہتے ہیں؟"

اختر نے سر جھکا لیا۔ اس کی طرف سے جواب رمنا نے دیا۔ اس وقت گویا وہی اس کی ترجمان بنی ہوئی تھی.......... "یہ اب میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے میں ان کی پہلی بیوی ہوں جس سے ان کی شادی بہ قائم ہوش و حواس ہوئی تھی.......... میں لگی لپٹی سے کام نہیں لوں گی۔ صاف گوئی سے بات کروں گی۔ تمہارا دل دکھے تو اس کے لئے میں پیشگی معذرت چاہتی ہوں۔ تم بھی عورت ہو.......... میں تمہارے محسوسات کو سمجھتی ہوں لیکن میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔ میں اپنے شوہر کو کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی۔ میں سوتن کا وجود برداشت نہیں کر سکتی۔ چاہے وہ میرے قریب رہے یا دور.......... اس لئے اختر تمہیں آزاد کر دیں گے.........."

صنوبر کی آنکھیں گویا کسی انجانی اذیت سے پھیل گئیں۔ اس کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا تھا۔ تاہم وہ خاموش رہی۔ شاید وہ حتی الامکان صبر سے رمنا کی پوری بات سن لینا چاہتی تھی۔

رمنا بولی.......... "تم سے اختر کی شادی ایک نادانستہ غلطی تھی.......... تم چاہو تو اسے اس کا ایثار بھی سمجھ سکتی ہو۔ تم اس وقت بہت برے حالات کا شکار تھیں۔ تم سمجھ لو کہ اس کے ایثار کا عرصہ اتنا ہی تھا.......... بہرحال.......... ہم تمہیں بے سہارا نہیں چھوڑیں گے۔ تمہیں اور تمہارے بچے کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ تم اسی طرح یہاں رہتی رہو گی۔ تمہیں معقول خرچ ملتا رہے گا۔ جب تک تم دوسری.......... بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ تیسری شادی نہیں کرو گی تب تک ہم تمہیں اپنی ہی اخلاقی ذمے داری سمجھیں گے.......... لیکن تم اختر سے کوئی تعلق نہیں رکھو گی۔ تم ساری بات سمجھ گئی ہو نا؟"

صنوبر گویا کسی ڈراؤنے خواب سے چونک کر سنبھلتے ہوئے بولی..........
"بیگم صاحبہ! مجھے سہارا نہیں.......... شوہر چاہئے۔ میں بھوکی رہ کر گزراہ کر لوں گی لیکن

میرا شوہر مجھ سے نہ چھینیں.........."۔

رمنا کے چہرے سے ملائمت و ہمدردی غائب ہو گئی اور اس کی جگہ قدرے سختی جھلک آئی۔ "تمہاری مثال تو اس شخص کی سی ہو گئی جسے سر راہ کوئی چیز پڑی مل جائے اور وہ خود کو مالک ہی سمجھ لے۔ اصل مالک کے مل جانے پر بھی وہ چیز واپس نہ کرے"۔

"میں یہ سب نہیں جانتی بیگم صاحبہ..........! میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ شاہد صاحب نے.............. میرا مطلب ہے اختر صاحب نے مجھ سے بھی جب نکاح کیا تب بھی یہ ہوش و حواس میں تھے.......... دیوانے نہیں تھے.......... اور اب میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ تو بالکل ایک مذاق سا ہی ہو جائے گا"۔ صنوبر سنبھلتے ہوئے بولی۔

"کبھی کبھی تقدیر انسان کے ساتھ مذاق بھی کرتی ہے"۔ رمنا تحمل سے بولی۔ "تم ابھی ٹھنڈے دل سے سوچو.......... اچھی طرح غور کرو.......... اور اپنا فائدہ نقصان سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم پھر آئیں گے.......... یہ بھی ہماری شرافت اور اعلیٰ ظرفی ہے کہ ہم تم سے تصفیہ کرنے آ گئے ہیں"۔

صنوبر نے گویا تڑپ کر اختر کی طرف دیکھا "کیا آپ کے دل میں میرے لئے ذرا سی بھی محبت نہیں رہی؟"

"یہ بات نہیں ہے.........." اختر یوں گڑ بڑا کر بولا جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔ "میں مجبور ہوں.......... رمنا دوسری عورت کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے"۔

"آپ تو تیار ہیں نا؟" صنوبر نے یکدم پوچھا۔

"میں.......... میں..........،" اختر زبان سے تو اقرار نہ کر سکا لیکن اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

تب صنوبر نے یکدم اٹھ کر رمنا کے پاؤں پکڑ لئے اور زار و قطار رونے لگی۔ روتے روتے وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "بیگم صاحبہ! میں آپ دونوں کی نوکرانی بن کر وقت گزار لوں گی .... میں آپ دونوں کی خدمت کروں گی۔ مجھے سوکن سمجھ کر نہیں' ایک ملازمہ ایک خادمہ سمجھ کر برداشت کر لیجئے گا۔ میں آپ سے کبھی کچھ نہیں مانگوں گی۔ لیکن خدا کے لئے مجھے طلاق مت دلوایئے"۔ اس نے ایک بار پھر رمنا کے پاؤں پکڑ لئے۔

"یہ تو بڑا ٹیڑھا مسئلہ آن پڑا"۔ رمنا اس سے پاؤں چھڑاتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ صنوبر کو بری طرح روتے دیکھ کر اس کا بچہ رونے لگا۔ رمنا اٹھتے ہوئے بولی۔ "دراصل ہمیں اس طرح اچانک آ کر تمہیں یہ خبر نہیں سنانی چاہئے تھی۔ خیر.......... اب بھی تم اس صدمے سے سنبھلنے کی کوشش کرو ہم پھر آئیں گے"۔

"آپ بھی جا رہے ہیں؟" صنوبر نے آنسوؤں سے بھیگی آنکھوں سے اختر کی طرف

دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے اختر کا ارادہ ڈگمگایا لیکن پھر اس نے رمنا کی طرف دیکھا تو اس کے دل کا پلڑا ایک بار پھر رمنا ہی کی طرف جھک گیا۔ اسے احساس ہوا کہ اگر وہ رمنا کو حاصل کرنا چاہتا تو اسے اپنا دل سخت کرنا پڑے گا۔

"میں پھر آؤں گا.......... آتا جاتا رہوں گا.........." وہ جلدی سے بولا۔ اسے خود بھی اپنا لہجہ کھوکھلا سا محسوس ہوا۔ صنوبر اور بچہ کمرے میں کھڑے اسے دیکھتے رہ گئے اور وہ جلدی سے گویا رمنا کا سہارا لے کر وہاں سے نکل آیا۔

نیچے آ کر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے رمنا قدرے ناگواری سے بولی۔ "تم بہت ہی کمزور قوت فیصلہ کے آدمی ہو تمہیں اس عورت کو ابھی اور اسی وقت فارغ کر دینا چاہئے تھا تین الفاظ ہی تو کہنے تھے تمہیں"۔

اختر نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ "اتنے اہم رشتے یوں چٹکی بجاتے ہی تو نہیں ٹوٹ جاتے"۔

"نئے رشتے جوڑنے کے لئے پرانے رشتوں کو چٹکی بجاتے ہی توڑنا پڑ جاتا ہے"۔ رمنا تیزی سے گاڑی ریورس کرتے ہوئے بولی۔

"مجھے حوصلہ جمع کرنا پڑے گا"۔

"لیکن تم ایک بار پھر اس کے سامنے جاؤ گے اور تمہارا حوصلہ اس کے آنسوؤں میں بہہ جائے گا"۔ رمنا ناگواری سے بولی۔

"نہیں.......... میرا خیال ہے آہستہ آہستہ یہ کام ہو جائے گا.......... اور پھر آہستہ آہستہ اسے بھول جاؤں گا اگر کوئی معقول وجہ ہوتی تو شاید میں اسے آسانی سے طلاق دے دیتا"۔

"تو کیا میں معقول وجہ نہیں ہوں؟" رمنا تیکھے لہجے میں بولی۔ "لوگ تو اپنے خوابوں کے جیون ساتھی کو پانے کے لئے کسی کو قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ایک تم ہو کہ محض زبان بھی نہیں ہلا پا رہے ہو"۔

"یہ سب کچھ اچانک ہو رہا ہے نا۔ ذرا ہچکچاہٹ تو ہو گی"۔

"زندگی اس سے بھی زیادہ تیز رفتار ہے"۔ رمنا نے کہا پھر وہ ڈرائیونگ سیٹ کے پشتے سے ٹیک لگا کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر ڈرائیو کرنے لگی وہ کسی گہری سوچ میں تھی مگر گاڑی بدستور مشاقی سے ڈرائیو کر رہی تھی۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔ "یہ بات بہرحال طے ہے کہ یہ عورت آسانی سے تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گی بہت رونا دھونا مچائے گی.......... اور میں نہیں چاہتی کہ کسی کو اس معاملے کی ہوا بھی لگے اس سے تو اچھا تھا کہ ہم یہاں نہ ہی آتے وہ کچھ عرصہ تمہیں ڈھونڈ ڈھانڈ کر رو دھو کر صبر کر کے بیٹھ جاتی۔ یہ پر ہجوم شہر مہران بھی ہے اور بے

حد سفاک بھی یہاں کی بھیڑ بھاڑ میں ایک بار کسی کا ہاتھ چھوٹ جائے تو پھر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب دوبارہ سامنا ہو گا"۔

اختر خاموش رہا رمنا بے شک اس کے خوابوں کی عورت تھی لیکن اسے لگ رہا تھا کہ وہ خاصی مہنگی قیمت پر اسے حاصل کر رہا تھا اسے ایک بڑی اذیت سے گزرنا پڑ رہا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد رمنا بولی۔ "بہر حال.......... ہمیں شادی تو کر لینی چاہئے اس کے سامنے تو ہم نے دعویٰ کر دیا ہے کہ میں تمہاری پہلی بیوی ہوں اب ہم پرانی تاریخوں میں تو نکاح نامہ تیار نہیں کرا سکتے کم از کم اب تو شادی کر لیں۔ میرا خیال ہے کل ہی سادگی سے نکاح پڑھوا لیا جائے اور پرسوں ہم لوگ ایک مختصر سے ہنی مون پر مری چلے جائیں گے ایک ہفتے میں واپس آ جائیں گے آج کل بزنس میں خود چلا رہی ہوں میں زیادہ عرصے آفس سے غیر حاضر نہیں رہ سکتی"۔

☆ ============ ☆ ============ ☆

شادی نہایت سادگی سے ہو گئی اور وہ مری میں ایک ہفتے کے قیام کے بعد واپس بھی آ گئے۔ اختر کے لئے گویا زندگی کے ایک عجیب ہی دور کا آغاز ہوا تھا۔ اس کے تمام تشنہ تعبیر خوابوں کو تعبیر مل گئی تھی۔ راتوں رات ہی اس کی دنیا بدل گئی تھی۔ محل نما گھر.......... شاندار گاڑیاں.......... زندگی کی ہر آسائش.......... جھک جھک کر سلام کرتے ہوئے نوکر چاکر.......... وہ تمام تعیشات جن کے اس نے شاید کبھی خواب دیکھے تھے.......... اور رگ و پے میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دینے والی رمنا کی رفاقت۔ یہ سب کچھ اسے اچانک ہی حاصل ہو گیا تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

صنوبر کے بارے میں بھی اس کے دل میں خلش کم ہو گئی تھی لیکن جب رمنا کی رفاقت کے ہنگامے ذرا ٹھنڈے پڑے تو اس نے فیصلہ کیا کہ جا کر صنوبر کی خبر بھی لے لینی چاہئے۔ اس نے رمنا کو بھی بتا دیا کہ وہ صنوبر سے ملنے جا رہا تھا اسے حیرت ہوئی کہ رمنا نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس نے خود اختر کے ساتھ چلنے کی فرمائش بھی نہیں کی۔ شاید اسے اطمینان ہو چکا تھا کہ اختر بہر حال اس کا ہو چکا تھا اور اب وہ کہیں نہیں جا سکتا تھا۔

رمنا نے دوسری شاندار گاڑی اختر کے لئے مخصوص کر دی تھی اس میں بیٹھ کر وہ صنوبر سے ملنے پہنچا۔ اسے امید تھی کہ تنہائی میں وہ صنوبر کے ساتھ بہتر طور پر اپنے معاملات طے کر لے گا لیکن جب وہ فلیٹ پر پہنچا تو وہاں تالا لگا ہوا تھا وہ سمجھا کہ شاید صنوبر کہیں سودا سلف لینے گئی ہو گی وہ خاصی دیر وہیں کھڑا انتظار کرتا رہا۔

ایک پڑوسن نے باہر آتے جاتے وقت کافی دیر تک اسے کھڑے دیکھا تو رک کر ناگواری سے ناک چڑھاتے ہوئے بولی۔ "اب کس لئے کھڑے انتظار کر رہے ہو؟ تم نے خود ہی تو اس بے چاری کو طلاق دے دی۔ اس کے رشتے دار آ کر اسے لے گئے وہ تو فلیٹ کی

چابی بھی مالک مکان کے لئے چھوڑ گئی تھی"۔

"رشتے دار..........؟" اختر نے حیرت سے دہرایا۔ جہاں تک اسے معلوم تھا صنوبر نے کسی رشتے دار کا ذکر نہیں کیا تھا وہ اٹکتے ہوئے بولا۔ "میں نے اسے طلاق تو نہیں دی تھی.......... ابھی تو بات چیت چل رہی تھی"۔

ادھیڑ عمر پڑوسن برہمی سے بولی۔ "تم مرد اسی طرح کرتے ہو۔ پہلے غصے میں طلاق دے دیتے ہو غصہ اترتا ہے تو مکر جاتے ہو تم لوگوں نے طلاق کو مذاق بنا رکھا ہے.........." شاید خود اس عورت کے ساتھ بھی کوئی ایسی ہی ٹریجڈی وابستہ تھی وہ خاصی جذباتی ہونے لگی تھی۔

"کیا صنوبر نے آپ سے خود کہا تھا کہ اسے طلاق ہو گئی ہے؟" اختر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں میں تو باہر جا رہی تھی کہ ایک شخص کو میں نے تمہارے فلیٹ سے نکل کر تالا لگاتے دیکھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر چابی میرے حوالے کر دی کہ جب مالک مکان آئے تو میں اس کو دے دوں میں نے کل ہی مالک مکان کو دی ہے۔ اسی شخص نے جاتے جاتے مجھے بتایا تھا کہ صنوبر ان کی رشتے دار تھی اور وہ لوگ اسے ساتھ لے جا رہے ہیں کیونکہ اسے طلاق ہو گئی ہے"۔ عورت نے بتایا۔

اختر گھر واپس آیا تو اس کا سر گھوم رہا تھا اس نے یہ بات رمنا کو بتائی تو وہ اطمینان سے بولی۔ "چلو اچھا ہوا تمہیں یا مجھے کچھ نہیں کرنا پڑا خود ہی پیچھا چھوٹ گیا اصل میں اسے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ طلاق اسے ہر حال میں ہو گی اس نے عزت آبرو سے غائب ہو جانا ہی بہتر سمجھا ہو گا"۔

"اس نے کبھی مجھ سے اپنے کسی رشتے دار کا ذکر نہیں کیا تھا"۔ اختر بوجھل سے لہجے میں بولا۔

"ضروری نہیں کہ اس نے اپنی زندگی کی ہر بات ہی تمہیں بتا دی ہو"۔ رمنا بے پروائی سے بولی۔

"مسئلے کا کوئی فیصلہ ہوئے بغیر بھلا وہ کیسے غائب ہو سکتی تھی؟" اختر ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں تمہیں ایک قیمتی مشورہ دوں؟ رمنا یکدم بدلے ہوئے سے لہجے میں بولی۔ "تم کبھی یقین سے یہ کہنے کی کوشش نہ کرنا کہ ایک عورت کیا سوچ رہی ہے.......... کبھی یہ دعویٰ مت کرنا کہ تم عورت کے ذہن میں جنم لینے والے ہر خیال سے آگاہ ہو"۔

پھر وہ ذرا ملائمت سے بولی۔ "آخر تم اسے عورت کے لئے اتنی پریشانی میں کیوں مبتلا ہو؟ وہ کوئی ایسی قابل رشک عورت تو نہیں تھی"۔

"میں اس لئے اس کے بارے میں پریشان ہوں کہ مجھے شبہ ہے اسے تم نے غائب کرا دیا ہے"۔ اختر دل کی بات کہے بغیر نہ رہ سکا۔

رمنا کا چہرہ یک لخت پتھر سا ہو گیا وہ گویا پلک جھپکنا بھول گئی۔ ایک ٹک اختر کی طرف دیکھتے ہوئے وہ سرد لہجے میں بولی۔ "مجھے الزام تراشیوں سے نفرت ہے اگر ابھی سے تمہاری بدگمانیوں کا یہ عالم ہو چلا ہے تو زندگی کا طویل سفر کیسے کٹے گا؟"

اس کی نظروں میں نہ جانے کیا بات تھی کہ اختر ایک لمحے کے لئے خوف زدہ ہو گیا اس نے اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں کی اسے چپ سی لگ گئی۔ اس دن سے ان کے درمیان ایک سرد مہری سی در آئی لیکن اختر نے دوبارہ یہ موضوع نہیں چھیڑا تب رفتہ رفتہ کی سرد مہری دور ہو گئی اور زندگی میں وہی ہمی' وہی ہنگامہ خیزی لوٹ آئی۔

روزانہ انہیں خود کہیں نہ کہیں پارٹی میں جانا ہوتا تھا یا ان کے اپنے عظیم الشان بنگلے میں پارٹی کا اہتمام ہوتا تھا۔

اس دوران اختر ایک بار پھر اپنے پرانے فلیٹ پر گیا وہاں کوئی اور کرائے دار آ چکے تھے۔ مالک مکان نے سامان عمارت کے تہہ خانے میں امانتاً رکھوا دیا تھا۔ اختر خاموشی سے لوٹ آیا اس کے ضمیر کی خلش بڑھ گئی اس کے تصور میں بار بار صنوبر کی تصویر ابھر آتی۔ وہ اسے اسی طرح زار و قطار روتی ہاتھ جوڑتی دکھائی دیتی جس طرح آخری ملاقات میں اختر نے اسے دیکھا تھا۔ اختر نے رمنا کے پاؤں پکڑتے دیکھتا پھر اس کی آنسوؤں میں بھیگی آواز کانوں میں ابھرتی۔ "بیگم صاحبہ! میں آپ دونوں کی نوکرانی بن کر زندگی گزار لوں گی.......... میں آپ دونوں کی خدمت کروں گی.......... میں آپ سے زندگی بھر کچھ نہیں مانگوں گی.......... لیکن خدا کے لئے مجھے طلاق مت دلوائیے"۔

پھر اختر کو اس بچے کی معصوم سی صورت یاد آتی جو اسے ہی باپ سمجھتا تھا اور اس کے بغیر سوتا نہیں تھا یہ تصویریں اس کے ذہن کی لوح پر زخم کی طرح نقش ہو چکی تھیں وہ انہیں جتنا کھرچنے کی کوشش کرتا' وہ اتنی ہی گہری ہو جاتیں خود فراموشی کی آغوش میں پناہ لینے کے لئے اس نے کچھ زیادہ ہی پینا پلانا شروع کر دیا وہ اکثر ہی مدہوش رہنے لگا حتیٰ کہ ایک روز خود رمنا اسے ٹوکنے پر مجبور ہو گئی۔ رات کو گھر میں پارٹی کے دوران وہ بعض معزز مہمانوں سے نہ جانے کیا مذاق کرتے ہوئے سوئمنگ پول میں جا گرا تھا رمنا نے بڑی خجالت محسوس کی۔

دوسرے روز نشہ اترنے پر رمنا نے اسے سرزنش کی تو وہ بولا۔ "تم نے خود ہی تو پینا پلانا سکھایا ہے"۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تھرڈیٹ لوگوں کی طرح اپنے ظرف سے کہیں زیادہ پی کر ادھر ادھر گرتے پھرو آج سوئمنگ پول میں گرے کل کسی نالے میں پڑے پائے جاؤ

گے"۔ رمنا برہمی سے بولی۔ "تم تو بہت کمزور ذہن اور کمزور قوت ارادی کے مالک ہو۔ پیتی میں بھی ہوں لیکن جب چاہتی ہوں ہاتھ روک لیتی ہوں جب چاہتی ہوں پھر کئی کئی دن نہیں پیتی"۔

پھر وہ ترحم بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے متاسفانہ سے لہجے میں بولی۔ "میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنی کمزور شخصیت کے مالک ہو گے۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر تمہاری شخصیت میں کچھ کمزور پہلو بھی ہوں گے تو ہمارے طبقے میں آنے کے بعد وہ ٹھیک ہو جائیں گے"۔

اختر اسے نہیں بتا سکا کہ وہ کون سی پرچھائیاں تھیں جو اسے پریشان رکھتی تھیں دوسرے وہ رمنا کی جس شخصیت جس شان و شوکت سے سحر زدہ ہو کر اس کی طرف کھنچتا چلا آیا تھا جلد ہی ان سب چیزوں سے اس کا دل بھر گیا تھا بہت کم عرصے میں ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ رمنا کی شخصیت کچھ ایسی طلسمی بھی نہیں تھی جیسی وہ سمجھتا تھا اور دولت شان و شوکت یا تعیشات میں وہ سکون وہ خوشی بھی نہیں تھی جس کا وہ متلاشی تھا۔ سب کچھ کھوکھلا مصنوعی اور بے کیف تھا اس سے زیادہ تو وہ صنوبر کے ساتھ غربت میں خوش تھا۔

شادی کے چند ماہ بعد اس پر یہ انکشاف بھی ہوا تھا کہ رمنا اس پر ایسی بھی فریفتہ نہیں تھی چند ماہ تو بڑی وارفتگی اور والہانہ پن میں گزرے تھے اس نے گویا اختر کو کسی اور ہی دنیا میں پہنچا دیا تھا اپنی محبت سے اختر کے حواس پر ایک الگ ہی قسم کا نشہ سا طاری کر دیا تھا لیکن اس کے بعد اس کی وہی آوارہ مزاجی عود کر آئی تھی اور اس کے گرد نئے نئے دوست منڈلاتے نظر آنے لگے تھے۔ شوہر اس کے لئے صرف سوسائٹی میں سر اٹھا کر چلنے کے لئے ایک سہارے ایک آڑ کی طرح تھا۔ اختر کو یہ اذیت بھی ڈسنے لگی تھی۔

اس اذیت کو ایک روز کمال احمد نے دوچند کر دیا۔ کمال احمد ایک دفتر میں آفیسر تھا دولت مندوں کو اس سے کام پڑتے رہتے تھے۔ دولت مندوں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا بھی تھا۔ رمنا نے کئی بار اختر کو اس پاس کاروباری سلسلوں میں بھیجا تھا اور غیر محسوس طور پر اختر کی اس سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی وہ پینے پلانے کا بھی شوقین تھا دونوں اکٹھے بیٹھ کر پینے لگے تھے۔

ایسی ہی ایک نشست میں جب دونوں ذرا نشے میں بہک کر ایک دوسرے کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھنے کی کوشش کر رہے تھے تو کمال بولا۔ "اختر.......... میرے یار.......... ! تم نے ایسی خطرناک عورت سے شادی کیوں کر لی..........؟"

"خطرناک..........؟" اختر نے ہچکیاں لیتے اور جھومتے ہوئے دہرایا۔

"ہاں.........." کمال بھی جھومتے ہوئے بولا۔ "یہ تو بڑی عجیب اور پراسرار سی عورت ہے.......... کسی جادوگرنی کی طرح.......... یہ تو گویا مرد کو مکھی بنا کر دیوار سے

چپکا دیتی ہے۔.......... جو لوگ بھی اسے تھوڑا بہت جاننے لگتے ہیں وہ تو اسے سے خوف کھانے لگتے ہیں.......... اسی لئے تو یہ نت نئی دوستیاں استوار کرتی رہتی ہے..........“۔

اختر کے ذہن میں وہ پرچھائیاں کچھ اور گہری ہو گئیں جو اسے بے چین رکھتی تھیں زار و قطار روتی ہوئی اور ہاتھ جوڑتی ہوئی صنوبر اسے زیادہ یاد آنے لگی معلوم نہیں رمنا نے اسے کہاں غائب کرا دیا تھا اور وہ کس حال میں تھی؟ زندہ بھی تھی یا..........؟ یہ سوچتے ہوئے اسے جھرجھری سی آ جاتی اور وہ مزید ایک پیگ کی ضرورت محسوس کرنے لگتا۔ کمال احمد کی باتیں اس کے ذہن میں گونجنے لگتیں۔

آخر ایک روز نشے کے عالم میں وہ رمنا کے سامنے پھٹ پڑا۔ ”میں جاننا چاہتا ہوں کہ صنوبر کہاں ہے؟ مجھے معلوم ہے اسے تم نے غائب کرایا ہے.......... کیا تم چاہتی ہو کہ میں قانونی طریقے سے اس کی تلاش شروع کراؤں؟“

رمنا کے چہرے سے یک لخت سرد مہری جھانکنے لگی وہ سرد اور سفاک لہجے میں بولی۔

”تو اب تم مجھے قانون کی دھمکیاں بھی دینے لگے..........! بہت خوب..........! کہیں ایسا نہ ہو کہ قانون کی مدد سے اسے تلاش کرتے کرتے تم خود کہیں کھو جاؤ۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ قانونی طور پر خود تمہاری اپنی پوزیشن کچھ اچھی نہیں ہے تم ایک بیوی کو طلاق دیئے بغیر.......... اس سے اجازت لئے بغیر دوسری شادی کئے بیٹھے ہو“۔

اختر کا جوش و خروش ٹھنڈا ہو گیا رمنا گویا اس کی حالت پر ترس کھاتے ہوئے بولی۔ ” آخر تم اس گھٹیا اور ٹٹ پونجیا عورت کو بھول کیوں نہیں پاتے؟ ایسی کیا خوبی تھی اس میں □>

”وہ تم سے زیادہ وفاشعار تھی“۔ اختر بے ساختہ بولا۔

”ہاں..........“ رمنا زہریلے لہجے میں بولی۔ ”تم نے اس کی جو کہانی مجھے سنائی تھی اس سے واقعی اس کی وفا شعاری کا اندازہ ہوتا تھا پہلے اس نے اپنے شوہر سے وفا نبھائی.......... پھر اس سیٹھ سے وفا نبھائی جس کے ہاں اس کا شوہر ڈرائیور تھا.......... پھر وہ وفا نبھانے تمہارے پاس آ گئی.......... اور بھی نہ جانے کس کس سے وفا نباہ چکی ہو گی..........“۔

”شٹ اپ..........“ اختر چیخا۔

”اس بار معاف کر رہی ہوں آئندہ کبھی چیخ کر مجھے شٹ اپ کہنے کی جرات نہ کرنا“۔ رمنا کی آنکھیں دہک اٹھیں۔

رفتہ رفتہ حالات اس نہج پر پہنچ گئے کہ اختر کو یقین ہونے لگا کہ وہ مزید اس گھر میں رہا تو ذہنی توازن کھو بیٹھے گا۔ ان دنوں رمنا کا افیئر امریکہ سے آئے ہوئے ایک لمبے تڑنگے سانولے سے نوجوان سے چل رہا تھا۔ اختر کو خود اپنی حالت قابل رحم محسوس ہونے لگی

تھی۔ پینے پلانے کے باوجود اسے سونے کے لئے خواب آور گولیوں کی ضرورت پڑتی تھی۔

اس روز ان کی شادی کی دوسری سالگرہ تھی۔ رمنا نے گھر پر ایک زبردست پارٹی کا اہتمام کیا تھا ایسی پارٹیوں میں عموماً“ وہ خوب پیتا تھا لیکن اس روز اس نے شراب کو ہاتھ تک نہ لگایا وہ بالکل سنجیدہ اور ہوش و حواس میں رہنا چاہتا تھا اس نے اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ کر لیا تھا۔

رات گئے پارٹی کا ہنگامہ تھما اور رمنا خواب گاہ میں پہنچی تو اختر پہلے سے وہاں موجود تھا۔ آج وہ شادی کی سالگرہ کی خوشی میں اس پر مہربان نظر آ رہی تھی شب خوابی کا لبادہ پہن کر وہ خوشبوؤں میں بسی اس کے قریب آ بیٹھی اور مہرباں بازوؤں کا حلقہ بنانے لگی اور اختر آہستگی سے اس کے بازو ہٹاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے آج تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے“۔

”میری قربت سے زیادہ ضروری بھی کوئی بات ہے کیا؟“ وہ شوخ ہلکے سے مخمور انداز میں مسکرائی۔

”ہاں..........“ وہ افسردگی سے بولا۔ ”تمہاری کشش.......... تمہاری افسانوی محبت کا طلسم.......... یہ سب ایک دھوکا تھا۔ سراب تھا۔ میں بہت احمق تھا.......... نا تجربہ کار تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا زندگی کی حقیقتیں کتنی سفاک ہیں اور زمانہ کتنا آگے چلا گیا ہے۔ خصوصاً“ دولت مندوں کے لئے اب میرا ہر نشہ اتر چکا ہے.......... حتیٰ کہ شراب کا نشہ بھی.......... آج سے میں شراب کو بھی چھوڑ رہا ہوں اور تمہیں بھی“۔

”کیا..........؟“ رمنا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”ہاں۔ تمہیں اپنی عیش و عشرت کی زندگی اور اپنی یہ چمکتی دمکتی دنیا مبارک میں اب اس دنیا سے رخصت ہونا چاہتا ہوں معلوم نہیں تم نے کس مصلحت کے تحت میاں بیوی کے اس کمزور سے رشتے کو برقرار رکھا ہوا ہے.......... حالانکہ میرے خیال میں تمہیں اس کی ضرورت نہیں ہے بہر حال.......... میں اس رسمی رشتے کو توڑ رہا ہوں آج سے تم میری طرف سے آزاد ہو۔ میں تمہیں طلاق..........“

”یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟“ رمنا سرسراتی سی آواز میں بولی۔ وہ بھی یکدم، حد سے زیادہ سنجیدہ نظر آنے لگی تھی اس کی آنکھوں میں اب بھی گلابی ڈورے تیر رہے تھے مگر لہجے سے خمار غائب ہو گیا تھا۔

”ہاں یہ میرا آخری فیصلہ ہے؟“ اختر اٹل لہجے میں بولا۔

رمنا نے چند لمحے سوچا کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ”ٹھیک ہے.......... جب تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں بھلا کیا کر سکتی ہوں تم اپنا مردوں والا حق استعمال کر سکتے ہو لیکن ٹھہرو.......... ہمیں اچھے دوستوں کی طرح جدا ہونا چاہئے۔ میں ڈرنک تیار کر کے لاتی ہوں ہم آج ساتھ بیٹھ کر آخری ڈرنک لے لیں اس کے بعد تم بے شک شراب بھی چھوڑ

دینا......... اور مجھے بھی"۔

"چلو......... تمہاری فرمائش ہے تو یونہی سہی"۔ اختر بولا۔

رمنا کچن میں چلی گئی کچن کی ایک دیوار میں بھی بار موجود تھا۔ چند لمحے بعد وہ ایک چھوٹی سی ٹرے میں دو ڈرنکس رکھے لے آئی۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ رمنا کے چہرے پر تاسف، پچھتاوے یا ندامت کی کوئی رمق نہیں تھی صرف گہری سنجیدگی تھی وہ ایک ٹک اختر کی طرف دیکھے جا رہی تھی اختر نے سگریٹ کی تلاش میں جیب میں ہاتھ مارا اس کی جیب سے نکلنے والا پیکٹ خالی تھا۔

وہ تھکے تھکے انداز میں سنٹر ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ذرا سگریٹ باکس اٹھانا......... تھکن کے مارے مجھ سے تو ہلا بھی نہیں جا رہا"۔

رمنا اٹھی اور جا کر شیشے کی تپائی سے سگریٹ باکس اٹھا کر لوٹ آئی۔ اختر نے سگریٹ سلگا کر جام اٹھایا رمنا نے بھی گلاس بلند کیا اختر بولا۔ "ان خوبصورت یادوں کے نام......... جو نہ جانے کہاں کھو گئیں"۔

"یادوں کے نام.........!" رمنا مسکراتے ہوئے بولی اور دونوں نے جام ہونٹوں سے لگا لئے کمرے میں مدھم مدھم موسیقی بکھر رہی تھی وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتے رہے دفعتاً" رمنا بولی۔ "ارے......... تم تو رو رہے ہو.................!"

"اچھا.........؟" اختر نے رخساروں پر ہاتھ پھیر کر نمی صاف کی۔ "مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ میں رو رہا ہوں"۔ وہ مسکرایا۔

وہ گلاس خالی کر چکے تو رمنا گہری سانس لے کر بولی۔ "اب میں بھی تمہیں کچھ ضروری باتیں بتا دوں۔ میری زندگی میں تم پہلے مرد ہو جس نے مجھے چھوڑ کر جانے کی بات کی ہے ورنہ ہوا یہی ہے کہ میں نے جب جسے چاہا چھوڑ دیا کوئی مجھے چھوڑ کر نہیں گیا یہ میری توہین تھی جسے میں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ تم مجھے طلاق دے کر نہیں جا سکتے میں نے تمہاری ڈرنک میں زہر ملا دیا تھا جس کا اثر پانچ سات منٹ میں ہو گا لیکن ظاہر یہی ہو گا کہ تمہاری موت ہارٹ اٹیک سے ہوئی ہے........."

اختر کے سکون میں کوئی فرق نہ آیا وہ نئی سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ "مجھے پہلے ہی کچھ شبہ ہوا تھا اس لئے میں نے تمہیں سگریٹ باکس اٹھانے کے لئے کہا تھا جونہی تم نے منہ پھیرا میں نے اپنی ڈرنک تمہاری ڈرنک سے بدل لی تھی زہر آلود شراب میں نے نہیں، تم نے پی ہے........."

"نہیں.................." رمنا چیخی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا مرمریں گلا تھام لیا۔

اختر افسردگی سے بولا۔ "مجھے افسوس ہے ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے آئیڈیلز پر

پورے نہیں اتر سکے......... اس کہانی کو خوبصورت انجام بھی مل سکتا تھا لیکن قدرت کو شاید یہی منظور تھا.........!"

رمنا اٹھ کر ٹیلی فون کی طرف لپکی لیکن شاید نفسیاتی اثر تھا کہ اس کی ٹانگوں میں جان نہیں رہی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر راستے میں گر پڑی۔

☆ ========== ☆ ========== ☆

رمنا کی موت کے بعد اختر اس کی تمام دولت و جائداد کا مالک تھا لیکن اس نے فوری طور پر تمام املاک کو ایک فلاحی ٹرسٹ میں تبدیل کر دیا اور ٹرسٹیوں کا ایک بورڈ قائم کر کے سب کچھ انہیں سونپ دیا کہ وہ تمام آمدنی غریبوں اور ناداروں کی مدد پر خرچ کریں۔

اختر ایک عجیب و غریب سی ذہنی کیفیت میں جنگلوں کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ اس کا دل دنیا کی ہر چیز سے اچاٹ ہو چکا تھا اسے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا اسے پختہ یقین ہو چکا تھا کہ اس دنیا کی ہر چیز ایک سراب تھی ایک دھوکا تھا۔ سکون صرف جنگلوں میں تھا اور محبت صرف بے زبان جانوروں کے پاس تھی حتیٰ کہ سانپ بھی انسان سے زیادہ باوفا اور قابل بھروسا تھا جنگلوں میں اس کا خوب دل لگ گیا جنگل رفتہ رفتہ اسے راس آ گئے شہروں کی طرف جانے کے تصور سے بھی اسے وحشت ہونے لگی۔ دنیا اختر حسین کو بھول گئی اور اختر حسین دنیا کو بھول گیا.........

جانوروں والے بابا نے اپنی کہانی ختم کی اور اٹھتے ہوئے بولا۔ "آؤ......... اب میں تمہیں اس راستے پر چھوڑ آؤں جو شہر کی طرف جاتا ہے........."

.... اور ہم......... شہر کے باسی......... شہر کی طرف واپس آنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

======= ختم شد =======